سلسلۂ مطبوعات مجلس
۳۹۱

اوراقِ زندگی

(جلد اول)

ماضی کے جھروکوں سے کچھ تاریخی، خاندانی جھلکیاں، زندگی کے کچھ سبق آموز واقعات، مطالعاتی وتدریسی مشاغل، تعلیمی، دعوتی اسفار، اہم دینی، علمی، ادبی اور سیاسی شخصیات سے ملاقاتیں، دینی ملی، تعلیمی اور دعوتی تحریکات سے وابستگی کا حال۔

از

(مولانا سید) محمد رابع حسنی ندوی

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام
ٹیگور مارگ، ندوہ کیمپس، ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

طبع اول

شعبان ۱۴۴۳ھ -- مارچ ۲۰۲۲ء

نام کتاب	:	اوراق زندگی (جلد اول)
نام مصنف	:	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
صفحات	:	۵۰۴
تعداد اشاعت	:	۶۰۰
طباعت	:	لکھنؤ پریس
قیمت	:	۴۰۰/روپے
باہتمام	:	محمد کلام الدین ندوی

ناشر

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

ٹیگور مارگ، ندوہ کیمپس، ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ

فون نمبر: 0522-2741539

E-mail: info@airp.org.in

Website :https://www.airp.org.in

فہرست مضامین

’’اوراقِ زندگی‘‘

(اول)

صفحہ	عناوین	
۱۶	عرض ناشر	
۱۸	مقدمہ	
۲۰	خاندان اور وطن	
۲۰	دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی	
۲۸	عارف باللہ حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ کے اثرات	
۳۰	پیدائش	
۳۱	مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی اور مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کی فکر و تربیت	
۳۶	والدہ محترمہ رحمہا اللہ	
۳۷	تعلیم و تربیت	
۴۰	مظاہر علوم سہارنپور اور دار العلوم دیوبند میں	
۴۳	حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی لکھنؤ آمد اور ان کی مجالس	
۴۴	برادر اکبر سید محمود حسن حسنی کی وفات کا حادثہ	
۴۵	حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کی توجہات	
۴۷	حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی شفقتیں	
۴۷	حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے استفادہ	
۴۹	دار العلوم ندوۃ العلماء سے تکمیل	

	اجازت حدیث	۵۶
	مولانا سید محمد طلحہ حسنی ٹونکی مرحوم کی تعلیم وتربیت	۵۷
	حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت وارادت کا تعلق	۵۸
	ملک کی آزادی اور تقسیم ملک، فسادات اور لکھنؤ میں جمعیۃ علماء ہند کا کل ہند اجلاس اور اس کے اثرات	۶۰
	مطالعاتی ادوار اور چند گزارشات ومشورے	۶۳
	۱۹۵۰-۵۱ء کے حج وزیارت کی کچھ یادیں	۷۰
	حجاز مقدس سے واپسی پر خاندانی حادثہ	۸۷
	شادی	۸۸
	شیخ علی طنطاوی اور شیخ امجد الزھادی کی ندوہ آمد	۸۹
	امیر مساعد بن عبدالرحمٰن آل سعود کی ندوہ آمد	۸۹
	سپاس نامہ	۹۰
	بعض خاندانی اور اہم ملی حوادث	۹۳
	دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس	۹۵
	ایک امتحان اور اللہ کی توفیق	۹۶
	عراق اور بحرین کا سفر	۹۸
	کویت کا سفر اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے خطابات	۹۹
	دنیا میں اسلامی ممالک کی پوزیشن	۱۰۰
	''جزیرۃ العرب'' کی تالیف	۱۰۲
	عربی اردو جرائد ومجلات سے قلمی وابستگی	۱۰۴
	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کا قیام ۱۹۵۹ء	۱۰۵

	حجاز مقدس کے اسفار اور علماء و مشائخ سے استفادہ	۱۰۸
	ایک یادگار نظم اور وصیت	۱۰۹
	حجاز مقدس کا ایک طویل قیام، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے محاضرات اور حج کی سعادت	۱۱۰
	پہلا خطبہ: نبوت، انسانیت کو اس کی ضرورت، تمدن پر اس کا احسان	۱۱۵
	دوسرا خطبہ: انبیائے کرام علیہ السلام کی امتیازی خصوصیات اور مزاج و منہاج	۱۱۶
	تیسرا خطبہ: ہدایت کے امام اور انسانیت کے قائد	۱۱۶
	چوتھا خطبہ: ارادۂ الٰہی اور اسباب مادی	۱۱۷
	پانچواں خطبہ: رسالت محمدیؐ کی عظمت	۱۱۷
	چھٹا خطبہ: نبوت محمدی کا کارنامہ	۱۱۸
	ساتواں خطبہ: ختم نبوت	۱۱۸
	عالم عربی کی فکری بساط پر رونما ہونے والے پرخطر حالات	۱۱۸
	۱۹۶۴ء کے سفر یورپ کے چند تاثرات	۱۲۱
	اسلامک کلچرل سینٹر لندن	۱۲۱
	ایسٹ لندن ماسک	۱۲۳
	کھانے کی مصیبت	۱۲۴
	اسلامی اقامت خانوں کے قیام کی ضرورت	۱۲۵
	یورپ کی زندگی کا ایک بڑا خلا	۱۲۵
	دنیاوی لطف و منفعت مقصد حیات	۱۲۶
	عرب طلبہ کی کوشش	۱۲۶
	جرمن قوم میں دعوت کا کام	۱۲۸

	جینوا کا اسلامک سنٹر	۱۲۸
	ملت کے تحفظ کی دینی تعلیمی، ملی، رفاہی اور سیاسی کوششیں	۱۲۸
	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا سیتاپور میں بغرض علاج قیام	۱۳۴
	مرکز اصلاح وتبلیغ کچہری روڈ لکھنؤ میں مستقل قیام	۱۳۵
	عالم عربی کا المیہ اور مشرق وسطی کے قابل تشویس حالات	۱۳۶
	بعض حوادث ووفیات	۱۳۸
	خاندان کی بہت ہی بابرکت وبزرگ خاتون کا سانحہ وفات	۱۳۹
	والد ماجد کے سفر حج میں رفاقت	۱۴۰
	ایک یادگار خط	۱۴۱
	ایک آزمائش	۱۴۴
	بنگلہ دیش کا قیام	۱۴۶
	رابطہ عالم اسلامی کے وفد کا شام، شرق اردن، لبنان، عراق اور کویت کا دورہ	۱۴۷
	بادیۃ الشام کا مغربی شمالی علاقہ	۱۵۰
	والد صاحب کی علالت اور مولانا سید محمد ثانی حسنی کا رائے بریلی میں مستقل قیام	۱۵۵
	مولانا واضح رشید حسنی ندوی کی دہلی سے لکھنؤ کا واپسی	۱۵۶
	مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کا مولانا واضح رشید حسنی ندوی کے نام ایک مکتوب	۱۵۶
	عالم اسلام کے لیے سخت سانحہ اور صدمہ	۱۵۹
	ملک میں ایمرجنسی کے حالات، ظلم وتشدد، گرفتاری اور وزیر اعظم سے ملاقات	۱۶۰
	ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن تعلیمی	۱۶۱
	جشن تعلیمی کا دعوت نامہ	۱۶۲
	دو خاندانی حادثے اور ایک بڑا علمی خسارہ	۱۶۴

	مغرب اقصیٰ (مراکش) میں دو ہفتے	۱۶۵
	رابطۃ الجامعات الاسلامیۃ کی رباط کانفرنس اور اہم شخصیات سے ملاقات	۱۷۱
	الدار البیضاء اور مراکش شہر کی مصروفیت	۱۷۵
	آل ورلڈ اسلامک ایجوکیشن کانفرنس مکہ مکرمہ ۱۹۷۷ء	۱۷۷
	ریاستہائے متحدہ امریکہ و کناڈا کا دورہ (اواخر مئی تا اوائل اگست ۱۹۷۷ء)	۱۷۸
	جنتا پارٹی کا اقتدار، مسز اندرا گاندھی کی تکیہ کلاں رائے بریلی آمد	۱۸۶
	ندوہ میں وزیر خارجہ اٹل بہاری واجپئی کی آمد و ملاقات	۱۸۷
	امام حرم شیخ عبدالعزیز آل الشیخ کی ندوۃ العلماء تشریف آوری	۱۸۷
	متحدہ عرب امارات، سعودی عرب و قطر کا ایک طویل سفر	۱۸۹
	مولانا تقی الدین ندوی کے نام راقم کا ایک مکتوب	۱۹۱
	حجاز مقدس کا دوبارہ سفر اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی رفاقت	۱۹۳
	شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی ندوہ تشریف آوری اور محاضرات	۱۹۷
	برادر عزیز مولانا سید محمد الحسنی کی وفات اور بعض دوسرے حوادث	۱۹۷
	حرم شریف کا حادثہ اور مہدویت کا دعویٰ	۲۰۰
	شاہ فیصل ایوارڈ کے لیے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے نام کا اعلان	۲۰۱
	دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس اور اس کے اثرات	۲۰۲
	ندوۃ العلماء میں عربی و اسلامی ادب پر بین الاقوامی مذاکرہ	۲۰۴
	دعوت نامہ	۲۰۹
	تجاویز و سفارشات	۲۱۳
	اول۔ اسلامی ادب کے دائرہ کار میں توسیع اور اس کی عمومی ہمت افزائی	۲۱۴
	دوم۔ ادب اسلامی کی تعلیم کا میدان	۱۱۶

	سوم-اسلامی ادب کی اشاعت اور اسلامی ادباء کی کوششوں کو ہم آہنگ کرنا	۲۱۷
	چہارم- دینی تربیت کا میدان -بچوں، نوخیزوں اور نوجوانوں کے لیے اسلامی لٹریچر	۲۱۸
	پنجم-عربی زبان کی تعلیم اور اس کی نشر واشاعت	۲۲۰
	صدر جمہوریہ ایوارڈ جنوری ۱۹۸۲ء	۲۲۲
	بڑا خاندانی حادثہ، برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کی وفات	۲۲۳
	برادر معظم مرحوم کی وفات پر راقم کی ایک تحریر	۲۲۶
	دار المصنفین کا اسلام اور مستشرقین پر بین الاقوامی سیمینار	۲۲۷
	دار العلوم ندوۃ العلماء میں حاکم شارقہ شیخ سلطان بن محمد القاسمی کی آمد	۲۳۲
	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کا حادثہ وفات	۲۳۳
	الجزائر کا سفر اور عالمی کانفرنس تلمسان میں شرکت	۲۴۰
	حیدرآباد (دکن) واورنگ آباد (مراٹھواڑہ) کا علمی دعوتی سفر	۲۴۸
	آکسفورڈ یونیورسٹی کا اسلامک سنٹر اور حضرت مولانا کا مقالہ اسلام اور مغرب	۲۵۳
	حضرت مولاناؒ کا امارات، سعودی عرب اور کویت کا دورہ	۲۵۴
	ندوۃ العلماء میں مدارس عربیہ کے نظام ونصاب پر مذاکرہ علمی اور دوسرے پروگرام	۲۵۷
	حضرت مولاناؒ کا پانچ ملکوں کا سفر اور رابطۂ ادب اسلامی عالمی کی تشکیل	۲۶۰
	دار العلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ کا تعلیمی اجلاس	۲۶۲
	خوش آئند الفاظ موجودہ تمدن کا فریب	۲۶۴
	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی نئی عمارت کی تکمیل وافتتاح	۲۶۵
	وزیر اعظم ہند کا حادثہ قتل: اسباب ومحرکات	۲۶۶
	خمینی اور اسلام کے نام پر ایران میں انقلاب: اسباب ونتائج	۲۶۸

	سیرت النبیؐ پر حضرت مولاناؒ کو صدر ضیاء الحق کی طرف سے ایوارڈ کا اعلان	۲۷۰
	مدینہ طیبہ کی ''نادی المدینۃ الادبی'' میں حضرت مولاناؒ کی تقریر	۲۷۱
	شیخ عبدالعزیز الرفاعی کے مکان پر ادب اسلامی کا ایک جلسہ	۲۷۲
	رابطۂ ادب اسلامی عالمی کی ریاض میں اہم اور پہلی تاسیسی میٹنگ	۲۷۳
	رائے بریلی میں مولانا محمد ثانی حسنی میموریل لائبریری کا افتتاح	۲۷۵
	انگریزی میگزین کے اجراء کے لیے ایک اپیل	۲۷۶
	ندوۃ العلماء میں ادب اسلامی پر دوروزہ ملتقی	۲۷۸
	رفیق درس وتدریس مولانا عبدالماجد ندوی کی وفات	۲۸۰
	امام حرم شیخ عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز السدیس کی ندوۃ العلماء تشریف آوری	۲۸۱
	مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی وفات	۲۸۳
	محدث جلیل مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کی کراچی سے تشریف آوری	۲۸۴
	دارالعلوم تاج المساجد بھوپال میں علامہ سید سلیمان ندویؒ پر سیمینار	۲۸۴
	یورپ میں حضرت مولاناؒ کے ساتھ چند دن	۲۸۵
	آکسفورڈ سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز	۲۸۶
	حاکم شارقہ شیخ سلطان بن قاسمی سے ایک ملاقات	۲۹۲
	آکسفورڈ یونیورسٹی	۲۹۶
	آکسفورڈ سنٹر	۲۹۸
	لکسمبرگ کا سفر	۲۹۹
	عالمی انجمن برائے تحقیقات اسلامی کے جلسہ کی کاروائی	۳۰۳
	تحقیقی کاموں کا جائزہ	۳۰۴
	ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی اور ڈاکٹر حسن ترابی	۳۰۶

	لندن واپسی	۳۰۷
	ڈاکٹر فتحی عثمان	۳۰۸
	اسلامک ویلفیئر ہاؤس	۳۰۸
	عربی روزنامہ ''الشرق الاوسط''	۳۰۹
	اسلامک سنٹراور مسلم ویلفیئر سنٹر	۳۱۰
	اسلامک سنٹر میں	۳۱۱
	ڈاکٹر سعید رمضان سے ملاقات	۳۱۱
	شیخ سعید باز سجکی	۳۱۱
	صالح نومسلم انگریز	۳۱۲
	ہندوستان واپسی	۳۱۲
	سید محمود الحسن عثمانی کی وفات	۳۱۲
	جامعۃ الہدایہ جے پور کا افتتاح	۳۱۳
	شاہ بانو کا مسئلہ اور حکومت کا فیصلہ	۳۱۵
	ملت کا بے نظیر اتحاد اور اس کی برکات	۳۱۵
	ندوۃ العلماء میں رابطہ ادب اسلامی کا بین الاقوامی اجلاس	۳۱۸
	بابری مسجد کا مسئلہ	۳۲۱
	حضرت مولانا علی میاںؒ کا بیان	۳۲۳
	ترکی میں رابطہ ادب اسلامی کی اہم کانفرنس	۳۲۵
	ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشا کا انتقال (۱۸؍جولائی ۱۹۸۶)	۳۲۷
	مولانا محمد عمران خان ندوی کا سانحۂ وفات	۳۲۹
	ندوۃ العلماء میں امام حرم اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے وفد کی آمد	۳۳۰

	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام میں ایک استقبالیہ	۳۳۴
	معہد تحفیظ القرآن الکریم کا افتتاح	۳۳۴
	اخبار کا تاثر	۳۳۵
	ولکن اللہ سلم (۱۸ر نومبر ۱۹۸۶ء)	۳۳۵
	دار العلوم ندوۃ العلماء میں حضرت مولانا محمد احمد پرتا بگڈھی کی تشریف آوری	۳۳۶
	رائے بریلی کا سفر	۳۳۷
	سعودی عرب کے وزیر تعلیم شیخ حسن عبداللہ آل الشیخ کی وفات	۳۳۸
	رابطہ ادب اسلامی کا اجلاس جے پور (فروری ۱۹۸۷ء)	۳۳۸
	ملیشیا کا سفر	۳۴۱
	شیخ علی طنطاوی کا ندوۃ العلماء کے بارے میں اظہار خیال	۳۵۹
	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا کلیدی خطبہ	۳۶۱
	تخریب کاری کا ایک واقعہ اور حادثہ حرم مکی	۳۶۳
	حرم مکی کی عظیم توسیع کی تکمیل اور مسجد نبویؐ کی توسیع کا آغاز	۳۶۳
	انگلستان کا سفر	۳۶۴
	جمعیۃ الاصلاح ندوہ کے جلسہ میں تاثرات کا اظہار	۳۶۵
	رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے پچیس سال ہونے پر عالمی کانفرنس	۳۶۶
	ایک اپوزیشن قائد کا اعتراف حقیقت	۳۷۳
	ایک خوش کن خبر اور مبارک اقدام	۳۷۴
	ندوۃ العلماء میں رابطہ ادب اسلامی کا دوسرا سیمینار اور سکریٹری رپورٹ	۳۷۵
	سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ کی وفات	۳۸۰
	ایک ملی ضرورت کا احساس	۳۸۰

	جنرل ضیاء الحق کی شہادت	۳۸۱
	رابطۂ ادب اسلامی ''نعت نبوی شریف'' سیمینار منعقدہ اورنگ آباد	۳۸۲
	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی کتاب ''المرتضیٰ'' کا رسم اجرا	۳۸۶
	حجاز مقدس کا اہم سفر اور امارات کے راستہ سے وطن واپسی	۳۸۷
	لکھنؤ میں دینی تعلیمی کونسل کا مشاورتی جلسہ	۳۹۳
	حیدر آباد کا جلسۂ پیام انسانیت	۳۹۴
	دارالعلوم ندوۃ العلماء میں توسیعی خطبات کا سلسلہ	۳۹۵
	چند ممتاز اہل علم کی وفات	۳۹۶
	مسلم پرسنل لا بورڈ کا کانپور اجلاس	۴۰۰
	دارالعلوم ندوۃ العلماء میں دوروزہ دینی تعلیمی کنونشن	۴۰۱
	محدث جلیل مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کی دوسری تشریف آوری	۴۰۲
	آیت اللہ خمینی کا انتقال	۴۰۴
	المعہد العالی للدعوۃ الفکر الاسلامی کی ضرورت وافادیت	۴۰۷
	ترکی میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کا اجلاس	۴۰۸
	آکسفورڈ لندن کے اسلامک سنٹر کی میٹنگ میں شرکت	۴۱۰
	حیدر آباد میں رابطہ ادب اسلامی کا سیمینار	۴۱۲
	برصغیر کی صورت حال پر ایک تبصرہ ومشورہ	۴۱۲
	دو خاندانی حادثے (دسمبر ۱۹۸۹ء)	۴۱۳
	چند دیگر وفیات	۴۱۵
	دارالعلوم ندوۃ العلماء میں شعبہ تجوید قرأت کا افتتاح	۴۱۶
	مولانا ابوالکلام آزاد کی صد سالہ پیدائش کی تقریبات	۴۱۶

	دہلی میں پیام انسانیت کا ایک اہم جلسہ	۴۱۸
	اردو اکاڈمی اتر پردیش کے زیر اہتمام مولانا عبدالماجد دریابادی پر سیمینار	۴۱۹
	پروفیسر مشیر الحق ندوی کی شہادت	۴۱۹
	پیام انسانیت کا بنگلور میں ایک جلسہ	۴۱۹
	پیام انسانیت کا لکھنؤ میں جلسہ	۴۲۰
	چند اہل تعلق کا سانحۂ وفات	۴۲۰
	دینی تعلیمی کونسل کی عاملہ کی لکھنؤ میں میٹنگ اور کچھ اہم فیصلے	۴۲۱
	عالم عربی کا تازہ المیہ	۴۲۲
	رائے بریلی میں حمد و مناجات کے موضوع پر عالمی سیمینار	۴۲۴
	سکریٹری رپورٹ	۴۲۶
	بابری مسجد کا مسئلہ نئے موڑ پر	۴۲۹
	چند اہل علم و اہل تعلق کی وفات	۴۳۰
	رائٹرس کانفرنس کے زیر اہتمام پیام انسانیت کا اہم جلسہ	۴۳۱
	علماء ترکستان کی ندوۃ العلماء آمد	۴۳۲
	افسوس اور فکر کی بات	۴۳۳
	مسلمان بچوں کے لیے ایک نادر تحفہ	۴۳۴
	چند اہم وفیات	۴۳۴
	خلیج کی جنگ اور اس کے مضمرات و نتائج پر سیمینار	۴۳۵
	سابق وزیر اعظم ہند راجیو گاندھی کا دردناک قتل	۴۳۶
	دو اہم حادثۂ وفات	۴۳۷
	ندوۃ العلماء میں شعبہ تربیت افتاء و قضاء کا قیام و افتتاح	۴۳۸

	سیکولرزم اور ہندوستان کے موضوع پر سیمینار	۴۳۹
	یادگار سلف حضرت مولانا محمد احمد پرتا بگڈھی کا حادثۂ وفات	۴۳۹
	بھوپال میں رابطہ ادب اسلامی کا ساتواں سالانہ علمی مذاکرہ	۴۳۹
	افغانستان میں اسلامی حکومت کا قیام	۴۴۰
	دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مسجد اقصیٰ کے امام شیخ محمد محمود الصیام کی آمد	۴۴۳
	ندوۃ العلماء میں المعہد العالی للقضاء والافتاء کی عمارت کا افتتاح	۴۴۴
	مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور بلاد عربیہ کے دو اہم شخصیتوں کی وفات	۴۴۵
	ندوۃ العلماء کے قیام کے سو سال	۴۴۶
	اتحاد ملت کانفرنس ممبئی اور آل انڈیا ملی کونسل کا قیام	۴۴۷
	رابطہ ادب اسلامی کی تعارفی مہم اور اس کے وفد کا مختلف شہروں کا دورہ	۴۴۸
	آکسفورڈ اسلامی سنٹر کے اہم فیصلہ اور پروجیکٹ	۴۵۰
	چند اہل تعلق و اہم شخصیات کی وفات	۴۵۲
	لیسٹر (برطانیہ) میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا اہم خطاب	۴۵۳
	افغانستان سے بوسنیا تک کے حالات کا ایک تجزیہ	۴۵۴
	عالمی دعوت وفکر اسلامی کانفرنس کا رائے بریلی میں انعقاد	۴۵۵
	دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کا آٹھواں سیمینار	۴۵۷
	بابری مسجد کا انہدام، ظلم و بربریت کا دور دورہ اور پیام انسانیت کے جلسے	۴۵۸
	بابری مسجد کے حادثہ پر "تعمیر حیات" کا اداریہ	۴۵۹
	ملک میں فسادات کی لہر	۴۶۰
	بارہ دری لکھنؤ میں پیام انسانیت کا بروقت اہم جلسہ	۴۶۲
	وزیر اعظم نرسمہا راؤ سے علماء وقائدین کے ایک وفد کی ملاقات	۴۶۲

	رائے بریلی میں پیام انسانیت کا جلسہ	۴۶۳
	چند اہم اہل علم ودعوت کی وفات	۴۶۳
	''صحافت عصر حاضر میں''-ایک محاضرہ	۴۶۵
	استنبول میں رابطہ ادب اسلامی کی کانفرنس	۴۶۶
	ایک گرامی قدر مکتوب	۴۶۹
	لندن میں	۴۷۴
	شکاگو میں عالمی مذاہب کانفرنس	۴۷۵
	مجدد الف ثانیؒ کا حکیمانہ طرز عمل زیادہ کامیاب ہوسکتا ہے	۴۷۶
	مکتوب امریکہ	۴۷۸
	تین ملکوں کے سفر سے واپسی پر ندوہ میں ایک محاضرہ اور تاثرات	۴۸۱
	سمرقند و بخاریٰ کی بازیافت	۴۹۴
	وقت کا سب سے بڑا اجہاد اور اس کا سب سے بڑا چیلنج	۴۹۷
	جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڈھ کا دوروزہ اجتماع	۴۹۸
	انسٹی ٹیوٹ آف انٹگرل ٹیکنالوجی کا تقریب سنگ بنیاد	۴۹۸
	دارالعلوم ندوۃ العلماء سے متعلق اہم سانحہ وفات	۵۰۰
	دارالعلوم بستی کا پروگرام	۵۰۲
	مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی کا سالانہ جلسہ	۵۰۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی أشرف الأنبیاء والمرسلین وخاتم النبیین سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین۔

''اوراق زندگی'' آپ کے ہاتھ میں ہے، والد ماجد مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کا اصرار نہ ہوتا تو شاید یہ کتاب آج آپ کے ہاتھ میں نہ ہوتی، وہی تھے جن کے دل میں اس کا خیال آیا، وہی تھے جنھوں نے اس پر زور دیا، وہی تھے جنھوں نے مولانا محمود حسن حسنی ندوی کو اس کام پر مامور کیا، کام مشکل تھا، محنت طلب تھا، دیانت کا متقاضی تھا، مولانا محمود حسن حسنی ندوی کے علاوہ دوسرا کوئی شخص اس کام کے لیے موزوں نہ تھا، یہ کام ان کے ذوق کا تھا، ان کی دلچسپی کا تھا، ان کے مزاج کا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں سیرت وسوانح پر کام کرنے کا بڑا تجربہ تھا، ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (حفظہ اللہ تعالی) کے ساتھ سفر وحضر میں ساتھ رہنے کا موقع بھی انھیں ملتا رہتا تھا، ان کے لیے زیادہ مواقع تھے پوچھنے کے، دریافت کرنے کے، معلومات لینے کے، چنانچہ انھیں جب وقت ملتا، قلم کاغذ لے کر بیٹھ جاتے اور پوچھتے جاتے اور لکھتے جاتے اور جو لکھتے وہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (حفظہ اللہ) کو سنا دیا کرتے، مزید ایک کام ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کرتے کہ ''کاروان زندگی'' اور ''تعمیر حیات'' میں موضوع سے متعلق جو چیزیں ملتیں خواہ وہ سفر کی روداد ہو، یا سیمیناروں اور کانفرنسوں کی رپورٹیں، مناسب جگہ پر وہ بھی شامل کر دیتے، اس طرح یہ کتاب تیار ہو کر ایک دستاویز کی شکل میں ''اوراق زندگی'' کے نام سے آپ کے سامنے آئی۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (حفظہ اللہ) کو اپنے نامور ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ رہنے کا جتنا موقع ملا یقیناً کسی دوسرے کو اتنا موقع نہیں ملا، سفروں میں ساتھ، کاموں میں ساتھ، مشوروں میں ساتھ، ملاقاتوں میں ساتھ، کانفرسوں

اور سیمناروں میں ساتھ، بہت کچھ دیکھا بہت کچھ جانا اور بہت کچھ سمجھا، ضرورت تھی کہ ان کی زندگی کے حالات، مشاہدات وتجربات سامنے لائے جائیں تاکہ لوگ اس دور کو دیکھ سکیں، اس دور کے مسائل کو سمجھ سکیں اور اس دور کے مسائل کو حل کرنے کے لیے جو کوششیں کی گئیں ان کوششوں سے واقف ہوسکیں۔

ہم شکر گزار ہیں مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی کے کہ انہوں نے اس ضرورت کو پورا کیا اور ساتھ ساتھ ہم شکریہ ادا کرتے ہیں مولانا اسماعیل بھولا ندوی کا کہ ان کے مالی تعاون سے اس کتاب کی اشاعت کا کام آسان ہوا اور مجلس پر اس کا کوئی بوجھ نہ پڑا۔

یہ کتاب مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندویؒ کی زندگی میں مکمل ہوچکی تھی اور وہ اس پر ایک مقدمہ بھی تحریر فرما چکے تھے، لیکن افسوس کہ طباعت کی نوبت ان کی زندگی میں نہ آسکی، بہرحال خوشی کی بات ہے کہ ان کے مقدمہ کے ساتھ یہ کتاب اب آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے واللہ ولی التوفیق۔

جعفر مسعود حسنی ندوی

سکریٹری مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

ندوۃ العلماء، لکھنو

۲؍شعبان ۱۴۴۳ھ/۶؍مارچ ۲۰۲۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی أشرف الأنبیاء والمرسلین وخاتم النبین سیدنا محمد وعلی آلہٖ وصحبہ أجمعین۔

"آپ بیتی" کہیے، "یادایام" کہیے، "سفرنامہ حیات" کہیے، "کاروان زندگی" کہیے، موضوع سب کا ایک ہی ہے اور وہ ہے زندگی، کسی اور کی نہیں، اپنی زندگی اور صرف زندگی ہی نہیں، زندگی کے واقعات، تجربات، مشاہدات، زندگی کے نشیب و فراز، خوشی وغمی کے لمحات اور اچھے اور برے تمام حالات۔

مقصد بیان کرنے کا اپنی زندگی سے متعارف کرانا نہیں، اپنے کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا نہیں، اپنی حیثیت منوانا اور اپنی شخصیت تسلیم کروانا نہیں۔

مقصد اگر لکھنے کا صرف یہی ہوتا تو بہت سے اللہ والے جنہوں نے ہمیشہ اپنے کو دوسروں سے کمتر سمجھا، شہرت پر گمنامی کو ترجیح دی، نام ونمود سے ہمیشہ دور رہے اور اخفاء ہی کو اپنا سرمایہ حیات سمجھا، وہ کبھی اس موضوع پر قلم نہ اٹھاتے اور اظہار پر کبھی آمادہ نہ ہوتے؛ لیکن انہوں نے قلم اٹھایا اور اپنی کتاب زندگی کے صفحات دوسروں کے سامنے کھولے تاکہ دوسرے لوگ ان کی زندگی کے واقعات سے روشنی حاصل کریں، ان کی زندگی کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں، ان کے مشاہدات سے اپنی معلومات میں اضافہ کریں اور وہ ماضی جو ان کی نظروں سے اوجھل تھا، اس ماضی کی شمع سے اپنے حال اور مستقبل کی شمع کو روشن کریں۔

اپنی زندگی کی کہانی سنانا تو بہت آسان ہے، کیوں کہ سب کچھ نگاہوں کے سامنے اور سب کچھ ذہن میں محفوظ ہوتا ہے؛ لیکن واقعات کے گودام سے ان واقعات کو نکالنا جن کا تذکرہ پڑھنے والوں کے لیے مفید ہو اور پھر ایسے اسلوب میں ان کو پیش کرنا کہ پڑھنے والے کی دلچسپی آخر تک برقرار رہے اور اس سے اس کو علمی، فکری اور روحانی غذا بھی ملتی رہے، آسان کام نہیں۔

"اوراق زندگی" میں آپ کو نہ کہیں مبالغہ آرائی ملے گی، نہ اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے

کا کہیں جذبہ نظر آئے گا، نہ کہیں اپنی انفرادیت کے اظہار کا عنوان ملے گا، سادہ زبان اور بے تکلف انداز میں وہ حقیقت بیانی ملے گی جو یقیناً آپ کے دل پر اثر انداز ہوگی جس سے بہت سی گرہیں کھلیں گی، بہت سی گھتیاں سلجھیں گی، بہت سی غلط فہمیاں دور ہوں گی اور ان دشواریوں کا علم ہوگا جو کسی بھی کام کرنے والے کو کام کے دوران پیش آتی ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اکثر اسفار میں ان کے مرافق مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رہتے تھے، جو ان کے علمی، دینی، دعوتی، فکری، اصلاحی اور تمام کاموں میں دست راست اور معاون ومشیر تھے، پھر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے دنیا سے جانے کے بعد ان کے چھوڑے ہوئے کاموں کو انہوں نے آگے بڑھایا اور اس خلا کو کافی حد تک پُر کر دیا جو ان کے جانے کے بعد پیدا ہوا تھا، یہی وجہ ہے کہ آج ان کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے جانشین کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور ان کو وہ مقام دیا جاتا ہے جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کو دیا جاتا تھا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پر آپ کی اہم کتاب ''مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عہد ساز شخصیت'' مشاہدات وتجربات کی روشنی میں آچکی ہے، لیکن حضرت مولانا رحمۃ اللہ کے متعلق بہت سی باتیں اس کتاب میں نہیں آسکی تھیں، وہ ''اوراق زندگی'' میں ہمیں ملتی ہیں، چنانچہ اس کتاب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

مولانا محمود حسن حسنی ندوی نے اس کتاب میں سفروں کی روداد، کانفرنسوں کی رپورٹوں اور سیاسی وملی حالات پر تبصروں کو جو ''تعمیر حیات''، ''ندائے ملت'' اور بعض دوسرے رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے تھے، جمع کر کے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی تعلیم وتربیت، اہل خاندان، اسلاف ومشائخ اور محسنین کے تذکرے کے ساتھ اس کتاب کو ایک بہترین خودنوشت سوانح عمری کی شکل میں پیش کر دیا، اس کتاب کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی آپ بیتی ''کاروان زندگی'' کی کڑی قرار دیا جاسکتا ہے۔

محمد حمزہ حسنی ندوی
ندوۃ العلماء لکھنو

۱۹؍شعبان المعظم ۱۴۴۲ھ
یکم اپریل ۲۰۲۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خاندان اور وطن

دائرہ شاہ علم اللہ، رائے بریلی

خاندان کا تعلق دائرہ حضرت شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں آباد خاندان سے ہے جو حسنی الحسینی کہلاتا ہے جس کے مورث اعلیٰ حضرت عبداللہ المحض تھے جنہیں المحض کہا ہی اس لئے جاتا ہے کہ وہ سیدنا حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ (سبط اکبر) کے پوتے (ابن الابن) اور سیدنا حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ (سبط اصغر) کے نواسہ (ابن البنت) تھے، ان کی اولاد خلیفہ منصور عباسی کے زمانہ میں یا تو جہاد میں شہید ہوئی یا پھر دعوت وہدایت کے لیے دوسرے ملکوں میں پھیل گئی، لیبیا، مراکش، الجزائر وغیرہ میں ان کا فیض زیادہ عام ہوا، مراکش میں تو ان کی آج بھی حکومت ہے۔

ہندوستان میں حضرت عبداللہ الاشتر بن محمد ذوالنفس الزکیہ آئے اور شہید ہوئے، ان کے بیٹے محمد بن عبداللہ مدینہ منورہ واپس گئے جن کی نسل میں امیر کبیر بدر الملۃ المنیر فاتح ہند شیخ الاسلام حضرت سید قطب الدین محمد المدنی الحسنی الحسینی اشارہ غیبی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بشارت پاکر دعوت وہدایت کے کام کے لیے ہندوستان ساتویں صدی ہجری کے آغاز غالباً ۶۰۷ھ میں آئے، ان کا یہ سفر اپنے اہل خاندان واقارب اور مریدین ومسترشدین ومجاہدین کے ساتھ براہ غزنی (افغانستان) تھا اور کڑا میں قیام کیا، وہیں ان کی قبر ہے، وہ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ کے خلیفہ تھے، اور بادشاہ ہند قطب الدین ایبک ان کا مرید تھا جیسا کہ خال معظم مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "اپنے ماموں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے استفادہ کیا تھا، اور ان کی وفات کے بعد حضرت شیخ نجم الدین کبری سے بیعت کی اور ان کے بڑے خلفاء میں ہوئے، سلطان قطب الدین ایبک آپ کا مرید تھا، آپ کو رویائے

صادقہ میں بارگاہ نبویؐ سے حکم ملا، کہ ہندوستان جاکر ظلمت کفر مٹائیں (ترجمہ مصنف یادآیام ص۲نسخہ قدیم) ان کی اولاد میں بڑے بڑے علماء، مصلح، قاضی، داعی، مبلغ، مرشد، مربی اور مجاہد پیدا ہوئے، جن کی ایک شاخ جائس ہوتی ہوئی نصیر آباد آئی، ان میں شیخ وقت حضرت شاہ علم اللہ حسنی نقشبندی (۱۰۳۴ھ-۱۲۱۶ء) نے تکیہ کلاں رائے بریلی میں دریائے سئی کے کنارے طرح اقامت ڈالی، اوران کے بھائی شاہ داؤد نے اس سے تھوڑی دور شہر کے کنارے خالص ہاٹ میں قیام اختیار کیا، حضرت شاہ علم اللہؒ کے تکیہ میں قیام کا ایک خاص واقعہ ہے، ان کے شیخ حضرت سید آدم بنوری مدینہ پاک ہجرت کررہے تھے، انہوں نے بھی اس کا ارادہ ظاہر کیا؛ مگران کے شیخ نے فرمایا کہ راستہ میں جو اللہ کے خاطر روکے، ٹھہر جانا، رائے بریلی میں دریائے سئی کے پاس ایک بزرگ نے یہ بات یاد دلائی اور روکا، استخارہ کے بعد انہوں نے رکنے کا فیصلہ کیا اور پھر انہی کی تجویز کردہ جگہ پر ساحل دریائے سئی آباد ہوئے اور ''ربنا لیقیموا الصلاۃ'' کے جذبہ اورانہی بزرگ کے اشارے پر مغربی جانب مسجد اور مشرقی جانب قیام گاہ اختیار کی، اور جب ۱۰۸۳ھ میں پختہ مسجد بنائی تو اس کی بنیاد میں زمزم شریف ڈالا جو اپنے حج کے سفر سے لے کر آئے تھے، عقیدہ میں صلابت، سنت کی اتباع، بدعت سے تنفر، اور دین کے لئے قربانی کا جذبہ ان کا خاص وصف تھا، ان کی اولاد در اولاد یہ خصوصیت منتقل ہوتی رہی، اور یہ خصوصیت ان کے پوتے مولانا سید محمد نور کے پوتے امیر المومنین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ میں زیادہ وسعت وجامعیت کے ساتھ ظاہر ہوئی، جو شاہ علم اللہ حسنیؒ کے پرپوتے حضرت شاہ ابوسعید حسنی ابن حضرت سید محمد ضیاء کے نواسے بھی تھے، حضرت شاہ ابوسعید حسنی حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ممتاز تلامذہ میں شمار کیے جاتے ہیں، حضرت سید احمد شہیدؒ نے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اوران کے بھائی شاہ عبدالقادر صاحب ''موضح القرآن'' کی خدمت میں رہ کر تربیت حاصل کی، اور خاندانِ ولی اللہ کے ممتاز اشخاص حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ ان کی دعوت ومشن میں شریک ہوگئے تھے اوران کے ساتھ فرائض وسنن کے احیاء اور حج کی ادائیگی، ہجرت کے عمل اور جہاد میں حصہ لے کر بعض نے جامِ شہادت بھی نوش کیا، حضرت شاہ ولی

اللہ کے عظیم القدر پوتے حضرت شاہ اسماعیل شہید کا نام بہت نمایاں ہے، میرے اجداد میں مولانا سید سعید الدین کا حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ سے اچھا تعلق و رابطہ تھا، جو ان کے تکیہ کے قیام میں قائم ہوا تھا اور بیعت و ارادت کا تعلق حضرت سید احمد شہیدؒ سے تھا۔ ان سے پہلے خاندان میں فقر و فاقہ اور بڑی تنگی معاش تھی، ان کو اللہ نے وسعت و فراخی عطا فرمائی ، جو حضرت سید احمد شہید کی دعا کی برکت تھی اور پھر ان کی اولاد میں کچھ عرصہ زمینداری رہی اور علاقہ میں دبدبہ رہا مگر ظلم اور حق تلفی سے حد درجہ اجتناب رہا، یہ محض اللہ کا فضل تھا۔

میرا آبائی سلسلہ نسب اس طرح ہے:

سید رشید احمد حسنی بن مولوی سید خلیل الدین بن مولوی سید رشید الدین بن مولانا سید سعید الدین بن مولانا غلام جیلانی بن مولانا محمد واضح محدث بن مولانا سید محمد صابر بن مولانا سید شاہ آیت اللہ بن حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی نقشبندی رائے بریلی بن مولانا سید محمد فضیل بن مولانا سید محمد معظم بن مولانا قاضی سید احمد بن مولانا قاضی سید محمود نصیر آبادی بن قاضی سید علاء الدین بن قاضی سید قطب الدین محمد الثانی جائسی رحمہم اللہ۔

آگے کا سلسلہ اس طرح ہے:

امیر سید قطب الدین محمد الثانی بن صدر الدین بن زین الدین، بن احمد، بن علی، بن قیام الدین بن صدر الدین قاضی رکن الدین بن امیر سید نظام الدین کڑوی بن شیخ الاسلام بدر الملۃ المنیر حضرت سید قطب الدین محمد المدنی، بن مولانا رشید الدین، بن یوسف بن عیسی بن حسن بن ابوالحسن علی بن ابو جعفر محمد ابن قاسم بن ابو محمد عبداللہ بن حسن الاعور الجواد نقیب الکوفہ ابن محمد بن عبداللہ الاشتر بن حضرت محمد ذو النفس الزکیہ شہید بن عبداللہ المحض بن حسن مثنی بن سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سبط النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

مادری انتساب اس طرح ہے: سیدہ امۃ العزیز مرحومہ بنت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ بن مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی بن مولانا سید عبدالعلی حسنیؒ بن سید علی محمد بن سید اکبر شاہ بن سید محمد شاہ بن مولانا سید محمد تقی بن مولانا سید عبدالرحیم شہیدؒ بن مولانا سید ہدایت اللہؒ (صدر الصدور عہد شاہجہانی) بن مولانا سید محمد اسحاق بن مولانا سید محمد معظم نصیر آبادی رحمہم

اللہ، مولانا سید محمد معظم سے آگے سلسلہ نسب پدری نسب نامہ میں گزر چکا ہے۔ شیخ الاسلام حضرت سید قطب الدین محمد المدنی الحسنی کی اولاد قطبی، مدنی، حسنی اور ان کے صاحبزادے امیر نظام الدین کی وجہ سے نظامی بھی لکھتی رہی، لیکن زیادہ تر لوگ حسنی لکھتے ہیں۔

سید قطب الدین محمد الثانی اور قاضی علاء الدین جائس میں رہے اور ان سے پہلے کے اجداد کڑا (الہ آباد) میں رہے جہاں سب سے پہلے قطب الدین ایبک کے زمانہ میں امیر کبیر بدر الملة المنیر شیخ الاسلام سید قطب الدین محمد المدنی مدینہ پاک سے ازراہ عراق و افغانستان تشریف لائے، اور دعوت دین واعلاء کلمۃ اللہ مقصد ہجرت تھا، مختلف فتوحات ان کے حصہ میں آئیں، امراء وسلاطین بھی ان کا بڑا احترام کرتے تھے، علماء ومشائخ بھی بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کی عمر ۹۶ سال ہوئی، اور ۶۷۷ھ میں انتقال ہوا، کڑا میں مدفون ہوئے جو رائے بریلی اور الہ آباد کے درمیان ایک تاریخی حیثیت کا حامل شہر رہا ہے۔

مولانا سید سعید الدین ابن مولانا غلام جیلانی مولانا سید معصوم احمد (بہنوئی حضرت سید احمد شہید جن کے ہاتھ پر قریب کے گاؤں میدان پور کے محمد رستم ایمان لائے تھے، جن کی اولاد وہاں آباد اور وہیں مدرسہ ضیاء العلوم قائم ہے) اور مشہور عالم مولانا سید قطب الہدیٰ حسنی کے بھتیجے تھے جو حضرت شاہ عبد العزیز کے مخصوص تلامذہ میں تھے، ان کے پاس خاندانی اور دوسری کتابوں کا بڑا اہم ذخیرہ تھا جو انہوں نے اپنے علمی اشتغال رکھنے والے بھتیجے مولانا سید محمد ظاہر حسنی کو ہبہ کر دیا تھا، اس ہبہ نامے پر حضرت سید احمد شہیدؒ کے بھی دستخط تھے، مولانا سید محمد ظاہر حسنی کی نرینہ اولاد نہ تھی، دو بیٹیاں تھیں، دونوں علم و دین میں ممتاز خاتون تھیں اور یکے بعد دیگرے ہمارے خاندان کی دوسری شاخ کے بڑے صاحب تقویٰ فرد مولانا سید عبد العلی نصیر آبادی کو منسوب ہوئیں، جن میں ایک مولانا سید فخر الدین حسنی صاحب ”مہر جہاں تاب“ کی والدہ ہیں، مولانا محمد ظاہر حسنیؒ حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ بھی تھے اور انہی نے مولانا فخر الدین حسنی کی تربیت کی اور اجازت سے بھی سرفراز کیا۔

یہاں سے ہمارا ددیہال اور ننیہال جڑ جاتا ہے، مولانا سید فخر الدین کی کئی بہنیں تھیں، ان میں بڑی بہن میرے دادا مولانا سید خلیل الدین حسنیؒ کی والدہ تھیں، اس طرح

میرے دادا اور میرے نانا مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ حقیقی پھوپھی زاد ماموں زاد بھائی ہوئے، دونوں میں بڑی محبت اور تعلق تھا، دہلی اور اس کے اطراف کا تاریخی سفر دونوں نے ساتھ کیا تھا جو ''دہلی اور اس کے اطراف'' کے نام سے ہندوستان و پاکستان کے مکتبوں سے کئی بار شائع ہو چکا ہے، اس سفر میں میرے دادا مولانا سید خلیل الدین حسنی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہو گئے تھے اور میرے نانا نے اجازت حدیث کی سعادت حاصل کی تھی، وہ بیعت حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن مرادآبادیؒ سے تھے اور ان کی وفات کے بعد بیعت عثمانی حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے کی تھی اور جواب بھی حاصل کیا تھا، محققین انہیں ان کے خلفاء میں شمار کرتے ہیں۔ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ لکھتے ہیں: ''بیعت عثمانی کے ذریعہ سے حضرت شیخ المشائخ حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی کی جانب سے چاروں مشہور سلاسل میں اجازت وخلافت عطا ہوئی'' (از ترجمہ مصنف یادایام ص ۱۲)

مولانا سعید الدین اور مولانا محمد ظاہر حقیقی بھائی تھے۔ مولانا سعید الدین نے اچھی علمی قابلیت حاصل کر کے وہ حیثیت بنائی کہ آس پاس کی زمین جائداد خرید کر دوسروں کے کام آنے کا موقع حاصل کیا، آج بھی ہم لوگ ان کی بنائی جائداد سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اور ان کو ثواب حاصل ہو رہا ہے، ان کے دو بیٹے تھے، سید رشیدالدین اور سید وحیدالدین معروف بہ حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ، سید رشیدالدین نے جائداد کا نظم ونسق سنبھالا، اور حج کی سعادت بھی حاصل کی، بعد میں جائداد کا نظم ونسق ان کے بڑے صاحبزادے سید خلیل الدین حسنی مرحوم کے ذمہ ہوا۔ اور انہوں نے اپنے عم مکرم حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ کے ساتھ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی، وہ حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ کے بڑے خویش (داماد) بھی تھے۔

سید خلیل الدین مرحوم میرے دادا تھے چوں کہ ان کا نکاح حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ کی بڑی صاحبزادی سے ہوا تھا، اور ایک صاحبزادی کا نکاح مولانا سید عبدالحی حسنیؒ سے ہوا جو میری نانی تھیں، اس طرح میری دادی اور میری نانی حقیقی بہنیں تھیں۔

میرے والد ماجد سید رشید احمد حسنی مرحوم (۱۸۹۲ء-۱۹۷۵ء) کی سماعت ونطق

خاصا متاثر تھا، پھر بھی انہوں نے اشارہ سے دی ہوئی تعلیم کا ایک ضروری حصہ حاصل کر لیا تھا، ان کی بڑی بہن جوان سے خاصی بڑی تھیں، والدہ کی جلدی وفات کی وجہ سے مادرِ مشفقہ کی طرح رہیں، ان کا نام بتول بی تھا، وہ میری نانی سیدہ خیر النساء بہتر مرحومہ کی بھانجی تھیں مگر ہم سن تھیں اور دونوں حافظ قرآن تھیں، ان کے علاوہ بھی خاندان کی بعض خواتین حافظ قرآن تھیں، جس کا پورے ماحول پر بڑا اثر تھا، میری ان پھوپھی کی شادی حافظ سید عبداللہ حسنی بن سید محمد نعیم سے ہوئی جو میرے والد کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھے، ان کے کئی صاحبزادے ہوئے مگر وہ بچپن میں فوت ہو گئے جو تین بڑے ہوئے، انہوں نے اچھی عمر پائی اور صاحب اولاد ہوئے، اور ہمارے اس چھوٹے سے گاؤں تکیہ کلاں میں ہم سب کے ساتھ مکیں ہوئے، ان کے نام سید حسن مجتبیٰ حسنی، ڈاکٹر سید حسن مثنی حسنی، اور سید محمد مسلم حسنی ہیں، ان سب کو اللہ تعالیٰ اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ہم بھائیوں کا ان بھائیوں سے بہت قرب و یگانگت کا معاملہ رہا اور ان کی اولاد نے بھی اس تعلق کو سمجھا اور اس کا خیال رکھا۔

میرے والد کے چچازاد بھائی جو ان کے خالہ زاد بھائی بھی تھے، بیرسٹر سید محمد احمد حسنی مرحوم بن سید امین الدین مرحوم، ان کا اور ہم لوگوں کا قیام اگر چہ مشترک تھا مگر وہ کراچی پاکستان منتقل ہو گئے، وہ بڑے چاہنے والے چچا تھے، ان کے صاحبزادوں سے بھی حقیقی بھائیوں جیسا تعلق تھا، جن میں سید سعید احمد حسنی اور سید سعد حسنی نے زیادہ تعلق رکھا، سید سعید احمد حسنی امریکہ میں مقیم ہیں۔ بیرسٹر صاحب نے برطانیہ میں تعلیم حاصل کی اور بڑا نام کمایا تھا۔

حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ کی اولاد میں سید احمد سعید کے پوتے اور حافظ سعید عبید اللہ کے نواسے سید مصباح النبی حسنی مرحوم تھے، جو چالیس سال جدہ میں رہے اور آخر میں اپنے وطن آکر یہیں وفات پائی۔ ان کا تعلق بھی حقیقی بھائیوں کی طرح تھا، ماموں زاد بھائی مولانا سید محمد الحسنی مرحوم ابن مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) تھے، جو اپنی بہنوں میں اکیلے اور سب سے چھوٹے تھے مگر ان میں سب سے پہلے ان کی وفات ہوئی جبکہ ان کی عمر صرف ۴۴ سال تھی وہ فکر و عمل میں اشتراک رکھنے کی وجہ سے بہت قریب تھے اور ان کی وفات کا معاملہ بھی ہم سب کو بہت محسوس ہوا، مولانا ابوبکر

حسنی جو اگرچہ ایک رشتہ سے میرے ماموں اور ایک رشتہ سے چچا بھی تھے، ایک رشتہ سے بھائی بھی ہوتے تھے، بڑے بھائی کی شفقت کا معاملہ رکھتے تھے ان کے والد مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی ندوہ کی تحریک سے بھی جڑے اور مولانا عبدالحی حسنی کے دور نظامت میں سرگرم رہے، اور ان کے صاحبزادے مولانا سید ابوبکر حسنی ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ و نظامت کے تاعمر رکن رہے۔ جو جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے اور اس سے پہلے آل انڈیا ریڈیو میں بھی رہے تھے۔

خاندان کی برگزیدہ ہستی مولانا سید عبدالعلی نصیر آبادی جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے پردادا ہیں ان سے بھی میرا ددیہالی و ننہالی تعلق تھا وہ ایک طرف میرے دادا سید خلیل الدین صاحب کے نانا تھے تو دوسری طرف میرے نانا مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کے دادا تھے، مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی اور مولانا سید ابوالقاسم حسینی بھی ان کے نواسہ ہیں۔

سب سے پہلے سیدنا حضرت حسن اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما کی اولاد کے آپسی رشتوں کا پتہ چلتا ہے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کا نکاح حضرت علی زین العابدین بن الحسینؓ سے ہوا تھا جن سے امام محمد باقر پیدا ہوئے، جعفری، نقوی، رضوی، حسینی سادات کا یہ مادری سلسلہ ہے، اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ بنت الحسین کا رشتہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت حسن مثنٰی سے ہوا تھا جن سے حضرت عبداللہ المحض پیدا ہوئے، محض انہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حسنی الحسینی ہیں، ان کے بیٹے حضرت محمد ذوالنفس الزکیہ شہید جو منصور عباسی کے خلاف جنگ میں شہید ہوئے، ان کے بیٹے حضرت عبداللہ الاشتر سندھ آگئے تھے، ۱۵۱ھ میں وہ منصور کے لشکر کا مقابلہ کرتے ہوئے سندھ میں شہید ہوئے، ان کے صاحبزادے حضرت محمد بن عبداللہ واپس بغداد گئے اور منصور نے ان کے نسب کی تصدیق کرتے ہوئے انہیں مدینہ منورہ بھیج دیا، جہاں ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں حضرت سید قطب الدین محمد المدنی اپنے والد سید رشید الدین المدنی کے ساتھ ہندوستان کے لئے براہ غزنی و کابل روانہ ہوئے، اور دہلی

آ کر پھر مختلف علاقے کڑا، قنوج، ہنسوہ وغیرہ فتح کئے اور ان کا زمانہ قطب الدین ایبک سے علاء الدین خلجی تک کا ہے، اور سبھی ان کی بڑی قدر کرتے تھے ان کا مرقد کڑا میں ہے، ان کے ساتھ حضرت خواجگی بھی کڑا آئے تھے اور ان کا بھی وہیں مرقد ہے۔ وہ حسینی زیدی سادات میں تھے اور عظیم المرتبت شخصیت تھے، ان کی حضرت سید قطب الدین محمد المدنی سے قرابت داری بھی تھی، ان کی اولاد ہنسوہ فتح پور میں بسی، رائے بریلی حسنی قطبی سادات اور ہنسوہ فتح پور کے حسینی زیدی واسطی سادات کے رشتے ڈھائی تین سو سال سے ہورہے ہیں، اس حسینی ہسوی خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت خواجگی کڑوی بڑے پایہ کے بزرگ تھے، اور ہمارے خاندان حسنی قطبی کے مورث اعلیٰ حضرت سید قطب الدین محمد المدنی کے بھانجہ تھے، ہمارے جد مادری حضرت مولانا محمد واضح محدث (خلیفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) کا رشتہ وہاں ہوا، پھر ہمارے جد مادری مولانا سید فخر الدین صاحب کا رشتہ وہاں مولانا سید سراج الدین بن حضرت سید محمد المہدی الحسینی کی صاحبزادی سے ہوا جو ہمارے نانا مولانا سید عبدالحی حسنی، والد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی والدہ ماجدہ تھیں۔ مولانا سید سراج الدین کی اہلیہ خاندان علم اللہی کے ہی ایک ممتاز فرد سید علم الہدیٰ کی صاحبزادی سیدہ حمیرا تھیں اور انہیں حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی بن حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی صاحبزادی سے تفسیر موضح القرآن کی اجازت بھی حاصل تھی۔

ہمارے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کی والدہ ماجدہ بھی ہنسوہ کے اسی زیدی حسینی واسطی سادات سے تعلق رکھتی تھیں اور مولانا عبدالعزیز صاحب کی بیٹی تھیں، جو میرے دادا مولانا سید خلیل الدین کی حقیقی خالہ زاد بہن تھیں، مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کی اہلیہ زہرا بی مولانا سید ابوالقاسم حسینی ہنسوی کی بیٹی تھیں ہمارے والد سید رشید احمد حسنی مرحوم کی حقیقی پھوپھی زاد بہن بھی تھیں، اور عظیم المرتبت بزرگ حضرت مولانا شاہ عبدالسلام حسینی ہسوی (م ۱۲۹۹ھ) میرے نانا مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کے چچیرے ماموں تھے اور ان پر حد درجہ مشفق تھے، اور ابھی بھی یہ رشتے قرابتیں قائم اور جاری ہیں، بعد میں منصور پور مظفر نگر کے حسینی سادات کے ایک صالح ذی علم فرد مولانا سید محمد طاہر منصور پوری سے میری ماموں زاد بہن کا رشتہ ہوا۔

عارف باللہ شاہ ضیاء النبی حسنیؒ کے اثرات

حضرت شاہ ضیاء النبی حسنی قدس سرہٗ چودھویں صدی ہجری کے اوائل کے ان عظیم المرتبت بزرگوں میں تھے جن کے پاس حصول معرفت الٰہی ربانیت صادقہ کے لیے بڑی ذی علم شخصیتیں قیام فرماتھیں، جن میں مولانا محمد ابراہیم آروی، مولانا ابوبکر شیث جونپوری، حضرت مولانا سید محمد امین نصیرآبادی کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں، اوران کا فیض دوردور پھیلا، مشہور بزرگ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے عظیم القدر خلیفہ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری نے بھی قیام فرمایا تھا اورانھوں نے ایک باران کے نواسہ خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے فرمایا تھا کہ میں نے آپ کے نانا (حضرت شاہ ضیاء النبی حسنی) سے اچھی نماز پڑھتے کسی کو نہیں دیکھا۔ حضرت مولانا عبدالحی حسنی نے جو ان کے داماد تھے اور خلیفہ بھی، ان کے متعلق تذکرہ میں لکھا ہے، ''برکۃ الدنیا، سرالوجود، ولب لباب العرفان''، نماز سے انہیں جو شغف اور مناسبت والی بات حاصل تھی، ان کی اولاد، پوتے پوتیوں اور نواسہ نواسیوں میں دیکھ کر بھی اس کا کسی طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا بے چینی سے انتظار، قرآن مجید سے تعلق کا بھی یہی حال تھا، ان کے ایک پوتے سید سراج النبی حسنی کا یہ حال تھا کہ قرآن مجید سن کر وہ تاب نہیں لا پاتے اور گر پڑتے، کئی بار چوٹ بھی آئی، ان کے ایک پوتے حافظ سید حبیب الرحمٰن حسنی مرحوم نے اپنے شوق سے حفظ کیا، اور دوسروں کو کرایا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی ان کے پاس حفظ کیا، اور ایک پوتے مولانا سید ابوالخیر برق حسنیؒ حافظ حدیث تھے، اور اسی قرآن وحدیث کی محبت وشیفتگی نے انہیں عربیت کا بڑا عالم بنادیا تھا، مع سند کے حدیثیں بہ آسانی سنانے لگتے۔ اور عربی اور اردو کے الفاظ اور محاورے نوک زبان رہتے۔ حضرت شاہ ضیاء النبی کے بیٹوں سید احمد سعید صاحب اور حافظ سید عبیداللہ صاحب کا بھی دین سے تعلق بہت گہرا تھا۔ حافظ عبیداللہ صاحب اذان کے ساتھ مسجد پہنچتے، لوگوں کو حیرت ہوتی کہ ابھی بہت دور دیکھے گئے، کیسے یہاں پہونچ گئے؟ نماز پڑھاتے اور بڑے خشوع وطمانیت سے پڑھاتے، میری عمر سات آٹھ سال تھی کہ ان کا انتقال ہوا، اس وقت طاعون پھیلا ہوا تھا،

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب سیرت سید احمد شہید ۱۹۳۹ء میں چھپ کر آئی تو اس کا انتساب انہوں نے اپنے انہی ماموں کی طرف کیا، ان کی شخصیت بڑی محبوب، معتدل، دلآویز اور پرکشش تھی، اور ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتے تھے۔

حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب کی صاحبزادیوں میں اور گھر کی دوسری خواتین میں ۵ پانچ خواتین حافظ قرآن تھیں، جن میں دو ان کی صاحبزادی، ایک نواسی، اور ایک بہو اور غالبًا اہلیہ بھی حافظ قرآن تھیں، اس کا بھی خاندانی ماحول پر بڑا اثر تھا، (۱) دینی حمیت، ملی غیرت کو اُبھارنے کے لئے ''صمصام الاسلام'' پڑھی جاتی، جو ہماری نانی دادیاں، خالائیں، پھوپھی وغیرہ پڑھتی تھیں، یہ فتوح الشام واقدی کا مولانا سید عبدالرزاق کلامی حسنی کا بڑا مؤثر منظوم ترجمہ ہے۔ سید عبدالرزاق کلامی حضرت سید احمد شہیدؒ کے بھانجے سید حمیدالدین کے پوتے تھے اور ان کی اہلیہ ہمارے دادا سید خلیل الدین صاحب کی خالہ اور ہمارے نانا مولانا عبدالحی حسنی کی پھوپھی تھیں، سید عبدالرزاق کلامی میاں کی صاحبزادی حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب کے بڑے بیٹے سید احمد سعید حسنی کو منسوب تھیں اور ہماری ممانی صاحبہ (اہلیہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ) کی والدہ تھیں، ہماری والدہ صاحبہ اور والد صاحب دونوں حضرت شاہ صاحب کے نواسے تھے، والد صاحب نے ان کا اچھا زمانہ پایا تھا لیکن والدہ صاحبہ چند ماہ کی تھیں کہ ان کے نانا حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ کا سانحہ انتقال پیش آیا، والدہ ماجدہ اور والد صاحبؒ کی نانی صاحبہ بھی بڑی بزرگ قناعت پسند خاتون تھیں اور تین بھائیوں سید محمد نعیم عرف اچھے میاں، سید محمد یقین والد مولانا محمد عزیز الرحمٰن حسنیؒ) اور مولانا حکیم سید محمد یامین حسنی میں اکیلی بہن تھیں اور سیدہ طیب النساء (طیبہ بی) نام تھا، سیدہ طیب النساء مرحومہ کے والد مولانا سید محمد معین حسنی، حضرت سید محمد امین اگھا میاں کے پوتے اور مشہور مصلح حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی کے ماموں زاد بھائی تھے، حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ کی صاحبزادی نانی صاحبہ سیدہ خیر النساء بہتر میں ان کے دینی اثرات اور تعلق مع اللہ کی بڑی

---

(۱) آج بھی ماشاء اللہ اس کا مزاج ہے اور میری بھتیجی مرحومہ کی ایک بیٹی حافظ قرآن ہے، اللہ تعالیٰ آگے بھی اس فضل کو جاری رکھے، آمین۔

کیفیت منتقل ہوگئی تھی اور وہ سراپا دعا بن گئی تھیں، ذکر و دعا اور نماز میں ان کا انہماک قابل دید ہوتا، جانماز ان کے آنسوؤں سے تر ہو جاتا تھا، اس پر بھی بس نہ تھا، اشعار میں مناجات اتنی کہتیں کہ ان کا مجموعہ ''باب رحمت'' تیار ہو گیا پھر اس کا اختصار ''کلید باب رحمت'' شائع ہوا اور بہت مقبول ہوا، اس کے ساتھ تربیت کا بڑا ذوق تھا اس لئے بھی ان کی کتاب ''حسن معاشرت'' کو بڑی مقبولیت ملی، اور کثیر تعداد میں اس کے ایڈیشن نکل چکے ہیں، امور خانہ داری میں ''ذائقہ'' بھی مقبول ہوئی، اس کے ساتھ ایک صاحب ارشاد خاتون کی حیثیت سے معروف تھیں۔ ''الدعاء والقدر'' کے نام سے بھی مؤثر کتاب لکھی جو ''دعا اور تقدیر'' کے نام سے بھائی محمد عثمان صاحب حیدرآبادی نے ابھی چند سال قبل شائع کرائی تو متاع گمشدہ کے طور پر بڑا اس کا استقبال ہوا، ان کو اللہ نے اچھی عمر دی، ہم سب کی تربیت میں ان کا بڑا حصہ رہا، ۹۳ سال کی عمر میں ۱۳۸۸ھ (۱۹۶۸ء) کو رائے بریلی میں ذکر الٰہی کے ساتھ وفات پائی، وہ میری نانی تھیں جن کی بڑی دعائیں ملیں۔

پیدائش:

میرے والد ماجد سید رشید احمد حسنی اور والدہ ماجدہ سیدہ امۃ العزیز (۱۹۰۶ء-۱۹۹۶ء) حقیقی خالہ زاد بھائی بہن تھے، میرے نانا مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی نے اندرونی صلاح اور قریبی قرابت کو ترجیح دیتے ہوئے شادی کی، اور یہ ان کی نیت اور جذبہ کا اثر تھا کہ ان کی اولاد نے دین کی تعلیم حاصل کی۔

میرے ایک بھائی سید محمود حسن مرحوم نانا صاحب کی حیات میں ۱۱/جمادی الاولی ۱۳۳۹ھ ۲۴/جنوری ۱۹۲۱ء کو پیدا ہو گئے تھے اور انہیں ان کی شفقت ملی تھی مگر ان کا انتقال عنفوان شباب میں ۲۱ سال کی عمر میں ۱۹۴۲ء کو ہو گیا جس کا والدہ صاحبہ پر بہت زیادہ اثر پڑا مگر صبر و برداشت ایسی کہ پہاڑ ثابت ہوئیں۔

میرے دوسرے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ بروز جمعہ ۲۵/دسمبر ۱۹۲۵ء-۹/جمادی الثانیہ ۱۳۴۴ھ کو پیدا ہوئے اور ان کا بھی انتقال والدہ صاحبہ مرحومہ کی حیات میں ۵۷ سال کی

عمر میں ۱۶ر جنوری ۱۹۸۲ء - ۲۱ر ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ کو ہوگیا، وہ اپنی للّٰہیت، تقویٰ، دعوتی واصلاحی کام اور علمی، ادبی خصوصیات میں فائق تھے، ان کی وفات کا اثر بہت محسوس کیا گیا۔

میرے ایک بھائی مسعود حسن اور ایک بہن رابعہ بھی تھیں جن کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ میری تاریخ پیدائش والد ماجد سید رشید احمد حسنی مرحوم کی ایک تحریر کے مطابق ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۹ء - ۲۵ر جمادی الثانیہ ۱۳۴۸ھ اور مولوی سید محمد واضح مرحوم کی ۲۰ر نومبر ۱۹۳۳ء - ۳ شعبان ۱۳۵۲ھ ہے، نام سب کا محمد رکھا گیا امتیاز کے لئے عربی عدد لگا دیا گیا، میرے دادا کو یہ نام اتنا پسند تھا کہ فرماتے تھے جتنی اولاد ہوگی سب کا یہی نام رکھیں گے۔

مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی فکر و تربیت

ہمارے یہ دونوں ماموں بہت دین دار اور دین کی سربلندی کے حامی تھے جس کا اثر ان کی تعلیم و تربیت کے عمل میں ظاہر تھا، زندگی کا دیندارانہ طرز کچھ نادانشمندانہ سمجھا جاتا تھا، چنانچہ ہم بھائیوں (مولانا محمد ثانی حسنیؒ، مولانا واضح رشید ندویؒ، مولانا محمد الحسنیؒ) کی تعلیم کو اس نہج سے ناقابل تائید سمجھا جاتا تھا لیکن ہمارے دونوں ماموں اور ہماری نانی صاحبہ (مخدومہ سیدہ خیر النساء بہتر مرحومہ) بھی دینی برتری کو قابل ترجیح عمل سمجھتے تھے، ہمارے بڑے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب بھی دینی ترجیح کے ایسے قائل وحامی تھے کہ دینی تعلیم ندوہ، دیوبند سے پوری کرنے کے بعد عصری تعلیم میڈیکل سائنس وغیرہ کی بھی امتیازی حیثیت سے حاصل کی۔ اور اپنی وہی خالص دینی وضع قطع قائم رکھی جس سے انہیں کالج میں بھی عزت ملی اور نماز وغیرہ کی ایسی پابندی وہاں بھی رکھی کہ امتحان کے وقت نماز کا وقت آگیا تو وہیں اپنی شیروانی جو ان کا تعلیمی لباس تھا، بچھائی اور نماز پڑھ لی۔ مغربی تعلیم حاصل کی مگر لباس، حلیہ شرعی رکھا، اور پائجامہ نصف ساق تک رکھا، وہ قدیم وجدید کا سنگم تھے۔ اور بڑی جامعیت رکھتے تھے، علم قدیم اور علم جدید، طب قدیم وطب جدید دونوں کے جامع تھے، اور تین طریق علاج ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، یونانی تینوں کے نسخے تجویز کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں بڑی شفا دی تھی۔ اپنے مطب کی مشغولیت

کے ساتھ گھر کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے خاص عزیزوں اور اولاد کو قرآن وحدیث کے اسباق بھی پڑھائے۔ اور بعض شائقین علم نے ان سے گھر آکر حدیث کی باقاعدہ تعلیم بھی حاصل کی۔ اس کے ساتھ غیر مسلموں میں دعوت کے کام کا بڑا جذبہ اور درد رکھتے تھے اور ایسے مبلغین کا خرچ برداشت کرتے جو ان کی سعی کرتے، خود بھی مساوات کا عملی درس دینے کے لئے اچھوت سمجھے جانے والے طبقہ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی کھا لیتے، دوسری طرف بڑی نفاست اور نظافت والے تھے، اور نماز باجماعت تکبیر اولیٰ وغیرہ کے بہت پابند، زبان کے بہت محتاط، اور صرف ضرورت کی گفتگو کرنے والے تھے، اور اس بات کا بڑا خیال رکھتے کہ ان سے کسی کو اذیت، تکلیف نہ پہونچے، اور ادارہ کے کام میں اپنا ذاتی فائدہ ذرا بھی نہ اٹھاتے حتی کہ قلم کے استعمال میں بھی بہت محتاط تھے، اور دونوں کے لئے ان کے قلم الگ تھے۔ دینی خوبی میں صرف عملی نہیں بلکہ فکری اور علمی خوبی بھی قائم رہی۔ دینی واسلامی قوت و برتری کی فکر بھی رکھتے رہے کہ عالم اسلام میں کیا ہو رہا ہے، اور اپنے حدود میں رہتے ہوئے حجاز کے مدرسوں کو چندے بھی بھیجے، بلقان کی جنگ میں بھی مسلمانوں کی اعانت کی، دنیا کے اقلیتی مسلم ملکوں کے حالات معلوم کر کے وہاں کی ضرورتوں پر دوسرے اہل استطاعت کو متوجہ کرتے، وہاں کی تاریخ وجغرافیہ تک کی تحقیق کرتے، اس کی ضرورت کی طرف متوجہ کرتے، مجھ سے جغرافیہ پر ''جزیرۃ العرب'' کے نام سے کتاب لکھوائی، جس سے دینی تعلیم کے طلبہ فائدہ اٹھاتے ہیں، عملی لائن میں بھی مسلمانوں کے حالات کی فکر کرتے، مولانا علی میاں کو مسلم ممالک میں جانے اور وہاں کے حالات دیکھنے اور جاننے اور ضرورت کی طرف توجہ دلانے کو کہتے، تعلیمی معاملات میں جو بہتر طریقۂ تعلیم کی بات ہوتی اس کی طرف توجہ کرتے، ان کی نظر میں درجہ اور مدت کی تقسیم سے بہتر استاد اور کتاب کی بنیاد پر نظام زیادہ کارگر ہو سکتا ہے، جیسا کہ مسلمانوں کے علمی عروج کے زمانہ میں ہوا اور جو یورپ میں تعلیم کے آخری مرحلہ میں ہوتا ہے لیکن متعدد دشواریوں کی وجہ سے یہاں نہیں ہو پاتا۔ ان کے اس نظریہ کے تحت خود مجھ کو کئی سال فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ ندوہ میں کئی سال اور دیوبند میں ایک سال کے بعد ڈاکٹر صاحب نے طب قدیم اور طب جدید میں ڈاکٹر مختار انصاری

سے استفادہ کیا، اور لکھنؤ کے میڈیکل کالج سے ایم، بی، بی، ایس کرکے مزید ٹریننگ کے لئے مدراس گئے، یہی زمانہ تھا کہ ان کے والد ماجد اور ناظم ندوۃ العلماء مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی نے ۲ر فروری (۱۹۲۳ء-۱۳۴۱ء) لکھنؤ میں وفات پائی جس کا انہیں بعد میں اخبار کے ذریعہ علم ہوا اور انہوں نے بہت صبر وہمت سے کام لیا، پھر ان کی اولاد کی سرپرستی اور تربیت میں لگ گئے اور اسے اپنی عین ذمہ داری سمجھا، اسی وجہ سے ہمیں بھی ان کے بھانجہ ہونے کی وجہ سے خصوصی سرپرستی ملی، امتحانات کے سلسلہ میں آخر سال محنت کو وہ دوران سال یکساں محنت وتوجہ کی کمی بتاتے تھے، اور عمل میں یکسانیت اور مداومت زیادہ مفید اور کارگر سمجھتے تھے، رات کو دیر میں سونا پسند نہ تھا، دینی سیرت کردار کو ترجیح دی، اور بیٹے جو صرف ایک تھے، خود ان کو علم دین سکھایا اور عالم بنایا، تمام امور دینی ہوں یا دنیوی اعتدال کی طرف توجہ دلاتے، قرب بالفرائض کو قرب بالنوافل پر ترجیح دیتے، اور اس کو اختیار کرتے، کثرت عبادت پر ادائیگی حقوق کی فکر کرتے، اور جو کام کرتے پورے استحضار نیت کے ساتھ کرتے، جس عمل میں نیت درست نہ ہو رہی ہوتی، اسے ترک کر دیتے، اس کے بہت واقعات ہیں۔ اولاد کے معاملہ میں رشتوں کے پاس ولحاظ اور دامادوں کے ساتھ معاملات میں سب میں شریعت وسنت کو طبیعت پر غالب رکھتے تھے، اور خواہش نفس پر نہیں چلتے، تربیت فرماتے اور شرعی ہدایات کے مطابق عمل کرتے، اور لکھنؤ آنے والے اعزہ کو اپنا مہمان بناتے، صلہ رحمی، مہمان نوازی، علماء کی توقیر، مشائخ کا پاس ولحاظ اور اس بات کا بڑا خیال کہ دوسرے کو ایذا نہ پہونچے، اور بلاوجہ اسے زحمت وتکلیف دینے سے بچایا جائے، حالانکہ لکھنؤ میں کئی بڑے علماء اور شیوخ تھے، اپنے بڑے بھانجہ میرے برادر معظم مولانا محمد ثانی حسنی کو کہا کہ علی سفر پر رہتے ہیں، میرا انتقال ہو وہ نہ ہوں تو تم نماز پڑھا دینا، اس میں بھی دوسروں کو زحمت اور تکلیف سے بچانے کا کیسا باریک خیال تھا، مگر خبر ملتے ہی بڑے علماء وشیوخ اور عوام کا خاصا مجمع ہو گیا، اور امام اہلِ سنت مولانا عبدالشکور فاروقی سے درخواست کی گئی کہ وہ نماز پڑھائیں اور انہوں نے نماز پڑھائی، تدفین رائے بریلی میں ہوئی، وہاں بھی بڑی تعداد میں لوگ پہونچ گئے تھے، وہاں مشہور عالم دین مولانا محمد منظور

نعمانی نے نماز پڑھائی اور خاندان کی بڑی برگزیدہ شخصیت حضرت شاہ علم اللہ حسنی کے سرہانے تدفین عمل میں آئی۔

انہیں دین، علم دین، تبلیغ دین اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی فکر رہتی تھی، جنہیں ان خطوط سے سمجھا جاسکتا ہے جو انہوں نے اپنے بھائی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو لکھے ہیں، اور رسالہ ''فرشتہ صفت انسان'' از حضرت مولانا عبدالباری ندوی میں لاحقہ کے طور پر شائع ہوگئے ہیں، ندوۃ العلماء کی نظامت ۳۰-۳۱ سال کی، اس سے پہلے نائب ناظم کے طور پر بھی خدمت کرتے رہے تھے، جب نواب سید علی حسن خان مرحوم ناظم ندوۃ العلماء تھے، بڑی جامعیت رکھنے والی زاہدانہ اوصاف کی حامل شخصیت تھی، باغ وغیرہ لگاتے تاکہ اس کے خرچ سے ان کی اولاد دینی کاموں میں یکسو ہو، مگر مکان نہ خریدا نہ تعمیر کرایا بلکہ کرایہ پر رہنا پسند کیا کہ دنیا سے تعلق پیدا نہ ہو۔

ماموں صاحب مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ تعلیمی مرحلہ کے اختتامی حصہ میں مدراس میں ڈاکٹری کی تکمیل کے حصول میں تھے، کہ ان کے والد صاحب میرے نانا اور ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی نے دنیائے فانی سے دارفانی کا سفر کیا، فروری ۱۹۲۳ء کی تاریخ تھی، اور ان کے چھوٹے بھائی میرے دوسرے ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صرف ۹ سال کے تھے، اس طرح ان کی اور دوسرے پسماندگان کی سرپرستی ڈاکٹر صاحب نے کی، ابتداء میں نواب نورالحسن خان مرحوم کی کوٹھی بھوپال ہاؤس میں یہ گھرانہ رہا جہاں نواب صاحب مرحوم کی اہلیہ صاحبہ کی سب کو بڑی شفقت ملی، اس گھرانہ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل رہا، مولانا عبدالحی صاحب جمع نہیں کرتے، روز کا روز خرچ کرتے، کوئی جائداد اور ترکہ نہیں چھوڑا، صرف ایک روپیہ چھوڑا، ڈاکٹر صاحب نے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے پوری سرپرستی فرمائی، اور بھائی بہنوں کو یتیمی کا احساس نہیں ہونے دیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تعلیم مکتب کے مرحلہ کی تھی ماہر فن علماء کے پاس تعلیم کے لئے اور مشائخ وقت کے پاس دینی تربیت کے لئے بھیجا، اور باہر کے سفروں میں بھی پوری رہنمائی فرمائی اور اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کی فکر کے ساتھ اپنی بہن کی اولاد کے ساتھ بھی پوری

سرپرستی کا معاملہ فرمایا اوران کے ساتھ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے بھی نظام تعلیم و تربیت میں پوری سرپرستی کی، مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کے پاس وقت کی بڑی مقتدر شخصیات کوقریب سے دیکھا، اور بہت کچھ سیکھنے کو ملا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ ملک و بیرون ملک سفروں میں خاص طور سے ممالک عربیہ واسلامیہ کے دوروں میں صاحب اقتدارلوگوں کا ان سے تکریم سے ملنا اوراس کا پورا استغنا، اورداعیانہ وزاہدانہ کردار خاموش تربیت کا کام دیتا رہا، بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت، بڑے عمائدین، علماء کبار، دانشورحضرات اورسرکردہ شخصیات کے ساتھ ملاقاتیں، یہ سب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ ہوئیں، اوردارالعلوم ندوۃ العلماء کے نظام تعلیم ودعوت میں ان کی رہنمائی میں بہت کچھ کام کرنے کو ملا، اورملی وملکی قائدین کے ساتھ مذاکرات، ملاقاتیں، مراسلت سب میں ماموں جی ساتھ رکھتے رہے۔ اوراس کا بڑا فائدہ اس وقت ظاہر ہوا جب ان کی وفات ۳۱؍دسمبر ۱۹۹۹ء کے بعدندوۃ العلماء کی ذمہ داری اور ملی، علمی، تعلیمی اداروں کی سربراہی ملی، اور بہت سے ان اداروں میں نمائندگی ملی جس میں وہ نمائندگی کرتے آئے تھے، اس طرح سے دونوں ماموؤں کی سرپرستی میں ایک کامل نظام تعلیم وتربیت گذرا۔

سیدہ خیرالنساء بہتر جوعارف باللہ حضرت شاہ ضیاءالنبی حسنی قدس سرہ کی صاحبزادی اور بڑی صاحب ورع وابتہال خاتون تھیں، دنیاان کی نظرمیں ہیچ اورآخرت اصل تھی، اوروہ نئی اور ابھرتی نسل کی اپنے دینی اثر سے سختی کے ساتھ تربیت ضروری سمجھتی تھیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کوان کی طرف سے دینی بے چینی، اورتعلق مع اللہ، دنیا کی بے ثباتی کی اوردوسری خصوصیات اوراپنے بڑے بھائی مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کی قدیم اسلامی اور جدید عصری جامعیت اور بدلتے ہوئے حالات پرنظر اوربصیرت وفراست اوروالد ماجد مولانا عبدالحی حسنیؒ کا اخلاص عمل وخلق حسن اورعلمی تحقیقی ذوق اورتاریخی مزاج ملا تھا، یہ ان کی شخصیت تھی، تشکیل کے اہم مؤثرات واسباب تھے، پھرانہیں اہلِ قلوب مشائخ کی شفقت دعا اور ماہرفن اساتذہ و مدرسین کی توجہ ملی اوراس کی انہوں نے پوری قدر کی اور فائدہ اٹھایا اوران کی شخصیت بڑی جامعیت کے ساتھ سامنے آئی اورانہوں نے اپنے بھانجوں اوربھتیجہ مولانا سید محمد الحسنی اوراپنے

دوسرے متعلق خاص شاگردوں کی تربیت میں اختیار کی، جس کا راقم کو بھی بڑا حصہ اور فائدہ ملا، جو عصر جدید کی خرابیوں سے بچانے کی فکر اور جامع صفت مزاج و کردار کی روشنی میں رہنمائی کے طور پر نظر آتی ہے۔ تعلیم اور دعوت کے کاموں سے وسیع دائرہ میں اور اہم مواقع پر حضرت مولانا نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اس کا ان کی زندگی اور پھر وفات کے بعد بھی پورے عالم اسلام سے کھل کر اعتراف سامنے آیا، جو ان کی وسیع القلبی، وسیع النظری کے ساتھ دیکھا گیا، بعض وقت بہت سخت بات انہوں نے بڑے اہم اور منتخب مجمع میں کہی مگر اخلاص، خیر خواہی، وسیع القلبی اور وسیع النظری اور اچھے اسلوب بیان نے سامعین میں انہیں اور قدر و منزلت دی، اور ان کی بات کا اثر لیا گیا، ان کا ایک بڑا وصف تواضع اور دوسروں کی خوبیوں کو سراہنا بھی تھا، اس کا بھی مخاطب پر بڑا اثر پڑتا ہے، وہ اپنا تفوق دوسروں پر ظاہر نہیں کرتے تھے مگر وہ دوسروں پر ان کی تواضع اور حقانیت سے ظاہر ہو جاتا تھا، اس سے مجھے بڑا فائدہ ہوا۔

والدہ محترمہ رحمہا اللہ

والدہ صاحبہ مخدومہ معظمہ سیدہ امۃ العزیز اعلیٰ علمی و ادبی ذوق رکھتی تھیں، انہوں نے متعدد اصلاحی مضامین لکھے اور بعض موضوعات پر کتابیں بھی لکھیں، اولاد کی تربیت پر خاص توجہ کی، انبیاء و صالحین کے تذکروں سے ان کی ذہنی تشکیل کی فکر کی، وہ اپنی والدہ کی خدمت کے ساتھ اپنے شوہر کی خدمت اور اولاد کی تربیت اور اہل تعلق کی خدمت و مدد پر خصوصی توجہ کرتیں، خاص طور پر غریبوں، مسکینوں کا بے حد خیال کرتیں حتی کہ کسی غریب، مسکین نے اپنی کوئی خواہش اچھے کھانے اچھے لباس کی ظاہر کی یا تمنا کی تو اس کو انہوں نے دشواری کے ساتھ بھی پورا کیا، ایک بھنگن نے بریانی زردہ کی خواہش کی تو اس کے لئے اس کا انتظام کیا، غریبوں اور مسکینوں کی حاجت روائی کا ترجیحی عمل ہوتا، فرماتیں کہ عید میں ہمارے بچے اچھے لباس پہنیں اور دوسروں کے یہاں کھانے کو بھی نہ ہو؟ یہ جذبہ اس حد تک ان میں بڑھا ہوا تھا کہ قرض لے لے کر وہ مدد کرتیں، وہ بڑی مہمان نواز تھیں۔

نماز و تلاوت کا اہتمام گھر کے کام کاج کے ساتھ کرتیں، اور اولاد کو اس کا اہتمام

کرنے کی تاکید کرتیں، خلاف شرع کام پر سخت ناگواری ظاہر کرتیں، نیک کاموں میں اخفاء سے کام لیتیں، اپنے بارے میں یہ احساس بہت بڑھا ہوا تھا کہ ہم بہت برے ہیں، یہ بات اختلاج کے مرض تک پہونچ گئی تھی، اس سلسلہ میں وہ اپنے سارے خواطر و احساسات کو اپنے شیخ، مرشد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہ کو لکھ کر بیان کرتیں، حضرت شیخ بڑے تشجیعی کلمات تحریر فرماتے، ایک خط میں حضرت شیخ نے تحریر فرمایا کہ ''ہم تمہارے لیے برابر دعا کرتے ہیں اور روضۂ پر صلوٰۃ وسلام بھی روز پیش کرتے ہیں اور تمہاری اولاد اور تمہارے پوتوں پوتیوں کی طرف سے بھی'' آج ہمیں یہ جو کچھ حاصل ہے اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کے احساس کے ساتھ یہ کہنے میں تأمل نہیں کہ سب والدہ صاحبہ کی دعاؤں اور صبر کا صلہ اور نتیجہ ہے۔

والدہ صاحبہ کے یہاں عدل و انصاف اور مساوات ومؤاسات کا وصف نمایاں تھا، اپنی اولاد کی تربیت میں بھی اس کا خیال رکھتی تھیں کہ جو ایک بیٹے کے ساتھ ہو وہی دوسرے بیٹے کے ساتھ ہو، کم سنی میں ایک بیٹے نے ایک چیز زیادہ لے لی دوسرے کی کم ہوگئی، اس پر سخت تنبیہ کی، اور اسی طرح نماز وآداب میں بہت سخت تھیں، اور چاہتی تھیں کہ اذان ہوتے ہی مسجد جایا جائے، دل آزاری اور ظلم سے آخری درجہ پرہیز تھا، اور پاکیزہ طیب مال اختیار کرتیں کہ اسی سے پاکیزہ زندگی بنتی ہے، اور تربیت میں اس پر زور تھا، اور عقیدہ میں بڑی صلابت اور پختگی تھی، ان کے احسانات بے شمار ہیں جنہیں گنایا نہیں جاسکتا۔

تعلیم وتربیت

ہماری عمر تین سال کی رہی ہوگی کہ دادا کا انتقال ہوگیا، دادا سید خلیل الدینؒ کا انتقال ۱۹۳۲ء میں اور ان کے چھوٹے بھائی سید امین الدینؒ کا ۱۹۳۵ء میں ہوا دونوں کو دیکھنا یاد ہے، دادی اور نانا کو نہ دیکھ سکا، نانی صاحبہ سیدہ خیر النساء بہتر مرحومہ کا زمانہ پایا، وہ ایسی خدا ترس خاتون تھیں جن کا پورا وجود خیر و برکت کا باعث تھا، وہ دینی تربیت میں ذرا رعایت نہ کرتی تھیں، نماز، دعا وغیرہ کا اہتمام، دینی وشرعی آداب کا خیال اور اس پر روک ٹوک کرتیں، ان کی یہ

خصوصیت ان کی بہنوں میں بھی منتقل ہوئی تھی جن میں ایک میری والدہ ماجدہ امۃ العزیز اور دوسری خالہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم تھیں، پھر ہمارے ماموں صاحبان مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی جو بڑے ماموں تھے، ندوۃ العلماء کے ناظم اور ایک صاحب نظر مربی واتالیق تھے اور دوسرے ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی تھے جن پر میں اپنی کتاب ''عہد ساز شخصیت'' میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں، ان کے تعارف کی ضرورت نہیں، ان کی سرپرستی اور رہنمائی ہر ہر قدم پر ملی اور کوشش رہی کہ ان کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کریں، بلکہ صرف مشورہ لینا نہیں، ان کا انشراح پیش نظر رہتا تھا۔

مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی اور ان کے بھائی عبدالرحمٰن حسنی خاندان کے بچوں کی تعلیم وتربیت کرتے، ان کے بڑے بھائی سید محمد اسحاق حسنی مرحوم اگرچہ سنتے بولتے نہیں تھے مگر وہ بھی باوقار شخصیت تھے اور مسجد کی بڑی فکر رکھتے تھے یہ وصف ان کے صاحبزادے سید محمد اسماعیل حسنی مرحوم میں بھی آیا جو حالانکہ آخر میں نابینا ہو گئے تھے مگر مسجد کی پابندی اور اذان دینے کی ذمہ داری ادا کرتے رہے جو حسبۃ للہ تھی، اور ان کے بعد ہماری والدہ کے ماموں زاد بھائی حافظ حبیب الرحمٰن حسنی اور مولانا سید ابوالخیر برق سے بھی علمی، ادبی اور تربیتی فائدہ پہونچا۔ حافظ حبیب الرحمٰن صاحب تیراکی، ورزش، کھیل وغیرہ میں بھی ہمت افزائی کرتے۔ ہماری والدہ مرحومہ کے پھوپھا مولانا سید طلحہ حسنی کی علمی سرپرستی بھی حاصل تھی جو علم فلکیات، علم طبعیات، علم ہیئت، ادب، بلاغت، تاریخ، جغرافیہ سبھی علوم وفنون کے ماہر تھے اور اس کی ضروری واقفیت کرانا اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔

ابتدائی مرحلہ میں بچوں کی سطح کی تعلیم مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی سے وطن تکیہ کلاں رائے بریلی میں حاصل کی پھر لکھنؤ جا کر اپنے ماموں ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کی سرپرستی میں رہتے ہوئے لکھنؤ کے محلہ گوئن روڈ، امین آباد کی گلی محمد علی لین کی مسجد میں ۳۷/۱۹۳۸ء میں حاصل کی، مکتب مسجد میں ہمارے خاص استاد مولوی سلیم صاحب مرحوم تھے جو بعد میں مرکز والی مسجد میں امام ومؤذن رہے، مسنون دعائیں بھی انہوں نے پڑھائیں، بہت نیک ورحمدل ہمدرد انسان تھے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کی نماز جنازہ

پڑھائی۔ ۳۹-۴۰ء میں ندوہ کے مکتب میں داخلہ لیا۔ پھر ۱۹۴۱ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے درجہ اول میں داخلہ ہوا، ۱۹۴۲ء میں درجہ دوم عربی میں داخلہ ہوا، پھر میرے سرپرست ماموں نے درجات کے بجائے اساتذہ کے اصول پر تعلیم شروع کرائی، غالباً درجہ سوم عربی میں مولانا سید حمید الدین صاحب فیض آبادی (والد مولانا سید رشید الدین سابق مہتمم مدرسہ شاہی مراد آباد) مولانا سید نور الحسن صاحب وغیرہ سے بھی پڑھنے کو ملا، ۱۹۴۳ء کے اوائل میں ندوۃ العلماء میں کچھ حالات پیش آگئے تھے کہ جس سے تعلیم متاثر ہوگئی تھی، اور کچھ وقت کے لیے دار العلوم کو بند کرنا پڑا تھا، پھر ۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی فضا و ماحول ایک بڑے نورانی ماحول میں تبدیلی ہو گیا تھا جب حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے ہفتہ عشرہ قیام دار العلوم کے احاطہ میں کیا اور یہیں سے شہر اور اس کے نواح میں تبلیغی نقل وحرکت نے زور پکڑا، ان کے معتمد خاص وخلیفہ حافظ مقبول صاحب دہلوی پہلے ہی آگئے، وہ اس جماعت کے امیر تھے جو لکھنؤ آئی تھی۔ ان کے ساتھ بھی لکھنؤ کی گلیوں میں جانا ہوا، مسجد ماموں قبر بھانجہ جہاں ہم لوگوں کا اب مسکن ہے، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نے ازخود جماعت تشکیل فرمائی تھی اور جماعت کانپور اور رائے بریلی بھی گئی، پھر حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ نظام الدین مرکز دلی میں ایک ہفتہ ساتھ گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی جب حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ پشاور کے ایک سفر پر جارہے تھے اور دہلی تک ہم بھی ان کے ساتھ گئے تھے، آگے مولانا عبد الغفار ندوی جونپوری مرحوم ساتھ گئے تھے اور ہم نظام الدین رک گئے تھے۔

۱۹۴۳ء ایک بڑے صدمہ کے واقعہ کی وجہ سے ہی یاد رکھا جائے گا جب حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے رحلت فرمائی، اس کا ہمارے ماموں صاحب مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی اور علامہ سید سلیمان ندوی پر بڑا اثر تھا چونکہ ہم لکھنؤ ۳۶ء میں آگئے تھے، اس دوران حضرت تھانوی کے لکھنؤ کے دو سفر ہوئے تھے اور ان کی مسجد خواص میں مجلس ہوتی تھی، ماموں صاحب کے ساتھ مجھے بھی حاضری کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ اگرچہ کم عمری کی وجہ سے پیچھے جگہ ملی تھی مولانا عبد الباری ندوی اور مولانا عبد الماجد دریابادیؒ، مولانا مسعود علی ندوی یہ سب حضرات جو

ہمارے ندوہ کے اہم لوگ سمجھے جاتے تھے، یہ سب حضرات حضرت تھانویؒ سے وابستہ تھے۔

۱۹۴۴ء میں حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا حادثۂ وفات پیش آیا جو تمام مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ محسوس کیا جانے والا حادثہ تھا، اس لیے کہ ان کی عمومی تبلیغی محنت نے دین کے لیے درد کو عام کر دیا تھا اور جماعت میں نکلنے کا ایک مزاج بنتا جا رہا تھا۔ یہ خوشی کی بات ہوئی کہ ان کی جگہ ان کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی نے لی اور انہوں نے اپنی پوری قوت اس میں صرف کر دی، ملک و بیرون ملک کام پھیلتا چلا گیا، اس سلسلہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے حجاز کے دو سفر ہوئے، پہلا سفر حج جولائی ۱۹۴۷ء میں ہوا اور تقریباً ۶ ر مہینے حجاز میں قیام رہا، دوسرا سفر حج ۱۹۵۰ء میں ہوا جس میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری بھی تھے، اس سفر کا تذکرہ آگے آئے گا۔

مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم دیو بند میں

جہاں تک مروجہ نظام تعلیم کی بات ہے، اس سلسلہ میں ہمیں دارالعلوم دیو بند میں بھی رہ کر وہاں کے اساتذہ سے درجہ میں پڑھنے کا موقع ملا۔ چونکہ ہمارا داخلہ دورۂ حدیث میں نہیں ہوا تھا اس لیے اس محرومی کا احساس رہا کہ اس وقت وہاں کے شیخ الحدیث اور عظیم المرتبت دینی شخصیت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے درجہ میں نہ بیٹھ سکا اور شرائط دورہ کی کتابیں میں مختلف اساتذہ سے پڑھیں، ان میں مولانا عبدالجلیل صاحب، مولانا عبدالاحد جیسے اساتذہ تھے، جلالین و ہدایہ میں مولانا محمد سالم قاسمی علیہ الرحمہ (خلف اکبر حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیو بند) کا ساتھ رہا، اور یہ ساتھ بہت سے ملّی معاملات و امور میں اشتراک عمل کی وجہ سے آخر تک رہا کہ وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر ہو گئے تھے اور رکن عاملہ مجھے بھی منتخب کر لیا گیا تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد بورڈ کی صدارت کے لئے جب مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کا انتخاب عمل میں آیا تو مشورہ میں ان کا اور ہمارا بھی عمل رہا تھا، پھر جب صدارت کی ذمہ داری ہمارے سپرد ہوئی تو ان کا تعاون بلکہ رہنمائی حاصل رہی، دورۂ حدیث کی

تیاری میں اسی زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں مولانا اسعد مدنی، مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی اور مولانا حامد میاںؒ بھی تھے، اور جس کمرہ میں میرا قیام تھا وہاں مولانا سلیم اللہ خاں صاحب نوہاروی جو بعد میں کراچی منتقل ہو گئے تھے، رہتے تھے، وہ دورۂ حدیث میں تھے اور ان کے بھائی بھی کمرہ میں ساتھ تھے، مولانا سلیم اللہ صاحب بڑا خیال فرماتے تھے اور بڑے بھائی کی طرح معاملہ کرتے تھے، انہوں نے کراچی میں جامعہ فاروقیہ قائم کر کے بڑا مقام پیدا کیا اور پاکستان کے دیوبندی الفکر وفاق المدارس کے سربراہ بھی ہوئے، جامعہ فاروقیہ کے قیام سے پہلے انہوں نے دارالعلوم کراچی میں کچھ عرصہ پڑھایا تھا جہاں ان کے شاگردوں میں نمایاں مقام حاصل کرنے والوں میں مولانا محمد رفیع عثمانی اور مولانا محمد تقی عثمانی کے نام ہیں۔

دارالاقامہ میں جائے قیام سے پہلے دو تین دن حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے یہاں مہمان بنے اور ان کی اجازت سے دارالاقامہ منتقل ہوئے۔ مولانا اعزاز علی امروہوی علیہ الرحمہ کی سرپرستی رہی۔

دارالعلوم دیوبند میں مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی علیہ الرحمۃ تھے، ان کے حجۃ اللہ البالغہ کے درس میں بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، وہ بھی خیال فرماتے تھے۔ ان کی مجلس میں استفادہ کا موقع ملا۔

دارالعلوم دیوبند جانے سے پہلے ایک ماہ مظاہر علوم سہارنپور میں گزار جہاں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے گھر پر قیام رہا، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب، حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہی کی بھی زیارت ہوئی، مولانا مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی سے کچھ علمی استفادہ بھی کیا، مولانا اسعد اللہ صاحب کی شفقت بھی حاصل ہو گئی تھی اور لکھنؤ میں انہوں نے اپنے قیام کے دوران ازراہ شفقت فرمایا کہ جی چاہتا ہے تم کو اپنا شاگرد بنائیں، اور کشاف موجود تھی وہ کھولنے کو کہا اور ایک عبارت پڑھوائی اور کہا تم اب ہمارے شاگرد ہو گئے۔

اس طرح ہمیں دیوبند اور سہارنپور کے اساتذہ وعلماء سے نیاز بھی حاصل ہوا اور وہاں کے دینی، ایمانی وتربیتی ماحول کے فوائد بھی محسوس کیے۔

سہارنپور و دیوبند کا قیام ۱۹۴۶ء کا تھا اور اس سے ایک دو سال پہلے برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی مظاہر علوم میں دورۂ حدیث کر چکے تھے، اور ان کو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اور وہاں کے دوسرے اساتذہ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب، حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری، حضرت مولانا عبداللطیف پورقاضوی، حضرت مولانا منظور خان صاحب وغیرہ کی خاص شفقت حاصل رہی، اگرچہ میرا قیام صرف ایک ماہ کا تھا، لیکن پرانا تعلق محسوس ہوتا تھا، مگر ملک کے حالات سخت ہوتے جارہے تھے، اور غیر یقینی صورت حال کا سامنا تھا، صوفی محمد اقبال صاحب ہوشیار پوری ثم مہاجر مدنی کے ساتھ میرا سفر لکھنؤ سے سہارنپور اور سہارنپور سے دیوبند ہوا تھا، ان کو ماموں جی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے والہانہ تعلق تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے اہم واقعات میں ایک واقعہ ہمارے لیے خاص اہمیت کا یہ تھا کہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ وغیرہ کی حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے یہاں تشریف آوری ہوئی تھی اور یہ حضرات ہمارے وطن تکیہ رائے بریلی ہو کر آئے تھے، حضرت رائے پوریؒ نے حضرت مدنیؒ سے فرمایا ''حضرت سید صاحب (سید احمد شہید قدس سرہٗ) کے تکیہ رائے بریلی گئے تھے، اور وہ زمین ہمیں کھینچ رہی تھی کہ یہیں رہ جائیں''، اس پر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا کہ ''دو جگہیں ایسی ہیں جہاں قیام کرنے کو جی چاہتا ہے ایک حضرت سید صاحب کی جگہ تکیہ رائے بریلی میں اور دوسری حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی کی جگہ لوہاری میں''۔

مظاہر علوم ۱۹۴۶ء کے آخر میں گیا اور وہاں سے دارالعلوم دیوبند ۱۹۴۷ء کے شروع میں گیا اور ۴۷ء کے آخر میں لکھنؤ واپسی ہوئی، لکھنؤ سے پھر دیوبند جانے کی تیاری تھی لیکن فسادات مانع بنے، اس دوران شرائط دورہ کی بعض کتابوں کی تیاری لکھنؤ میں رہ کر کر لی تھی، ملا حسن مولانا محمد اسباط صاحب سے پڑھنے جاتے تھے جو شہر میں مقیم تھے اور مشہور عالم مولانا عبدالحی لکھنوی کے شاگرد تھے، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درجہ نہم میں داخلہ ہو گیا،

اور کامیابی ملنے پر ۱۹۴۸ء کے آخر میں معاون مدرس کے طور پر جگہ مل گئی۔

ابتدائی تدریسی زمانہ تعلیم وتربیت کے مراحل کا آخری مرحلہ ہوتا ہے اور اس میں وہ محنت کرنی پڑتی ہے جو زمانہ طالب علمی میں بھی نہیں کی گئی ہوتی ہے، خود مجھے اس کا تجربہ ہوا اور ایک ڈیڑھ سال کا عرصہ گذرا تھا کہ بلاد عربیہ جانے کا موقع مل گیا، اور حجاز مقدس کے قیام سے بڑا علمی، دینی روحانی، ادبی اور زبان کا فائدہ ہوا، وہاں کے علماء و مشائخ عمائدین، امراء، وزراء، ادباء ودانشور طبقہ سے ملنے اور تبادلہ خیال کے اچھے مواقع ملے، اور ہمارے ہندوستان کے علماء ومشائخ کی صحبت ملی، جس سے تہذیب وتادیب نفس کا بھی بڑا فائدہ ہوا، ان میں خاص طور پر حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کا نام قابل ذکر ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی لکھنؤ آمد اور ان کی مجالس

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کا آفتاب علم وحکمت نصف النہار پر تھا اور ان کی طرف تیزی سے لوگوں کا خاص طور پر اہل علم و دانشور طبقہ کا رجوع تھا اور خود حضرت تھانوی قدس سرہ نے تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا بھی تھا کہ الحمدللہ ہمارے حصہ میں عقلاء آئے ہیں ہمارے ندوہ کی متعلق شخصیات میں مولانا عبدالباری ندوی جنہیں اپنے عہد کا بڑا عالم ومصنف اور اسلام کا فلسفی کہا گیا، مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کا تعلق تھا پھر سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر سبھی کو حیرت میں ڈال دیا تھا، لوگوں کو تعجب تھا کہ اتنا عظیم القدر عالم دین، محقق ومصنف اور رہنما اپنے کو کسی ایک شخص کے حوالہ کردے، لوگوں کو ایک طرح اعتراض تھا، لیکن سید صاحب کو پورا اطمنان اور شرح صدر تھا اور جانبین میں بہت جلد یہ تعلق پیدا ہوا کہ حضرت سید صاحب کو حضرت تھانوی نے بڑے اہتمام سے اجازت وخلافت سے سرفراز کیا اور ان کی شان میں اشعار بھی کہے، غالباً یہ سفر لکھنو ۱۹۳۷ء کا واقعہ تھا، پھر دوسرا سفر ۱۹۴۱ء کو ہوا، اس میں ایک مبارک تقریب یہ ہوئی کہ حضرت تھانوی نے ازخود ارادہ فرمایا کہ خال مخدوم ومعظم مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کے مکان پر جو گوئن روڈ، امین

آباد میں لب سڑک تھا اور وہیں ان کا مطب تھا، تشریف لائیں جس کا مسجد خواص سے پیدل ۵/منٹ کا راستہ ہے، مولانا ابرارالحق صاحب (ہردوئی) وغیرہ اور دوسرے حضرت کے خدام ومتوسلین ساتھ تھے، کچھ دیر حضرت گھر پر تشریف فرما رہے اور ماموں صاحب کی خواہش ہوئی کہ وہ اپنے صاحبزادے عزیزی سید محمد میاں حسنی مرحوم کی بسم اللہ کرائیں۔ ایک تعلق والے نے بھی اپنے بیٹے کو ساتھ کر دیا، ان کی آواز ذرا تیز تھی محمد میاں کی معتدل تھی، حضرت نے فرمایا: یہ نقشبندی ہوگا، یہ چشتی، اس وقت محمد میاں کو گھر کے بالائی حصہ سے نیچے لانے کی سعادت مجھ کو حاصل ہوگئی تھی اور اس دعائیہ تقریب میں میں بھی شریک تھا۔ حضرت کی روز مجلسیں بھی ہوتی تھیں لیکن جن کے داڑھی نہیں نکلی تھی وہ اندر نہیں جاتے، باہر کھڑے ہو کر اس کی برکت حاصل کرتے، ہمارے دونوں ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور میرے بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنی اندر جاتے اور قریب بیٹھتے۔ میں بھی شریک مجلس ہوتا لیکن باہر رہ کر ہوتا تھا، حضرت سے تعلق کے لئے یہ کافی تھا، البتہ ان کے علوم سے مناسبت کی یہ تقریب پیدا ہوئی کہ ان کے خلیفہ مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب ''تجدید تصوف وسلوک'' جو حضرت تھانوی کی تعلیمات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے، مجھے عربی میں ترجمہ کو دی گئی، اور اس وقت میری عمر ۲۰-۲۲ سال رہی ہوگی، اس سے بڑا فائدہ ہوا، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا سانحہ ارتحال ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء میں پیش آیا، اس وقت میری عمر ۱۳/۱۴ سال تھی۔

برادر اکبر سید محمود حسنؒ کی وفات

ہم سب بھائیوں میں سب سے بڑے سید محمود حسن مرحوم تھے جن کا نام بھی ہم سب بھائیوں کی طرح محمد تھا کہ ہمارے دادا نے یہ طے کر رکھا تھا، جتنی اولاد ہوگی محمد نام رکھیں گے، فرق کرنے کے لئے عربی عدد کا لاحقہ تھا، نانا صاحب مولانا عبدالحی حسنی نے محمود حسن نام رکھا کہ انہیں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے بڑی عقیدت تھی اور بھائی صاحب کی ولادت سے چند ماہ قبل ۱۳۳۹ھ میں حضرت شیخ الہند کا سانحۂ وفات پیش آیا تھا، بھائی صاحب

نے صرف ۲۱ رسال کی عمر میں ۱۹۴۲ء (۱۳۶۱ھ) کو وفات پائی، اور ان کی تدفین ان کے دادا سید خلیل الدین حسنی مرحوم کے قریب مسجد شاہ علم اللہ، رائے بریلی کے مغربی شمالی جانب حظیرۃ مولانا سید محمد صابر میں ہوئی، ہمارے والدین ماجدین کے لئے یہ حادثہ بہت جانگسل حادثہ تھا، اس کے بعد والدہ صاحبہ کی طبیعت مسلسل خراب رہنے لگی تھی مگر انہوں نے بڑے صبر و ہمت سے کام لیا تھا، ہمارے چند افراد پر مشتمل گھرانہ کے لئے یہ حادثہ بہت سخت تھا کہ یوں بھی بڑے بیٹے سے گھر کا نظم ونسق سنبھالنے کی بڑی توقع ہوتی ہے، افسوس ان کی صحت شروع سے کمزور تھی، اور اسپتال میں بھی انہیں رہنا پڑا تھا، خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی ان کے ساتھ اسپتال میں رہے تھے، اور اسپتال میں گذرے ان لحات کو وہ اپنی زندگی میں دینی وایمانی تغیر وترقی کا بڑا سبب قرار دیتے تھے، وہ مجھ سے پورے آٹھ سال بڑے تھے اور ان کے انتقال کے وقت میری عمر ۱۳ رسال یا اس سے بھی کم رہی ہوگی، ہم بھائیوں میں ان کو یہ شرف حاصل تھا کہ انہیں دادا سید خلیل الدین حسنی مرحوم کی شفقت ومحبت کے ساتھ عظیم القدر نانا مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی شفقت حاصل ہوئی تھی۔ وہ اپنے نانا کی وفات کے وقت دو سال کے اور دادا کی وفات کے وقت گیارہ سال کے تھے، تعلیم کا کچھ ابتدائی وقت اپنے وطن تکیہ کلاں رائے بریلی میں گزارنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوگئے تھے، وہ اور میرے دوسرے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنی دارالعلوم کے دارالاقامہ کے اس کمرہ میں ساتھ مقیم رہتے تھے جہاں خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زیادہ آمدورفت تھی اور وہ مجلّہ ''الضیاء'' کا بھی کمرہ تھا کہ اس کے ایڈیٹر اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے دوست مولانا مسعود عالم ندوی کا بھی قیام تھا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور رحم وکرم کا خصوصی معاملہ فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی توجہات

خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا تعلق حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی تحریک اور جماعت دعوت وتبلیغ سے ۱۹۳۹ء سے قائم ہوگیا تھا جب وہ اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور جناب عبدالواحد صاحب دینی، تعلیمی وتربیتی مراکز و

شخصیات کی زیارت کے لئے نکلے تھے، پھر حضرت مولانا نے ندوہ کے اساتذہ وطلبہ کو نظام الدین مرکز لے جانے کا سلسلہ شروع کیا، اور جماعت میں ان کا زیادہ وقت لگنے لگا، اوران کے متوجہ ہونے سے اور لوگ بھی متوجہ ہونے لگے، خاندان کے افراد کو بھی حضرت کے پاس لے جانے کی فکر کرتے، ہمارے رشتہ کے ماموں سید احمد الحسنی مرحوم کو بھی لے گئے جو حضرت سید احمد شہید کے نواسہ سید محمد اسحاق کے پوتے تھے، حضرت نے ان کا بڑا خیال فرمایا اور حضرت شہید کی نسبت سے تکریم فرمائی، ہمارے یہ سب بزرگ حضرت شہید کے دور قریب سبھی رشتہ داران اور نسبت رکھنے والوں کا بڑا خیال فرماتے تھے۔ ہمارے رشتہ کے قریبی بھائی مولانا سید ابوبکر حسنی کو دہلی میں ملازمت کی وجہ سے وہاں مکان کی ضرورت تھی، اس کا ذکر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا تو انہوں نے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کو خط لکھا اور توجہ دلائی کہ یہ اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ہم سب مسلمان ہیں، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب بھی اس نسبت کا خیال رکھتے تھے، ہمارے ماموں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا پشاور کا سفر تھا، ہمیں بھی دہلی تک ساتھ لے لیا وہ اور مولانا عبدالغفار ندوی صاحب تو آگے سفر پر چلے گئے، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کے پاس مجھے ایک ہفتہ قیام کا موقع ملا، ان کے خاص حجرہ میں رہنے کا بھی وقت ملا، اور شفقت حاصل ہوئی، پھر نوح کے ایک سفر میں بھی ساتھ لے گئے، اسی میں مولانا محمد یوسف صاحب اور مولانا محمد انعام الحسن صاحب بھی ساتھ تھے لیکن ان دونوں پر علم ومطالعہ کی فکر غالب تھی جو ان کی گفتگو سے ظاہر ہوتی تھی، وہ حضرت کا درد وسوز اور امت بلکہ انسانیت کے لیے ان کی فکر وتڑپ اور بے چینی دیکھ رہے تھے جس کے بعد میں یہ دونوں بزرگ حامل ووارث اوران کے فکری وروحانی جانشین ہوئے اور یہ دعوتی کام پورے عالم میں پھیلتا چلا گیا جس کو بہت محدود انداز میں شروع ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور خیال کرنا مشکل تھا کہ یہ کام آگے چل کر اتنی وسعت اور قبولیت حاصل کرے گا اور لاکھوں لوگوں کی اصلاح وتربیت اوران کو دین کے لیے کھپا دینے کا ذریعہ بنے گا، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کا سانحہ وفات سن ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۹۴۴ء دہلی میں پیش آیا۔

حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی شفقتیں

اسی زمانہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی بھی تشریف آوری لکھنؤ رائے بریلی ہوئی اور ندوہ اور تکیہ پر قیام ہوا جب حضرت مولانا محمد الیاس صاحب تشریف لائے تھے، ان کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے بڑا تعلق اور لگاؤ وانس تھا جو برابر بڑھتا ہی گیا جسے جانبین کی مراسلت سے بھی بخوبی سمجھا جاسکتا ہے، ادھر میری والدہ ماجدہ کا بیعت وارادت کا تعلق حضرت شیخ سے ہی ہوگیا تھا اور حضرت شیخ الحدیثؒ کو برابر خطوط لکھتی تھیں اور شیخ جواب کا اہتمام فرماتے تھے، پھر برادر معظم مولانا محمد ثانیؒ کا شیخ سے خصوصی تعلق تھا، جو شاگردی اور مریدی کا تھا، شیخ کے یہاں قدر اور تشکر کا معاملہ بہت تھا جب وہ حجۃ الوداع وعمرات النبی پر کام کررہے تھے اور اس ناچیز سے بھی کچھ دریافت کیا تو اپنی کتاب میں اس کا تذکرہ کیا اور اس کے بعد شفقت اور بڑھ گئی حضرت مولانا کے سفروں میں رفاقت اور ندوہ کے معاملات میں مشوروں میں واسطہ بننا پڑا تو ان کی شفقت اور دعائیں ملیں اور ان سب سے بڑھ کر ۱۹۴۶ء میں سفر سہارن پور میں حضرت کے یہاں ایک ماہ کا قیام اور دار العلوم دیوبند کے قیام میں عیدالاضحیٰ کی تعطیل حضرت کے یہاں گزارنے پر حضرت کی الگ عنایات دیکھیں۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے استفادہ

میری عمر ۸-۹ سال تھی کہ اپنے وطن رائے بریلی سے لکھنؤ منتقل ہوگیا تھا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کا لکھنؤ میں قیام ہمارے بڑے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کے یہاں رہتا تھا۔ حضرت مدنی تحریک آزادی کے قائد اور جمعیۃ العلماء کے صدر تھے، لکھنؤ اس کا اہم مرکز تھا، حضرت مدنی سے قرب کا اچھا موقع تھا، ان کی خدمت کی بھی سعادت حاصل ہوئی اور رات میں کمرہ میں ان کی دعا ومناجات کا حال بھی دیکھا، کہ کیسے شب بیدار اور آہ وزاری کرنے والے تھے۔ استفادہ کا موقع بھی ملتا، بہت کچھ پوچھنے کی سعادت بھی حاصل ہوتی، ان کا شفقت بھرا جملہ "کہیئے حضور"! آج بھی یاد آتا ہے یہاں

حضرت اچھی طرح پہچان چکے تھے جب ۱۹۴۶ء میں دارالعلوم دیوبند تعلیم کے لئے گیا، تو حضرت کی اچانک نظر پڑی، فرمایا: آپ یہاں کیسے؟ عرض کیا پڑھنے کے لیے آیا ہوں، فرمایا تو آپ گھر آیئے اور تین دن حضرت کے گھر میں رہا، جہاں کھانا وغیرہ ساتھ ہوتا، پھر حضرت سے اجازت لے کر دارالاقامہ کی سکونت اختیار کر لی، لیکن حضرت کی مسجد میں ایک وقت نماز ساتھ پڑھنے کی ضرور کوشش کرتا اور گھر تک ساتھ جاتا اور جو پوچھنا ہوتا راستہ میں پوچھ لیتا، ہمارے ماموں صاحب نے خط لکھا تھا کہ فلاں بات حضرت سے پوچھ کے بتاؤ، اس کے حوالہ سے بھی ملا، حضرت نے تشفی بخش جواب دیا اور وہ ماموں صاحب کو لکھ دیا، اس زمانہ میں فون وغیرہ کا سلسلہ نہ تھا، خط کے ذریعہ ہی رابطہ ہوتا تھا۔ حضرت کی جب نظر پڑتی تو فرماتے: کہئے حضور! یہ خاص شفقت کا انداز تھا جس کا لطف آج بھی آتا ہے، دورۂ حدیث میں حضرت کے درس میں شرکت تو نہ کر سکا لیکن گھر حاضری دے کر اور مسجد میں حاضر ہو کر استفادہ کا موقع حاصل ہو جاتا۔ دیوبند سے واپسی پر بھی حضرت سے ربط و تعلق رہا اور حضرت کی شفقت حاصل رہی اور آخر تک ان کے سفر جاری رہے اور لکھنؤ بھی تشریف آوری ہوتی رہی۔ ۱۹۵۳ء میں جب میرا نکاح میرے بڑے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی سے ہوا تو حضرت نے ہی نکاح پڑھایا۔

ہمارا خاندان ان کا عقیدت مند تھا اور ان کی فکر و سیاسی رجحان کا اثر بھی افراد خاندان پر تھا اور ذہنی طور پر ہم سب جمعیۃ العلماء سے وابستگی رکھتے تھے اور آزادی کے پروگراموں میں بھی شریک ہوتے تھے، بعض لوگ محلّہ کے اور بعض تعلق والے مسلم لیگ سے وابستگی رکھتے تھے، ان سے بحث و مباحثہ بھی ہوتا، ہم سب کے سامنے حضرت کے بلند اخلاق اور معیاری سیرت و کردار تھا جس کا نمونہ دوسرے لوگ نہیں پیش کر سکتے تھے۔

حضرت مدنیؒ کی شخصیت میں غیر معمولی کشش اور جاذبیت تھی ان کی دینداری، تقویٰ، للّٰہیت کے اثرات ان کے چہرے پر پوری طرح نمایاں تھے، ان کا رہن سہن کھانا پینا سب کچھ بہت سادہ تھا اور مزاج میں بڑی تواضع تھی، لکھنؤ کا مکان ان کے لیے تنگ ہوتا اور بجلی نہ ہوتی، گرمیوں میں پریشانی ہو جاتی ان کی تکلیف دیکھ کر ماموں جی نے وقتی طور

پر کہیں اور رابطہ کرنا چاہا مگر حضرت نے منظور نہیں کیا کہ جہاں پڑے ہیں وہیں ٹھہریں گے، دسترخوان حضرت کا اجتماعی ہوتا تھا جو کوئی ہوتا اور ایک پیالہ و برتن میں سب ساتھ کھاتے تھے۔ ان کے جس وصف نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ تواضع، عبدیت اور چھوٹی بڑی سنتوں کا ظاہری و باطنی طور پر غیر معمولی اہتمام اور دینی حمیت وملی غیرت اور جذبہ جہاد وعمل بالعزیمت تھا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تکمیل

دارالعلوم ندوۃ العلما کا تعلیمی نظام مکتب، ثانویہ، پھر عالمیت کے چار سال اور فضیلت کے دو سال تھے، ہمارا تعلیمی نظام درجہ کی بنیاد پر کم، اساتذہ اور مساجد کی بنیاد پر زیادہ رہا۔

جیسا کہ پچھلی سطروں میں تذکرہ گزر چکا ہے کہ شوال ۱۳۶۵ھ (۱۹۴۶ء) میں مظاہر علوم سہارن پور گیا اور ایک ماہ سے کچھ زیادہ قیام رہا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک عزیز اور بڑے محب شاگرد صوفی محمد اقبال صاحب ہوشیار پوری کے ساتھ کر دیا تھا، مظاہر علوم سے دارالعلوم دیوبند انہی کے ساتھ ذی قعدہ میں گئے اور شعبان یعنی آخر تعلیمی سال تک قیام رہا ہے اور پھر لکھنؤ واپسی ہوئی، بعض شرائط دورہ کی کتابوں کی تیاری یہاں بھی کرتے رہے اور مولانا محمد اسباط صاحب سے ملاحسن پڑھتے تھے، جو بڑے ماہر استاد اور نابینا تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ممتاز اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، غالباً ۲۵ رمضان ۱۳۶۶ھ کو ملک آزاد ہوا جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ تھی اور ملک کے ایسے حالات ہوئے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر بہت مشکل ہوگیا، اس لیے ماموں صاحب مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کے مشورہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ کی بات سامنے آئی اور سال آخر میں داخلہ کا ٹیسٹ شوال ۱۳۶۶ھ کو دیا۔ حضرت مولانا شاہ محمد حلیم عطا صاحب سلونوی جو حدیث کے بڑے استاد تھے بلکہ شیخ الحدیث تھے اور مولانا مفتی محمد سعید صاحب اعظمی نے داخلہ امتحان لیا۔ الحمدللہ کامیابی حاصل ہوئی اور ان کی توقعات بھی صحیح

ثابت ہوئیں کہ اچھے نمبرات سے کامیابی حاصل ہوئی، بخاری شریف حضرت مولانا شاہ محمد حلیم عطا صاحب سے اور مسلم شریف مولانا سعید احمد صاحب اعظمی سے پڑھی اور مولانا محمد ناظم ندوی سے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' پڑھی۔ یہ سب ماہر اور شفیق استاد اور بہت ذی علم اور صاحب رشد وصلاح تھے، مولانا مفتی محمد سعید صاحب اعظمی سے بھی پڑھا جو دارالعلوم کے مفتی اور اہم استاد تھے، اور مولانا محمد اسحاق سندیلوی جو علوم شرعیہ کے بڑے اساتذہ میں تھے اور حدیث کی اہم کتابیں ان کے ذمہ تھیں سے پڑھا، اس کے بعد ایک سال تکمیل کا لگایا، جسے فضیلت سے تعبیر کر سکتے ہیں اور پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت معاون مدرس تقرر ہو گیا، ابتدائی عربی سالوں میں مولانا سید حمید الدین فیض آبادی سے جو شیخ الحدیث تھے، نحو پڑھی، مولانا نور الحسن صاحب، مولانا سید عبد الغفار نگرامی صاحب، مولانا محمد عمران خاں صاحب مہتمم اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بھی پڑھا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے درجہ کے علاوہ الگ سے بھی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا، اور ان کا طرز غلطی پر یوں ہی گذر جانے کا نہیں تھا، تنبیہ وتادیب فرماتے اور عار دلاتے یہاں تک کہ رو دے اور پھر غلطی نہ کرے، مولانا سید محمد اویس نگرامی سے بھی استفادہ کے مواقع ملے، تفسیر کے ایک استاد قاری منیر صاحب بھی تھے اور تجوید وقرأت میں مولانا قاری سید وددوالحی صاحب ندوی لکھنوی سے بھی کچھ سیکھنے کو ملا ماسٹر محمد سمیع صدیقی بھی بڑے شفیق استاد تھے ان سے انگریزی پڑھی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نظام کے تحت میرے تین تعلیمی مراحل رہے۔ اس کے نصاب کی کتابیں اپنے ماموؤں کے مشورہ اور رہنمائی میں الگ الگ اساتذہ سے پڑھی تھیں، البتہ مکتب کے تین سال، ثانویہ کے دو سال اور عالمیت وفضیلت کا ایک ایک سال نظام کے تحت درجہ کی پابندی کے ساتھ پڑھا، درمیان میں دارالعلوم میں ایک سال گذرا، اور پھر ملک آزاد ہوا۔ آزادی کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فضیلت کر لیا کیوں کہ کتابوں کی تیاری دارالعلوم دیو بند کے قیام اور لکھنؤ کے قیام میں کر لی تھی اس لئے دشواری نہیں ہوئی، جہاں تک ساتھیوں کا تعلق ہے، مکتب کی تعلیم میں ہمارے ایک ساتھی محمد الیاس خان مرحوم یاد رہیں گے جنہوں نے اس تعلق کو جو اس وقت بچپن میں قائم ہوا تھا تا عمر بڑی

محبت وتعلق کے ساتھ نبھایا اور ہمارے گھر کے افراد کو اپنے گھر کا فرد سمجھا، اور بہت مخلصانہ تعلق رکھا، اللہ انہیں غریق رحمت کرے اور بہترین صلہ دے، بعد کے ساتھیوں اور دوستوں میں سید محمود حسن صاحب ندوی مرحوم ندوہ میں استاد بھی ہوگئے تھے اور اچھا علمی، ادبی، صحافی ذوق رکھتے تھے۔ پھر دہلی چلے گئے جہاں ریڈیو میں اور جامعہ میں وہ رہے، اور وہیں وفات پائی، بالکل بھائی کی طرح ان کا معاملہ تھا، لکھنؤ کے مشہور بزرگ حضرت مولانا شاہ محمد وارث حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قیام ٹیلہ والی مسجد میں رہتا تھا ان کے صاحبزادوں میں شاہ محمد واعظ حسن اور شاہ تشفی حسن اور شاہ تسلی حسن مرحوم تھے، شاہ تشفی حسن مرحوم پاکستان چلے گئے تھے وہ میرے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنی مرحوم کے ساتھی تھے اور شاہ تسلی حسن مرحوم میرے ہم عمر اور درجہ کہ ساتھی تھے، لیکن آخر تک تعلیم ساتھ نہ رہی البتہ تعلقات اور راہ ورسم رہی ان کا تعلق ہمارے ہسوہ فتح پور کے عزیزوں سے تھا اس طرح رشتہ داری کا بھی ایک تعلق اور خاتون منزل لکھنؤ میں قیام کی اور سکونت کا قرب بھی تھا، رشتہ داروں میں میرے بڑے ہم عمر سید محمد قاسم مرحوم بے تکلف ساتھی تھے، یہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے بھانجہ مولانا سید محمد علی کی اولاد میں تھے۔ ان کے بڑے بھائی سید حسین حسنی مرحوم میرے بڑے بھائی مولانا محمد ثانی حسنی کے بے تکلف ساتھی تھے مگر یہ لوگ آزادی کے بعد پاکستان چلے گئے اور ملنے کے مواقع کم ملے، قاسم مرحوم آزادی تحریک میں بھی لڑکپن کے جوش کے ساتھ حصہ لیتے تھے، مگر وہ لیگی تھے، اور ہم لوگ جمعیتی تھے اور ہم لوگوں کے آئیڈیل جمعیۃ کے رہنما حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی ذات بابرکت تھی اور اس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ ان کے بھی ندوہ کے لوگوں سے اچھے تعلقات تھے، اور مولانا سید سلیمان ندوی معتمد تعلیم ندوۃ العلماء بھی جمعیۃ کے اجلاس میں شرکت کرتے اور بعض اجلاس کی صدارت بھی فرمائی، ندوہ میں ہمارا تعلیمی آخری مرحلہ تھا، ملک آزاد ہو چکا تھا، جمعیۃ علماء ہند نے بڑا زبردست اجلاس لکھنؤ میں منعقد کیا اور ندوہ اس طور پر میزبان تھا کہ اس کے ناظم مجلس استقبالیہ کے صدر تھے اور الاصلاح کے ناظم ہمارے ایک ساتھی طیب عثمانی مرحوم تھے، ماموں جی کی سرپرستی ورہنمائی میں جمعیۃ نے زبردست تاریخی علمی نمائش کا اہتمام کیا تھا جو

اس ملک کے لیے ہندوستانی مسلمانوں بالخصوص علماء کی خدمات اور کارناموں کو روشن کرتی تھی، حضرت مدنی نے اس نمائش کی تعریف کی تھی اور سبھی کو بہت پسند آئی تھی۔

علمی وثقافتی کاموں میں میرے ہم فکر وہم مذاق ساتھی ڈاکٹر ارشد حسین ندوی مرحوم تھے جن سے آخر تک دوستانہ تعلق قائم رہا، انہوں نے اپنے والد حکیم شرافت حسین رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی اور حضرت مولانا محمد اویس ندوی نگرامی کی نگرانی میں ''صبح صادق'' نکالنا شروع کیا، ندوہ سے فارغ ہوتے ہی اس کے ذریعہ لکھنے کا اچھا میدان ملا۔

مولانا شاہ محمد حلیم عطا صاحب سلونوی رائے بریلی کے قصبہ سلون سے وطنی تعلق رکھتے تھے اور ان کے آباء واجداد شریعت وطریقت کے جامع افراد ہوئے تھے اور ان کا ہمارے خاندان کے بزرگوں سے قدیم تعلق رہا تھا، اس وجہ سے بھی شاہ صاحب کی شفقت وتوجہ حاصل تھی، افسوس کہ ۲۰؍صفر المظفر ۱۳۷۵ھ میں مختصر علالت کے بعد انہوں نے وفات پائی اور ان کی وفات سے دارالعلوم نے خاص طور پر حدیث میں بڑا اور نہ پُر ہونے والا خلا محسوس کیا۔

ان کی جگہ کچھ مدت کے لئے محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی محدث کی خدمات لی گئیں، اور بخاری شریف کے اسباق ان کے ذمہ کئے گئے، مگر ہمارا تدریس کا زمانہ تھا چونکہ ان کا قیام ہمارے محلّہ میں شہر میں تھا، اس لئے ان سے ملاقات اور استفادے کے مواقع تھے، جس سے فائدہ اٹھایا گیا۔

حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی خدمات بھی لی گئیں، مگر وہ زمانہ بھی ہماری تدریس کا زمانہ تھا، البتہ ان کا جو تعلق ہمارے ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے تھا، اس کی وجہ سے میں ان کو اپنے بڑوں میں سمجھتا اور ان سے مشورہ اور رہنمائی بھی لیتا، خاص طور پر جب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی باہر کسی سفر پر ہوتے تھے اور مشورہ کی کوئی بات ہوتی تو ان کے مشورہ سے کام کرتا اور فیصلہ لیتا۔

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی جب ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم ہوئے تو ان سے بھی استفادہ کا موقع ملا، چونکہ ان کے گھنٹے اس وقت اوپری درجات میں تھے جب میں دارالعلوم میں ثانوی درجات میں زیر تعلیم تھا، پھر وہ جامعہ ملیہ دہلی چلے گئے، اس لئے درجہ میں ان سے

استفادہ کا موقع نہ مل سکا، مولانا محمد عمران خان ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم تھے مگر کچھ گھنٹے بھی لیتے تھے اور عربی کا اچھا ذوق رکھتے تھے، انہوں نے ندوہ سے تعلیم پوری کرنے کے بعد جامعہ ازہر مصر میں جا کر بھی تعلیم حاصل کی، ثانوی درجات میں ان سے بھی عربی پڑھی، پھر انہی کی فکر و توجہ سے دارالعلوم میں خدمت کا موقع ملا، اور برابر شفقت حاصل رہی، وہ بھی ہمارے ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھیوں میں تھے۔

مولانا محمد ناظم ندوی بھی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے دوستوں اور ساتھویں میں تھے اور بہت اعلیٰ صلاحیت رکھتے تھے، ان سے فضیلت میں حجۃ اللہ البالغہ، پڑھی، انہیں قرآن و حدیث فہمی اور علم اسرار شریعت، شعر و ادب اور معقولات، سب کا اعلیٰ ذوق تھا۔

ندوہ کے استادوں میں مولانا سید حمید الدین صاحب وہ بزرگ استاد تھے جو ندوہ کے شیخ الحدیث تھے، لیکن جب ہم اوپر کے درجہ میں پہونچے تو وہ ندوہ سے جا چکے تھے، اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں پڑھانے لگے تھے، بعد میں ایک کار حادثہ میں ۱۹۶۷ء میں وہ شہید ہوئے، وہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے عزیز داری کا تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کے ہم زلف بھی تھے، ان کا قیام ہمارے محلہ میں ہی تھا مگر ان سے ثانویہ کے کسی درجہ میں پڑھا، میرے بڑے بھائی مولانا محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے حدیث کی بڑی کتابیں بخاری شریف وغیرہ پڑھیں۔

مولانا سید نور الحسن صاحب مرحوم سے ہم نے ثانویہ میں غالباً ''ریاض الصالحین'' پڑھی، بڑے نیک طبیعت عالم باعمل تھے۔ تقریباً ندوہ میں پچاس سال پڑھایا۔ کئی نسلوں کے استاد ہیں، وہ دیوبند میں خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھیوں میں تھے۔

انگریزی کے استاد ماسٹر محمد سمیع صدیقی صاحب تھے، وہ بھی بڑے مہربان اور ماہر استاد تھے، اور ایک اچھے مربی بھی تھے۔ ہم سے بڑوں نے بھی اور بعد کی نسل کے لوگوں نے بھی ان سے پڑھا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بھی وہ استاد تھے، ان کے صاحبزادگان نے اچھا مقام بنایا۔ پروفیسر محمد وصی صدیقی شاہجہاں پور کے ایک کالج کے پرنسپل رہ کر پھر ندوہ کے معتمد مال ہوئے، چھوٹے بیٹے ڈاکٹر مطیع صدیقی نیویارک میں ہیں، قیام امریکہ میں ان کے

ہاں قیام بھی رہا، اس زمانہ میں ماسٹر صاحب بھی وہاں آئے ہوئے تھے، اور فصیح صدیقی صاحب علیگڑھ میں مقیم ہیں۔ ندوہ کیمپس میں ماسٹر صاحب کے قیام کی وجہ سے ان سب سے دوستانہ و برادرانہ تعلق رہا۔ (۱) مولانا محمد ناظم صاحب ندوی کی بڑی شفقت ملی، وہ بھی ماموں جی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ہم درس اور دوستوں میں تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اور بہاولپور میں شیخ الجامعہ ہو گئے، اس زمانہ میں کسی ملاقات میں انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ بہاولپور آجاؤ اور آٹھ سو مشاہرہ کی بات کی، اس وقت ندوہ میں مدرسی کا مشاہرہ اسی روپئے تھا، مگر معذرت کرلی، جس کی مختلف وجوہات تھیں۔

ندوہ کے اساتذہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا حیدر حسن خان ٹونکی کو دیکھنا تو یاد ہے مگر ان سے استفادہ و مجلس میں شرکت اور ملاقات یاد نہیں۔ ان کے زمانہ میں ندوہ میں میرا داخلہ ہو گیا، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم تھے، اور شیخ الحدیث بھی، اور ہمارے اساتذہ کے استاد تھے، اور ایک بڑے بابرکت اور آئیڈیل اور نہایت متواضع انسان تھے، انہیں حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے اجازت و خلافت بھی حاصل تھی، ان کا رنگ ان کے شاگردوں میں بھی نظر آتا تھا، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی ان کے شاگرد بھی تھے، اور مرید بھی، مجھ کو بالواسطہ حدیث میں ان سے استفادہ اور اجازت کا شرف حاصل ہے جو مجھے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ذریعہ حاصل ہوا، اور جے پور کے ایک سفر میں ان کے ایک دوسرے شاگرد مولانا تقی احمد حسن خان ٹونکی کے ذریعہ حاصل ہوا، اور ان دونوں نے اپنے قلم سے یہ اجازت دی۔

مولانا حیدر حسن خان ٹونکی اور مولانا سید حمیدالدین صاحب کو یہ منصب ملا اور وہ حدیث کے بڑے استاد ہوئے مگر میں نے ان سے حدیث نہیں پڑھی، دوسری کتاب پڑھی، ان کے ندوہ سے جانے کے بعد مولانا شاہ محمد حلیم عطا سلونوی شیخ الحدیث ہوئے، اور ان سے ہم نے بخاری شریف پڑھی، مولانا شاہ حلیم عطا صاحب کی حدیث میں استعداد بہت

---

(۱) آج بھی ان کے گھرانہ کا ندوہ سے گہرا تعلق ہے ہے پروفیسر محمد وصی صدیقی مرحوم کے صاحبزادے جناب محمد اسلم صدیقی (سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لکھنؤ) کا بھی ندوہ کے احاطہ میں ہی قیام ہے اور وہ معتمد مال ہیں۔

بلند تھی اور بڑا ذخیرہ انہیں حفظ تھا، اس کے علاوہ ان کا مطالعہ بہت وسیع اور گہرا تھا، اور متنوع بھی، ان کے پاس بیٹھ کر علم میں اضافہ ہی ہوتا، شیخ امام ابن تیمیہ اور ان کے جانشین امام ابن قیم کے علوم و معارف کے گویا حافظ تھے۔ عربی زبان کے ساتھ اردو زبان میں بھی انہیں بڑی واقفیت اور عبور حاصل تھا۔ ہماری خالہ صاحبہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم نے ''ریاض الصالحین'' کا سلیس اردو ترجمہ ہر حدیث میں عنوان کے امتیاز کے ساتھ کیا اور بعض جگہ حواشی بھی لکھے تو ماموں صاحب مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کے مشورہ سے ان کو دکھانا طے ہوا اور یہ مسودہ ان کی خدمت میں لے جانے اور ان کے افادات سے مستفید ہونے کا یہ ایک مزید اچھا موقع تھا، پھر ان کے زمانہ تدریس کا آخر زمانہ ہمارے زمانۂ تدریس کا ابتدائی سالوں کا زمانہ تھا، اس میں بھی ان کے اہم تجربے حاصل ہوئے، وہ ہمارے ایک محسن و مربی استاد اور محبوب شخصیت تھے، بہت نرم مزاج اور کثیر المطالعہ اور طلبہ کے لئے بڑے شفیق و مہربان تھے، میرے ساتھ بھی بہت محبت و شفقت کا معاملہ کرتے۔

مفتی محمد سعید صاحب اعظمی جو اعظم گڈھ کے رہنے والے اور فقہ کی ممتاز صلاحیت کے حامل استاد تھے، اور بہت نرم طبیعت کے اور عالم باعمل تھے، اچھی انتظامی صلاحیت بھی رکھتے تھے، مہتمم صاحب انہیں اپنا قائم مقام بناتے تھے، ان سے حدیث کی ایک اہم کتاب پڑھی، ان کے بیٹے مولوی ابوالبقاء ندوی بھی اچھے باصلاحیت عالم ہیں جو دارالمصنفین اعظم گڈھ میں رفیق رہے اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج کے ناظم بھی ہوئے۔

قاری منیر صاحب بھی تفسیر کے استاد تھے اور تدریس کا اچھا تجربہ رکھتے تھے، ان سے بھی پڑھا۔

مولانا محمد اسباط صاحب دارالعلوم کے اہم اساتذہ میں شمار ہوتے تھے جو مولانا عین القضاۃ صاحب کے شاگرد تھے اور وہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے شاگرد تھے، علوم شریعہ اور معقولات، سب میں ممتاز تھے اور نابینا تھے، ان کے درجہ میں نہیں پڑھا، الگ وقت لے کر ان سے ملا حسن پڑھی۔

اجازت حدیث

مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی صاحب ندوہ کے ناظم تھے گھر میں بعض لوگوں کو الگ سے لوجہ اللہ پڑھایا۔ گھر کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے ہمیں بھی ان سے استفادہ کا موقع ملا، ان کو مدینہ منورہ کے بعض مشائخ اور مشائخ دیوبند شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، علامہ انور شاہ کشمیری اور اپنے والد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کی حدیث کی بھی اجازتیں حاصل تھیں۔ افسوس ان سے اس میں فائدہ نہ اٹھا سکا۔

مولانا شاہ محمد حلیم عطا صاحب سلونوی کی بھی اجازت یاد نہیں۔ ان سے بھی حدیث پڑھی اور جنہوں نے ان سے اجازت چاہی ان کو حاصل ہوئی۔ ان میں ان کے شاگرد مولانا ڈاکٹر تقی الدین صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں، البتہ ان کے یہاں حدیث پڑھنا ہی اجازت تھی انہوں نے بڑی شفقت ومحبت سے پڑھایا جس کے نقوش آج بھی قائم ہیں۔

میرے پاس تحریری طور پر جو اجازت ہے وہ مسلسلات کی حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہ کی ہے، اوران کے مظاہر میں درس مسلسلات میں حدیث پڑھنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی۔ ان کی بھی بڑی شفقت وتوجہ ملی جو آخر تک قائم رہی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مفتی احمد حسن خان ٹونکی سے بھی اوائل کتب صحاح کی اجازت حاصل ہے، اور قرأت کا شرف بھی حاصل ہوا، فالحمدلله علی ذلك ۔ یہ دونوں شیخ الحدیث حضرت مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث کی اجازت دیتے تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی حضرت مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی کی تفصیلی اجازت کے ساتھ جو ان کے قلم سے ان کو حاصل تھی محدث کبیر علامہ عبد الرحمٰن مبارکپوریؒ صاحب تحفۃ الاحوذی کی بھی اجازت دیتے تھے کہ ان کے سامنے بھی اوائل کتب ستہ پڑھی تھی، مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی کے یہاں اوائل میں مؤطا امام مالک اور مسند امام احمد کی بھی اول اول حدیث کا تذکرہ ہے، مولوی ڈاکٹر اکرم ندوی نے اپنی کتاب ''بغیۃ المتابع'' میں بعض اضافوں وتحقیقات کے ساتھ جمع کردیا ہے، محض اللہ کے

فضل وتوفیق سے اور والدہ ماجدہ مرحومہ کی دعاؤں کا اثر ہے کہ ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ میرا اشتغال حدیث شریف سے رہے جبکہ میرا موضوع ادب عربی اور جغرافیہ، عربی زبان اور اس کے متعلق گھنٹے رہے تھے، حدیث میں ریاض الصالحین پڑھانے کی توفیق ملی اور ادھر آخر چند سالوں میں صحیح بخاری کی کتاب الرقاق بھی پڑھائی۔

علامہ محدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے ندوہ کی مجالس اجازت حدیث میں رہنے کا شرف حاصل ہوا اور تقریری اجازت ملی۔ حدیث کی اجازت لینے والوں کو بھی اجازتیں دے دیتے ہیں کہ:

اذاأجـــزت مـــع الـــقـــصـــور فـــانـــنـــی
ارجـــو التشبة بـــالـــذیـــن أجـــازوا
الســـابـــقـیـــن الـــی الـــحـــقـیـــقة منـهـجـاً
سبـــقـــواالـــی عـــرف الـــجـــنـــان فـفـــازوا

مولانا سید محمد طلحہ حسنی ٹونکیؒ کی تعلیم وتربیت

میرے اساتذہ اور مربیوں میں ایک اہم نام مولانا سید محمد طلحہ ٹونکی (متوفی ۱۹۷۰ء) کا بھی ہے جن سے باقاعدہ درجہ میں تو نہیں پڑھا، وہ اورینٹل کالج لاہور میں مشرقی علوم کے استاد تھے، اور بڑی متنوع معلومات اور وسیع علم رکھتے تھے اور دوسروں میں گھلا کر پلا دینے کا بھی ملکہ رکھتے تھے، علوم دینیہ شرعیہ، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، تاریخ، علوم ادبیہ اور زبان، اس کے لہجات، جغرافیہ، علم عروض، نحو، بلاغت، علم ریاضی، علم ہیئت اور تمدن سبھی کا وہ بڑا علم رکھتے تھے، وہ لکھنؤ تشریف لاتے اور ان کا طویل طویل قیام ہوتا، ان کی اہلیہ شمس النساء میری والدہ ماجدہ کی پھوپھی تھیں، اس طرح ان سے یہ قریبی رشتہ اور اس کے علاوہ بھی رشتے تھے اور بڑے شفیق، مہربان، مربی واستاد تھے لیکن غلطی پر تنبیہ ضرور کرتے، اور ایسی کرتے کہ پھر وہ غلطی دوبارہ نہ ہو، میرے بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنی سے ان کو بڑا اُنس ہو گیا تھا، انہوں نے علم عروض سیکھا اور وہ اچھے قادر الکلام شاعر بن گئے۔ اس کے علاوہ تاریخی اور

جغرافیائی ذوق کے علاوہ ریاضی کا علم بھی حاصل کیا اور اس سے میراث (علم الفرائض) میں انہوں نے بڑا فائدہ اٹھایا، مجھے علم ہیئت اور جغرافیہ سے دلچسپی تھی، اس میں ان سے اور زبان و ادب میں بہت فائدہ پہنچا، میرے چھوٹے بھائی مولوی واضح رشید ندوی، مولوی محمد میاں مرحوم اور دوسرے شائقین علم نے ان سے خاصا فائدہ اٹھایا، خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی تاریخ وادب، جغرافیہ، اور دوسرے علوم وفنون میں ان سے اچھا فائدہ اٹھایا جس کا انہوں نے تفصیل سے اپنے مضمون میں تذکرہ کیا ہے۔ علماء ومشائخ سے ملنے ملانے کا بھی ان میں بڑا جذبہ تھا اور اس میں بھی وہ دوسروں کو شریک کر لیتے تھے، میرے دیوبند کے قیام میں ان کا ایک سفر دیوبند کا ہوا تھا تو ان کے ساتھ مشہور اور بڑے عالم علامہ شبیر احمد عثمانی کی زیارت وملاقات کا موقع اور ان کی مجلس میں حاضری دی اور ان دونوں کی علمی گفتگو سے فائدہ اٹھایا، مولانا طلحہ صاحب بڑا اعلیٰ علمی وادبی وثقافتی ذوق رکھتے تھے اور بڑا اچھا تعلیمی وتربیتی طرز عمل رکھتے تھے، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت وارادت کا تعلق

جس زمانہ میں ہماری نشونما ہوئی وہ زمانہ جن بڑے مشائخ کے وجود بابرکت سے مغتنم تھا، ان میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی طرف ہمارے لکھنؤ کے لوگوں کا رجوع تھا، ہمارے اہلِ خاندان زیادہ تر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے، اس کی بڑی وجہ خاندان کی بزرگ شخصیت خال مخدوم ومعظم مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء کا ان سے بیعت وارادت کا تعلق تھا اور لکھنؤ کے سفر میں حضرت انہی کے مکان پر قیام فرماتے تھے، جو ہمارے اہلِ خاندان واقارب کی بھی لکھنؤ میں منزل تھی، لیکن میرے چھوٹے ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا تعلق ان کے لاہور کے سفر میں جو تعلیم کی غرض سے ہوا تھا، ان کے استاد حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے ایماء

پر دین پور میں حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوری سے بیعت وارادت کا تعلق قائم ہو گیا تھا؛ مگر تربیت واصلاح ان کے خلیفہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے لی، البتہ تقسیم ملک کے بعد بہت سے موانع اور دشواریوں کی بنا پر ان کی اجازت سے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری سے تعلق قائم کر لیا اور ان کے مجاز خلیفہ ہوئے، اس سے پہلے ان کو حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے سلسلہ قادریہ میں ۱۹۴۶ء میں اجازت دی تھی، حضرت رائے پوری سلاسل اربعہ قادریہ، نقشبندیہ چشتیہ میں اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ وطریقہ میں اجازت دی۔ یہ ان کے سفر رائے بریلی ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ میں جب حضرت رائے پوری سے بیعت ہوا تو انہوں نے ضروری اذکار کی تعلیم کے ساتھ خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی خدمت وصحبت اختیار کرنے اور ان کے کاموں میں معاون ورفیق ہونے کی تاکید فرمائی، اور اس کو وظیفہ سمجھ کر اللہ کی توفیق سے ہم نے اختیار کیا۔ یہی زمانہ حضرت رائے پوری کا لکھنؤ میں قیام کا بھی تھا، ندوہ میں بھی قیام رہا، اور ایک بار پورے ندوہ کا راؤنڈ لگایا اور اس پر نگاہ توجہ ڈالی جس کی برکات برابر ظاہر ہو رہی ہیں۔ ندوہ میں مہمان خانہ میں حضرت کا قیام تھا، ذکر سے فضا معمور ومنور تھی۔ شہر میں مرکز تبلیغ کچہری روڈ میں بھی قیام رہا، حضرت صبح ٹہلنے کچھ دور تشریف لے جاتے میں بھی ساتھ ہو لیتا اور حضرت کی شفقت کا فائدہ اٹھا کر سلوک کے سوالات بھی کرتا اور حضرت بڑی محبت وشفقت سے جواب دیتے۔

پھر ۱۹۵۰ء میں حضرت کا سفر حجاز طے ہوا اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا قدس سرہ نے ماموں جی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے کہا کہ وہ ان کی صاحبزادی کی طرف سے اس موقع پر حج کا سفر قبول کر لیں اور دعوتی تقاضے سے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے چند لوگوں کا بھی ساتھ میں انتخاب کیا جن میں یہ ناچیز بھی تھا، اس سفر میں حضرت کی شفقتیں مختلف انداز سے ظاہر ہوتی تھیں، ایک بار میرا جوتا جو مجھے بہت پسند تھا ایک صاحب پہن کے چلے گئے، دوبارہ وہ آئے تو ہم نے رکھ لیا مگر انہوں نے اس پر اپنا دعویٰ کر دیا، ہم نے کہا ہمارا ہے، بات بڑھی حضرت تک پہنچ گئی، حضرت نے فرمایا تم ان صاحب کو دے دو، حضرت کی بات مان کر میں نے بغیر چوں چرا کے دے دیا۔ اس کا حضرت پر بڑا اثر

پڑا اوران کی شفقت مزید حاصل ہونے لگی اوراس کی برکات زندگی کے ہر موڑ پر کھلی محسوس ہوتی ہیں۔رائے پور بھی حضرت کی خدمت میں حاضری کی سعادت ہوتی رہتی، حضرت نے بیعت ہونے کے ساتھ جو کچھ ذکر واذکار تلقین فرمائی اور ہدایات دیں اس میں اہم بات یہ تھی کہ فرمایا تمہارا سلوک یہ ہے کہ علی میاں کے ساتھ لگے رہو، اور حضرت کواس بات سے بڑی خوشی تھی کہ ہم خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے کاموں میں معاون بن رہے ہیں، حضرت سے محبت، مناسبت، عقیدت سبھی کچھ تھا، اور جو تعلق قائم ہوا تھا وہ بڑھتا ہی رہا، کم نہیں ہوا۔اس سفر کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

ملک کی آزادی، تقسیم ملک، فسادات اور لکھنؤ میں جمعیۃ علماء ہند کا کل ہند اجلاس اوراس کے اثرات

ملک کی آزادی اور تحریک آزادی اور تحریک خلافت میں ہندوستانی مسلمانوں کا جو کردار رہا ہے، اسے تاریخ کبھی نظر انداز نہیں کرسکتی، اوراس کی سزا مسلمانوں کو برطانوی حکومت نے بڑے وحشیانہ طریقہ سے دی، مگر مسلمانوں نے اپنے دینی وملی تشخص کی بقاء کے لئے سب کچھ برداشت کیا، اوراس بات کے لئے بھی بڑی قربانیاں دیں کہ ترکی میں خلافت عثمانیہ کونقصان نہ پہونچے، مگر ہوتا وہی ہے جواللہ کے یہاں مقدر ہوتا ہے۔حضرت سید احمد شہیدؒ نے جو روح پھونکی تھی اوران کی جماعت مجاہدین نے جو قربانیاں دیں، ۱۸۵۷ء میں ان کے اخلاف کی قربانیاں اسی کا حصہ ہیں، ظاہر میں انگریز اس ملک پر پوری طرح قابض ہوگئے اورعلماء کواس ملک سے باہر نکلنا پڑا، بڑی تعداد میں حرمین شریفین چلے گئے پھرایک دوسرے خطرہ خطرۂ ارتداد کا مقابلہ تھا جو برطانوی استعمار کے نتیجہ میں مسیحیت کے فروغ کا تھا۔مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی بانی مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ، مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء کا اس کے مقابلہ کے لئے جو علمی بھی تھا اور عملی بھی، بڑا زبردست کردار رہا، اور ان حضرات نے اور جنوب میں دوسرے علماء نے بڑی قربانی دے کراس ملک کومسیحیت کی گود میں جانے سے تو بچالیا، لیکن انگریز اقتدار کے اثر سے مغربی کلچر وثقافت سے مرعوبیت

ایسی پیدا ہوتی گئی کہ اس کا مقابلہ بھی ایک چیلنج تھا۔ مادیت کو ہمیشہ شکست روحانیت سے دی گئی ہے، اس کے ساتھ خالص دینی تعلیمی کام اور پھر دعوتی کام سے اس کا مقابلہ کیا، اس میں دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، ندوۃ العلماء اور تبلیغی جماعت کا کردار اور اس کے علماء اور داعیوں کی کوششیں ایک ناقابل فراموش حصہ ہیں۔

اس سلسلہ میں حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی اور حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے خلفاء اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، اور حضرت مولانا محمد علی مونگیری، مولانا شبلی نعمانی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا محمد علی جوہر مولانا شوکت علی کی خدمات، علامہ اقبال کا پردرد کلام اور فکر وکوشش، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی حکمت و دعوت، بصیرت و رہنمائی اور ان کے خلفاء کی خدمات، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہ کی تگ و دو اور جدوجہد اور ان کا سیاسی و دعوتی کردار اور اس کے ساتھ مسلم لیگ، جمعیۃ العلماء کا تاریخی اجلاس اور قربانیاں اور کانگریس کے قائدین کے خطابات، میٹنگیں اور مختلف طبقات اور صلاحیتوں کے حامل لوگوں کی اپنے اپنے طور پر شرکت اور فکر وکوشش اور جذبہ وولولہ، یہ سب وہ نقوش اور یادیں ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا، ملک کی آزادی کے وقت میری عمر ۱۸ رسال تھی جو فکر وشعور کی اچھی عمر کہلاتی ہے، طلبہ کی کوششوں میں مجھے بھی حصہ لینے کو ملا، حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ اور ان کی جماعت کا حصہ پورے برصغیر کو اسلامی روح و مذہب سے وابستہ کرنے میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے، ۱۹۴۷ء میں یہ ملک ہندوستان دو حصوں میں بٹ گیا، چونکہ پاکستان مذہب کے نام پر بنا تھا، اس کے ردعمل میں مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں رہنا ایک بڑی آزمائش تھی، فسادات کا لامتناہی سلسلہ ہوا اور نقل مکانی میں جو قتل وفساد کا دور دورہ ہوا، اس نے دنیائے انسانیت کو ہلا کر رکھ دیا، لیکن ۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی کا قتل انہی کی قوم کے ایک فرد کے ذریعہ ہوا اور پھر بروقت وزیراعظم جواہر لال نہرو

کے اس اعلان سے اس کی نوعیت خاصی بدل گئی اور دوسری طرف جمعیۃ علماء ہند نے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی صدارت وقیادت میں جمعیۃ کا کل ہند اجلاس لکھنؤ میں رکھا جس نے مسلمانانِ ہند کو بڑا حوصلہ دیا، اس کی ضیافت میں اہل لکھنؤ کے ساتھ ندوۃ العلماء بھی پیش پیش تھا کہ اس کے ناظم مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے اور انہی کی طرف سے خطبہ استقبالیہ تھا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ندوۃ العلماء میں ایک ایسی نئی علمی نمائش کا اہتمام کرایا تھا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ مسلمانانِ ہند نے اس ملک کو کیا کیا دیا، یہ ایک تاریخی اور بڑا حوصلہ دینے والی نمائش تھی، اس کو حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے دیکھا اور پسند فرمایا تھا، ہمارے رفقاء جو آخری مرحلہ تعلیم میں تھے اجلاس کو کامیاب بنانے میں بہت پیش پیش تھے، آج بھی اس کی یادیں قائم ہیں، مولانا عبداللہ عبداللہ عباس ندویؒ نے ان کی اہمیت وخصوصیت پر جو تأثر تحریر کیا تھا وہ تعمیر حیات مفکر اسلام نمبر سے نقل کیا جاتا ہے، جو حسب ذیل ہے۔

"۱۳۶۷ھ مطابق اپریل ۱۹۴۸ء میں جمعیۃ علماء ہند کا آل انڈیا جلسہ لکھنؤ میں شیخ الاسلام حضرت سید حسین احمد مدنیؒ کی صدارت میں ہوا تھا مجلس استقبالیہ کے صدر حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ ناظم ندوۃ العلماء تھے اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ جمعیۃ کے جنرل سکریٹری تھے، ندوۃ العلماء نے مہمانوں کے لئے دارالاقامہ خالی کر دیئے تھے، اس موقع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے جن کی عمر اس وقت صرف ۳۰-۳۵ سال رہی ہوگی، بڑی محنت، توجہ اور عرق ریزی سے ہندوستان میں علمی واسلامی تاریخ کے چارٹس تیار کئے جس نے بعد میں علمی نمائش کی شکل اختیار کر لی جو معلوماتی اور علمی لحاظ سے جاذب نگاہ اور جذبہ وفکر کے امتزاج کی ایک حسین وجمیل علمی وتعلیمی نمائش بن گئی، پھر انہیں علمی چارٹس کو سامنے رکھ کر ۸۵ سالہ جشن تعلیمی کے موقع پر ایسی نمائش کا اہتمام کیا گیا جو زیادہ شاندار چوکھٹوں میں پھیل گئی، اور اس سے مختلف اہل علم نے علمی فائدے حاصل کئے اور بہت سے دانشوروں نے اس کی نقلیں حاصل کیں۔ یہ چارٹس حضرت مولاناؒ کے طویل مطالعہ ومشاہدہ کا ماحصل اور عرق ریزی اور دیدہ وری کا اعلیٰ نمونہ ہیں جن کی افادیت آج

بھی اسی طرح قائم ہے جس طرح آج سے پچاس سال پہلے تھی، ریسرچ کرنے والوں کو ایک نظر میں اتنا مواد مل جائے گا جو آسانی سے دوسری جگہ یکجا نہیں مل سکتا''۔

مطالعاتی ادوار اور چند گذارشات و مشورے

''النخیل'' کراچی کے مطالعاتی نمبر کے لیے اس کے فاضل مدیر و مرتب مولانا ابن الحسن عباسی نے اس ناچیز سے بھی مضمون طلب کیا تھا جو یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

''جہاں تک مطالعہ کے شوق کا تعلق ہے، اس کے اسباب میں دو سبب ہیں، ایک سبب تو یہ رہا کہ ہمارے ماموں کا گھر ایک طرح سے کتابوں کا گھر تھا، جہاں بے ضرورت بھی کتابوں کو دیکھنے کا موقع ملتا اور اس سے شوق بڑھتا رہا۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم پوری کرنے کے بعد فوراً تدریس کا موقع مل گیا اور پھر اپنے ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے ساتھ حجاز مقدس کا سفر ہوا جہاں نصف سال سے زیادہ قیام کی نعمت ملی، قیام مکہ معظّمہ میں دہلی کے ایک تاجر حاجی عبدالوہاب کے مکان میں تھا جہاں ایک اچھا کتب خانہ تھا، مکہ معظّمہ میں یہ عرصہ ۸/ماہ کا رہا اور ان کے کتب خانہ سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا، پھر مدینہ منورہ میں چار ماہ قیام کی سعادت ملی، وہاں قریب میں ''مکتبہ شیخ الاسلام'' تھا جس کے امین ایک ترکی تھے جو ہمت افزائی کرتے اور موقع دیتے، اس طرح وہاں سے بھی فائدہ اٹھایا، حجاز سے واپسی کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے جلسۂ انتظامی میں تقرری کی بات آئی، تو دارالعلوم کے مہتمم مولانا محمد عمران خان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے کہا کہ تمھیں عربی کے ادیب دوم بنانے کی تجویز ہے، اس لیے کہ تم حجاز سے فائدہ اٹھا کر آئے ہو، اس طرح مجھ کو یہ اہم عہدہ ملا، اتنی اہم ذمہ داری ندوہ جیسے مرکز علمی میں ملنے پر ذمہ داری کے احساس کا ذہن پر بہت اثر پڑا، اس احساس نے مطالعہ کا ایک غلبہ پیدا کر دیا اور ہم نے مطالعہ کا نظام بہت چوکس کیا کہ بہتر سے بہتر انداز سے مطالعہ کر سکیں، اسی کی پوری ترتیب بنائی اور جتنی محنت ہو سکتی تھی کی، اور تین چار سال ایسے گزرے کہ میرا نام بعض اہل تعلق نے ''مولوی مطالعہ'' رکھ دیا، پھر تصنیف و تالیف

اور ترجمہ وغیرہ کا کام ملا، عربی ادب کے نصاب کی کتابوں کی ترتیب جدید اور حسب ضرورت نئی کتابوں کی تصنیف کا کام ندوہ میں شروع کیا گیا تھا اس کی بنا پر "منثورات من أدب العرب" کی تصنیف میرے حوالہ کی گئی، جو اولاً مناسب اور مفید کتابوں کا انتخاب و ترتیب کا کام تھا جس کی ضرورت سے تقریباً دو سو معتبر کتابوں پر انتخابی حیثیت سے نظر ڈالنی ہوئی، یہ کتاب طبع ہونے سے پہلے ہاتھ سے لکھی ہوئی تھی، میں لکھ کر پڑھتا اور طلبہ نقل کرتے۔

ان کتابوں میں ادب، تاریخ، دینیات کا جو تنوع تھا اس سے واقفیت نے بھی بہت فائدہ پہنچایا، ان میں زبان کی خوبی، اخلاقیات اور معلومات سے واقفیت حاصل ہوئی، الحمدللہ یہ کتاب مدارس کے نصاب میں داخل ہوئی اور صرف دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اس کے نظام و نصاب کے تحت چلنے والے مدارس میں ہی نہیں، بلکہ ملک و بیرون ملک کے اسکولوں میں بھی شامل نصاب ہے، یہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "مختارات من أدب العرب" سے پہلے پڑھنے کے لحاظ سے ترتیب دی گئی اور ان طلبہ کی ذہنی سطح کو سامنے رکھا گیا، جو اس سے پہلے کے درجات کے ہیں۔

مجھے عربی ترجمہ کا کام بھی ملا، ترجمہ کے لیے ہمیں پہلے جو کتاب ملی وہ مشہور عالم حضرت مولانا عبدالباری ندوی کی ''تجدید تصوف وسلوک'' ہے، وہ علامہ شبلی نعمانی کے فائق شاگردوں اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے خلفاء میں تھے۔ "بین التصوف والحياة" کے نام سے ترجمہ سامنے آیا، جواب "المنهج الإسلامي لتربية النفس" کے نام سے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔

جہاں تک خاندانی نظام تربیت کے اثر کا تعلق ہے تو یہ عرض کرنا ہے کہ ہمارا دادیہال زمینداری کا تھا اور اس کے کچھ اثرات بھی تھے، لیکن ہمارے دادا سید خلیل الدین صاحب کا بزرگوں سے تعلق تھا، ان میں ان کے چچا حضرت شاہ ضیاء النبی حسنی بھی معزز بزرگ عالم، شیخ طریقت تھے، اور مزید یہ کہ میرے والدان کے نواسے اور والدہ نواسی تھیں، ہمارے والد سننے بولنے میں معذوری رکھتے تھے، انہوں نے اور میری والدہ نے مجھے میرے دونوں ماموں ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے سپرد کر

دیا تھا اور میرے بھائیوں مولانا سید محمد ثانی حسنی ندوی اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا، بڑے بھائی سید محمود حسن صاحب بیمار رہتے ہوئے جوانی ہی میں انتقال کر گئے، اس طرح ہم بھائیوں کی تعلیم و تربیت میرے ماموں کے زیر اثر ہوئی۔

جہاں تک مطالعاتی ادوار کا تعلق ہے تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ انگریزی دور حکومت کی وجہ سے اس کا اثر وغلبہ پورے سماج پر تھا اور خاندان پر بھی ظاہر ہوتا، مگر میرے ماموں حضرات خالص دینی فکر و ثقافت کے تھے، انہوں نے اس سلسلہ میں پوری رہنمائی اور تربیت کی، اور ایسے ماحول میں رکھا اور بھیجا جہاں دین کے اعتبار سے اور امت کے لئے زیادہ مفید ہونے کا عمل اچھے طریقہ سے انجام پا سکے، کتابوں کے مطالعہ میں بھی وہ پوری رہنمائی کرتے، اس طرح ہم لوگ اس میں آزاد نہیں تھے کہ جو کتاب چاہیں پڑھیں، مزید مولانا سید محمد طلحہ حسنی ٹونکی جو ہماری والدہ کے پھوپھا تھے اور مولانا سید ابوالخیر حسنی رائے بریلوی جن سے ہماری خالہ منسوب ہوئی تھیں، کی صحبتوں سے بھی فائدہ پہنچا، ان دونوں کا مطالعہ بہت متنوع تھا۔

عمر کے انیسویں سال تک جو وقت گذرا جو تعلیم کا وقت تھا، وہ اپنے ماموؤں کے پاس اور ان کی تربیت میں گذرا، ان کا گھر چونکہ ان کے علمی ہونے کی وجہ سے کتابوں کا اچھا مرکز تھا، ان سے بھی بڑا فائدہ حاصل ہوا، بے تکلف کتابوں پر نظر پڑتی اور جو کتاب باعث کشش ہوتی اسے دیکھنے کی طرف طبیعت مائل ہو جاتی، اس سے وہ فائدہ ہوا جو درسی کتابوں تک محدود نہیں رہتا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مطالعہ چونکہ عرب دنیا کے مصنفین کا بھی تھا اور ان کی کتابیں ان کے پاس تھیں، اس سے مطالعاتی علم کا حصہ بھی مجھ کو حاصل ہوا۔

مطالعہ کے مختلف دور ہوتے ہیں، ان سے مجھے بھی گذرنا پڑا، مطالعاتی ادوار کے سلسلہ میں پہلا دور وہ تھا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سرپرستی کے تحت کتابوں پر نظر پڑی، پھر حسب رغبت ایسی کتابیں دیکھنے کا موقع ملا جو آئندہ کی زندگی کے لئے فائدہ مند ہوئیں، درسی تعلیم کے اختتام پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے خاندان کے ساتھ حج کے لئے گئے، یہ ۱۹۴۷ء کا موقع تھا، وہاں سے واپسی میں نئی شائع شدہ اہم موضوعات کی کتابیں اپنے ساتھ لائے، اس میں نئے موضوع اور نئے حالات کی

رعایت واضح تھی، اس میں جاذبیت بھی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کے مطالعہ کی توفیق عطا فرمائی اور اس سے فائدہ حاصل ہوا، پھر اس کے دو تین سال کے بعد خود حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اور وہاں ایک سال سے زیادہ قیام سے بہت فائدہ پہنچا اور علم کو عملی دائرہ میں لانے کی مشق کا آغاز ہوا، چنانچہ اسی کے نتیجہ میں پندرہ روزہ عربی اخبار نکالنے کی توفیق ہوئی جو اولاً شخصی اور اپنے متعلق اشخاص کی اپنی کوششوں سے شروع ہوئی اور الحمدللہ قبول ہوئی اور وہ بتدریج ندوۃ العلماء کا ایک عربی ترجمان بن گیا جو "الرائد" کے نام سے الحمدللہ آج بھی جاری ہے، اور اس کے ساٹھ سال ہو چکے ہیں۔

ندوہ کے مدرس ہو جانے پر نصاب کی حسب ضرورت تربیت وانتخاب کا عمل اس کے ناظم اور میرے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے شروع کرایا تو مجھے بھی بعض کام سپرد کیے گئے، جن میں منثوات اور معلم الانشاء وغیرہ کا کام ہے، اس میں جزیرۃ العرب کا جغرافیہ بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس کی تیاری میں تین سال صرف ہوئے، اس کا مواد جمع کرنے اور ترتیب دینے میں وقت لگا اور عجیب بات ہے کہ بلاد عربیہ میں مختلف ممالک پر نئی کتابیں شائع ہو چکی تھیں کہ وہاں تمدن زیادہ تھا، لیکن سعودی عرب کے علاقے جس کو اصل جزیرۃ العرب سمجھا جاتا ہے، اس پر مواد عام طور پر قدیمی تھا، تمدنی یا علاقائی تبدیلیوں کی وجہ سے نئی معلومات عام طور پر نہیں ملتی تھیں، ان کے حصول میں خاص فکر کرنی پڑی، بعض جدید سفرناموں اور بعض واقف کار اشخاص سے ملنے پر زبانی معلومات بھی حاصل کی گئیں، اس طرح وہ ایک فائدہ والا کام انجام پایا۔

اس کے علاوہ بعض دیگر موضوع پر بھی کام کرنے کا موقع ملا اور جب عربی پرچے شائع ہونے لگے، ان کے ذریعہ سے عربوں کو پیغام دینے اور بات پہنچانے کا موقع ملا، جس کی اس وقت وہاں خاص ضرورت تھی، اور یہ "الرائد" کے افتتاحیوں اور "البعث الاسلامی" کے مضامین کے ذریعہ حاصل ہوئی۔

تدریس کے شعبہ میں آنے کے بعد بعض مشکل اور فنی موضوعات کی تدریس کا بھی موقع ملا، جس سے تدریسی عمل میں محنت کرنے اور تحقیق واستفادہ کی صلاحیت کو مدد ملی،

بعض مشکل کتابیں شروع میں ہی حوالہ کردی گئیں، اس سے تدریسی استفادہ کی محنت کو فائدہ پہنچا اور ایک بات مجھ کو مزید یہ حاصل ہوئی کہ میری تعلیمی مدت اگر چھ سال کی عمر سے بیس سال کی عمر تک دیکھی جائے تو مجھ کو اس کے تین چار سال بڑے مراکز علمی سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا، شروع میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء، پھر بہت تھوڑی مدت کے لئے مظاہر علوم سہارنپور، اور ایک تعلیمی سال کے بقدر دارالعلوم دیوبند، پھر ندوۃ العلماء میں، اس کے ایک سال بعد حجاز مقدس کا قیام، اس طرح مختلف علمی اور تعلیمی ذائقوں سے گذرنا ہوا۔

تدریسی زمانہ میں مجھ کو ادب کی کتابوں کی تدریس کے علاوہ حدیث وسیرت کی ''ریاض الصالحین'' اور ''سیرت ابن ہشام'' پڑھانے کا موقع کئی سال ملا، اور مجھے دونوں کتابیں بہت ہی دل لگتی محسوس ہوئیں اور اس نے سیرت نبوی کی اثر انگیزی کی طرف متوجہ کیا، اور اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ اپنے علم کے عملی دائرہ میں فائدہ اٹھانے کا جذبہ پیدا ہوا، اور بعض تصنیفات بھی پیش کرنے کا موقع ملا، جن میں ''رہبر انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' قابل ذکر ہے، اب تک اس کتاب کے نو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور عربی، انگریزی اور ہندی میں اس کا ترجمہ بھی ہوا اور الحمدللہ اس کو پسند کیا گیا، اور اس کو قرآن مجید کے مطالعہ سے ملانے سے بڑی افادیت محسوس ہوئی، تفسیر کے گھنٹے اور حدیث کے اسباق بھی ملے، دینی زندگی میں بڑا فائدہ پہنچا، اور مطالعہ قرآن اور مطالعہ حدیث سے اہم گوشے ملے جس سے آج بھی فائدہ محسوس ہوتا ہے اور قرآن وحدیث کے درس میں اس سے مدد ملتی ہے، میری تصنیف ''قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل'' اس کا نتیجہ ہے، اس طرح مجموعی طور پر متنوع مطالعہ کا فائدہ حاصل ہوا، اور ایک وقت ایسا گزرنا چاہئے کہ خوب مطالعہ کیا جائے اور کسی کی نگرانی میں کیا جائے، الحمدللہ یہ بات اللہ کے فضل سے حاصل ہوئی۔

جہاں تک پسندیدہ کتابوں کا تعلق ہے اس سلسلہ میں موضوع اور عہد کے فرق کے ساتھ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم جوزی، مشہور سیرت نگار ابن ہشام، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جن کی "حجۃ اللہ البالغہ" نے متاثر کیا، اور اپنے عہد کے مصنفین میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی

کتابوں اور مؤثر اسلوب بیان نے نئی نسل پر بہت گہرا اثر ڈالا، خالص علمی، تاریخی موضوعات میں علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی نے وہ اسلوب چھوڑا جو تحقیقی اسلوب کہے جانے کا زیادہ مستحق ہے، مولانا عبدالباری ندوی کو وقت اور ضرورت کے موضوعات کو آسان کر کے پیش کرنے اور تفصیل کو ایجاز میں لانے میں ملکہ حاصل ہے، ان کی کتابوں میں ''مذہب وسائنس''، ''مذہب وعقلیات'' اور ''معجزات انبیاء'' بڑی معرکہ آراء کتابیں ہیں، مولانا عبدالماجد دریابادی کا اسلوب زیادہ متاثر کرنے والا اسلوب نظر آیا، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی کی کتابیں بھی لوگوں کو مطالعہ میں رکھنی چاہیئے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتابوں میں ''النبی الخاتم'' بہت متاثر کرنے والی کتاب ہے، مولانا ابوالاعلی مودودی کی کتابوں نے ان لوگوں پر زیادہ اثر ڈالا جن کے ذہن شکوک وشبہات کے شکار ہو رہے تھے، مولانا محمد منظور نعمانی کا اسلوب بہت آسان سادہ اور عام فہم ہے، اہم دینی موضوعات کو آسان کر کے پیش کرنے کا کام کیا، فکر اسلامی اور تاریخ نگاری میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتابوں نے پورے عالم اسلام کو متاثر کیا، اور سب سے زیادہ ان کے اسلوب نے ہم پر اثر ڈالا، خاص طور پر ان کی اردو کی سب سے پہلی کتاب ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' اور عربی کی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' نے، ان کی کتاب ''ارکان اربعہ'' کی تدریس کا بھی کئی سال موقع ملا اور ''السیرۃ النبویۃ'' (نبی رحمت) سیرت کے کتب خانہ میں انفرادی حیثیت کی حامل کتاب ہے، اسلامی تاریخ پر دارالمصنفین کا ذخیرہ خاصے کی چیز ہے، ندوۃ المصنفین دہلی نے بھی اچھی خدمت انجام دی۔ اس کے علاوہ احمد امین کی تاریخ نگاری، علی طنطاوی کا اسلامی موضوعات پر قلم، طہٰ حسین کی انشاء نگاری اور ادبیت، عقاد کی عبقریات اور قدیم ادباء وشعراء میں امرؤالقیس، ابوتمام اور جاحظ کو بھی پڑھانے کا موقع ملا، اور بہت فائدہ پہنچا۔

دینیات میں امام نووی کی حدیث کی کتاب ''ریاض الصالحین'' پسندیدہ کتاب ہے، جو ایک مدت تک پڑھائی بھی اور بڑا روحانی فائدہ حاصل ہوا، اس کا اردو ترجمہ خالہ صاحبہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم نے ''زادِ سفر'' کے نام سے کیا جس کا پروف وغیرہ دیکھنے سے بھی

اس کتاب سے تعلق بڑھا، حضرت سید احمد شہید کے ملفوظات ''صراط مستقیم'' مرتبہ حضرت شاہ اسماعیل شہید بہت مفید دینی کتاب ہے۔

جہاں تک افسانہ نگار حضرات کا تعلق ہے، اس میں عربی اور اردو افسانوں کے مطالعہ کا موقع ملا، مگر اس کا موقع نسبتاً کم رہا، رابطہ ادب اسلامی کے قیام اور اس کی ذمہ داری ملنے پر سیمیناروں کے انعقاد میں اس کے موضوع بھی آئے، ہمیں بامقصد اور تعمیری ادب سے دلچسپی رہی، اور تخریبی اور بے مقصد ادب سے جو انسانیت کو نقصان پہنچا، اس کے مقابلہ کے لئے ایک چھوٹی کوشش رابطہ ادب اسلامی کے ذریعہ اسلام پسند ادباء نے ترقی پسند ادباء کے مقابلہ میں کی، اس کے قیام کے وقت سے مجھے سکریٹری کی ذمہ داری دی گئی اور اب نائب صدر اور ممالک مشرقیہ کی صدارت کی ذمہ داری ہے اور ہندوستان میں جو سیمینار و مذاکرات منعقد ہوتے ہیں، ان میں شرکت کی توفیق ہوئی ہے، پچاس کے قریب سیمینار ہو چکے ہیں، جس میں عہد قدیم وعہد جدید کے مصنفین کی کاوشوں کو موضوع بنایا گیا ہے، جس میں اسلامی ناولوں وافسانوں کو بھی موضوع بنایا گیا، اور اسلامی صحافت کو بھی موضوع بنایا گیا اور سبھی اجلاس بڑے مفید اور کامیاب ہوئے، ان کے افتتاحیے اور اکثر میں مقالات بھی پیش کرنے کا موقع ملا۔

ہمارے مطالعہ میں عربی اخبارات وجرائد اور مجلّات ورسائل بھی رہے، جس سے زبان وادب وصحافت کے فائدہ کے ساتھ دنیا کے مسلمانوں کے حالات اور مختلف قوموں کے طرز زندگی سے واقفیت بھی ہوئی، جس سے ان کی فکر ودرد پیدا ہوا، اور ان کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ اٹھا۔ جہاں تک مطالعہ کے اوقات کا تعلق ہے، اسفار اور انتظامی کاموں کی وجہ سے جو ندوۃ العلماء سے متعلق ہیں، مطالعہ کے لئے کوئی خاص وقت متعین کرنا مشکل تھا، جب موقع ملا مطالعہ کیا، لیکن برابر مطالعہ جاری رکھا، وسائل سفر میں ٹرین کے سفر کو اس لئے بھی ترجیح دیتے رہے کہ اس میں مطالعہ کی یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے، اور بہت سے لکھنے پڑھنے کے کام اس میں بسہولت انجام پائے، بعض کتابیں اور اہم مقالات ومضامین بھی ٹرین میں لکھے، رات کی یکسوئی بھی مطالعہ کے لئے بہتر ثابت ہوئی۔

مطالعہ کے سلسلہ میں کچھ اہم مشورے بھی ہیں جو مطالعہ کے تجربات کے نتیجہ میں پیش ہیں، ایک تو یہ کہ آزاد مطالعہ لطف ولذت کی چیز تو ضرور ہے، مگر شخصیت کی تعمیر اور سیرت سازی میں کم مفید ہوتا ہے، البتہ سطحی مطالعہ سے گریز ضروری ہے، اس سے بہت کم دلچسپی رکھنا چاہئے، تحقیقی مطالعہ کا مزاج بنانے کی طرف توجہ دینا چاہئے اور مطالعہ کے لئے کسی کو ضرور رہبر چننا چاہئے، ورنہ بعد میں کمزوری اور کمی کا علمی اور دینی دونوں لحاظ سے بہت احساس ہوتا ہے، ایک تجربہ کی بات نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ زمزم کے متعلق اس کے طبی فوائد پر ایک اہم مضمون نظر سے گذرا، میں نے بہت خوشی خوشی اپنے بڑے ماموں اور مربی حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا، انہوں نے کہا ہم اس کو سنت سمجھ کر پیتے اور فائدہ اٹھاتے ہیں، اور اس کے اس فائدہ کو اصل حیثیت دیتے ہیں، ان کی اس بات نے ہمارے سوچنے کا انداز ہی بدل دیا، وضو، نماز، روزہ، حج وغیرہ ان سب میں جسمانی فوائد کو سامنے رکھ کر عمل سے زیادہ، اللہ کا حکم اور دین کی بات سمجھ کر کرنے کا جذبہ ہونا چاہئے۔

تحریر کا کام کرنے والے کو اس طرف توجہ کرنی چاہئے کہ تحریر پر لکھنے والے کی فکر، عمل، عقیدہ، سب کا اثر پڑتا ہے، جو پڑھنے والے پر متعدی ہوتا ہے تاکہ اس کو مضرت سے بچایا جائے، اس لئے اس کا بھی خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے، دینیات کا مطالعہ بہتر دینی زندگی گزارنے کے لئے اور سماجیات کا مطالعہ بہتر سماجی زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہے، اس لئے جو زبان رائج اور عام ہو اس سے بھی ضروری واقفیت ہونی چاہئے جو اخبارات کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہے"۔

۱۹۵۰-۵۱ء کے حج وزیارت کی کچھ یادیں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا حجاز مقدس کا پہلا سفر ۱۹۴۷ء میں ہوا تھا، وہ رمضان المبارک شروع ہونے سے قبل یعنی اگست سے قبل بحری جہاز سے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے آغاز سے پہلے ہوا تھا۔ اس سفر میں تقریباً پانچ ماہ حجاز

مقدس میں گذرے تھے، اس سفر میں مولانا کی والدہ، اہلیہ، ہمشیرہ جو راقم کی خالہ تھیں اور بھانجے مولانا محمد ثانی حسنی جو میرے بڑے بھائی تھے، ساتھ تھے۔ اس سفر میں وہاں کے قیام کے دوران مولانا کو وہاں کے علماء اور صلحاء سے ملاقات کا موقع ملا تھا۔

اس زمانے میں حجاز کی صورتِ حال معاشی لحاظ سے کمزور تھی، حتی کہ وہاں کے بعض کام ہندوستان کے مسلمانوں کے تعاون سے بھی چلتے تھے۔ حرم شریف میں فراہم کردہ بعض سہولتوں میں بھی ہندوستان کی مسلم ریاستوں کا تعاون تھا، ان ریاستوں نے اپنے حجاز کے قیام کے لئے رباطیں بنائی تھیں۔ ہندوستان سے حجاز کے بعض دینی اداروں کو مدد بھی بھیجی جاتی تھی۔ اس زمانے میں جو حجاز جاتا تھا تو وہاں کی اپنی ضروریات کے لئے ضروری سامان لے کر جاتا تھا کہ وہاں اقتصادی لحاظ سے مشقت کا سامنا نہ کرنا پڑے، لیکن وہاں کے مقدس کاموں کی خاطر حرمین شریفین میں رہائش اور دیگر دشواریوں کو برداشت کرنے کے ارادے سے جاتا تھا۔

اسی زمانے میں تبلیغی دعوتی کام کی وہاں حجاز میں بنا پڑی تھی، وہاں تقریباً اسی زمانے میں نظام الدین دہلی مرکز کی طرف سے مولانا سعید احمد خاں صاحب سہارنپوری اور مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی بھی مقیم تھے اور ابتدائی طور پر کام کا آغاز ہوگیا تھا جو بالعموم مختلف ملکوں سے آئے ہوئے حجاج میں اور مساجد میں آنے والے حضرات میں کیا جاتا تھا۔

مولانا نے وہاں حج وعمرہ کی غرض کے ساتھ تبلیغ ودعوت کے مقصد کو شامل کر لینے کی ضرورت کو محسوس کیا، تعلیمی لحاظ سے وہاں اس وقت کوئی خاص توجہ نہ تھی اور بدوی حضرات اور بھی اس مقصد سے دور ہوتے نظر آرہے تھے، لہٰذا وہاں جانا ایک اہم ضرورت تھی، اسی کے ساتھ یہ عزیمت کی بھی بات تھی، ہندوستان سے ان کے لئے صرفہ کی رقم بھیجی جاتی تھی، جو بقدر کفاف ہوتی تھی، اس طرح اخلاص اور عزیمت کے ساتھ وہاں کام کی ابتدا ہوگئی تھی، ندوی فارغین میں مولانا معین اللہ ندوی اور مولانا عبدالرشید اسی مقصد سے وہاں بھیجے گئے، ان دونوں کے بھیجے جانے کے بعد ایک سال گزر جانے کے قریب تھا کہ مولانا کا خیال نئے سال کے لئے مزید فارغ التحصیل ندویوں کو بھیجنے کا ہوا، مولانا نے مجھ سے فرمایا

کہ اس سال بھیجنے کے لئے جو افراد ذہن میں آرہے ہیں، ان میں تم کو بھی شریک کردیں۔ مجھے ندوہ سے فارغ ہوئے دو سال ہوئے تھے اور ندوے میں معاون استاد (متعلم تکمیل) کی حیثیت سے ایک سال گذرا تھا، مجھے مولانا معین اللہ صاحب اور مولانا عبدالرشید صاحب اعظمی کے وہاں کے قیام کی بعض دشواریوں کا علم ہوگیا تھا، میں نے مولانا سے اس کی طرف اشارہ کیا، جس کو مولانا نے ناپسند کیا اور میرا نام ان میں شامل کردیا۔

مولانا معین اللہ صاحب دارالعلوم کی تعلیم سے فارغ ہونے میں مجھ سے کئی سال متقدم اور میرے بڑے بھائی مولانا محمد ثانی رحمہ اللہ کے بعض اسباق میں ساتھی تھے، اور مولانا عبدالرشید اعظمی ندوی مرحوم فراغت میں مجھ سے ایک سال بعد کے تھے، لیکن قریب العہد ہونے کی وجہ سے ہمارے درمیان ایک طرح کا دوستانہ اور بے تکلفی کا تعلق تھا، اسی طرح منصور پور کے مولانا سید محمد طاہر صاحب جن کے والد سید محمد یوسف صاحب حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے مرید تھے اور تیسرا نام رامپور کے ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی کا تھا جنھوں نے عصری تعلیم کے بعد ندوہ میں اپنی تعلیم پوری کی تھی اور پھلواری شریف پٹنہ کے مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب اور میرا نام تجویز ہوا، مولانا عبداللہ عباس صاحب مجھ سے تین یا چار سال متقدم اور میرے بڑے بھائی مولانا محمد ثانی حسنی صاحب کے ساتھی تھے باقی دو حضرات میرے بعد کے تھے، لیکن ان سب حضرات کا حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے قریبی ربط ہونے کی بنا پر مجھ سے بھی ربط تھا، افسوس کہ ان میں سے سبھی ایک ایک کرکے اپنے مالک حقیقی کے حضور حاضر ہوچکے ہیں، رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

یہ مولانا کے حج کے تین سال بعد کی بات ہے، مولانا کو اپنے پہلے سفر حج میں ادائیگی حج کے ساتھ دینی وعلمی تعارف اور دعوتی ضرورت کے تحت جو تجربات حاصل ہوئے تھے، جن کی بنا پر مولانا کو کچھ ندوی فضلاء کو وہاں کے دعوتی کام کی ادائیگی کے لئے بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی، وہ تجربات اور وہاں کے حالات کے احساسات کو ان خطوط سے سمجھا جاسکتا ہے جو مولانا نے اس زمانے میں اپنے اہل تعلق کو لکھا، خاص طور پر اپنے برادرِ معظم مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کو جو ان کے سرپرست بھی تھے اور دعوتی کام

کی اہمیت کو بہت محسوس کرنے والے بھی۔

ادھر مولانا کو اس سے تین سال قبل کے اپنے پہلے حج کے دو سال بعد فضلاء ندوہ کو بھیجنے کے سال ۱۹۴۹ء میں دوسرا حج کرنے کی ایک پیشکش ہوئی، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ جو ان کے اور ہم سب کے شیخ تھے اور مولانا اپنے بڑے پروگراموں میں ان کا ایماء حاصل کر کے ہی فیصلہ لیتے تھے، چنانچہ انہوں نے یہ پیشکش ملنے پر اپنے شیخ و مرشد کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے دوبارہ حج کی سعادت کا موقع ملنے جا رہا ہے، آپ کی اجازت چاہئے، حضرت نے فرمایا: اگر ہم روک دیں تو؟ تو مولانا نے عرض کیا کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا، تو حضرت نے فرمایا: اس موقع پر نہ جائیے، مولانا نے پوری بشاشت سے اس مشورے کو قبول کیا، اگرچہ پہلے حج کے بعد دوسرے حج کا تقاضا بہت ہو جایا کرتا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ پہلا حج میں نے بہت سی چیزوں سے پہلا واسطہ پڑنے کی وجہ سے پوری افادیت کے ساتھ نہیں کیا، تو دوبارہ مو[illegible] ما[illegible]س کی تلافی ہو، اس لئے یہ موقع چھوڑنا دینی اطاعت کی ایک مثال تھی اور اپنی پسند کی قربانی تھی، جس کو حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، اور اس پر ایک سال گزرنے والا تھا کہ حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے خود سفرِ حج کا ارادہ کیا اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ میں بھی حج پر جاؤں گا، آپ بھی چلئے، اور یہ حج میں آپ ہی کی خاطر آپ کے بات ماننے کی قدر دانی میں کر رہا ہوں۔

حضرت کے ساتھ رائے پور کے متعدد حضرات بھی تھے جو حضرت کے مسترشدین میں تھے، اس طرح متعدد آدمیوں کا یہ قافلہ بن گیا، ادھر ہم لوگوں کو یہ سعادت ملی کہ اس قافلے میں جو بزرگانِ گرامی پر مشتمل تھا، رفاقت حاصل ہو گئی، چنانچہ غالباً جولائی (۱۹۵۰ء) کے آخری ایام تھے کہ ہم لوگ ممبئی کے لئے روانہ ہوئے، جہاں سے حاجیوں کے قافلے پانی کے جہازوں سے جدہ جایا کرتے تھے، اس کے لئے ممبئی میں حج کمیٹی کے ذریعے انتظامات کئے جاتے تھے، جہاں کئی روز ٹھہرنا ہوتا تھا، اس زمانے میں حج کے مسافروں کا یہی نظم تھا، مغل لائن کے جہازوں سے سفر ہوتا تھا جو کہ سال کے دوران مال

برادری کا کام کرتے تھے اور حج کے زمانے میں وہ مسافر جہاز ہو جاتے تھے۔

ممبئی سے روانہ ہونے والے مغل لائن جہاز بڑے، متوسط اور چھوٹے تین سطح کے چلتے تھے، ان میں چھوٹے جہازوں میں ایک ہزار سے کم اور بڑے میں ایک ہزار سے زائد مسافر سفر کرتے تھے، بڑے جہاز آٹھ روز میں ممبئی سے جدہ پہونچاتے تھے، متوسط جہاز دس روز میں اور ان سے چھوٹے بارہ روز میں پہونچاتے تھے۔

حج کے مسافروں کے سفری مسائل ممبئی میں تشکیل کردہ حج کمیٹی حل کرتی تھی جس کے افراد رضا کارانہ طور پر بھی کام کرتے تھے، حج پاسپورٹ بنتا تھا اور حجاز کے دوران قیام جو تقریباً تین مہینے کی مدت پر مشتمل ہوتا تھا، کھانے کے لئے غلہ ساتھ لے جانا ہوتا تھا، جہاز کا ٹکٹ اس وقت تین سو عمومی درجہ، اور آٹھ نو سو کا اوپر درجہ کا تھا۔

بہر حال ممبئی میں کئی روز رہ کر ہم لوگوں کا قافلہ ''اسلامی'' نامی جہاز سے روانہ ہوا، جس کی مدتِ سفر دس روز کی تھی، سمندری سفر کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ جب سمندر میں حرکت ہوتی تو عام طور پر لوگوں میں امتلائی کیفیت ہونے لگتی، اور جب سمندر میں سکون ہوتا تو بہت خوشگوار طبیعت رہتی، جب جہاز روانہ ہوا تو لوگوں نے رخصت کیا اور رخصت کرنے والوں نے اس احساس کے ساتھ رخصت کیا کہ جانے والے خوش قسمت ہیں کہ وہاں جا رہے ہیں، اور دعا کی کہ ہم لوگوں کو بھی موقع ملے، لیکن اس زمانے میں ہندوستان کے لوگوں کی مالی حالت عام طور پر بہت کمزور تھی، حج کے سفر کا خرچ برداشت کرنا عام طور پر قابلِ برداشت نہیں سمجھا جاتا تھا، اسی لئے جانے والوں کو بہت رشک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

حج کے جہازوں کو رخصت کرتے وقت ایک طرف مسافر لوگ، اور دوسری طرف رخصت کرنے والے آبدیدہ ہو جاتے تھے اور بہت جذبات کا اظہار ہوتا تھا، جب لوگوں نے رخصت کیا اور جہاز پر کھانا ملا جو پہلا کھانا ہونے کی وجہ سے دعوتی کھانا تھا، لوگوں نے خوشی خوشی کھایا، اس کے تین گھنٹے کے بعد جہاز جب سمندر میں آگے بڑھا تو سمندر میں حرکت کا سلسلہ پیش آیا، تب تو ایسا حال ہوا کہ ہر طرف امتلائی کیفیت کے مناظر عام ہوئے، کھانا دیکھ کر طبیعت میں امتلا پیدا ہو جاتا اور قے کا ایسا سلسلہ جاری ہوا کہ ختم ہونے

کو نہ آتا، ہر طرف اسی کا منظر تھا، اور یہ سلسلہ کئی روز جاری رہا، لوگوں کے پیٹ بالکل خالی ہو گئے، کھانا دیکھنا مشکل ہو گیا، معلوم ہوتا تھا کہ دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آ گیا، تیسرے روز سمندر میں سکون محسوس ہوا اور آہستہ آہستہ طبیعت بہتر ہونے لگی۔

۵-٦ دن کے بعد حضر موت کے شہر کی بندرگاہ مکلا میں جہاز رکا اور وہاں سے بھی حاجی چڑھے، اس میں وہاں کے قاضی صاحب کے صاحبزادے اور ان کے بعض رفیق بھی تھے، یہ جان کر کہ جہاز میں بعض بزرگ شخصیتیں بشمول مولانا علی میاں صاحب بھی ہیں، یہ سب ملنے آئے اور بڑی اچھی نشست رہی، حضر موت والوں میں قاف کی ادائیگی مشکل ہوتی ہے، اس کو وہ گاف میں بدل دیتے ہیں، وہاں اس کا مظاہرہ دیکھا، ان کو کھانے کی کوئی چیز پیش کی گئی جو تھوڑی تھی، پیش کرنے والے نے کہا:

هٰذا شیء قلیل، اس پر وہ بولے:

قلیل منك یكفینی ولكن
قلیلك لا یقال له قلیل

اس کی ادائیگی انھوں نے اس طرح کی:

گلیل منك یكفینی ولكن
گلیلك لا یگال له گلیل

بہت اچھے لوگ تھے اور اچھی نشست رہی۔

دسویں روز جہاز جدہ پہونچا اور جدہ کا جو پورٹ تھا، وہ گہرے سمندر کا نہ تھا، لہٰذا جہاز وہاں تک نہیں جاتا تھا اور تقریباً ایک میل کے فاصلے پر گہرے سمندر میں ٹھہرتا تھا، اور وہاں سے کشتیوں پر پورٹ میں لوگ جاتے تھے۔

جدہ پہونچ کر مسرت اور خوشی سے بھر گئے، دس روز سمندر میں رہنے سے اُکتا گئے تھے کہ ہر طرف حدِ نظر پانی پانی ہی تھا، اور دن رات یہی ایک منظر، انسان خشکی کی مخلوق ہے، خشکی کی اصل قدر وہاں ہوتی تھی، جدہ پہونچنے پر سب کی طبیعتیں مسرور سی ہو گئیں، خاص مسرت اس بات کی تھی کہ ہم بلادِ عربیہ کی سرزمین پر اتر رہے ہیں، کتنی بڑی سعادت

کی بات ہے، کتنے مسلمان ہیں جو اس کی حسرت لے کر دنیا سے چلے گئے، اور یہ سعادت ان کو نہ حاصل ہوئی جو اللہ نے اس کم عمری میں ہم کو عطا فرمائی، دس روز نے اس کی قدردانی کے احساس کو اور بڑھا دیا۔

جدہ میں خود ہندوستان کا بنایا ہوا ایک حج ہاؤس تھا، لکڑی کی بارکیں بنی ہوئی تھیں اور حاجی ان میں ٹھہرتے تھے، اس حج ہاؤس کی انتظامی ذمہ داری علامہ رحمۃ اللہ کیرانوی کے خاندان کے ہی ایک فرزند حکیم نعیم صاحب انجام دیتے تھے، وہ ہندوستانی اور عرب دونوں کے مزاج و مذاق کو سمجھنے والے تھے، حجاج میں جو کسی اہمیت کے حامل ہوتے، وہ ان کو سمجھتے اور اس کا لحاظ رکھتے تھے، معلّم اور ان کے وکلاء مکہ، مدینہ پہونچانے کی کارروائی انجام دیتے اور سواری کا انتظام کرتے، اس میں دو ایک روز لگ جاتے تھے، بالآخر وہاں مقررہ کارروائی انجام پانے پر وہاں سے بذریعہ بس مکہ مکرمہ روانگی ہوئی، اردگرد پہاڑیاں خشک زمینیں ہیں، لیکن وہ خشکی اور صحرائی انداز دل میں محبوبیت پیدا کرتا، اور یہ احساس کہ یہ ہماری قسمت کہ اس سرزمین پر ہمیں چلنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے، جہاں سرکار دو عالم ﷺ چلے اور رہے ہیں، جبرئیل امین علیہ السلام وحی لے کر اور اللہ رب العالمین کا پیغام لے کر اترے ہیں، مسلمان شاعر ماہر القادری کا شعر ہے، اس کو دیکھ کر انہوں نے کہا:

نہ یہاں پر سبزہ اگتا ہے، نہ یہاں پر پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کر ملتے ہیں

اور زائرِ حرم حمید صدیقی نے کہا:

اب جا رہے ہیں جانے والے
اب کوئی کیسے دل کو سنبھالے
اے یادِ ماضی، اے عہدِ رفتہ
تو جتنا چاہے ستا لے

راستے میں دو ایک جگہ قہوہ خانے، چائے خانے ملے، بالکل سادہ طریقے کے، بدوی انداز کے، وہاں شوق سے چائے پی گئی، اور ابھی مکہ مکرمہ دور ہی تھا، چالیس پچاس

کلومیٹر کا فاصلہ رہا ہوگا کہ وہاں کے اثرات محسوس ہونے لگے، وہاں کی نورانیت یہاں تک آرہی ہے، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، بیت اللہ شریف کو اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی بنایا ہے، گویا وہ آسمانی ٹکڑا ہے جو زمین سے جوڑ دیا گیا ہے، اس کے اثرات دور تک پہونچنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

وہاں پہونچنے پر باب السلام سے داخلہ ہوا، داخل ہونے پر جب بیت اللہ پر نظر پڑی تو دل پر ایسا اثر ہوا، جس میں آدمی بے قابو ہو جاتا ہے، اور یہ صرف اپنا ہی تجربہ نہیں بلکہ وہاں کی پہلی حاضری اور بیت اللہ پر پہلی نظر پڑنے پر ہر ایک کا ایسا ہی حال ہوتا ہے، اس کی نورانی اور روحانی طاقت انسان کو بے قابو کر دیتی ہے، ہمارے ایک تعلق والے کے متعلق سنا کہ ان کی نظر پڑی تو وہ گر گئے۔

وہاں کی اس حاضری میں پوری جماعت تھی، جس کی سرپرستی اللہ کے ایک بڑے نیک بندے مرشدنا وشیخنا حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کر رہے تھے، اور قافلہ والوں کو وہاں کی نورانیت اور روحانیت کا فیض ملنے کے ساتھ ساتھ اللہ کے نیک بندے کی سربراہی کا فائدہ بھی حاصل ہو رہا تھا، خالی اوقات میں حضرت کی مجلسوں میں بیٹھنا ہوتا اور حضرت کے وہاں پہنچنے کی شہرت ہونے سے حج میں آئے ہوئے مختلف علاقوں کے لوگ حضرت سے ملنے آتے اور ان کی باتیں سنتے، ہم لوگوں کا پہنچنا بالکل ایام حج کے قریب ہوا تھا، ہمارا قیام رباطِ بھوپال میں ہوا اور حضرت رائے پوری، اور ان کے قافلہ رائے پور کا قیام وہاں کے مقیم ایک شخص کے یہاں تھا، حرم شریف میں بھی ملاقات ہوئی اور ان کے مکان پر بھی ملاقات ہوئی، چار پانچ روز کے بعد حج کے مناسک شروع ہو گئے اور وہ نعمت ہم لوگوں کو حاصل ہوئی۔

حج کے بعد حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ روانہ ہو گئے، لیکن ہم لوگوں کا قیام سال بھر کا تھا، اس لئے ہم لوگوں کو مدینہ منورہ جانے میں جلدی کی ضرورت نہیں تھی، ہم لوگ رباط میں رہے، ادائیگی حج اور مدینہ منورہ کی زیارت کے بعد حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء ہندوستان واپس ہو گئے، اور حضرت مولانا سید

ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام رہا اور وہاں کے اہل علم حضرات سے ربط رہا۔

سعودی عرب کا یہ وہ زمانہ تھا جب وہاں باقاعدہ خوش حالی کا حال نہیں بنا تھا۔ اس کا اثر حکومت پر بھی تھا، صرف وزارت مالیہ ایک وزارت تھی، باقی شعبوں میں ''مدیر'' کے لفظ کا استعمال ہوتا تھا، تعلیمی شعبے کے لئے بھی مدیر اور کام کے لحاظ سے وزیر کی حیثیت تھی، لیکن وزیر کے لفظ کا استعمال نہیں تھا، وزیر مالیات عبداللہ سلیمان تھے، جو تنہا وزیر ہونے کی بنا پر بہت اثر رکھتے تھے اور وہ حکومت کے بہت معتمد علیہ تھے، ان کے نائب اور معاون محمد سرورالصبان تھے، ان کو بھی اچھی حیثیت حاصل تھی، ان میں مزید ایک بات یہ تھی کہ ان کا مزاج ادب اور ادیبوں کی سرپرستی کا مزاج تھا، چنانچہ حجاز کے ادباء کو ان کی سرپرستی ملتی رہتی تھی، حجاز کے معروف ادیبوں میں احمد عبدالغفور عبدالقدوس انصاری، علی حسن فدعق، سعید العامودی، اور دیگر کئی اہم شخصیتیں تھیں۔

ان میں احمد عبدالغفور عطار اصلاً بنگالی تھے، لیکن عربی ادب سے اشتغال رکھنے پر حجاز کی ادبی کاوشوں میں ان کو معروف مقام حاصل تھا، ان کا مصر کے ادیبوں میں عباس محمود العقاد اور سید قطب سے قریبی ربط تھا، اور برصغیر کے ہونے کی وجہ سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ قربت محسوس کرنے لگے تھے، ان کے اس تعلق کی بنا پر حجاز کے دیگر ادیبوں سے مولانا کا تعارف ہونے میں بڑا حصہ رہا، ان کا تعلق گورنمنٹ کے سرکاری پریس کے منیجر سید محمود حافظ سے بھی تھا، سید محمود حافظ دیندار، وضع دار، اچھی تربیت اور خصوصیت کے تھے، ان کی والدہ پشاور کی تھیں، اس لئے ان کا ربط برصغیر سے بھی تھا، اس چیز نے بھی مولانا اور ان کے درمیان ربط بنایا، شیخ محمود حافظ اور احمد عبدالغفور عطار کے توسط سے مولانا کا حجاز کی ادبی اور ثقافتی شخصیتوں سے ربط برابر قائم ہوا، جس میں خود مولانا کی کوشش کو دخل تھا تاکہ دعوتی کام کے سلسلے میں وہاں کے ذہین طبقے کو اسلامی ذہن سے زیادہ سے زیادہ جوڑا جا سکے۔

مزید اس ربط کی ایک شکل یہ ہوئی کہ وہاں کی وہ مذکورہ بالا باثر شخصیت جن کو گورنمنٹ کے ایک محکمہ میں ذمہ دار ہونے کا مقام حاصل تھا، جن کا نام سید محمود حافظ

(شامی) تھا، وہ بڑے نیک صالح شخص تھے، ان کی والدہ پشاور کی ہونے کی وجہ سے وہ برصغیر ہندوپاک سے ایک رشتہ محبت رکھتے تھے مولانا سے بڑے مانوس ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ کی ملاقات یہاں کی بڑی اہم شخصیات علماء، ادباء اور دانشوروں سے کرائیں گے، علماء سے مولانا کا تعلق تھا لیکن ادباء سے نہ تھا، ان کو محمود الحافظ صاحب نے ایک دعوت پر جمع کیا اور مولانا کا تعارف کرایا، ان میں اکثر سیکولر ذہن کے تھے اور حجاز میں رہتے تھے، مولانا سے تعارف ہونے پر مولانا سے طرح طرح کے سوالات کئے جن کا تعلق ادب اور انگریزی لٹریچر سے تھا، مولانا کے جوابات سن کر وہ حیران رہ گئے، ان کو توقع نہ تھی کہ ایک عالمِ دین ادب سے اتنی اچھی واقفیت رکھتا ہوگا۔

پھر مولانا نے ان کو تبلیغ سے جوڑنے کی کوشش کی اور یہ کہا کہ ایک دن پکنک کے طور پر وہاں کے ایک دیہات میں کھلی فضا میں گزاریں، وہ لوگ تیار ہو گئے اور روانہ ہوئے، اور قریب کے ایک دیہات میں ایک مسجد میں تبلیغی طرز پر ٹھہرے، یہ دیہات مکہ شہر سے تقریباً پندرہ کلومیٹر پر وادی فاطمہ کے علاقے میں تھا، وادی فاطمہ مکہ مدینہ کے راستے پر ہے، یہ وادی ہونے کی بنا پر سرسبزی وشادابی کی صلاحیت رکھتا ہے، مکہ مکرمہ چونکہ پہاڑی خطے کے درمیان میں ہے، وہاں پانی اور پانی کے اثر سے ہونے والی شادابی نہیں، پانی کی بڑی کمی ہے، وہاں پانی اندرونِ زمین نہر زبیدہ کے ذریعے پہونچایا جاتا تھا، اب مزید ایک بڑی بستی کے اضافے سے پانی کی کمی کو دور کیا گیا ہے، شہر کا علاقہ خشک ہونے کی بنا پر وہاں کاشت وسبزیاں نہیں ہوتی ہیں، وہ ضرورت کے مطابق باہر سے مہیا کی جاتی ہیں زیادہ سبزیاں وادی فاطمہ سے آتی ہیں۔

ان میں سے ایک صاحب اپنے ساتھ ریڈیو بھی لے گئے، ریڈیو اس وقت تک عام نہیں ہوا تھا، اس کو صرف جدید ذہن کے لوگ ہی رکھنے کو پسند کرتے تھے، گانے اور خبریں سنی جاتی تھیں، اس لئے دینی ذہن کے لوگ کم پسند کرتے تھے، وہ صاحب صرف خبریں سننے کے عنوان سے لئے گئے تھے، مولانا نے دینی ودنیوی تقاضے سے ریڈیو لانے کو برداشت کیا۔ وہاں مولانا نے ان لوگوں سے ان کے ذہنوں کا لحاظ کرتے ہوئے دین کی باتیں کیں، جس

سے وہ لوگ مانوس ہوئے اور دین کے تعلق کو محسوس کیا، پھر اس کے بعد وقتاً فوقتاً ان لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور وہ لوگ مولانا سے بہت مانوس ہوتے چلے گئے، ریڈیو پر تقریریں بھی کرائیں اور زوردار تعارف بھی کرایا اور ان کے رسائل بھی جو وہ ساتھ لے کر گئے تھے، سنوائے، ان میں استاد احمد عبدالغفور عطار، استاد سعید عامودی، استاد علی فدعق، استاد عبدالقدوس انصاری، استاد محسن احمد باروم، شیخ رشید فارسی، علی المزروع وغیرہ اہم نام ہیں، ان میں کئی لوگ گورنمنٹ کے اہم عہدوں پر بھی تھے، مملکت کے اہم لوگوں میں نائب وزیر مالیات محمد سرور الصبان کی بھی بڑی اہمیت تھی، ان کے ادبی اور علمی ذوق اور اہلِ علم و ادب کی سرپرستی کی وجہ سے اہلِ ادب ان سے خاص تعلق رکھتے تھے۔

ان اہل ادب میں استاد احمد عبدالغفور عطار جن کو حضرت مولانا سے اچھا تعلق ہو گیا تھا، سرور صبان صاحب سے مولانا کا تعارف کرانے کا ذریعہ بھی بنے اور پھر یہ تجویز پیش کی کہ مولانا طائف کا بھی سفر کریں، طائف اس علاقے میں نسبتاً سرد مقام ہونے کی بنا پر خوش حال لوگوں کی دلچسپی کا بھی شہر تھا، وہ عموماً مکہ کی گرمی سے بچتے اور طائف میں گرمی گذارتے تھے۔ اس وقت موسم بھی گرمی کا تھا، مولانا کے سفر کے لئے موزوں تھا، چنانچہ شیخ سرور صبان نے مولانا کے سفر کا انتظام کیا، اس سفر میں استاد عبدالغفور عطار اور ان کے ساتھ ہم تین لوگ تھے، مولانا معین اللہ اور تبلیغی جماعت کے ذمہ دار مولانا سعید احمد خاں مکی اور یہ کاتب تحریر۔

عربی زبان وادب میں پختگی اور مہارت کی وجہ سے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ حجاز ونجد کے ادباء سے برابر کی سطح پر بلکہ بلند سطح پر بات کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، احمد عبدالغفور عطار اور شیخ سید محمود الحافظ نے مولانا کی وہاں کے ادباء سے ملاقات کے لیے انتظام کیا، دعوت میں ان کو کھانے پر جمع کیا اور ادب کے نام پر وہاں کے ادباء شریک ہوئے، ان کے ذہن میں علماء کے سلسلے میں وقعت والا تصور نہ تھا، ان کے سامنے مصر کے علماء تھے، جو جدید ذہن سے الگ ذہن کے حامل تھے، اور ہندوستان کے علماء میں مزید یہ بات تھی کہ عربی میں پڑھے ہوئے نہیں تھے، چنانچہ ان ادباء نے علماء کو عالم دین سمجھتے ہوئے اس ملاقات کو محض اخلاقی ملاقات قرار دیا، کھانے کے بعد بطور دلچسپی ان ادباء نے مولانا

سے ایسے سوالات کیے جوادب کے ادبی رجحانات سے تعلق رکھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ یہ یورپ کو کیا جانتے ہوں گے اور کوئی وقیع جواب نہ دے سکیں گے، لیکن ان کے سوالات پر مولانا کے جوابات ادباء کی معلومات سے کچھ آگے ہی تھے، چنانچہ اس مجلس نے سب کو متاثر کیا اور ان سب نے محسوس کیا کہ مولانا کی فکران کی حاصل کردہ فکر سے بلند ہے، اس وقت سے ان سب کا ربط احترام و تعلق و محبت کا ہو گیا جو آخر تک قائم رہا، انھوں نے علمی سطح پر مولانا سے تبادلۂ خیال کا بھی سلسلہ جاری رکھا اور اپنے اداروں میں بھی مولانا کو بلایا، چنانچہ جدہ ریڈیو پر مولانا کی تقریریں رکھیں اور ان کا تعارف احمد عبدالغفور عطار نے کرایا جو مجلۃ ''الحج'' نے شائع بھی کیا۔

مولانا کی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' ٹھیک اسی زمانے میں چھپ کر آئی تھی، اور چونکہ مصر میں چھپی تھی، اس لئے بھی لوگوں نے اس کو اہمیت کے ساتھ لیا، اور مولانا کی فکر بلند سے متاثر ہوئے، مولانا نے اپنی اس کتاب میں اسلامی دور کی جو برتری و کمال ہے، اسے اور مغرب کے مذہب مخالف رخ کی بے بضاعتی ظاہر کی ہے، اس سے اس پورے علاقے کا دانشور طبقہ متاثر ہوا، مولانا چونکہ بے تکلف عربی بولتے تھے اور فصیح عربی میں بات کرتے اور خطاب کرتے تھے، اس لئے مولانا کی ملاقات کا اثر محسوس کیا جاتا تھا۔

مولانا ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' سے پہلے کئی رسالے تحریر کر چکے تھے، جن میں عربوں کا جو قائدانہ مقام رہا ہے، اس کی طرف لوٹنے کی طرف توجہ دلائی ہے، مولانا کا اسلوب عربوں کے مقام کی بلندی اور اسلامی لحاظ سے ان کی برتری کے تذکرے اور احترام کے ساتھ ان کی موجودہ احساس کمتری اور فطری لحاظ سے کم بضاعتی پر تعجب کا اظہار ہوتا تھا اور اپنا بلند مقام واپس لینے کی تلقین ہوتی تھی۔

مولانا نے اس خصوصیت کے ساتھ مزید یہ خصوصیت بھی اختیار کر رکھی تھی کہ دیگر مختلف اصحاب علم وادب کو دنیاوی فائدے کے حصول میں حرج نہیں سمجھتے تھے، مولانا نے پوری طرح اس سے گریز کیا، وہاں کے حکومتی افراد سے ہدیہ تک لینا گوارہ نہ کیا اور اپنا ہمدردانہ رویہ

برابر ظاہر کیا، وہاں کی خوشحال شخصیتوں نے اس کو بہت اہمیت کی نظر سے دیکھا۔

حجاز کے ادیبوں سے مولانا کی ملاقات کا سلسلہ برابر قائم ہو گیا، وہ سب محبت اور قدردانی سے مولانا سے ملتے، ان میں سید علی حسن فدعق دیگر ادیبوں کے مقابلے میں زیادہ آزاد ذہن رکھتے تھے، وہ مولانا سے ایسے متاثر ہوئے کہ بڑے بھائی اور مخلص دوست کی حیثیت سے مولانا سے ملتے اور مولانا سے تعلق رکھتے، اور ان کے ذہن کی وہ آزاد خیالی جو پہلے تھی، اس کی خاص اصلاح ہوئی، علی حسن فدعق جدہ کی میونسپلٹی کے چیرمین بھی منتخب ہوئے، جس سے وہاں ان کی وقعت میں اضافہ ہوا، وہ آخر تک مولانا سے محبت و قدردانی کا تعلق رکھتے رہے، دیگر ادباء میں عبدالقدوس انصاری وہاں کے بڑے ادیب مانے جاتے تھے، اور وہ عربی میں ایک مجلّہ "المنهل" بھی نکالتے تھے، جو وقیع رسالہ سمجھا جاتا تھا اور اس سے ان کو اچھی شہرت حاصل تھی، وہ بھی مولانا کے گرویدہ ہو گئے اور مولانا کے تعلق سے جو بھی ان سے ملتا وہ اس سے محبت سے ملتے، ان کی تعلیم ہندوستانی علماء کے قائم کردہ مدرسہ ''مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ'' میں ہوئی تھی، اس طرح ان کی ذہنی بنیاد اچھی بنیاد تھی۔

دوسرے ادیب محمد سعید العامودی وہاں کے ادباء کے طبقے میں احترام والا مقام رکھتے تھے، وہ بھی مولانا سے ایک طرح کی شفقت و محبت کا تعلق رکھنے لگے، اور شیخ محسن باروم جو وہاں کی نئی نسل کے مشہور و معروف اہل علم و ادب میں تھے، وہ بھی محبت کا تعلق رکھنے لگے۔ وزارت حج کے آرگن ''مجلۃ الحج'' کے ایڈیٹر بھی ہو گئے تھے اور اس میں بھی مولانا کے مضامین انھوں نے شائع کرائے۔

مولانا نے حجاز کے مقام اور وہاں کے رہنے والوں کی خصوصیت کی طرف توجہ بنانے کے لئے ایک مؤثر مضمون لکھا جو وزارت حج کے آرگن ''مجلۃ الحج'' میں شائع ہوا اور پسند کیا گیا، مولانا نے اس میں مخلصانہ اور محبت آمیز انداز سے اسلامی خصوصیت کو اہمیت دینے اور قائدانہ مقام بتانے کی توجہ دلائی۔

اس وقت مسجد حرام کے سب سے بڑے امام شیخ عبدالظاہر بن محمد نورالدین ابوالسمح مصری تھے، اور ان کے نائب شیخ عبدالرزاق حمزہ اور دیگر ائمہ تھے، شیخ عبدالرزاق حمزہ عالِم

دین ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر مختلف موضوعات کا اچھا مطالعہ رکھتے تھے، ان سے مولانا کی ملاقات پہلے حج میں ہوئی تھی، اس وقت مولانا کی کتاب "ماذاخسر العالم بانحطاط المسلمین" چھپی نہیں تھی، لہٰذا مولانا نے اس کا مسودہ ان کو دکھایا تھا اور اس پر انھوں نے بڑی قدر دانی کا اظہار فرمایا تھا اور دیگر علماء میں اس کا تعارف کرایا تھا۔

دیگر علماء میں کئی ممتاز حضرات تھے، ان میں شیخ سید علوی مالکی خاص تعلق کا اظہار کرتے تھے اور انھوں نے اپنے صاجزادے کو ندوۃ العلماء میں تعلیم دلانے کے لئے بھیجنے کا ارادہ بھی کیا، اور وہ ندوہ کے ایک جائزے کے لئے بھی آئے اور دار العلوم دیوبند کو بھی جا کر دیکھا، پھر ان کی رائے حجاز سے باہر رہنے کی نہیں بنی، انھوں نے اپنی تعلیم وہیں مکمل کی، اور بعد میں ان کے والد کی شہرت ان کو بھی حاصل ہوئی، وہ تصوف کے بھی قائل تھے بلکہ اس کی سرپرستی کرتے تھے، اس کی وجہ سے حکومت کی نظر میں ان کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔

مولانا کی حجاز میں جو ملاقاتیں ہوئیں، ان میں ہم لوگ بحیثیت مولانا کے تلامذہ کے شریک ہوتے تھے، مولانا معین اللہ ندوی، مولانا عبد الرشید اعظمی ندوی، مولانا سید محمد طاہر منصور پوری، مولانا سید علی ندوی، ہم ساتھیوں میں مولانا معین اللہ ندوی، اور مولانا عبد اللہ صاحب پھلواروی ہم لوگوں سے سینئر تھے، ہم لوگوں کے ساتھ بھی بحیثیت طالب علم کے نہیں ؛ بلکہ ندوہ میں تعلیمی سلسلے سے متعلق ہو جانے سے وہاں کی علمی مجالس میں فارغ التحصیل یا شعبہ تدریس کے دائرۂ کار کا سمجھ کر معاملہ کیا جاتا تھا، اور مولانا کے بھانجے ہونے کا جو تعلق تھا، اس کی بنا پر یہ ادباء اور اہل علم مولانا کے اس تعلق سے محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے، اس طرح مجھ کو کئی مرتبہ ان ادباء کو تبلیغ و دعوت کے اجتماع میں بلانے کا ذریعہ بننے میں آسانی ہوئی، اور ان لوگوں نے ہم کو عزیز کی طرح رکھا۔

کئی مہینے مولانا نے حجاز میں گزار کر مصر کے لئے روانہ ہوئے، ہمارے رفقاء میں مولانا معین اللہ صاحب اور مولانا عبد الرشید صاحب آگے کے سفر میں مولانا کے ساتھ رہے اور مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی بھی مولانا کے ساتھ گئے، ہم چار آدمی مولانا عبد اللہ عباس صاحب، مولانا سید محمد طاہر صاحب، مولانا سید رضوان علی صاحب اور ہم حجاز ہی میں رہے،

حجاز کا ہمارا قیام بہت ہی نفع بخش رہا اور مقصد دعوتی رہا، لہٰذا دعوت کے کام میں اس کے ذمہ داروں سے ربط واتصال رہا اور وہاں کی اہم شخصیتوں کو بعض وقت بلانے کا ذریعہ بننے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

اس کے علاوہ وہاں کے کتب خانوں میں جاتے اور معروف شخصیتوں سے ملاقات کرتے رہے، وہاں جو یکسوئی اور مقصدیت حاصل تھی، اس سے فکری اور مفید علمی کتابوں سے مطالعے کا اچھا موقع ملا، اور مدینہ منورہ میں مکتبہ شیخ الاسلام جا کر دیکھا اور وہاں کے ذمہ دار سے ملنے کا موقع ملتا رہا، اور مکہ مکرمہ میں دہلی کے مشہور تاجر جو سعودی عرب میں بھی تجارت کی شہرت رکھتے تھے، وہ علمی آدمی تھے، ان کا اچھا کتب خانہ تھا، انھوں نے مجھ کو اجازت دے دی تھی کہ میں وہاں بے تکلف جاؤں اور مطالعہ کروں، بلکہ وہاں سے کتاب عاریۃ لے کر مطالعہ کروں، اس سے مجھے علمی لحاظ سے بہت فائدہ پہونچا۔

حرم شریف کے ائمہ میں شیخ ابوالسمح کے چھوٹے بھائی شیخ عبدالمہیمن مصری بھی بعض اوقات امامت کرتے تھے، وہ تجوید وقرأت کے اچھے فاضل تھے، ہم لوگوں نے چاہا کہ ان سے شرف تلمذ حاصل کریں، مولانا محمد طاہر صاحب اور میں نے ان سے وقت لیا، وہ تیار ہو گئے کہ روز آنہ ہم کو صحت قرأت کی تعلیم دیں، چنانچہ کچھ مدت تک حرم شریف میں ان کو قرآن مجید سنا کر فائدہ اٹھاتے رہے، وہ امامت کے علاوہ وہاں مدرسہ سلفیہ کے ذمہ دار بھی تھے، یہ مدرسہ مختصر سا تھا جو وہاں کے سلفی حضرات کی طرف سے قائم کیا گیا تھا، اور اس سے طلبہ فائدہ اٹھاتے تھے، ان کی سلفیت صرف علمی اور رواداری کی تھی شدت کی نہیں تھی، اس وقت تک سعودی عرب میں دینی مدرسے حکومت کے نہیں تھے، بلکہ ہندوستانی بزرگوں کے قائم کئے ہوئے تھے۔

ان میں مکہ مکرمہ کا مدرسہ صولتیہ جو مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کا قائم کیا ہوا تھا، ان کے خاندان کے لوگ ہی اس کے ذمہ دار تھے، اس وقت مولانا رحمت اللہ صاحب کے بھائی کے پوتے مولانا محمد سلیم صاحب کیرانوی مکی اس کے مہتمم وناظم تھے اور اس کی مالی اعانت ہندوستان کے اہل خیر بھی کرتے تھے۔

دوسرا مدرسہ مدینہ منورہ میں مدرسہ علوم شرعیہ تھا جو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی مولانا سید احمد فیض آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا قائم کیا ہوا تھا جو اپنے علمی و دینی فائدے کے لحاظ سے وہیں منتقل ہو گئے تھے اور بعد میں ان کے بیٹے مولانا محمود فیض آبادی اس کے ذمہ دار ہوئے، ان دونوں مدرسوں میں حجاز اور ملکی اور غیر ملکی طلبہ نے تعلیم حاصل کی اور ان کا فائدہ دنیا بھر میں عام ہوا، ان کا خاندان مدینہ منورہ میں استفادہ اور افادہ کے طور پر رہا، خود حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں عرصہ تک درس دیا اور بعد میں ہندوستان آنے پر دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث ہوئے، مولانا سید محمود کے بعد ان کے بیٹے مولانا سید حبیب احمد صاحب مرحوم اس کے ذمہ دار ہو گئے اور بعد میں حکومت کے قوانین کی وجہ سے وہ خالص دینی مدرسہ نہ رہا بلکہ حکومت کے مروجہ مدارس کی طرح ایک مدرسہ ہو گیا۔

سفر حجاز کی خاص بات ایک عظیم شرف کے طور پر پیش آئی کہ اس موقع پر نہ صرف حضرت مولانا اور ان کے قافلے کے ہمراہیوں نے یہ سعادت حاصل کی بلکہ بہت سے دوسرے احباب اور دوسرے ساتھیوں نے بھی بیت اللہ شریف کے اندر داخلہ کا شرف حاصل کیا اور اطمینان سے جوف کعبہ میں نوافل پڑھیں، بعض شناساؤں نے جن کو اس کی اطلاع ہوئی شکایت کی کہ ہم رہ گئے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ''کاروانِ زندگی'' جلد اول میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''میں نے محترم شیبی صاحب سے عرض کیا، انھوں نے دوبارہ حرم کی پولیس کے ذریعہ اس کا انتظام کیا اور خود بھی تشریف لائے، اس طرح پھر حضرت (رائے پوریؒ) کی معیت میں دوبارہ داخلہ کا شرف حاصل ہوا، میری زندگی میں یہ عزت و شرف کا سب سے مبارک دن تھا، جو نہ اس سے پہلے پیش آیا نہ اس کے بعد۔

اس واقعہ کی اہمیت و ندرت یہ معلوم کر کے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس کے بعد دو مرتبہ سرکاری طور پر اس کا انتظام کیا گیا کہ رابطہ کے ارکان (جن میں یہ ناچیز تھا) بیت اللہ شریف کے اندر جائیں، لیکن حکومت کے پورے انتظام کے باوجود یہ شرف حاصل نہ ہو سکا، ایک مرتبہ ۱۹۶۴ء میں باقاعدہ رابطہ کے ارکان کو دعوت دی گئی اور ان کو بیت اللہ کے دروازے کے سامنے بٹھایا گیا اور زینہ لگایا گیا، اور پولیس حفاظت و انتظام کے لئے متعین

کی گئی، لیکن زینہ لگاتے ہی ان لوگوں کا جو اس وقت مطاف یا حرم میں موجود تھے (یاد رہے کہ حج کا زمانہ قریب تھا) ایسا ہجوم ہوا کہ ایک یا دو کے علاوہ جو زینہ کے قریب تھے اور بہت چست اور مستعد، ہم میں سے کوئی زینہ کے قریب بھی نہ پہونچ سکا اور یہ خیال ترک کرنا پڑا، دوسری مرتبہ خانہ کعبہ کے غسل کے موقع پر (جن کو شاہ فیصل مرحوم کو ارکان حکومت اور معززین کے ساتھ انجام دینا تھا) ہم لوگوں کو جو قریب ہی کے ہوٹل فندق شبرا میں مقیم تھے، دعوت نامہ پہنچا کہ آپ غسل کعبہ میں شریک ہو سکتے ہیں دور دور فوج اور پولیس کا پہرا تھا (اور ان کو معلوم تھا کہ ارکان رابطہ مدعو ہیں) میں اور رفیق محترم مولانا منظور نعمانی صاحبؒ چند رفقاء کے ساتھ بڑی خوشی اور فخر محسوس کرتے ہوئے حرم شریف میں داخل ہوئے، معلوم ہوا کہ بیت اللہ شریف کا دروازہ بند ہو گیا ہے، اب جانے کا موقع نہیں۔

ان دونوں واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے کہ ہم لوگوں کو حضرت کے طفیل ہی میں یہ شرف حاصل ہوا تو بیجا نہ ہوگا۔ شاعر نے صحیح کہا ہے ۔

مور مسکین ہو سے داشت کہ در کعبہ رسید
دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید(۱)

مولانا مصر و سوڈان و شام کے سفر میں سات آٹھ ماہ رہ کر پھر حجاز واپس ہوئے اور ہم سب کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔

خال مخدوم و معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے سفر حجاز مقدس کی روداد دوسرے مقامات کی روداد کے ساتھ پیش کرنے میں احتیاط کی، البتہ سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ میں اس کو جگہ دی کہ ان کی سرپرستی میں یہ سفر ہوا تھا، چونکہ راقم الحروف کو اس مقدس سفر میں حجاز میں ساتھ رہنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی اس لئے کتاب کے نئے ایڈیشن کے لئے ناشر کے تقاضہ پر کچھ مشاہدات و تاثرات پیش کرنے کا شرف حاصل ہوا جو حرمین شریفین کے قیام میں محسوس کیے تھے۔

---

(۱) ملاحظہ ہو "کاروانِ زندگی" جلد اول، مطبوعہ مکتبۂ اسلام لکھنؤ

حجاز مقدس سے واپسی پر خاندانی حادثہ

حجاز مقدس کے سفر سے واپسی ہوئی تو ایک خاندانی حادثۂ وفات سے سب کو متأثر پایا، ہمارے والد ایک بھائی ایک بہن تھے، بہن ان سے کافی بڑی تھیں اور دادی صاحبہ کے جلدی انتقال ہو جانے کی وجہ سے بہن صرف بہن نہیں مادر مہربان کی طرح معاملہ کرتی تھیں، ان کی دعائیں لے کر ہم حجاز مقدس کے سفر پر گئے تھے، واپسی پر ان کو نہ پا کر طبیعت بہت متأثر ہوئی، انہوں نے ایک آنکھ کا آپریشن کرایا تھا جو کامیاب رہا مگر ان کو اس کے بعد سرطان کا عارضہ لاحق ہو گیا جو وفات کا سبب بنا، بڑی ہوشمند، چاہنے والی پھوپھی اور حافظ قرآن خاتون تھیں، اور ہم کو بھی مثل اولاد کی طرح سمجھتی تھیں، انہوں نے کچھ پیسے دئے کہ رابع حج کو گئے ہیں وہ واپس آئیں تو ان کو دے دینا، یہ تعلق خاطر کی بات تھی، ان کے صاحبزادگان نے ایسا ہی کیا، یہ ہمارے لئے ایک نہ بھولنے والا محبت وسلوک کا واقعہ تھا، رحمہا اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً وغفرلہا مغفرۃ تامۃ، یہ بتول بی تھیں جو میری نانی صاحبہ یعنی اپنی حقیقی خالہ سے ایک سال چھوٹی تھیں اور دونوں میں بڑا تعلق تھا اور ہم مذاق اور ہم مزاج تھیں، اور صاحب رائے خاتون تھیں، ان کے کئی صاحبزادے ہوئے جن میں تین بقید حیات رہے اور تینوں نے اچھی عمر پائی، بڑے سید حسن مجتبیٰ حسنی جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ہم زلف بھی تھے اور ان سے تین یا چار سال بڑے تھے ان کے دو صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں ہوئیں، انہیں ہم بھائی بھائی صاحب کہتے تھے، میرے والد صاحب ان سے زیادہ مانوس تھے کہ دونوں میں یہ چیز قدر مشترک تھی کہ سنتے بولتے نہیں تھے لیکن دونوں ہی بڑے ہی ذہن تھے، دوسرے ڈاکٹر حسن مثنیٰ حسنی جنہیں ہم بھائی "بھائی جان" کہتے تھے، وہ ہمارے مکان سے متصل مکان میں رہے اور علاج معالجہ کی وجہ سے ان سے زیادہ رابطہ رہا، ان کی دو صاحبزادیاں ہوئیں، تیسرے سید محمد مسلم حسنی جنہیں ہم سب بھائی "بھائی جی" کہتے تھے، وہ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کے بڑے داماد تھے، ان کے دو صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے تھے، ان کا لکھنؤ میں زیادہ قیام رہا اور

اخیر میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے، رائے بریلی میں مقیم رہے، یہ سب بڑی خوبیوں کے اور بڑے شفقت کرنے والے بھائی تھے، رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

شادی

ہمارے خاندان میں رشتہ کرنے کا یہ معمول چلا آرہا تھا کہ قریبی رشتہ داروں میں ہی رشتہ کیا جاتا ہے، اس کا ایک فائدہ یہ تو ضرور تھا کہ اس سے خاندانی خصوصیات وموروثی صفات منتقل ہوتی ہیں، اور خاندانی بزرگوں نے جن اچھی باتوں کا التزام کیا ہے اولاد کو ان کا فائدہ پہنچتا ہے، لیکن دوسری طرف اس کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ اولاد میں بعض جسمانی کمزوریاں پیدا ہوجاتی ہیں اور اس سے ان کی صحت بھی متاثر ہوتی ہے، میرے بڑے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی نے اپنی بڑی صاحبزادی سیدہ حمیراء (۱۹۰۲-۱۹۹۴) کی شادی میرے پھوپھی زاد بھائی سید محمد مسلم حسنی مرحوم سے کی تھی، دوسری صاحبزادی سیدہ فاطمہ (۱۹۲۷ء-۱۹۹۸ء) کی شادی مولانا سید محمد طاہر حسینی مظاہری منصور پوری سے حضرت رائے پوری، حضرت مدنی اور حضرت شیخ رحمہم اللہ کے مشورہ سے طے کی، ان کا اور میرا نکاح ۱۹۵۳ء کی کسی تاریخ میں ایک ہی وقت میں لکھنؤ (امین آباد، گوئن روڈ میں محمد علی لین کی مسجد میں) ہوا اور نکاح حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھایا، وہ مہر میں سنت کا بہت خیال فرماتے اور مہر فاطمی اگر نہ ہوتا تو وہ نکاح نہ پڑھاتے، مہر فاطمی پر انہوں نے نکاح پڑھایا۔ فالحمدللہ علی ذلك۔

یہ ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی صاحبزادی (سیدہ رقیہ مرحومہ) تھیں، چوتھی صاحبزادی سیدہ خدیجہ (۱۹۲۹ء-۱۹۹۹ء) کا نکاح میرے بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنی مرحوم سے اور پانچویں صاحبزادی سیدہ سکینہ (۱۹۳۳ء-۲۰۰۴ء) کا نکاح میرے چھوٹے بھائی مولوی سید محمد واضح رشید حسنی ندوی سے ہوا۔

جہاں تک اہلیہ کا تعلق ہے، ان سے میری تین بیٹیاں ہیں، میمونہ، آمنہ، ہاجرہ جن کی تاریخ پیدائش بالترتیب ۱۹۵۵ء، ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۶ء ہے، اولذکر کا نکاح مولوی سید محمد حمزہ

حسنی بن مولانا سید محمد ثانی حسنی سے جمعہ ۴/ذی قعدہ ۱۳۹۶ھ-۲۸ نومبر ۱۹۷۶ء کو ہوا، ثانی الذکر کا نکاح ۱۳/دسمبر ۱۹۸۰ء کو مولوی سید عبداللہ بن مولانا محمد الحسنی سے اور ثالث الذکر کا نکاح نومبر ۱۹۸۶ء کو مولوی محمد جعفر حسنی بن مولانا سید محمد واضح رشید ندوی سے ہوا اور سب رائے بریلی میں ہوئے اور ماشاء اللہ سب صاحب اولاد ہیں، بارک اللہ فیہم و تقبلہم۔

شیخ علی طنطاوی اور شیخ امجد الزہادی کی ندوہ آمد

۱۹۵۴ء میں شام کے بڑے عالم وقاضی شیخ علی طنطاوی اور عراق کے بڑے عالم شیخ امجد الزہادی لکھنؤ آئے اور ندوہ بھی آئے، ندوہ آکر انہیں خوشی کی انتہا نہ رہی، بڑے تعلق کا اظہار فرمایا کہ کاش بچپنا لوٹ آتا اور میں یہاں پڑھتا، پھر شیخ علی طنطاوی سے تعلق خال مکرم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بڑھتا گیا اور کچھ سالوں کے بعد جب ندوہ کے کام سے میرا اور مولانا معین اللہ ندوی، مولانا عبداللہ عباس ندوی کا عراق اور بحرین کا سفر ہوا، اور ایک ہفتہ بغداد میں ٹھہرے تو اس زمانہ میں شیخ علی طنطاوی بھی آئے ہوئے تھے، ان سے وہاں اچھی ملاقاتیں رہیں، بعد میں بھی کانفرنسوں اور اجتماعات کے موقعوں پر اور آخر میں ان کے قیام حجاز میں بھی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ ملاقات ہوئی اور شفقت حاصل ہوئی، ۱۹۹۹ء میں انہوں نے حجاز میں ہی وفات پائی۔

امیر مساعد بن عبدالرحمٰن آل سعود کی ندوہ آمد

حجاز مقدس کے گذشتہ دو سفروں ۱۹۴۷ء-۵۰-۱۹۵۱ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا بلاد عربیہ میں اچھا تعارف ہو گیا تھا اور سعودی عرب کے شاہی ایوان میں بھی تعارف ہو گیا تھا، یہ دونوں سفر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے دعوتی مقصد سے ہوئے تھے اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی تحریک سے ہوئے تھے۔ پہلے سفر میں بڑے بھائی مولانا محمد ثانی حسنی اور گھر کی بعض خواتین ساتھ تھیں، دوسرے سفر میں مجھے ساتھ لیا تھا، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ۳-۴ حضرات کو اور بھی لیا گیا تھا، دسمبر ۱۹۵۵ء میں شاہ سعود بن عبدالعزیز آلِ سعود نے جب ہندوستان کا دورہ کیا تو ان کے ساتھ

ان کے چچا امیر مساعد بن عبدالرحمٰن بھی تھے، ان کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے ندوۃ العلماء لکھنؤ آنے کی دعوت دی تو انہوں نے بہت خوشی سے قبول کی اور ان کے اعزاز میں ۴؍دسمبر ۱۹۵۵ء کو ایک جلسہ بھی ہوا جس میں حضرت مولانا کا کلمۃ استقبالیہ رہا جو اگرچہ عربی میں تھا، مگر اسے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے اخبار صدق میں اس کی اہمیت کے پیش نظر اردو میں شائع کیا، جو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

سپاسنامہ

''جناب والا! یہ ایک بڑا ازریں موقع ہے کہ ہم اپنے ایک ایسے واجب احترام مہمان کا خیر مقدم کر رہے ہیں جس سے روحانی وایمانی تعلق ہے، جس کا نسبی، لسانی اور وطنی تعلق ان مخلص داعیوں سے ہے جنھوں نے ہمارے اس ملک کو اسلام کا تحفہ دیا اور رسالت محمدی سے اس کا رشتہ جوڑا، اس احسان عظیم کے شکر سے کبھی ہم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

معزز مہمان! خدا نے آپ کے خاندان کو اس عظیم سرزمین کی تولیت وانتظام کا شرف بخشا ہے جس کے افق سے صبح صادق کا طلوع ہوا، اور انسانیت کو نئی زندگی ملی، آج بھی انسانیت کے درد کا درماں اسی میں ہے کہ یہ سرزمین جو اسلام کی امین ہے، تمدن کی اس کٹھن گھڑی میں اس کی مدد کرے، اس کو وہ یقین وہ روحانی قوت اور وہ بلند نظری اور پوری انسانیت کا درد عطا کرے جس سے اس تمدن کا دامن بالکل خالی ہے، ذرائع ووسائل سے معمور بلکہ مخمور وہ صحیح مقاصد بخشے جو ان ذرائع کو ساری انسانیت کے فلاح و بہبود کے کام پر لگائیں، میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ عصر حاضر آپ کی معنوی دولت کا زیادہ محتاج ہے، زمین نے آپ کے ملک میں دولت کے خزانے اگل دیئے ہیں، لیکن جو خزانہ آپ اپنے سینہ میں رکھتے ہیں دنیا اس کی زیادہ محتاج ہے اور یہ بڑی امداد کا وقت ہے۔

مہمان کریم! ہندوستان میں ہمارا جس دبستان فکر سے تعلق ہے، اس کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ دین کی روح کو سب سے زیادہ سمجھنے والے وہی لوگ تھے جن کو محمد رسول اللہ ﷺ سے اخذ واستفادہ کا براہ راست موقع ملا، ہم نے اپنی اصلاحی تاریخ کے ہر دور میں ان تمام اضافوں اور

تبدیلیوں کا انکار کیا جو اہل عجم اور یونانی فلسفہ کے اثر سے اسلام کے چشمۂ صافی میں داخل ہوگئی تھیں، ہمارے پیشروؤں میں سے مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنے اپنے زمانے کے مشرکانہ عقائد اور بدعات کے خلاف جہاد کیا، اور دین خالص کی دعوت دی، سید صاحب کی صراط مستقیم، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی کتاب التوحید میں بنیادی اتحاد ہے۔

جناب والا! دین کے اسی عقیدے اور تصور پر چودھویں صدی کے بالکل ابتدا میں ایک اصلاحی انجمن کا قیام ہوا جس کا نام ''ندوۃ العلماء'' تھا جس کے تین بڑے مقصد تھے ایک مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح، دوسرے علمائے کرام اور اہل دین کا اتحاد اور اشتراک عمل، تیسرے ہندوستان کے دینی نظام تعلیم کی اصلاح جو اپنی تازگی اور زندگی کھو چکا تھا، اور اپنے مقاصد کی تکمیل سے قاصر تھا، ندوۃ العلماء کے سامنے شروع سے یہ حقیقت تھی کہ ایسے علماء دین پیدا کیے جائیں جو خدا کے پیغام کو اس زمانہ کی زبان اور اسلوب میں پیش کریں۔

اس مقصد سے ندوۃ العلماء نے ۱۳۲۶ھ میں ہندوستان کے مشہور علمی، تہذیبی شہر لکھنؤ میں ایک نمونہ کی درسگاہ دار العلوم کے نام سے قائم کی اس درسگاہ کا بنیادی تصور یہ تھا کہ دین ایک ابدی حقیقت ہے جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں لیکن علم ایک پھلنے پھولنے والا درخت ہے جس کا نشوونما برابر جاری رہے گا، اس نے ایک ایسی جماعت پیدا کرنے کی کوشش کی جو اپنے اعتقادات میں فولاد کی صلابت اور اپنے علمی استفادہ اور فکر ونظر میں پوری لچک رکھتی ہو، وہ اگر اپنے دینی عقائد وعبادات میں کوہ گراں ہو تو اپنے علم ومطالعہ میں ایک دریائے رواں، اول الذکر معاملہ میں اس کے اندر کسی قسم کی کمزوری اور ثانی الذکر کے بارے میں اس کے اند جمود کا شائبہ بھی نہ ہو، اس کا شعار یہ تھا کہ مقاصد پر پوری ثابت قدمی ہو اور ذرائع ووسائل کے بارے میں پوری فراخدلی، اس کے نصاب درس میں قرآن شریف اور حدیث کو خاص اہمیت دی گئی، یونانی فلسفہ (جس نے ہندوستان وایران کے نصاب درس میں مرکزی جگہ حاصل کرلی تھی، اور طلبہ کی قوت اور وقت کا بڑا حصہ غیر واجبی طریقہ پر اس پر صرف ہو رہا تھا) بہت گھٹا دیا، عربی زبان کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے

جو اعلی ادبیات سے مالا مال ہے پڑھانے کا اہتمام کیا، چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہی وہ واحد درسگاہ ہے جہاں عربی زبان جیتی جاگتی بولتی چالتی نظر آتی ہے، اس سب کے ساتھ بعض جدید علوم اور انگریزی و ہندی کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا۔

جناب والا! ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارالعلوم سے فضلاء کی ایک ایسی جماعت نکلی جن کی تعداد اگر چہ زائد نہیں ہے، اس لئے کہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس ملک میں ایسے متوازن تعلیمی تخیل کی اہمیت پورے طور پر محسوس نہیں کی گئی، لیکن ان فضلاء نے اپنی علمی سنجیدگی ذوق کی بلندی اور فکر و نظر کے جو نقوش ثبت کئے وہ بڑے درخشاں ہیں، انہوں نے ملک کی زبان کو بلند پایہ تصنیفات اور علمی تحقیقات سے مالا مال کر دیا، اور خود عربی میں بھی ایسی تصنیفات پیش کیں جن کو علماء و ادباء عرب نے رفعت کی نگاہ سے دیکھا، اور قدر کے ہاتھوں سے لیا، اس مختصر سی جماعت کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ملت اسلامیہ کے دو متضاد اور مقابل گروہوں میں ایک اچھے سفیر کا کام دیا اور جدید تعلیم یافتہ اور قدیم تعلیم یافتہ گروہوں میں جو منافرت پیدا ہو گئی تھی اس کو کم کرنے کی کوشش کی۔

عالی جناب! بلاد مقدسہ میں حکومت سعودیہ کی اصلاحات اور اس کی خدمات تمام عالم پر روشن ہیں، بے نظیر امن وانتظام، علم کی اشاعت، قرآن مجید کے حفظ کی ہمت افزائی، بہت سی بداخلاقیوں اور منکرات کی ممانعت مسجد نبوی کی توسیع، ایسے رسوم اور تقریبات سے جو روح اسلام کے منافی ہوں کنارہ کشی یہ سب وہ کارنامے ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں اس حکومت کا خاص مقام پیدا کر دیا ہے۔

آخر میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ ہم آپ کے اسلاف سے اسلام کی دعوت کی اور علم کی جو امانت لیکر آئے تھے اس کو اس مادہ پرستی کے دور میں بھی اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہیں، ہم اب بھی انھیں اقدار عالیہ پر ایمان رکھتے ہیں جن کو نبوی محمدی نے آخری طور پر پیش کیا، ہمارا ایمان ہے کہ اس ترقی یافتہ دور کو اسلام کی رہنمائی کی اسی قدر ضرورت ہے جس قدر دور جاہلیت کو تھی۔

جناب والا! اس ملک میں مسلمانوں کی تاریخ جذبہ حب الوطنی اور تعلق روحانی کے

امتزاج کی ایک دلآویز مثال ہے، اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ مسلمان بیک وقت ایک ملک کا شریف اور مفید باشندہ اور محبّ وطن بھی ہوسکتا ہے اور دوسری طرف اپنے دین کا پیرو کار اور وفادار، اس ملک کے چپہ چپہ پر ہمارے بزرگوں کی ذہانت، دقت تخلیق اور ان کے ذوق لطیف اور حسن انتظام کی یادگار ہیں جن کو آپ نے اپنے اس دورہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا جس طرح ہم نے اس ملک کی تعلیم وترقی میں ایک نمایاں پارٹ ادا کیا، اسی طرح ہم نے عالم اسلام کی علمی وادبی سرگرمیوں میں پورا پورا حصہ لیا اور اسلامی کتب خانہ کو بعض نادرالوجود تحائف دیئے جس وقت تاتاریوں کے حملے سے تمام عالم اسلام پر ایک علمی انحطاط اور ذہنی اضمحلال طاری تھا اس وقت ہندوستان نے بعض ایسے غیر معمولی انسان پیدا کئے جو سارے عالم اسلام کی سطح سے بلند تھے خاص طور پر دور اخیر میں یہ ملک فن حدیث کا مرکز بن گیا اور اس فن میں سارے عالم اسلامی سے سبقت لے گیا، آج بھی بڑے بڑے عربی مدارس کا وجود مسلمانوں کے علوم اسلامیہ سے تعلق اور ان کی دینی زندگی کا ثبوت ہیں۔

آخر میں ہم آپ کی زحمت فرمائی کا بخلوص قلب شکریہ ادا کرتے ہیں آپ نے ہماری بڑی عزت افزائی فرمائی اور ہم کو بڑا اشرف بخشا۔ (منقول از صدق لکھنؤ، ۳۰؍دسمبر ۱۹۵۵ء)

بعض خاندانی اور اہم ملی حوادث

ادھر چند سالوں میں ہمارے مختصر ومحدود خاندان کے کئی محترم افراد نے وفات پائی جن میں ہمارے والدین کے حقیقی بڑے ماموں سید احمد سعید حسنی بن حضرت شاہ ضیاء النبی حسنی (المتوفی ۱۹۵۴ء)، ہمارے پھوپھا حافظ سید عبداللہ حسنی (متوفی ۱۹۵۶ء) اور ہمارے خاندان کے معلم اور ہمارے والدین کے رشتہ کے چچا مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی (م ۱۹۵۸ء)، ہماری اہلیہ کی والدہ ماجدہ (م ۱۹۵۷ء) اور ان کی خالہ صاحبہ اور تین ماموؤں (سید محمد زہیر ہنسوی، ڈاکٹر سید محمد ہنسوی، سید احمد ندوی ہنسوی) کا انتقال ہوا(۱)۔ قریبی عرصہ میں ان خاندانی حوادث نے سبھی کو بہت متاثر کیا، اور پھر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین

(۱) ان تینوں کے بڑے بھائی مولوی سید سراج الدین ندوی کا عین جوانی میں اور سب سے چھوٹے بھائی مولوی سید ابو محمد ندوی کا ۱۹۴۷ء ۴۶ رسال کی عمر میں انتقال ہوگیا تھا۔

احمد مدنی کا حادثۂ وفات (۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا جو ہمارے خاندانی مرشد بھی تھے اوران کا قیام لکھنؤ کے سفروں میں ہمارے بڑے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ کے مکان پر ہوا کرتا تھا اور یہ سلسلہ ہماری پیدائش سے پہلے ۱۹۲۸ء سے تھا، ان کی تشریف آوری سے بڑی نورانی فضا قائم ہوجاتی، اور ہم سب کے لئے عید سی ہوتی، ہمیں بھی ان کی خدمت کی سعادت حاصل ہوتی، اور رات کی تنہائی میں ان کی آہِ سحر گاہی اور دعائے نیم شبی کا خود مشاہدہ کیا، ان کو سنت کی ظاہری وباطنی اتباع اور عزیمت پر عمل میں بہت ممتاز پایا، اوران کے اس وصف نے اوران کی دینی حمیت اور ملی غیرت نے بھی بہت متاثر کیا، ان کے مرض وفات میں ہمارے دونوں ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ان کی عیادت کے لئے دیوبند بھی تشریف لے گئے تھے جس سے حضرت کو بڑی خوشی ہوئی تھی، ان کے انتقال کا اثر بھی پڑنا لازمی تھا کہ ملک کی تحریک آزادی میں ان کی بڑی قربانیاں رہی تھیں اوران کے وجود بابرکت سے ہندوستانی مسلمان اس ملک میں اطمینان کی سانس لے رہے تھے، اگلے سال ۱۹۵۸ء میں ملک وملت کے ایک دوسری بڑی وبے باک اور مؤثر شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی حادثۂ وفات پیش آگیا، ماموں صاحب کی طبیعت ان تمام حوادث سے بہت متاثر رہنے لگی تھی اور بلڈ پریشر کے مستقل مریض ہو گئے تھے، جس سے ان کا قلب بھی متاثر ہوا تھا، چنانچہ ۱۹۶۱ء میں اچانک ایک دن ان کا بھی حادثہ وفات پیش آگیا اور ہم سب اہلِ خاندان نے یتیمی کی کیفیت محسوس کی، ادھر ہمارے عزیزوں میں ایک عزیز سید محمد ابراہیم ہسوی کا کانپور میں انتقال ہوا جن کی عمر صرف ۴۰ سال تھی اور وہ دعوتی کاموں میں منہمک رہے تھے، ۱۹۶۲ء میں بڑا دینی خسارہ برصغیر کے مسلمانوں نے اٹھایا کہ ایک طرف مشہور بزرگ وداعی حضرت مولانا احمد علی لاہوری نے لاہور میں اور لاہور میں ہی مرشدنا حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری نے وفات پائی، اور پوری ملت اپنے روحانی سرپرست سے محروم ہوگئی، اوراسی طرح لکھنؤ کی عظیم المرتبت علمی ودینی شخصیت امام اہل سنت مولانا محمد عبد الشکور فاروقی کا سانحہ ارتحال بھی ہے جنہوں نے رافضیت وشیعیت کے خلاف تجدیدی سطح کا کام کیا تھا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس

فراغت تعلیم کے بعد کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا، مدرسے بھی اس وقت شاذ و نادر تھے، اسی فکر میں ایک سال گذرا، پھر مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا محمد عمران خان صاحب نے ہمدردی کی اور متعلم تکمیل کے دوسالہ کورس کے لئے مجھے رکھا، جسے مجلس انتظامی نے منظور کیا اور ایک دو گھنٹے بھی طے کیے گئے، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت معاون مدرس ۱۹۴۹ء میں میرا تقرر کیا گیا تھا، پھر دارالعلوم کی طرف سے حجاز کے دعوتی سفر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ رہنے کا بھی دارالعلوم نے موقع دیا، اور حجاز کے علماء، ادباء اور اعیان، عمائدین سے ملاقاتوں کے مواقع ملتے رہے، اور بڑے علمی، ادبی، ثقافتی فائدے کے ساتھ بڑا دینی روحانی فائدہ حاصل ہوا، جس کی تفصیل حجاز کے سفر کی روداد میں گذر چکی ہے، وہاں سے واپسی پر باقاعدہ مدرس رکھا گیا اور پھر ادیب دوم کی حیثیت سے ترقی دے دی گئی، اور عرب دنیا سے رابطہ کا کام بھی سپرد کیا گیا۔ جس سے علمی فکری فائدہ بھی ہوا، یہ تقرر مہتمم دارالعلوم مولانا محمد عمران خان ندوی کی خصوصی سفارش پر ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی میں ہوا، اور یہ حجاز کے قیام کی کھلی برکت تھی اور یہی وجہ ترجیح بھی تھی، مولانا عبداللہ عباس ندوی ادیب اول کے منصب پر تھے۔ ۱۹۵۵ء میں ان کی حجاز منتقلی اور پھر وہاں قیام اختیار کرنے کے باعث ان کی جگہ دارالعلوم کی انتظامیہ نے ادیب اول کا منصب بھی دے دیا اور اس کی وجہ سے مشاہرہ میں اضافہ بھی ہوا اور اہم اور بڑی کتابیں حوالہ کی گئیں جس کی وجہ سے محنت بھی خوب کرنی پڑی، اس محنت کا فائدہ آج بھی ہم کو حاصل ہے، علوم شریعہ میں تفسیر و حدیث کی کتابیں بھی پڑھائیں، ایک عرصہ تک ''ریاض الصالحین'' رہی اور وہ کتاب ایک بہترین مربی و مرشد کا کام کرنے والی کتاب ہے جس کا اپنی ذاتی زندگی میں بڑا فائدہ محسوس ہوا، قرآن مجید کا سبق بھی کئی سال ذمہ رہا، اور اس سے اس میں تدبر الفاظ و معانی کا خوب موقع ملا، جس کا تلاوت میں بڑا فائدہ محسوس ہوتا ہے، وللہ الحمد ولہ الشکر۔

ایک امتحان اور اللہ کی توفیق

دینی کاموں کی انجام دہی میں یہ دیکھا گیا ہے کہ زندگی میں ایک ایسا موڑ بھی آتا ہے جو دو خیر کے کاموں میں ایک کو ترجیح دینے کا ہوتا ہے، یہ ایک نازک وقت ہوتا ہے اور صرف توفیق الٰہی سے آدمی افضل اور زیادہ بہتر کو ترجیح دے پاتا ہے، میرے لیے بھی یہ وقت آیا کہ میرے استاد مولانا محمد ناظم ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھاولپور پاکستان میں شیخ الجامعہ ہو گئے، کسی سفر میں انہوں نے فرمایا کہ تم ہمارے یہاں آجاؤ، آٹھ سو مشاہرہ دیں گے، میرا ندوہ میں اس وقت اسی روپئے مشاہرہ تھا، اگر ہم اسے اختیار کر لیتے تو ہوسکتا ہے ہمیں بھی کوئی اعلیٰ منصب حاصل ہو جاتا مگر آج جو ہم کو حاصل ہوا وہ حاصل نہ ہوتا، جس میں سب سے اہم چیز خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی خدمت وصحبت کا شرف و سعادت ہے جس کی برکات آج بھی حاصل ہو رہی ہیں۔

نصاب درس میں ترمیم واصلاح واضافہ کا برابر کام کرتا رہا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس کو اس وقت کے ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کی سرپرستی ورہنمائی میں عملی جامہ پہنایا اور اس سلسلہ میں ان کی اہم تالیفات "مختارات من ادب العرب"، اور "قصص النبیین"، "القراءۃ الراشدۃ"، سامنے آئیں، "معلم الانشاء" کا سلسلہ بھی شروع ہوا، جس کا آخری اور تیسرے حصہ کا کام میرے سپرد کیا گیا تھا، یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا، اور برصغیر کے مدارس نے اس کو داخل نصاب کیا، اس کا پہلا اور دوسرا حصہ ہمارے رفیق تدریس مولانا عبدالماجد ندوی مرحوم نے ترتیب دیا، اور بہت اچھی ترتیب قائم کی، تاریخ میں مولانا عبدالسلام قدوائی کی کتاب "ہماری بادشاہی" بھی داخل ہوئی جو بہت مختصر اور جامع ومستند کتاب ہے، جغرافیہ پر کام ناظم ندوۃ العلماء مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ نے ہمارے سپرد کیا اور ان کا منصوبہ پہلے جزیرۃ العرب پر پھر ممالک اسلامیہ پر پھر عالمی جغرافیہ پر کام کرنے کا تھا، جزیرۃ العرب پر ان کی نگرانی میں کام کیا، جو ان کی زندگی میں شائع ہوا اور اس پر اچھے تبصرے آئے، بعض تبصرے ناقدانہ

بھی تھے، مولانا ماہر القادری صاحب جو ایک ناقد مبصر تھے، ان کا تبصرہ بہت ہمت افزا تبصرہ تھا، اس کا عربی ترجمہ دارالعلوم کے استاد مولوی محمد فرمان نیپالی ندوی نے عربی میں کردیا ہے، بعض حلقوں سے انگریزی اور ہندی میں ترجمے کی بات بھی سامنے آئی، مگر اس پر ابھی عمل نہیں ہوا۔

عربی ریڈروں میں "قصص النبيين"، "القراءة الراشدة" کے بعد "مختارات من أدب العرب" ایک بھاری کتاب طلبہ محسوس کرتے تھے، اس لئے یہ تجویز سامنے آئی کہ مختارات سے پہلے ایک کتاب ترتیب دی جائے جو اس خلا کو پر کر سکے، یہ کام بھی میرے سپرد ہوا اور "منثورات من أدب العرب" کے نام سے کتاب ترتیب دی لیکن اس کام کو ترتیب دینے میں تین سو کتابوں کا ہم نے مطالعہ کیا، دیکھنے میں تو صرف یہ ایک انتخاب ہے مگر طلبہ کی سطح اور ان کی زبان کے فائدہ کے ساتھ ان کے دینی و تربیتی فائدہ کو سامنے رکھ کر یہ حقیر کوشش کی گئی، خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کو دینی مدارس کے علاوہ یونیورسٹیز نے بھی اپنے عربی کے نصاب میں جگہ دی، شعر عربی کا ایک انتخاب ''مختار الشعر العربی'' کے نام سے دو حصوں میں ہے۔ یہ ذمہ داری بھی کاتب تحریر کے سپرد کی گئی تھی اور یہ کتاب بھی ندوہ سے شائع ہوئی۔

ادب عربی کے تعلق سے "الأدب العربي بين عرض و نقد" عالمیت کے آخری دو سال میں داخل نصاب ہوئی اور "تاريخ الأدب العربي" کا کام میرے اور میرے بھائی مولوی واضح رشید ندوی کے ذمہ ہوا تھا جس کا پہلا حصہ میں نے ترتیب دیا، اور وہ کلیۃ اللغۃ کے نصاب میں شامل ہے، آخر میں عقائد پر کتاب کی ضرورت محسوس کی گئی "الأصول الثلاثة" (التوحید، الرسالۃ، الآخرۃ) کے نام سے یہ کتاب مجلس صحافت ونشریات ندوۃ العلماء نے شائع کی اور یہ بھی عالمیت کے آخری سال میں داخل ہے، مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی فقہ کی قدیم کتابوں کا بدل بھی تلاش کررہے تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو ان کے سفر مصر ۱۹۵۱ء میں لکھا تھا کہ وہاں ایسی کتاب تلاش کریں جو اس کا بدل ہو۔ پھر اس کا ابتدائی کام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

نے خود شروع فرمایا تھا مگر ہجوم کار کی وجہ سے مولانا شفیق الرحمٰن ندوی کے سپرد کیا اور "الفقہ المیسر" (قسم العبادات) لکھی جو برصغیر کے مدارس میں رائج ہے(۱)۔

عراق اور بحرین کا سفر

دارالعلوم ندوۃ العلماء بہت مشکل حالات سے گذر رہا تھا، ندوۃ العلماء کے منتظمین نے یہ طے کیا کہ ایک سفر اس کے بعض اساتذہ کریں، اس سلسلہ میں مولانا معین اللہ ندوی، مولانا عبداللہ عباس ندوی اور میرا نام طے ہوا اور ایک مہینہ کا یہ سفر دینی، دعوتی اور ثقافتی طور پر تو مفید ثابت ہوا مگر ادارہ کے تعاون کے لیے سازگار نہ ہوسکا، ایک ہفتہ بغداد میں، ایک ہفتہ بصرہ میں قیام رہا، یہ سفر بحری جہاز سے ہوا تھا، بغداد میں شیخ تقی الدین الہلالی مراکشی اپنا قیام ترک کر چکے تھے، جن سے ۱۹۳۱ء-۱۹۳۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء نے بڑا فائدہ اٹھایا تھا، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ان سے خصوصی کسب فیض عربی زبان ولغت میں کیا تھا، مگر دوسرے بڑی تعداد میں موجود تھے، جیسے علامہ بہجۃ البیطار وغیرہ ان کی خدمت میں حاضری ہوئی اور انہوں نے شفقت کا معاملہ کیا، علامہ شام شیخ علی طنطاوی بھی بغداد آئے ہوئے تھے اور ۱۹۵۴ء کے ان کے لکھنؤ کے سفر میں ہم اہل ندوہ ان سے مانوس ہو چکے تھے، ان سے بھی اچھی ملاقاتیں رہیں، بغداد کو خلافت عباسی نے بڑی ترقی دی تھی اور سارے ماہرین علوم وفنون کو وہاں جمع کر دیا تھا، اس کی شوکت کے آگے دمشق پیچھے ہو گیا تھا، جو امویوں کا مرکز رہا تھا، پھر ایک ہفتہ بصرہ میں ٹھہرے، بصرہ کے قیام نے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بصرہ، اور بصرہ کے صحابہ وتابعین کی

---

(۱) حال ہی میں ایک دوسرے ندوی فاضل مفتی راشد حسین ندوی نے الفقہ المیسر (قسم المعاملات) تصنیف کی جو ہندوستان وپاکستان سے اور شام کے ایک ادارہ دارالعلوم سے شائع ہوکر مقبول ہو چکی ہے راقم کا اس پر مقدمہ بھی ہے، صرف ونحو پر کام کرایا گیا، اس سلسلہ میں مولانا معین اللہ ندوی کی "تمرین الصرف" اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی "علم التصریف" قابل قدر کتابیں ہیں، "تمرین النحو" کو مولانا محمد مصطفیٰ ندوی نے ترتیب دیا، اس کام کو مولوی عنایت اللہ ندوی نے آگے بڑھایا ہے اور بھی تجربے اور کوششیں سامنے آئی ہیں خاص طور پر قصص النبیین پر مختلف انداز سے کام مختلف اداروں کی طرف سے سامنے آیا ہے۔

یاددلادی، جن کے فیوض وبرکات سے پورا عالم اسلام آج بھی فیضیاب ہے۔

ایک ماہ بحرین میں قیام رہا، اور پھر واپسی ہوئی، بغداد اور بصرہ کے مقابلہ بحرین سے کچھ تعاون ندوۃ العلماء کے لئے حاصل ہوا، مسقط (سلطنت عمان) میں اندر نہ جاسکے، اس کی بندرگاہ میں جہاز ٹھہرا اور وہاں ناخدا آئے، اس طرح مسقط اور اہل مسقط کو بھی دیکھ لیا۔

یہ سفر مختلف تاریخوں میں ہوا تھا۔

سفر کا منتظم مولانا عبداللہ عباس ندوی کو بنایا گیا تھا، مگر مولانا معین اللہ ندوی کو ہم لوگوں نے اپنا امیر مان لیا تھا، ان کی ہدایات اور ان کی ظرافت طبع سے ہم سب محظوظ ہوتے، یہ ایک اچھا تجربہ اور اچھا سفر اور اچھے ایام تھے جن کی یادیں اور نقوش آج بھی قائم ہیں، اس سہ رکنی قافلہ کے یہ دونوں رفیق اللہ کے حضور حاضر ہوگئے اور اپنی نیکیوں کا صلہ پا رہے ہوں گے، ندوہ کے لئے ان دونوں کی خدمات ناقابل فراموش ہیں. غفر اللّٰہ لھما ورحمھما رحمةً واسعة.

کویت کا سفر اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے خطابات

کویت ایک چھوٹا ملک مگر محل وقوع کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ملک ہے جو عراق اور سعودی عرب کو جوڑتا ہے، یہ مستقل حکمرانی رکھتا ہے، یہ بھی مغربی استعمار کا شکار ہوا اور ۱۹۶۰ء-۱۹۶۱ء میں آزاد ہوا، اور پٹرول کی وجہ سے یہ بہت دولت مند ملک بن گیا، ان حالات میں ضرورت تھی کہ وہاں ایسے مصلحین، داعی و مصلح ہوں جو وہاں کے لوگوں کو ان خطرات سے آگاہ کریں جو دولت کی فراوانی سے اکثر پیدا ہوجایا کرتے ہیں۔

۱۳۸۱ھ/۱۹۶۲ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ وہاں کا سفر کیا جو دعوتی سفر تھا، مولانا معین اللہ ندوی اور راقم الحروف ساتھ تھا، حضرت مولانا نے ندوہ کی نظامت کا بار اٹھانے کے بعد کسی ملک کا یہ پہلا سفر کیا تھا، اس سفر میں کویت کی دو ممتاز شخصیات شیخ عبدالرزاق الصالح اور شیخ عبدالرحمٰن الاوسری بہت پیش پیش رہیں۔ حضرت مولانا کے جو خطابات ہوئے اس میں ایک تقریر "اسمعی یازھرۃ الصحراء" بہت مقبول ہوئی، اس سفر

میں حضرت مولانا نے امیر کویت شیخ عبداللہ السالم الصباح کو خط کے ذریعہ بعض اہم امور کی طرف متوجہ بھی کیا۔ اس سفر کے خطابات کی تاثیر کا یہ حال تھا کہ لوگوں کو روتے اور ہچکیاں مارتے خود ہم نے دیکھا، یہ تین ہفتے کا سفر تھا، جس میں رمضان کا عشرۂ اول بھی شامل تھا، پھر قطر اور بحرین کے راستہ واپسی ہوئی، اس سفر کی ایک خاص بات اور برکت کی بات یہ تھی کہ جب حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ سے سفر کی اجازت لی تو اپنی بھرپور توجہ اور دعا کے ساتھ یہ نصیحت کرتے ہوئے رخصت کیا کہ ''ان کو یہ پیغام پہونچائیں کہ وہ دولت کا صحیح استعمال کریں''۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے کاروانِ زندگی میں لکھا اور بالکل صحیح لکھا ہے کہ ''یہ سفر دعوتی اور فکری لحاظ سے بہت مفید ثابت ہوا''۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ یہ سفر ان حالات میں ہوا تھا کہ ندوہ کے پاس تنخواہ دینے تک کی رقم نہ تھی اور کویت اس کی بہترین جگہ تھی اور پھر لوگوں کے تأثر کا یہ عالم تھا کہ حضرت مولانا جس بات کا اشارہ کر دیں اس کے لئے سب تیار بیٹھے تھے۔ حضرت مولانا نے کہیں سے یہ محسوس کیا۔ مولانا معین اللہ ندوی صاحب جو ندوہ کی ترقیاتی کاموں کے انچارج بھی تھے، اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے تو سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور یہ واضح کیا کہ ہم لینے نہیں آئے ہیں، دینے آئے ہیں۔ آپ ایسا کوئی کام ہماری رفاقت سفر میں بالکل نہ کریں، اور بھی سخت لہجہ اختیار کیا، جبکہ مولانا معین اللہ ندوی کا عمل بھی مخلصانہ اور فکرمندانہ تھا، اس طرح یہ دورہ بڑا دینی واصلاحی دورہ تھا۔

دنیا میں اسلامی ممالک کی پوزیشن

مئی ۱۹۶۲ء میں ہفت روزہ ''ندائے ملت'' لکھنؤ کے لیے ایک اہم ''مضمون دنیا میں اسلامی ممالک کی پوزیشن'' کے عنوان سے سپرد قلم کیا تھا وہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

''دنیا میں آج مسلمانوں کی تعداد ۶۰-۷۰ کروڑ سے کم نہیں، جو اس وقت دنیا کے کل عیسائیوں کو مستثنیٰ کر کے دنیا کی کسی قوم کی نہیں، مزید برآں مسلمان اس وقت دنیا کے بہت بڑے رقبے کے مالک ہیں، جس میں سے زیادہ حصہ براعظم ایشیا اور براعظم افریقہ کا

ہے، ایشیا تقریباً نصف کے قریب اور افریقہ تین چوتھائی سے زیادہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے، اور افریقہ کی کل آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

اور یہ زیر اقتدار علاقے جن میں ہر طرح کا تصرف اور مالکانہ حقوق مسلمانوں کو حاصل ہیں، طرح طرح کی دولتوں سے مالا مال بھی ہیں، نباتات ہوں یا حیوانات، معدنیات ہوں یا دوسرے ذرائع آمدنی اور وسائل قوت وشکوہ مسلمانوں کی اس زیر اقتدار زمین میں زبردست مقدار میں پائے جاتے ہیں، موجودہ ترقیاتی دور میں سب سے اہم اور قیمتی پیداوار پیٹرول ہے جس پر جنگوں میں کامیابی اور مختلف تمدنی ترقیات کا بہت کچھ انحصار ہے، وہ دنیا کی کل پیداوار کا ایک تہائی صرف مسلم ممالک سے حاصل ہوتا ہے، بقیہ مقدار کی پیدائش میں امریکہ، روس، چین اور دنیا کے بہت سے ممالک ہیں، اگر مسلم ممالک محض اپنی طاقت کو پہچانیں اور اس کو اپنی قوت اور اہمیت کو بحال کرنے کے لیے کارآمد بنائیں تو دنیا کی کوئی طاقت ان کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔

اس کے سوا بھی مسلم ممالک ہر طرح کی قیمتی پیداوار سے مالا مال ہیں، ان میں طرح طرح کی پیداوار ضرورت کے مطابق بلکہ متعدد اشیاء ضرورت سے بہت زیادہ حاصل ہوتی ہیں، مثلاً ربر ہے یہ صرف ملایا (ملیشیا) میں اس قدر پیدا ہوتا ہے کہ پوری دنیا کی نصف ضرورت اس سے پوری ہوتی ہے، انڈونیشا سے جو ربر حاصل ہوتا ہے وہ اس کے علاوہ ہے، ٹین کی پیداوار میں بھی ملایا بڑا دولتمند ہے وہ دنیا کی ایک تہائی ضرورت اپنے ملک کے ٹین سے پوری کرتا ہے، اس کے علاوہ مختلف معدنیات مختلف اسلامی ممالک میں بے شمار اور بڑی مقدار میں پائی جاتی ہیں۔

نباتات میں متعدد اشیاء ایسی ہیں کہ دنیا میں مسلم ممالک کو خصوصی امتیاز حاصل ہے، کھجور کو لے لیجئے شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ دنیا کی اسی ۸۰ فیصد ضرورت صرف عراق کے کھجور سے پوری ہوتی ہے، حجاز ونجد وعمان کے کھجور کی مقدار اس کے علاوہ ہے، ہر طرح کے غلہ جات جگہ جگہ خاصی مقدار میں پیدا ہوتے ہیں اور بعض مسلم ممالک اس میں امتیازی شان رکھتے ہیں، میووں اور پھلوں میں بعض مسلم ممالک حیرتناک طور پر غنی ہیں، مثلاً انگور کو

لے لیجئے وہ الجزائر اور مراکش میں اتنی وافر مقدار میں پیدا ہوتا ہے کہ الجزائر کے انگور سے فرانس اربوں لیٹر شراب کشید کر کے برآمد کرتا ہے، زیتون کے درخت صرف چند عرب ممالک میں کروروں سے زیادہ ملیں گے، جنگلات سے ہمارے مسلم ممالک بھرے پڑے ہیں، جن سے لکڑی حاصل ہوتی ہے اور ہزاروں میل دور کے ممالک تک سپلائی کی جاتی ہے، حیوانات کی کثرت کا حساب بھی بہت بڑھا ہوا ہے، سب چیزوں کا جائزہ لینے پر اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ممالک دنیا کی دولتمند قوموں میں ہیں۔

اور اگر مسلمان اپنی سیاسی پوزیشن کا مطالعہ کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ وہ بڑی مستحکم ہے، یورپ، کو ایشیا سے جوڑنے والا راستہ مسلمان ممالک کے زیر اقتدار ہے، ان دونوں براعظموں کے مابین جانے والے تمام قافلے خواہ وہ بحری راستہ سے جارہے ہوں یا فضائی راستہ سے مسلمانوں کی اجازت کے بغیر گزر نہیں سکتے، مسلم ممالک جب چاہیں اس راستہ کو روک کر عالمی تجارت کو بڑی حد تک بے حرکت کر سکتے ہیں۔

دنیا کے تمام ممالک میں مسلمانوں کا تناسب ۳۰ فیصدی سے زیادہ ہے، تقریباً اسی اعتبار سے متحدہ اقوام میں بھی ان کی اچھی نمائندگی ہے، یہ اتنی بڑی طاقت ہے کہ مسلمان جب بھی غلط اقدام کی مخالفت پر متفق ہوجائیں تو اقوام متحدہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا اور پھر تمام زیر بحث مسائل میں مسلم نقطۂ نظر کو کوئی طاقت بھی فراموش نہیں کر سکتی اور فراموش کرنے پر کوئی پلاننگ کامیاب نہیں ہوسکتی''۔

''جزیرۃ العرب'' کی تالیف

۱۳۸۱ھ/۱۹۶۲ء میں کتاب ''جزیرۃ العرب'' طبع ہوکر سامنے آئی، اہلِ علم کے حلقوں میں اچھا استقبال وتعارف ہوا۔

جغرافیہ کے موضوع پر کوئی کتاب تیار کرنا درحقیقت بڑی ذمہ داری کا کام ہے، اس کے لیے بڑی محنت اور بے شمار وسائل کی ضرورت پڑتی ہے، جب مجھ پر جغرافیہ جزیرۃ العرب کے کام کی ذمہ داری ڈالی گئی تو مجھے کام کی دشواری کا اندازہ نہ تھا جب کہ میرے

ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی جو اس وقت ندوۃ العلماء کے ناظم تھے، نے فرمایا تھا اس میں تین مہینے صرف ہوں گے، اور مجھے چار سال لگ گئے، ان کے پیش نظر پورے عالم اسلام کا جغرافیہ پر کام تھا جس کا ایک ثلث کام یعنی صرف پہلا حصہ جزیرۃ نمائے عرب کا جغرافیہ مکمل کر سکا، چوں کہ ان کے پیش نظر ہی یہ کام تھا اور اس کا انھوں نے خاصا مطالعہ کیا تھا اور اس کے مصادر پر ان کی نظر تھی، اور انھوں نے جزیرۃ العرب کے جغرافیہ پر عربی زبان میں بڑی محنت سے ایک کتاب لکھی تھی، اور عرب کے مختلف نقشے تیار کئے تھے، اور ندوہ کے نصاب کو سامنے رکھ کر لکھی تھی کہ علوم شرعیہ اور عربی ادب کا طالب علم جغرافیہ جزیرۃ العرب کا اپنی درسیات میں محتاج ہے، لیکن وہ اپنے کام کی تکمیل نہیں کر سکے تھے، اور بعد میں ہجوم کار نے اور فرصت نہ دی، انھوں نے اپنی نگرانی و سرپرستی میں راقم السطور کو یہ کام سپرد کیا، اور اپنے اس کام میں ہمیں سب سے زیادہ انہی سے مدد ملی، جو باوجود اپنی علالت کے برابر اس کتاب کے متعلق دریافت کرتے اور مشورے عنایت فرماتے رہتے، انھوں نے مسوّدے کے متعدد حصوں کو ملاحظہ فرما کر قابل اصلاح وتغیر مواقع کی نشاندہی فرمائی، نیز ابتدائی مسوّدے میں اہم تغیرات کئے، ان کی توجہ اور ہمت افزائی کتاب کی تیاری میں بڑی معاون ثابت ہوئی، مگر افسوس کہ ان کی حیات میں کتاب طبع نہ ہو سکی، کہ انہیں مزید مسرت ہوتی، پھر دوسرے ماموں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی توجہ و ہمت افزائی اور رہنمائی سے کتاب کی قیمت وحیثیت کو بڑی مدد ملی، اور انھوں نے بڑی قدر افزائی کا مقدمہ بھی تحریر فرمایا اور پھر اس کتاب کو داخل نصاب بھی کیا، کتاب کے طبع ہونے پر مخدومی مولانا عبد الماجد دریابادی علیہ الرحمۃ نے بڑی ہمت افزائی اور قدردانی کا تبصرہ فرمایا، جس کا ملک وبیرون میں اچھا اثر پڑا، ایک دوسرے ادیب و ماہر صحافی جناب ماہر القادری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک مؤثر، طاقتور اور ہمت افزا تبصرہ شائع کیا اور کتاب کو بہت سراہا، اور اس کتاب کی علماء کے حلقوں اور دانشوروں کے حلقہ میں بھی الحمد للہ پذیرائی ہوئی، اور اس کا نیا ایڈیشن اہم اضافات وترمیمات کے ساتھ سامنے آیا، مگر یہ تشنگی رہے گی کہ اس سلسلہ کا پہلا حصہ ہے جو عالم اسلام کے جغرافیہ کا طے ہوا تھا، ایک تو جزیرۃ العرب ہے پھر بلاد عرب، پھر ممالک

اسلامیہ، اللہ تعالیٰ کسی کو ہمت دے اور وہ اس منصوبہ کی تکمیل کرے کہ اب پہلے سے زیادہ یہ کام آسان ہے کہ ذرائع اور کتابیں اب زیادہ مہیا ہیں، وماتوفیقی الا باللّٰہ۔

البتہ ''مسلمان جہاں بستے ہیں'' کے عنوان سے ماہنامہ صبح صادق میں برادر معظم مولانا محمد ثانی حسنی علیہ الرحمہ نے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا، جو بہت پسند کیا گیا تھا اور مصنف و محقق حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی تعریف کی تھی مگر وہ ''صبح صادق'' کے شماروں کی نذر ہو گیا جس کے متعدد شمارے ناپید بھی ہیں، اور جو شمارے موجود ہیں ان سے یہ موضوع پورا نہیں ہوتا۔

عربی اردو جرائد ومجلّات سے قلمی وابستگی

مجھے مطالعاتی فائدہ ملکی و بیرونی جرائد ومجلّات کے مطالعہ سے بہت ہوا جو ثقافتی فکری، اجتماعی، سیاسی اور زمانہ کے حالات وتقاضوں کو سمجھنے میں بہت معاون ہوا اور مجھے اپنے مطالعہ کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے کا اچھا میدان ملا۔ اس کے لئے میرے لئے لکھنؤ سے نکلنے والا ماہنامہ ''صبح صادق'' بہت معاون ہوا کہ اس کے معاون مدیر ہمارے ساتھی اور دوست ڈاکٹر ارشد حسین ندوی صاحب تھے اور اس کو ان کے والد حکیم شرافت حسین رحیم آبادی مرحوم اور ہمارے اور ان کے استاد مولانا محمد اویس نگرامی کی سرپرستی حاصل تھی، اس کے قرآن نمبر اور حدیث نمبر بہت خوب نمبر تھے اور بھی شماروں میں مجھے لکھنے کا موقع ملا، ہمارے گھر سے برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی اور خالہ محترمہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم مرحومہ کی ادارت میں خواتین کا رسالہ ماہنامہ ''رضوان'' دسمبر ۱۹۵۶ء سے نکلنا شروع ہوا تھا جو الحمد للہ برابر نکل رہا ہے، وہ بھی ایک میدان تھا، ۱۰ر نومبر ۱۹۶۳ء سے ندوۃ العلماء سے پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' برادر عزیز مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا اور وہ بھی الحمد للہ مسلسل نکل رہا ہے، اس میں جو مضامین اور بعض موقعوں پر اداریے شائع ہوئے ان کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ماہنامہ ''الفرقان'' اور پہلے سے نکل رہا تھا جو پہلے بریلی سے نکلتا تھا پھر لکھنؤ سے نکلنے لگا۔ یہ رسالہ مولانا محمد منظور نعمانی کی ادارت میں نکلتا تھا اور ان کے بڑے صاحبزادے اور میرے

ساتھی مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی بھی بعد میں اس کے مدیر ہوئے، وہ بھی ایک میدان تھا، اسی طرح ایک رسالہ ''ندائے ملت'' نکلا جس کی مجلس ادارت میں ڈاکٹر محمد آصف قدوائی، مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی اور جناب حفیظ الرحمٰن حفیظ نعمانی تھے، پھر آخر میں محب مکرم ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی نے اس کی ادارت سنبھالی اور تاعمر اسے نکالتے رہے۔ ''صدق'' حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کا ہفت روزہ اخبار تھا، جسے بہت شوق سے پڑھا جاتا تھا؛ بلکہ علم وادب و سیاست وصحافت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کے منتظر رہتے تھے، اس کا دفتر بھی قریب ہی تھا، اس کے علاوہ تحقیقی مجلّات میں ''معارف'' اعظم گڈھ، ''برہان'' دہلی اور ''ماہنامہ دارالعلوم'' دیوبند بھی اچھے رسالے سمجھے جاتے تھے، ''معارف'' اعظم گڈھ کی مجلس ادارت میں میرا نام بھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد سے آنے لگا، اور اس سے ضابطہ کی بھی وابستگی ہوگئی۔ عربی پرچوں میں "الرائد" نصف ماہی نکلنا شروع ہوا جو شعبہ صحافت ونشریات ندوۃ العلماء کی طرف سے آج بھی نکل رہا ہے، اس کو اللہ کی توفیق سے ۱۹۵۹ء میں راقم السطور نے نکالا اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا سید محمد الحسنی، مولانا محمد واضح رشید ندوی، مولانا ڈاکٹر ضیاء الحسن ندوی، مولانا شفیق الرحمٰن ندوی، مولانا محمود الازہار ندوی اور دیگر لوگوں کا قلمی و انتظامی تعاون ملا اور بہت جلد اس نے بھی شہرت حاصل کر لی، ''البعث الاسلامی'' مولانا محمد الحسنی نے اپنے رفقاء مولانا سعید الرحمٰن اعظمی، مولوی سید محمد اجتباء ندوی، مولوی محمد راشد اعظمی ندوی وغیرہ کے ساتھ ۱۹۵۵ء میں نکالا، اس نے بڑا نام پیدا کیا اور عرب اس کے مشتاق رہتے تھے، ایک طرح سے مجلۃ ''الضیاء'' کا احیاء تھا جسے مولانا مسعود عالم ندوی نکالتے تھے اور اس کے لکھنے والوں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی وغیرہ ان کے رفقاء ومعاصرین تھے۔ یہ دونوں پرچے ساٹھ سال سے زیادہ عمر پوری کر چکے ہیں اور عالم عربی کے لئے ندوہ کی آواز ہیں۔

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کا قیام ۱۹۵۹ء

مغربی فکر وفلسفہ اور یورپ سے آرہے الحاد وارتداد کے مقابلہ کے لیے ایک ایسے

علمی، تحقیقی، اشاعتی ادارہ کے قیام کی ضرورت کا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو شدید تقاضا ہوا جس سے وہ لٹریچر فراہم کیا جاسکے جس سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور دانشوروں کا اعتماد اسلام پر بحال ہو، ابتداء میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ ''نیا طوفان'' اور اس کا مقابلہ'' شائع کر کے اس کا عملی طور پر قیام عمل میں آیا، پھر مولانا عبدالباری ندوی کی ''مذہب و سائنس'' شائع کر کے کام کو آگے بڑھایا گیا اور ڈاکٹر محمد آصف قدوائی مرحوم کی ''مقالات سیرت'' شائع کی، پھر مشہور نومسلم یہودی دانشور محمد اسد (سابق لیو پولڈ ویس) کی کتاب ''طوفان سے ساحل تک'' شائع کی جو ان کی کتاب ''روڈ ٹو مکہ'' کا اردو ترجمہ برادر عزیز مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کے قلم سے تھا اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سلسلۂ اصلاح وتجدید و دعوت و عزیمت کی کتابیں طبع ہونا شروع ہوئیں جو پانچ جلدوں میں ''تاریخ دعوت و عزیمت'' کے نام سے سامنے آئیں۔ اولین اہم معاونین میں جناب ایچ. ایم حسین مرحوم حیدرآباد کا گرانقدر تعاون رہا۔(۱) اور اس سے کام آگے بڑھا، محبّ مکرم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس کے لئے بہت فعال اور فکر مند رہے اور بمبئی وغیرہ کے تعارفی دورے بھی کئے۔ مولانا اسحاق جلیس ندوی ابتداء میں اس کے انچارج اور ان کے معاون مولانا نذر الحفیظ ندوی رہے، مولوی غیاث الدین ندوی مرحوم اور مولوی سید محمد غفران ندوی نے اشاعت کے کاموں کی انجام دہی میں بڑی محنت کی اور اس کا معیار قائم رکھنے میں کامیاب کوشش کی، اہم علماء، مصنفین، مفکرین اور دانشوروں اور کچھ اصحاب ثروت پر مشتمل ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی، جن میں پروفیسر خلیق احمد نظامی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی جیسے مشاہیر اہل قلم بھی تھے، اور ترجمہ و تحقیق کے عمل کے لئے رفیق بھی رکھے گئے، جیسے مولانا شمس تبریز خان مرحوم، مولوی سلمان شمسی ندوی، مولوی زکی الدین افریقی ندوی، جناب سید غلام محی الدین وغیرہ، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ازراہ کرم مجلس کو اپنا نہایت گرانقدر تحفہ'' تفسیر ماجدی'' اردو و انگریزی عطا کیں، انگریزی اشاعت چار جلدوں میں پہلے ہوئی پھر

(۱) ان کے صاحبزادے الحاج انجینئر محمد عثمان صاحب بعد میں اہم معاون بنے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے بیرونی سفروں میں رفیق و معاون رہے۔

سات جلدوں میں۔ ہر منزل کے اعتبار سے ایک ایک جلد سے کام پایۂ تکمیل کو پہونچا جس میں ان کے خط کو سمجھنے میں ان کے برادر زادہ حکیم عبدالقوی دریابادی کی صاحبزادیوں اور ایک صاحبزادی کے نواسہ مولوی نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی کا اچھا تعاون ملا۔

مجلس نے اہم پروگرام بھی منعقد کیے، اور امام حرم مکی شیخ محمد بن عبداللہ سبیل، امام مسجد اقصیٰ شیخ محمد الصیام کو استقبالیہ دیا۔

پچاسی سالہ جشن تعلیمی ندوۃ العلماء میں بھی مجلس نے مہمانوں کو استقبالیہ دیا اور علمی نمائش پیش کی، اور ان پروگراموں کے ذریعہ اس کا اچھا تعارف ملک و بیرون ملک میں ہوا، اب تک مجلس چار سو کے قریب چھوٹے بڑے رسائل شائع کر چکا ہے، توسیعی خطبات کے پروگرام بھی منعقد کیے، اور اس کی بعض کتابیں بار بار شائع ہوئی ہیں۔ یہ اشاعتیں عربی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں سامنے آتی رہی ہیں۔ مجھے مجلس کے آغاز کے وقت سے انتظامی طور پر اس سے وابستگی رہی، اور سکریٹری کے طور پر صدر مجلس حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا معاون رہا، ان کی وفات کے بعد مجھے انتظامیہ نے صدر بنایا اور مولوی سید محمد واضح رشید ندوی اس کے سکریٹری ہوئے، اور انہوں نے تقریباً ۲۰ رسال اس کی خدمت کی اور اس کے کام کو آگے بڑھایا، اب اس کے سکریٹری مولوی سید محمد حمزہ حسنی ندوی ہیں اور حسب دستور ایک کمیٹی ہے جس کی ایک مشاورتی میٹنگ بھی سال میں ایک بار منعقد ہوتی ہے، اور باہمی مشورہ سے اچھی سمت میں اچھا کام جاری ہے۔(۱)

مئی ۱۹۵۹ء میں اس کا قیام عمل آیا، اور ندوہ کے مہمان خانہ کے ایک عارضی کمرہ سے اس کا آغاز ہوا۔ اب ماشاءاللہ اس کی مستقل سہ منزلہ عمارت ہے اور ایک اچھا اسٹاف ہے، انگریزی میں اس کا نام Academy of Islamic Research & Publications اور عربی میں المجمع العلمی الإسلامی ، اردو میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ہے۔ میری بھی متعدد

---

(۱) افسوس کہ ۲۴ر رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ/ ۸ر مئی ۲۰۲۱ء کو مولوی سید محمد حمزہ حسنی ندوی اور ۱۵ر شوال ۱۴۴۲ھ ۲۸ر مئی ۲۰۲۱ء کو مولانا نذر الحفیظ ندوی نے وفات پائی اور مولوی سید جعفر مسعود حسنی ندوی مجلس کے جنرل سکریٹری اور مولوی سید محمود حسنی حسنی ندوی جوائنٹ سکریٹری ہوئے۔

کتابیں اس ادارے نے شائع کی ہیں، جن میں حج ومقامات حج (اردو-عربی) جزیرۃ العرب (اردو-عربی)، دو مہینے امریکہ میں (اردو)، سمرقند و بخارا کی بازیافت (اردو-عربی)، غبار کارواں (اردو)، نقوش سیرت (اردو)، عالم اسلام اور سامراجی نظام (اردو)، قیمۃ الأمۃ الإسلامیۃ (عربی) امت مسلمہ رہبر امت (اردو)، مولانا ابوالحسن علی ندوی، عہد ساز شخصیت (اردو)، تحفہ رمضان (اردو-ہندی) اور بعض دوسرے رسائل و کتابیں۔

حجاز مقدس کے اسفار اور علماء و مشائخ سے استفادہ

رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے قیام اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اس میں تاسیسی رکنیت اور مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کے قیام اور اس کی تاسیسی رکنیت، پھر استاد زائر کی حیثیت سے محاضرہ کی دعوت اور اس کے لئے مدینہ منورہ کا قیام مزید رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی ذیلی کمیٹیوں، مجلس مساجد اور مجلس فقہی کی رکنیت، عمومی طور پر ان سفروں میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مجھے حاضری کی بار بار سعادت ملتی رہی، اور وہاں کے علماء و مشائخ اور سرکاری شخصیات، اعیان و عمائدین سے بھی ملاقات اور تبادلۂ خیال کا موقع ملا، اور حج کے زمانہ میں رابطہ کی سالانہ مجلس کے انعقاد کی وجہ سے حج کی بھی سعادت حضرت مولانا کے مرافق کی حیثیت سے بار بار ملی، اور عمرے کی برکات بھی خوب ملیں، پھر رابطۂ ادب اسلامی کا ۱۴۰۴ھ میں قیام عمل میں آیا تو اس کی مجلس امناء کی میٹنگ مدینہ منورہ میں منعقد کیے جانے کا اہتمام ہونے لگا، اس میں بحیثیت رکن کے راقم الحروف بھی مدعو ہوتا، یہ سب ارضِ مقدس کی برکات کے حصول کے بہترین مواقع اور وہاں کی دینی و علمی شخصیات سے استفادے کے بھی مواقع تھے، جن میں ہماری ہندوستانی شخصیات میں وہاں مدرسہ صولتیہ کے ذمہ دار مولانا محمد سلیم مکی، اور مدینہ منورہ میں مقیم حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہٗ کی ذات گرامی بھی ہے، دیگر بڑے علماء مولانا سید بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی مصنف ترجمان السنۃ، مولانا عبدالغفور نقشبندی مہاجر مدنی وغیرہ کے نام ہیں۔ علمائے عرب میں علامہ ابن باز، علامہ عبداللہ بن حمید، شیخ ناصر الدین البانی، شیخ تقی

الدین ہلالی مراکشی، شیخ امین شنقیطی، محدث حرم سید علوی مالکی، محدث حرم مدنی شیخ محمد علی الحرکان امام حرم شیخ عبداللہ خیاط، امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السبیل، امام مسجد نبوی شیخ عبداللہ عبدالعزیز الصالح، اعیان عرب میں شیخ صالح قزاز، استاد علی حسن فدعق، شیخ احمد محمد جمال، سید محسن باروم، عبدالمقصو دخوجہ، سید حبیب مدنی، ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف، ڈاکٹر عبداللہ عبد المحسن ترکی اور دوسرے بہت سے نام ہیں۔ لیکن سب سے اہم اور مبارک سفر وہ سفر ہے جو والد ماجد سید رشید احمد حسنی کے سفر حج کے لئے ان کی مرافقت کے طور پر کیا کہ وہ نطق و سماعت میں معذوری رکھتے تھے اور صحت بھی بہت کمزور ہو چکی تھی۔

ایک یادگار نظم اور وصیت

۱۹۶۳ء کے ایک سفر میں برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی نے ایک دعائیہ نظم بلکہ ایک طرح کا شعری ہدایت نامہ ارسال کیا تھا، اس کی تاثیر آج بھی تازہ ہے ۱۹۶۷ء میں جب برادر عزیز مولوی سید محمد الحسنی مرحوم حج کو گئے تو یہ اشعار ان کے لئے بھی بھیجے تھے جو حسب ذیل ہیں۔

میرے عزیز بھائی تم کو سلام پہونچے
بعد از سلام میرا تم کو پیام پہونچے

تم کو بہت مبارک کعبہ کی ہو زیارت
قابل ہے رشک کے جو تم کو ملی سعادت

جتنا بھی فخر تم کو محسوس ہو وہ کم ہے
بس میں نہیں کسی کے اللہ کا کرم ہے

اس وقت تم جہاں ہو وہ ہے مقام رحمت
مدینہ کی طرف برستی ہے صبح و شام رحمت

ہے اک کام تم سے میرا گر کرو تم
بھولوں نہ عمر بھر میں احسان گر کرو تم

مجھ کو بھی یاد رکھنا شام و سحر دعا میں
کعبہ کے پاک در پر عرفات میں منیٰ میں

کوہ صفا پر چڑھ کر کعبہ ہو جبکہ رُخ پر
مروہ کی سیڑھیوں پر مسعیٰ میں رہ گذر پر

منبر کے سایہ میں بھی اور حطیم کے بھی
رکن یمانی چھوڑ کر در پر کریم کے بھی

دیوار سے لگا کر سینے کو ملتزم پر
چل کر مطاف میں پھر رک کر ہر اک قدم پر

پردہ سے تم لپٹ کر آنسو بہا کے کہنا
کعبہ کے پاک در پر سر کو جھکا کے کہنا

بیتِ عتیق کے رب اپنے کرم کا صدقہ — اور رحمت و محبت بے کیف و کم کا صدقہ
تونے مجھے بلایا تیرا بہت کرم ہے — اک اور مضطرب ہے جو مبتلائے غم ہے
بے تاب ہو رہا ہے اس کو بھی تو بلالے — دنیا سے دل ہٹا کر اپنا ہی تو بنالے
دن رات جاکے زمزم بار بار پینا — میری طرف سے بھی تم دو چار بار پینا
للہ میری جانب سے بھی طواف کرنا — آنسو جو چند نکلیں نذر غلاف کرنا
ہوگا نویں کا عرفہ رحمت کا زور ہوگا — قلب وزبان میں پیدا جب دردوسوز ہوگا
تم بے قرار ہوکر سجدہ میں جب پڑے ہو — پہلو بدل رہے ہو مبہوت سے کھڑے ہو
اشکوں سے بھیگ جائیں جب حاجیوں کے دامن — ایسی جھڑی لگی ہو بھادوں ہو یا کہ ساون
چیخوں سے اپنی حاجی تھرادیں جب دنیا کو — جب رحم آئے سب پر بے ساختہ خدا کو
ہوگا وہ ایسا عالم ہر سمت نور ہوگا — قلب ونظر پہ طاری کیف و سرور ہوگا
ایسے ہی پیارے عالم میں مجھ کو بھی یاد رکھنا — ذکر و دعا سے للہ مجھ کو بھی شاد رکھنا
اللہ تم کو ہر دم اپنی اماں میں رکھے — اپنا بنا کے تم کو دونوں جہاں میں رکھے

حج کا سفر تمہارا صدبار ہو مبارک
جانا بھی ہو مبارک آنا بھی ہو مبارک

حجاز مقدس کا ایک طویل قیام، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے محاضرات اور حج کی سعادت

۱۹۶۲ء کی آخری تاریخوں میں علی گڈھ میں آنکھ کے ایک چھوٹے آپریشن کی وجہ سے مقیم تھا، سعودی سفیر شیخ یوسف فوزان جو بہت تعلق رکھتے تھے۔ ملک المملکۃ العربیہ السعودیہ شاہ سعود کی طرف سے یہ پیغام لے کر آئے کہ مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آرہا ہے، حضرت مولانا اس میں بحیثیت استاد کے مستقل طور پر تشریف لائیں، چونکہ ان کی ملاقات حضرت مولانا سے نہیں ہو پائی تھی اور آپریشن کی وجہ سے دہلی کا سفر بھی

آسان نہ تھا۔ حضرت مولانا نے مجھے اس خط کی وصولی کے لئے دہلی سفیر صاحب کے پاس بھیجا، اور اس کے جواب میں حضرت مولانا نے بعض اعذار و مصالح کی بنا پر یہ عذر پیش کیا کہ مستقل قیام کے بجائے عارضی اور جزوی قیام سے فائدہ اٹھا کر جامعہ کو فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے، جامعہ کے قیام کے ساتھ اس کی تاسیسی رکنیت دی گئی اور پھر اگلے سال محاضرات کے لیے مدعو کیا جس میں مجھے بھی شریک ہونے کا شرف ملا۔

مولانا کا پھر سفر ندوۃ العلماء کے تعارف کے لئے کویت وغیرہ کا ہوا جس کی اطلاع سعودی عرب کے ایک اہم ذمہ دار، مالیات کے وزیر شیخ محمد سرور الصبیان کو ہوئی، تو انہوں نے سعودی عرب کی دعوت بھیجی مگر انفرادی دعوت کی وجہ سے اپنا عذر پیش کیا، لیکن تھوڑی ہی مدت میں جامعہ اسلامیہ کی تاسیس کے پہلے جلسہ میں شرکت کے لیے سفر ہوا، اس میں بھی مولانا کے ساتھ مولانا معین اللہ ندوی تھے اور اسی میں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے قیام کی بات سامنے آئی اور اس کے قیام و تاسیس میں بھی مولانا روزِ اول سے شریک رہے، اور اس کے جلسوں میں ان کو ہمیشہ بڑی اہمیت دی جاتی رہی۔

پھر جامعہ اسلامیہ کے استاذ زائر کی حیثیت دعوت آئی، جامعہ اسلامیہ کا قیام وہاں کی ضرورت کے لحاظ سے سب نے ضروری سمجھا، اور یہ ایک اچھا موقع تھا کہ ان محاضرات کے ذریعہ دین کی وہ بات جس کی وقت کو ضرورت ہے، اور عربوں کو خاص طور پر ضرورت ہے کہ وہ دین کے اول داعی اور دین کے سرچشمہ کے مکین ہیں، ان کو قوت و صراحت سے پہونچائی جائے، النبوة والانبياء فی ضوء القرآن الكريم کو موضوع بنا کر آٹھ محاضرات اپنے تکیہ رائے بریلی کے قیام میں تیار کئے، اس وقت جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے وائس چانسلر شیخ بن باز تھے اور ان کی طرف سے دعوت تھی، مجھے مرافق کے طور پر لیا، اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک محاضرہ کا موقع ہمیں بھی دے دیا لیکن وہ ایک ضمنی طور پر تھا، اصل محاضرات مولانا کے ہوتے رہے اور بہت پسند کئے گئے، ان میں ایک خاص بات یہ ہوئی کہ مولانا کے بعض وہ خیالات جن کو وہاں کا سلفی ذہن انصاف کے انداز سے نہیں دیکھتا تھا مگر مولانا کا ایسا حسن ادا تھا کہ اس پر پسندیدگی کا اظہار ہوا اور بعض موقعوں پر تعجب بھی ہوا کہ شیخ بن باز جو وہاں کے سربراہ تھے اور واضح طور پر سلفی الذہن اور

سلفی العمل تھے، انہوں نے بھی تائیدی جملے کہے، اور بہت سراہا، وہ ان محاضرات پر تبصرہ بھی فرماتے تھے، اور وہاں کے تعلیمی شعبے کے ایک ذمہ دار شیخ عطیہ سالم پروگرام کو کنڈکٹ کرتے تھے اور وہ مولانا کے تعلق سے بلیغ الفاظ میں قدردانی اور تمہیدی کلمات کہتے تھے۔ محاضرات بعد میں کتابی شکل میں تیار ہوئے اور اردو میں ''منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین'' کے نام سے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے طبع ہوئے۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے قیام کے ہی موقع پر رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس کے قیام میں بڑا دخل مصر کے صدر جمال عبدالناصر کی سعودی عرب کی مخالفت کا سلسلہ اور قومیت عربیہ کا نعرہ تھا، اس کے مقابلہ کی ضرورت محسوس کرکے اس بین الاقوامی انجمن کا قیام عمل میں آیا تاکہ حرمین شریفین کو قومیت کے مضر اثرات سے بچایا جا سکے، رابطہ کے اول صدر شیخ الاسلام محمد بن ابراہیم آل الشیخ تھے اور ان کے بعد علامہ عبد العزیز بن عبداللہ بن باز صدر رہے۔

رابطہ پورے عالم اسلام کے ملی معاملات کا موضوع ہوتا تھا لیکن مملکت نے دینی معاملات کے لیے الگ سے ادارہ قائم کیا تھا۔ ہیئۃ الأمر بالمعروف والنهی عن المنکر جس کو دینی سرپرستی کی اہمیت حاصل تھی۔ جس کے صدر وہاں کے شیخ الاسلام محمد بن ابراہیم آل شیخ تھے۔ وہی رابطہ کے بھی صدر قرار پائے، اور مملکت کے مفتی اعظم بھی اور ان کی شخصیت کا بادشاہ بھی خیال کرتا تھا، مولانا کی انؒ سے ملاقات ہوئی اور ان کا مولانا سے تعلق بڑھ گیا تھا اور جب کسی کام سے وہ جلسوں سے جاتے تو ان جلسوں کی صدارت مولانا ان کی جگہ کرتے تھے، بعد میں ان کے نائب علامہ بن باز کا مولانا سے بہت تعلق بڑھ گیا اور وہ مولانا سے بہت مانوس ہوگئے تھے اور وہ بھی غیر معمولی صفات کے حامل بڑی قدآور شخصیت تھے جن کا پوری مملکت میں بڑا احترام تھا اور مملکت کے ارکان بھی ان کا بڑا خیال کرتے تھے، جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تو اس کے ذمہ دار بھی وہ قرار پائے، اس جامعہ میں وائس چانسلر تھے، رابطہ میں ان کی معاونت ورفاقت شیخ محمد بن ناصر العبودی کرتے تھے، اور وہ بڑے صاحب علم اور صاحب تصنیف شخصیت ہیں، اور خاص طور پر ندوہ

سے اور ہم لوگوں سے مانوس رہے ہیں، اور دنیا بھر کے سفر نامے لکھے، جس میں ندوہ کا بھی اچھا تذکرہ ہے۔ وہ ندوہ کی آخری کانفرنس مؤتمر الدعوة و القضايا الاسلامية منعقده ۱۹۹۷ء میں بھی آئے تھے اور ہمیشہ بہت تعلق سے ملے۔(۱)

رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری شیخ محمد سرور الصبان جو وزیر مالیات بھی رہ چکے تھے، پھر شیخ صالح قزاز، شیخ محمد علی الحرکان، ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف، ڈاکٹر عبداللہ عبد المحسن ترکی جو جامعۃ الامام بن سعود الاسلامیۃ ریاض کے مدیر (وائس چانسلر) رہ چکے تھے اور ندوہ بھی آئے، ان سب کا اچھا تعلق رہا اور ان کے سامنے حالات کے لحاظ سے جو تقاضے ہیں ان کو رکھنے کا موقع ملا اور صرف محاضرات کی علمی اور دعوتی پہلو تک بات محدود نہیں رہی بلکہ یہ ایک علمی اور دعوتی دائرہ میں مفید مشوروں اور مفید مذاکروں کا ذریعہ تھا۔

اسی دوران ملک فیصل بن عبدالعزیز آل سعود بحیثیت وزیر اعظم کے مدینہ منورہ آئے تو ان سے بھی مولانا کو ملاقات کرنے اور ملک کی اہمیت اور حالات کے جو تقاضے ہیں، ان پر توجہ دلانے کی ضرورت محسوس ہوئی، اس کے لئے مولانا نے وقت لیا اور ملاقات کی جس میں مجھے بھی اپنے ساتھ رکھا، اور مسائل پر گفتگو ہوئی، ملک فیصل نے ان چیزوں سے اتفاق کیا اور اپنی فکر کا بھی اظہار کیا، اور قابل توجہ باتوں کے سلسلہ میں اپنی فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی مجبوریوں کا بھی ذکر کیا، مولانا اپنی گفتگو کے علاوہ باقاعدہ تحریری طور پر بھی ایک موثر توجہ نامہ لے کر گئے تھے، جس کو پیش کیا، اس کو شاہ فیصل نے پڑھا، اور ملت کی طرف سے دین کے جو تقاضے ہیں، ان کا لحاظ رکھنے اور عمل کرنے کی پالیسی کا اظہار کیا، مولانا کا جو توجہ نامہ تھا، وہ خاص طور پر تین پہلوؤں پر مشتمل تھا اور اچھے انداز میں گفتگو کی تھی۔

۱- حرمین شریفین کا مرکز دین وایمان ہونا جس کی حفاظت اور قائم رکھنے کی ذمہ داری وہاں کے اہل حکومت کی سب سے زیادہ ہے۔

۲- نئی نسل کی تیاری کے لئے تعلیم کا ذریعہ بہت اہم ذریعہ ہے اور اس کے اسباب و ذرائع کا لحاظ رکھے کے بغیر اس کا وہ نتیجہ نہیں نکلتا جو مطلوب ہوتا ہے۔

---

(۱) ان سطور کے لکھے جانے تک الحمدللہ ابھی وہ بقید حیات ہیں، اطال اللہ بقاءہ۔

۴۔ ملک کی عام زندگی اخلاقی اور دینی حیثیت سے اس کے معیار کے مطابق ہو۔

اس سے ملک فیصل نے موافقت کا رویہ ظاہر کیا، اور بعد میں ملک فیصل کے رویہ سے یہ بات ظاہر ہوتی رہی کہ ملک کو اپنی اسلامی شناخت کو قائم رکھنا ہے، اور ان باتوں سے اجتناب کرنے کا خیال رکھنا ہے کہ جو مملکت کی بدنامی کا ذریعہ ہوسکتی ہیں، البتہ وہاں بادشاہ بدلتے رہے، ملک فیصل کے بعد ان کے کئی بھائی یکے بعد دیگرے بادشاہ ہوئے، اور ان لوگوں کے انداز میں ملک فیصل کے انداز سے مختلف کیفیت کا اظہار دیکھا گیا، مگر اسلام پسندی کا کسی نہ کسی طرح اظہار رہا اور حرمین شریفین کی خدمت کو ان سب بھائیوں نے اپنے سامنے رکھا اور شاہ فیصل بن عبدالعزیز کے وقت سے جلالۃ الملک کے بجائے خادم الحرمین الشریفین کا لقب اختیار کیا، البتہ ان کے بعد کی نسل جن کی تربیت مغرب میں ہوئی ہے، الگ مزاج وطبیعت کی حامل نظر آنے لگی ہے، اور بعض ایسے اقدامات سامنے آرہے ہیں جو ایک صاحب ایمان کے لئے تکلیف دہ ہیں اور جس سے بدنامی بھی ہورہی ہے۔

جن اہم علماء سے ملاقات ہوئیں، ان میں شیخ بن باز کے علاوہ شیخ عبدالمحسن عباد، شیخ امین شنقیطی، شیخ ناصرالدین البانی، شیخ صالح الحصین وغیرہ، کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شیخ عبدالمحسن عباد بعد میں ندوہ بھی آئے اور دیکھ کر کہا کہ یہ تو پورا علمی شہر ہے، ان کا تعلق آج بھی تازہ ہے، شیخ امین شنقیطی قدیم طرز کے بڑے علماء کی یادگار تھے۔ ان کے درس میں ملک فیصل بھی ایک روز بیٹھے اور اس درجہ میں ہمارے ایک ندوی فاضل مولوی تقی الدین فردوسی ندوی ان کے پہلو میں تھے، وہ کہتے ہیں شیخ امین شنقیطی نے درس جاری رکھا اور بادشاہ کے احترام پر درس حدیث کے احترام کو ترجیح دی اور ملک فیصل تواضع اور حدیث کے احترام میں پوری خاموشی کے ساتھ درجہ میں بیٹھے رہے۔

اس وقت جامعہ میں ادب کے ایک مشہور و بڑے فاضل استاد شیخ محمد المجذوب تھے، جو شام کے رہنے والے تھے، جامعہ میں وہ اپنے شعبہ کے سربراہ تھے، اور ندوہ سے بہت زیادہ تعلق رکھتے تھے، وہ ندوہ آکر کچھ دن رہے اور محاضرات بھی دیئے، ایسی ایک شخصیت استاذ محمد اطہار کی بھی تھی ان کا تعلق بھی شام سے تھا اور وہ بھی ندوہ سے بہت تعلق

رکھتے تھے، شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی بھی کچھ عرصہ جامعہ اسلامیہ میں رہے اور وہ ندوہ میں پڑھا بھی چکے تھے اور ماموں جی کے استاذ تھے، مجھے اکثر سفروں میں ۳۱-۳۲ھ شرکت کا شرف ملا اور ۱۹۶۹ء میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے مدینہ منورہ کی مستقل سکونت اختیار کی تھی، ان کی خدمت میں بھی حاضری ہوئی اور شفقت حاصل ہوئی، ایک روز مشہور محدث مولانا سید بدر عالم میرٹھی جن کا مدینہ منورہ میں قیام تھا، ان سے بھی ملاقات ہوئی، پاکستان کے ایک بزرگ مولانا شاہ عبدالغفور نقشبندی تھے، ان کی بھی زیارت و ملاقات ہوئی، مولانا صوفی محمد اقبال ہوشیار پوری نے بھی مدینہ پاک کی سکونت اختیار کر لی تھی، ان سے رائے بریلی اور لکھنؤ کا پرانا تعلق و تعارف تھا اور حضرت مولانا سے بڑی عقیدت رکھتے اور حضرت شیخ کے خاص لوگوں اور خلفاء میں تھے، اسی طرح مولانا عاشق الٰہی بلند شہری جو میرے بڑے بھائی مولانا محمد ثانی حسنی کے ساتھی تھے۔

جہاں تک ان خطبات کا تعلق ہے جو حضرت مولانا نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں دیے، اس کے لیے حجاز مقدس کا سفر شوال ۱۳۸۲ھ/فروری ۱۹۶۳ء میں ہوا تھا اور عمرہ کی ادائیگی کے بعد مدینہ منورہ حاضری ہوئی اور ذی قعدہ کا مہینہ اُن پروگراموں میں گذرا جو محاضرات کے تھے اور ہر ہفتہ دو محاضرات رکھے گئے تھے، جس کے موضوعات یہ تھے۔

پہلا خطبہ: نبوت، انسانیت کو اس کی ضرورت

تمدن پر اس کا احسان اور مقام کی موزونیت

اس افتتاحی محاضرہ میں حضرت مولانا نے اس بات کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی کہ: ''اس جگہ جہاں اس وقت ہم آپ جمع ہیں موزوں ترین گفتگو انسانیت کو نبوت کی ضرورت اور تمدن پر اس کے احسان سے متعلق ہو سکتی ہے''۔

اور پھر کہا کہ ''عالم اسلام میں کسی بھی درسگاہ کی خواہ وہ مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں کیوں قائم نہ ہو، یہ پہلی ذمہ داری ہے کہ سب سے پہلے وہ نعمت نبوت کے سمجھنے کی طرف توجہ کرے، جس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ نے کوئی نعمت نہیں اتاری اور اس نعمت کی قدر اور شکر کے

ساتھ، اس کے سرگرم حامیوں اور داعیوں میں ہو اور وہ زندگی کی رزم گاہ میں جہاں جاہلیت، ارتداد اور انقلاب کے پرچم ہر طرف لہرا رہے ہیں، وہ لوائے محمدیؐ اور خیمۂ مصطفویؐ کے سایہ میں آجائے اور زندگی کے ہر محاذ پر خواہ وہ فکری واعتقادی ہو یا عملی وانتظامی، اخلاقی واجتماعی ہو یا تمدنی وسیاسی، اسلام کی سربلندی کے لیے اپنے کو وقف کر دے۔ کسی بھی اسلامی دانش گاہ کے فارغین ومتوسلین کا دائمی شعار اور ان کا سب سے گرانقدر مقصد نبوت اور اس کے طریقۂ کار کا ہر فکر و فلسفہ، مذہب ومسلک، فکر کے ہر ڈھنگ، زندگی کے ہر رنگ اور انسانیت وتمدن کے ہر آہنگ پر ترجیح دینا اور اسے برتر سمجھنا چاہئے۔ یہ بنیادی ذمہ داری ان تمام علمی مطالبات اور مشغولیات سے زیادہ اہم اور مقدم ہے جن کی طرف مسلم دانش گاہیں اور جامعات توجہ کرتی ہیں۔"

اور مقام وجگہ کی مناسبت سے یہ بھی واضح کیا کہ:

"ان پہلوؤں سے بھی یہاں کی مؤقر مجلسوں کا آغاز جس کا آج پہلا دن ہے، اسی گفتگو سے ہونا چاہئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر، اسلام کا گہوارہ، ایمان کا مرجع، وحی کا مہبط و ماوی اور نبوت کے طویل سفر اور عظیم تاریخ کی آخری منزل ہے۔" (منصب نبوت: ص ۱۹-۲۰)

دوسرا خطبہ: "انبیائے کرام علیہ السلام کی امتیازی خصوصیات اور مزاج ومنہاج"

اس میں مقام نبوت کو سمجھنے پر خود ساختہ اصطلاحات کا ظلم، قرآن کے مخلصانہ وعمیق مطالعہ کی ضرورت، انبیاء اور دوسرے رہنماؤں کا بنیادی فرق، انبیاء کی دعوت میں حکمت و تیسیر، دعوتِ انبیاء کا سب سے اہم رکن دعوت توحید، شرک کی بیخ کنی، مظاہر شرک سے برأت، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام اور قرآنی اصطلاحات، دعوت انبیاء میں عقیدۂ آخرت کا اہتمام اور زور، نصیحت اور موعظت کا اصل محرّک کیا ہونا چاہئے؟ عقیدۂ آخرت کا اثر انبیاء کے متبعین پر اعمال کی غایت، آخرت میں سزا یا جزا، نبوی واصلاحی دعوتوں کا فرق، ایمان بالغیب کا مطالبہ اور ایمان بالظاہر، تکلفات سے پرہیز اور فطرت سلیمہ پر اعتماد، اہم مضامین وعنوانات تھے۔

تیسرا خطبہ: "ہدایت کے امام اور انسانیت کے قائد"

جس میں خود ساختہ رہنماؤں کا انسانیت کے ساتھ مذاق، انبیاء کی ضرورت، انبیاء کا

اپنی قوموں کو امانت داری، خیر خواہی اور اخلاص کی یقین دہانی، عصمت انبیاء کی حقیقت، انبیاء کیوں اطاعت کے حقدار ہیں؟ شعائر اللہ کی حقیقت، ابراہیمی محمدی تہذیب، جذبۂ محبت کی تاثیر، عالم اسلام اور ممالک عربیہ کے حوادث اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوتھا خطبہ: ارادۂ الٰہی اور اسباب مادّی“

جس میں مادّی اسباب کے سلسلہ میں انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخالفین کا فرق اور قرآن مجید میں اس کی تصویر کشی، مادی اسباب کے ذاتی تاثیر کے خلاف چیلنج، مادی ذہنیت کے خلاف چیلنج، قصۂ یوسف علیہ السلام اور سیرت نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم میں مماثلت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیبی امداد اور عظیم مستقبل کی بشارت، قرآنی قصے داعیوں کی قوت و اعتماد کا سرچشمہ، ایمان و اطاعت مومن کا ہتھیار اور کامیابی کی کنجی اور انبیاء کی سیرت سے وابستگی میں امت مسلمہ کی روشن مستقبل کو پیش کیا گیا۔

پانچواں خطبہ: ”رسالت محمدیؐ کی عظمت“

اس میں پہلے عصرِ جاہلی کا المیہ، قبل از بعثت نبوی اخلاقی انحطاط و زوال، انسانی حقوق کی پامالی، علم صحیح کا فقدان، طلب صادق، علم صحیح کا فقدان اور قوی ارادۂ خیر کی کمی، حق کی حامی و ناصر جماعت کے فقدان کو بیان کرنے کے بعد آفتاب رسالت کے طلوع کی ضرورت کو بتایا گیا، اور واضح کیا گیا کہ جاہلی ماحول میں تبدیلی نبی کی لائی ہوئی عالمگیر دعوت ایمانی ہی سے ممکن تھی، اور بعثت محمدیؐ کی انقلابی تاثیر بتائی کہ اس سے یکایک اس مردہ انسانی جسم یعنی انسانی معاشرہ میں روح حیات دوڑنے لگی، چنانچہ اس کا ایک بڑا اثر یہ بھی ظاہر ہوا کہ عرب بت پرستی سے نکل کر توحید کے سب سے بڑے داعی بن گئے، دنیا کے فاتح بن گئے کہ قیصر و کسریٰ کے نظام اور فراعنۂ مصر کے کارنامے نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دنیا میں صبحِ سعادت کے طلوع سے ماند پڑ گئے، چنانچہ بعثت محمدیؐ نے اس جاہلی ماحول کو یکسر بدل دیا اور متمدن دنیا میں ایمان و خدا طلبی، جہاد و سعی آخرت، انسانیت کو اس

کے دشمنوں سے بچانے، قوموں کو زوال کے بعد عروج اور لوگوں کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں اور دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی وسعت بے کراں اور مذاہب کے ظلم و جور سے نکال کر اسلام کے عدل کی طرف لانے کی طاقتیں اٹھ کھڑی ہوئیں، اور پوری دنیا کی انسانیت میں ایک ہلچل مچ گئی، اور پھر بتایا کہ امت محمدیؐ پوری کی پوری سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ عظیم ہے۔

چھٹا خطبہ: ''نبوت محمدی کا کارنامہ''

جس میں انسان کی اہمیت، انسانی فطرت کے اسرار و عجائبات اور ان بنیادوں سے بحث کی گئی جن پر اسلامی معاشرہ قائم ہوا، اور بتایا گیا کہ رسالت محمدیؐ کا اثر صرف اسی معاشرہ پر نہیں رہا جو معاشرہ سامنے تھا، بعد کی نسلوں اور صدیوں پر اس کا اثر پڑا جو برابر متعدی ہے، اور اس کے لیے زمان و مکان کے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے کہ آپ کی نبوت ہر زمان و مکان کے لیے، ہر قوم و نسل کے لیے ہے، پھر نمونے کے طور پر مختلف ادوار کا جائزہ لیتے ہوئے درسگاہ و تربیت گاہ نبویؐ کے عالمگیر و ابدی نمونوں میں سے کچھ نمونے پیش کیے، جو صرف ائمہ دین کی ہی سیرت میں نظر آتے ہیں اور فاتحین و سلاطین و امراء کی بھی زندگیوں میں اس کا عکس نظر آتا ہے۔

ساتواں خطبہ: ''ختم نبوت''

جب منصب رسالت و نبوت اور اس کے عالی مرتبہ حاملین اور ان کے خاتم و مکمل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کے اہم پہلوؤں اور گوشوں پر بات اچھی طرح سامنے آگئی تو اس کا اختتام ختم نبوت اور آنحضور ﷺ کے خاتم النبیین ہونے پر کتاب و سنت، تاریخ و ادیان و ملل، مذاہب کے تقابلی مطالعہ اور فلسفہ، اجتماع و تمدن کے بدیہی اصولوں اور طویل تحریروں کی روشنی میں گفتگو کی گئی، اس لئے یہ موضوع اختیار کیا اور آٹھواں اور آخری خطبہ اسی کا تتمہ تھا۔

عالم عربی کی فکری بساط پر رونما ہونے والے پرُ خطر حالات

ہندوستانی دینی مدارس میں جو نصاب تعلیم رائج رہا ہے، اس میں فلسفہ، و منطق کو

زیادہ اہمیت دی گئی اور عالم عربی کے نصاب میں فکری و عملی پہلو کو نظر انداز کیا گیا، اس کے نتیجہ میں فکری کشمکش پیدا ہوئی اور دوسری طرف زبان وادب جو ایک معاشرے کے درمیان قرب وتعلق کا ذریعہ ہوتا ہے، اس میں کوتاہی تھی، عربی زبان جو مرکز اسلام اور قرآن وحدیث کی زبان ہے، اس سے ربط وتعلق بہت ہی کمزور تھا، جس کی وجہ سے ہندوستانی علماء کے بلند علمی مقام اور پُر اثر شخصیتوں سے عرب علماء زیادہ واقف نہیں ہو پاتے تھے، حالانکہ ہمارے ہندوستانی علماء علمی ودینی خصوصیات کے حامل ہوتے تھے، لہٰذا ہندوستان کے ممتاز علماء نے اس کمی کو محسوس کیا اور حالات وضرورت کے تقاضے کے مطابق نصاب میں اصلاح وترمیم کی دعوت دی، جو ندوۃ العلماء کے نام سے ایک تحریک بنی اور شروع میں اس کو عملی طور پر ترقی دینے میں کمی ہوئی اور اس کمی کے اثرات ونتائج بھی پڑے لیکن بتدریج اس تحریک نے اثر ڈالا جو بعد میں ندوی علماء کے کاموں میں نظر آتا ہے، خود مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو جو اساتذہ ملے وہ نئے نصاب تعلیم کے بھی تھے، اور رائج نظریہ تعلیم کے بھی، اس طرح ان کی تربیت ان دونوں لائنوں میں ہوئی۔ ان کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کی خصوصیت میں تاریخی ذوق نمایاں تھا، جس کے اثر سے ان کے گھر میں کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا، ان سارے اسباب نے مولانا کی شخصیت سازی میں بڑا اثر ڈالا، اور عربی زبان کی اچھی صلاحیت ہونے کی بناء پر جدید عرب مفکرین اور قدیم علمی سرمائے سے استفادہ وتعلق نے عالم اسلام کی فکری اور ملی حالات سے اچھی واقفیت پیدا کرائی اور اپنے ہندوستانی بزرگوں سے تعلق کی بناپر دعوتی مزاج بنا جس کی بناپر حضرت مولانا کو عالم اسلام کی صحیح صورت حال سے اچھی واقفیت حاصل ہوئی، اور جو فاسد رجحانات محسوس ہوئے ان کے ازالہ کی فکر ابھری، اور انہوں نے اپنی عربی اور نظری صلاحیتوں سے اثر ڈالنے کو ضروری سمجھا، جو ان کی تصنیفات میں پوری طرح نمایاں ہے اور جس کو پورا عالم اسلام خاص طور پر عالم عربی جانتا اور مانتا ہے، اور جو ان کی کتاب ’’ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین‘‘ سے سمجھا گیا اور بہت قدردانی کے ساتھ لوگوں نے اس کو تسلیم کیا اور ہندوستان میں خاص طور پر ان کے حضرت سید احمد شہید کے طریقۂ عمل ودعوت کو باقاعدہ

تعارف کرانے میں ظاہر ہوا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں عالم عربی میں رائج فکری ودینی حالات کے ابھرنے کے اثرات بھی ظاہر ہونے لگے تھے، جس نے اخوان المسلمون کی تحریک کو ابھارا، اور اس کے شیخ وبانی شیخ حسن البناء شہید نے غیر معمولی اثر ڈالا، اس وقت عالم عربی کا علمی وفکری مرکز مصر تھا، اور وہاں اسی طرح انگریزوں کی حکومت تھی جس طرح ہندوستان میں تھی اور انگریزوں کی حکومتی پالیسی مشرقی قوموں کو اپنے ماتحت میں رکھتے ہوئے پورا فائدہ اٹھانے کی تھی اور اس میں وہ بڑے ذہین اور مشاق تھے، اور آزادی کی تحریک کے سلسلہ میں ان کا رویہ بہت ہوشیاری اور کامیابی کا تھا، انہی حالات میں مصر میں اور مصر کے ماتحت علاقوں میں اخوان المسلمین کی فکر پھیل گئی، اخوان المسلمون کی فکر کے دو پہلو تھے، ایک پہلو نظری اور دعوتی تھا، جسے ملت اسلامیہ کے سارے دانشور قابل تائید سمجھتے تھے اور دوسرا پہلو ان کا سیاسی یعنی حکومت سے ٹکراؤ کا تھا جس سے دعوتی ذہن کے لوگوں کو اختلاف تھا، اس دوسرے پہلو کے اثر سے ان کی تحریک کو نقصان پہونچا، ان میں حکومتی حلقہ سے مؤثر شخصیتوں میں سے نجیب اور جمال عبدالناصر ملے، اس میں نجیب میں اعتدال تھا اور ناصر میں اپنی شخصیت کا احساس تھا ،دونوں کے موازنہ عمل میں ناصر کو کامیابی ملی اور حکومت میں آنے پر ناصر کا رویہ اپنے کو ظاہر کرنے کا ایسا بڑھا کہ حکومت اور اخوان کے درمیان ٹکراؤ نے دین وسیاست میں ٹکراؤ بنادیا، جس کے نتیجہ میں اخوانی سربراہ شیخ حسن البناء کی شہادت پیش آئی جو فاروق کا زمانہ تھا اور حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کا سابقہ شیخ حسن البنا کے بعد کے لوگوں سے پڑا، ان کے جن قریبی لوگوں سے ان کی ملاقات ہوئی، ان کو اپنی فکر اور دینی عمل میں بہت ممتاز پایا اور مصر کے سفر ۱۹۵۱ء میں انہوں نے اس کا مشاہدہ کیا اور اس کو سراہا، جن میں شیخ بہی الخولی، شیخ حسن الہضیبی، شیخ محمد الغزالی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں اور خود ان کے والد شیخ عبدالرحمٰن البناء سے ان کی اچھی ملاقات رہی تھی۔

دیکھا جائے تو اخوان کا اصلاحی عمل تو بہت زبردست نتائج کا رہا مگر سیاسی طور پر ان کو اپنے نظریات میں کامیابی نہ ملی، بلکہ انہیں نقصان اٹھانا پڑا، مولانا نے ٹکراؤ کی پالیسی و

نظریہ کی مخالفت کی تھی اور ایمان اہل اقتدار تک پہنچانے اور ان سے تعلق پیدا کر کے ان کے ذہنوں میں ایمان راسخ کرنے کی حکمت عملی کو اختیار کرنے کی ترغیب دی تھی جس کا تجربہ ہمارے نقشبندی مشائخ نے مختلف ادوار میں کیا اور یہ کامیاب رہا جیسے حضرت خواجہ عبیداللہ احرار، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی وغیرہ کی مثالیں ہیں۔

عالم عربی کے فوجی حلقوں میں دینی نظریات کے لوگوں کو کچلنے کا طریقہ اختیار کیا گیا اور اس میں جمال عبدالناصر کا کردار سب سے خراب رہا، اور ان کے بعد بھی مصر میں انوارالسادات، اور پھر حسنی مبارک کے دور میں سامنے آیا، اور عراق میں سب سے زیادہ صدام حسین نے یہ فکر اختیار کی اور اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے یہی کردار پیش کیا، اور شام میں حافظ الاسد نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور دینی حلقہ کے لوگوں کو ملک چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں پناہ لینی پڑی، خاص طور پر سعودی عرب نے اس میں بڑی کشادہ دلی سے کام لیا، اور ان ملکوں کے علماء و دانشوروں اور تعلیم یافتہ لوگوں کو جن کا دینی مزاج تھا، اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے کا موقع ملا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے جو فکر پیش کی اور اس سلسلہ میں جو قلمی جہاد کیا اس میں ان کے رفقاء و معاونین نے بھی پورا حصہ لیا، جو خاص طور پر ان کے فاضل بھتیجے مولانا سید محمد الحسنی اور بھانجوں میں دیکھا جا سکتا ہے اور حضرت مولانا کی تصنیف ”الصراع بین الفكرة الإسلامية والفكرة الغربية فی الأقطار الإسلامية“ (مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش) میں اس کی تفصیل ملاحظہ کی جا سکتی ہے جس میں عالم عربی کے حالات کا اچھا تجزیہ آ گیا ہے۔

۱۹۶۴ء کے سفر یورپ کے چند تاثرات

اسلامک کلچرل سنٹر لندن

لندن کا میرا پہلا سفر ۱۹۶۴ء میں ہوا، لندن میں اس وقت مسلمانوں کی کئی کمیٹیاں

دینی کام انجام دے رہی تھیں ان میں ایک تو اسلامک کلچرل سنٹر ہے جس کے پاس ایک عمدہ کئی منزلہ عمارت ہے جس میں نماز اور جلسوں کے لیے دو ہال ہیں، نیز سنٹر کے ثقافتی، دینی اور اقامتی ضرورتوں کے لیے متعدد کمرے ہیں، سنٹر کے سربراہ ڈاکٹر محمد عوضی بدوی ہیں جو جامعہ ازہر کے فاضل اور کسی اسلامی موضوع پر پی. ایچ. ڈی بھی ہیں، یہ سنٹر لندن میں مشہور اسلامی شخصیات کی آمد پر نیز اہم مذہبی موقعوں پر جلسے منعقد کرتا ہے جس میں لندن وقرب وجوار کے مسلمان آپس میں ملتے اور ایک دوسرے سے تعارف بھی حاصل کرتے ہیں۔ ۱۰/اکتوبر ۶۴ء کو مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے قیام لندن سے بھی فائدہ اٹھاتے ہوئے سنٹر نے ایک جلسہ منعقد کیا، جس میں عام طور پر مشرقی ممالک سے آئے ہوئے مسلم طلباء شریک ہوئے، مولانا نے پر جوش لہجے کے ساتھ ان کو خطاب کیا اور ان کو ان کا اسلامی فرض یاد دلایا، مولانا نے اپنی اس تقریر میں خاص طور پر اس نکتہ کی طرف متوجہ کیا کہ کچھ عرصے سے مشرقی ممالک کی قیادت ان ہی افراد کے ہاتھوں میں آتی رہی ہے جو یورپ سے علوم حاصل کرتے ہیں اور مغرب کے ماہرین تعلیم وتربیت کے آغوش میں تربیت حاصل کرتے ہیں، اس بنیاد پر میں یہ پیشین گوئی کر سکتا ہوں کہ آپ مشرقی ممالک کے ہونے والے قائد ہیں اور اس بنیاد پر میں آپ کو توجہ دلاتا ہوں کہ اسلام کے سلسلے میں آپ کی بڑی ذمہ داری ہے، مشرق کی مسلمان نسلوں کو ان کے دین پر باقی رکھنے اور اسلام پر ان کے اعتماد کو بحال رکھنے کا فرض آپ ہی کو انجام دینا ہے، اور اگر آپ نے اس کوشش میں کامیابی حاصل کر لی تو آپ مشرق کے تمام موجودہ عظیم لیڈروں سے زیادہ بڑے لیڈر ہوں گے، تقریر بہت توجہ سے سنی گئی اور حاضرین نے اپنے تاثر کا اظہار کیا، یہ سنٹر لندن میں ہونے اور اچھے وسائل رکھنے کے باوجود افسوس ہے کہ وہ خدمات انجام دینے سے تاحال قاصر ثابت ہو رہا ہے جو خدمات اس سے متوقع یا اس کے لیے آسان ہیں، خود ڈاکٹر عوضی کی صلاحیتیں بھی محسوس طریقے سے بروئے کار نہیں آ رہی ہیں، سنٹر کی نگرانی اور اخراجات کا تکفل مسلمان حکومتوں کے ذمے ہے، خصوصاً مصر کا حصہ اس میں سب سے زیادہ ہے اور شاید سنٹر کی سست عملی میں اس کو بھی بڑا دخل ہے کیوں کہ سنٹر کی جدوجہد مصر کی حمایت وسیاست سے ہٹ کر نہیں چل سکتی ہے۔

ایسٹ لندن ماسک

لندن میں دوسرا دعوتی مرکز ''ایسٹ لندن ماسک'' ہے، یہ دراصل تبلیغی جماعت کا مرکز ہے، یہاں کام کا نہج تقریباً وہی ہے جو ہندو پاک کی تبلیغی جماعتوں کا ہے، یہاں مولانا علی میاں ندویؒ کی کئی تقریریں ہوئیں، جن سے وہاں جمع ہونے اور کام کرنے والوں نے خاصا تاثر لیا اور فائدہ اٹھایا، یہاں مولانا نے اپنی ایک تقریر میں مسلم اقامت خانوں کی تجویز رکھی جس کو بہت پسند کیا گیا اور وہاں بعض مالکان جائداد حضرات نے اس میدان میں اقدام اٹھانے کا ارادہ بھی کرلیا، مسلم اقامت خانوں کا مسئلہ یورپ کی بے دین زندگی میں بڑا اہم مسئلہ ہے، یہ سرزمین جو دینداری اور روحانیت کے ہر اثر سے خالی ہے، نہ صرف یہ کہ وہاں کے اصل باشندوں میں دینی روح پیدا نہیں کرسکتی؛ بلکہ وہاں آکر کچھ وقت گزارنے والے اہلِ دین کو بھی دینی لحاظ سے بالکل مفلوج بنا دیتی ہے، وہ سرزمین جس میں طہارت اور حلال غذا دشوارترین مسئلہ بن جاتی ہو، کسی بھی پابند دین شخص کے لیے نہایت پریشان کن اور کمزور آدمی کے دین کے لئے تباہ کن ہے، ہم سے خود متعدد ہندوستانی مسلمانوں نے بتایا جو وہاں کچھ عرصے سے مقیم ہیں کہ ان کو شروع شروع میں حرام غذا سے بچنے کے لئے فاقے تک کرنے پڑے اور زحمتوں سے تو اب تک نجات نہیں ملی ہے، انہوں نے نہایت تکلیف کے انداز میں بتایا کہ وہاں ہندوستان میں بڑا شہرہ سنتے تھے کہ لندن میں بڑی آسائشیں ہیں، بڑا آرام ہے اور زندگی کی ہر طرح کی سہولتیں ہیں لیکن یہاں آکر تو ہم مرگئے، ہر چیز حرام، ہر چیز مشکوک یا تو اپنے دین سے صرف نظر کریں اور آرام اٹھائیں اور دین کو بچائیں اور سہولتوں سے محروم رہیں، گوشت تو غیر ذبیحہ ہونے کی وجہ سے نہیں کھا سکتے، ترکاریاں اور دوسری غذائیں بھی حرام چربی کی وجہ سے ناقابل تناول ہو جاتی ہیں، حتیٰ کہ بسکٹوں میں بھی غیر ذبیحہ جانور یا خنزیر کی چربی ڈالی جاتی ہے، اور حد یہ ہے کہ تحقیق سے پتہ چلا کہ ڈبل روٹی میں بھی کسی نہ کسی حد تک اس چربی کی آمیزش کی جاتی ہے۔

کھانے کی مصیبت

کھانے کا مسئلہ پورے یورپ میں ایک مسلمان کے لیے بڑا اہم مسئلہ ہے، البتہ لندن میں کچھ گنجائش نکل آئی ہے، مثلاً یہ کہ شہر میں بعض جگہ ذبیحہ ہونے لگا ہے لیکن وہ بعض وقت حلال گوشت کے طلبگار کے لیے اس قدر دور پڑتا ہے کہ وہ اس سے صرف نظر کر لینے پر ہی مجبور ہو جاتا ہے، اس میں ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ بعض مسلمان دوکانوں پر غیر ذبیحہ گوشت ذبیحہ کے نام سے بکتا ہے۔ نیز وہاں مقیم مسلمان بہت شاذ و نادر گوشت کے معاملے میں احتیاط کرتے ہیں، حرام چربی کا مسئلہ بھی بڑا سخت مسئلہ ہے۔ یورپ میں چربی گھی تیل کی جگہ استعمال کی جاتی ہے، اس لیے مشکل سے کوئی کھانے کی چیز اس چربی سے بچتی ہے۔ لیکن پھر بھی بہت سے ہندوستانی پاکستانی بھائی احتیاط پر تاحال قائم ہیں، ایک ہندوستانی طالب علم بھائی سرور صاحب نے لندن میں ایک بیکری کی دوکان ایسی معلوم کر لی ہے جہاں بجائے چربی کے تیل کا استعمال ہے، سرور صاحب ان کے ساتھ مرتضٰی صاحب اور دوسرے رفقاء ڈبل روٹی تک اسی دوکان سے لیتے ہیں، دوسری دوکانوں سے نہیں خریدتے، جنیوا میں ''اسلامک سنٹر'' والوں نے ایک نئی تدبیر نکال لی ہے، وہ یہ ہے کہ سنٹر کے اہم رکن الاخی صالح باسلامہ اور ان کے بعض ساتھی جنیوا کے مذبح گئے اور انہوں نے اس کے منیجر سے یہ بات کی کہ ہم کو آپ صرف اس کی اجازت دے دیں کہ ہفتے میں ایک جانور بجائے آپ کے طریقے کے ہم اپنے ہاتھ سے اپنے طریقے سے ذبح کر لیا کریں، پھر پورا جانور ہم آپس میں تقسیم کر لیں گے، وہ اس پر راضی ہو گیا اور اب یہ لوگ اس گوشت کو ریفری جریٹر میں رکھ کر استعمال کرتے ہیں۔

یورپ میں خنزیر کی مصیبت بھی بڑی سخت مصیبت ہے۔ کسی مغربی کو سمجھانا کہ ہم خنزیر سے پرہیز کرتے ہیں، بڑا مشکل ہے، وہ اس صورت کو نہیں سمجھ پاتے، اور سور کی کسی نا کسی چیز سے کسی نہ کسی کھانے کو آلودہ کر دیتے ہیں، جرمنی میں تو سور تہنیت و تبریک کا محاورہ بن گیا

ہے، جب کسی کو کسی محبوب چیز کے حصول پر مبارک باد دیتے ہیں تو کہتے ہیں تم کو سور ملا۔

آخر میں ایک ہندوستانی بھائی اسد اللہ بیگ کہنے لگے کہ جب ایک مضمون میں ہم کو بڑے اچھے نمبر حاصل ہوئے تو ہمارے استاد نے کہا کہ تم کو سور ملا تو میں نے ان سے کہا کہ آپ کے یہ کہنے سے ہمیں کوئی مسرت نہیں ہوسکتی، آپ یہ کہتے کہ تم کو گائے ملی، بکری ملی یا کوئی اور جانور ملا تو ممکن ہے میں خوش ہوجاتا لیکن سور کا ملنا میرے لئے کوئی خوشی کی بات نہیں ہوسکتی۔

اسلامی اقامت خانوں کے قیام کی ضرورت

کھانے کی مصیبت کے علاوہ تربیت و تعلیم میں دین سے مکمل دوری اور انقطاع یورپ کی زندگی میں ایک لازمی امر ہے، اس ماحول میں آدمی برسوں تک اللہ کا نام تک سننے سے محروم رہتا ہے۔ دین پر عمل کرنا تو بڑی بات ہے۔ ایک ہندوستانی مسلمان جو وہاں تیس برس سے مقیم ہیں اور جن کی اولاد سن شعور اور بلوغ دونوں تک وہیں پہونچی، کہنے لگے کہ میں پوری قوت کے ساتھ اور اپنے تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ آدمی صرف اپنی ہی نسل کو نام کا مسلمان باقی رکھ سکتا ہے، اس کے بعد اس کی دوسری نسل اس سے بھی گئی گزری نکلے گی۔ یہی وہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر یورپ کی زندگی میں نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر ہو سکے اسلامی اقامت خانے قائم کئے جائیں جس میں کم سے کم ضروریات زندگی اور عادات مسلمانوں کے اصول اور تقاضوں کے مطابق مہیا ہوں تا کہ آدمی حلال غذا اور کسی نہ کسی درجے کا اسلامی ماحول تو پا سکے۔

یورپ کی زندگی کا ایک بڑا خلا

یورپ کی زندگی کی ایک دوسری بڑی مصیبت یہ ہے کہ وہاں کسی کے پاس اپنے کام سے فاضل وقت نہیں ہے، زندگی کی مصروفیت اور فاصلوں کی زیادتی کی وجہ سے آپس میں رابطہ بھی بہت کم ہے، بھائی بھائی کے لئے اور دوست دوست کے لئے قابل لحاظ حد تک توجہ نہیں صرف کرسکتا، اگر کوئی بیمار ہو تو اسپتال جائے یا خود اپنی تیمارداری کرے، کسی کو دوستوں و عزیزوں کی ہمدردی کی ضرورت ہو تو صبر کرے اور اپنا دل مضبوط بنائے۔

دنیاوی لطف ومنفعت مقصد حیات

یورپ کی ساری دلچسپیوں اور تعلقات کا سرچشمہ صرف دنیاوی لطف ومنفعت اور آمدنی ہے، مادی اقدار کو اولیت حاصل ہے، انسانی اقدار کا درجہ اس کے بعد آتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ظاہری اور تہذیبی اخلاق پوری طرح پایا جاتا ہے، وہاں کا آدمی بات توجہ سے سنے گا اور ٹھکانے سے جواب دے گا، کام اگر اس کو کرنا چاہئے اور کر سکتا ہے تو ضرور تندہی اور خوبی کے ساتھ کرے گا، ممنونیت کے الفاظ بھی ضرور استعمال کرے گا، یہ باتیں یقیناً بہت اچھی، ہیں افسوس ہے کہ ہمارا موجودہ مشرق ان سے خالی ہے، یورپ میں ظاہری صفائی اور آراستگی اور ستھرائی اپنے عروج پر ہے، وہاں معمولی معمولی جگہوں پر وہ پذیرائی اور طرز ملتا ہے جو مشرق کے اعلیٰ معیار کے علاقوں میں بھی مشکل ہے، لیکن وہ اپنے جسم کی صفائی کے لیے پانی بالکل نہیں استعمال کرتے، غسل بھی تقریباً معدوم ہے، اکثر آدمی مہینوں اور برسوں نہیں نہاتے، پیشاب پاخانے کے لیے تو صرف کاغذ ہی چلتا ہے، ایک مسلمان کے لیے یہ بڑی مصیبت ہے کہ ایسی جگہ وہ استنجے کے لیے بھی پانی نہیں پاتا اور کاغذ سے صفائی کی اس کو عادت نہیں ہوتی، پھر مسلسل کرنا تو کراہیت کا باعث بھی بنتا ہے۔

عرب طلبہ کی کوششیں

جرمنی میں جو عرب طلبا پڑھتے ہیں، انہوں نے ایک ''آل یوروپین اسلامک اسٹوڈنٹس فیڈریشن'' قائم کر رکھی ہے اور پورے یورپ میں اس کا ایک جال بچھا رکھا ہے، اس کی پورے یورپ میں سو سے زیادہ شاخیں ہیں، اس کی عاملہ اور رعہدیداران کا سالانہ انتخاب ہوتا ہے اور اس کا صدر دفتر ہر سال وہاں منتقل ہو جاتا ہے جہاں اس کا نومنتخب سکریٹری زیر تعلیم ہوتا ہے، سال رواں اس کے سکریٹری ایک شامی طالب علم نعمان انیس ہیں، یہ جرمنی کے مشرقی شہر آخن میں زیر تعلیم ہیں، سال رواں آخن ہی میں اس یونین کا مرکز ہے، مولانا کے آخن جانے پر انہوں نے اپنے رفقاء کو جمع کیا، اس اجتماع میں مولانا نے مؤثر خطاب کیا، آخن میں

یہی طلبہ ایک مسجد بھی تعمیر کر رہے ہیں جس کی پہلی منزل اس وقت تک بن چکی ہے، یہ منزل کتب خانہ مہمان خانہ اور دوسرے لوازمات پر مشتمل ہے، دوسری منزل نماز کے لئے مخصوص ہوگی، اس تعمیر پر بڑا خرچ آرہا ہے لیکن یہ طلباء پورے جوش و ہمت کے ساتھ رقم اکٹھا کرتے ہیں اور تعمیر میں لگاتے ہیں، آخن کے ٹیکنکل انسٹیٹیوٹ میں بڑی خاصی تعداد میں مشرقی اور مسلمان طلباء زیر تعلیم ہیں، ان میں ترکوں کی خاصی بڑی تعداد ہے۔

میونخ کی یونیورسٹی میں معلوم ہوا کہ ۱۰ فیصدی طلبہ مشرقی ملکوں سے آئے ہوئے ہیں اور مسلمان ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان میں بہت قلیل تعداد دین کا شوق رکھتی ہے۔

برلن یونیورسٹی میں بھی عرب طلباء کی قابل لحاظ تعداد زیر تعلیم ہے۔ جس میں متعدد طلباء دعوتی جذبہ سے سرشار ہیں، ان کے ایک فرد خالد قمیحہ اور ان کے متعدد ساتھیوں نے اپنی ایک انجمن بنا رکھی ہے، ان ہی کی کوششوں اور توجہ سے مولانا کی تقریر برلن یونیورسٹی ہال میں ہوئی جس کا جرمن ترجمہ ایک نو مسلم جرمن طالب علم نے پڑھ لیا، جرمن نوجوان ان ہی افراد کے جذبہ و اخلاق دیکھ دیکھ کر خود بخود اسلام کا حلقہ بگوش ہو گیا ہے اور اپنے اسلام پر پختگی کے ساتھ کئی سال سے قائم ہے اور اپنے اس حال پر مسرور بھی ہے۔

یورپ میں مشرقی ممالک کے مسلمان طلباء اگرچہ خاصی بڑی تعداد میں موجود ہیں لیکن ابھی تک یورپ کے اصل باشندے اسلام سے بہت ہی کم روشناس ہوئے ہیں۔ یورپ کے مختلف شہروں میں صرف اکا دُکا ایسے مسلمان پائے جاتے ہیں جو ان ملکوں کے اصل باشندے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی بڑی وجہ مسلمان طلبہ کی کوتاہی ہے، اگر یہ طلباء اپنے دین کے فرائض پر قائم رہیں اور اسلامی آداب و اخلاق اور انسانیت کا صحیح مظاہرہ کریں تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان کے ساتھ رہنے والے مغربی باشندے اور ان کے مغربی رفقاء متاثر ہوں گے اور کم سے کم درجہ یہ ہے کہ اسلام کی خوبی کو سمجھیں گے اور اس کے متعلق صحیح نظریہ قائم کریں گے، لیکن افسوس ہے کہ یہ طلباء زیادہ تر ان ہی آلودگیوں میں پوری طرح ملوث ہوتے ہیں جن میں ان کے مغربی ساتھی ملوث ہیں۔

جرمن قوم میں دعوت کا کام

یورپ کی قوموں میں اور خاص طور پر جرمن قوم میں مذہب کے معاملے میں ایک خاص سادگی پائی جاتی ہے اور ہٹ دھرمی بہت کم ہے، اگر ان کے سامنے اسلام کی اچھی اور صاف تصویر آئے تو بہت امید معلوم ہوتی ہے کہ وہ اسلام کے لئے اپنے دل و دماغ کی کھڑکیاں بند نہ کریں گے۔

جنیوا کا اسلامک سنٹر

جنیوا میں اسلامک سنٹر کا کام اس سلسلے میں خاصا قابل تعریف ہے، وہ خاموشی اور اخلاص کے ساتھ یورپ میں اسلام کے انسانی اور اخلاقی پہلوؤں کو پیش کرنے کا کام انجام دے رہا ہے، وہ اب تک یورپ کی متعدد زبانوں میں مفید رسائل کا ایک سلسلہ شائع کر چکا ہے جو اپنے مواد اور عمدہ طباعت کے لحاظ سے قابل تعریف حد تک اچھے ہیں، ان رسائل کے مصنفین عالم اسلام کے چیدہ علماء اور محقق ہیں، اس کے علاوہ اسلامک سنٹر نے اپنے ذمہ ان مشرقی مسلمان طلباء کو دینی غذا پہنچانے کا کام بھی لے رکھا ہے جو یورپ کے لادینی سمندر میں غوطے کھا رہے ہیں اور ان کو دینی سہارا نہیں مل پاتا، اللہ تعالیٰ دین کی جدوجہد کرنے والوں کی مدد فرمائے اور دوسروں کو اس کی توفیق دے۔ آمین

ملت کے تحفظ کی دینی، تعلیمی، ملی، رفاہی اور سیاسی کوششیں

ہندوستان کی آزادی کے بعد ملک کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو ہوئے، جو ملک کی آزادی کے وقت کانگریس کے قائد تھے اور اس سے پہلے میقات میں مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس کے قائد (صدر) تھے۔ مولانا آزاد ایک بڑے قائد بھی تھے اور ان کو ملت اسلامیہ ہندیہ نے ''امام الہند'' کا خطاب بھی دیا تھا جس کو ملک کے ہر طبقہ نے اور سیاسی حلقوں نے بھی قبول کر لیا تھا۔ ان کا ندوۃ العلماء سے بھی تعلق رہا، اور ان کا تعلیمی و تربیتی دور کا ایک عرصہ ندوۃ العلماء میں گذرا تھا اور اس کے پہلے معتمد تعلیم علامہ شبلی نعمانی سے انہوں نے خصوصی استفادہ کیا تھا اور ان کی ادارت میں ''الندوہ'' میں ان کا تعاون رہا تھا، پھر ''الہلال''

کے ذریعہ انہوں نے ملی وسیاسی حلقوں میں غلغلہ بلند کیا، اس میں ان کے معاون علامہ سید سلیمان ندوی بھی تھے، کانگریس اور جمعیۃ العلماء میں اشتراک عمل تھا، البتہ جمعیۃ العلماء، سیاسی پارٹی نہیں تھی لیکن ملی معاملات کو لیتی اور سیاست میں رہنمائی کرتی تھی، جمعیۃ العلماء کے قائد شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھے، اور اس کے اہم رہنماؤں میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کا نام سب سے نمایاں تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور آخر میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ملتانی اس کے اہم قائدین میں تھے جو اس کے اجلاسوں میں نمایاں اور پیش پیش رہے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی نے بعض اجلاس میں صدارت بھی فرمائی، ہمارا خاندان بھی جمعیۃ سے وابستگی رکھتا تھا اور لکھنؤ کے جمعیۃ کے اجلاس میں ہمارے بڑے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء مجلس استقبالیہ کے صدر تھے اور خطبۂ استقبالیہ پیش کیا تھا، اور اس اجلاس کو کامیاب بنانے میں ندوۃ العلماء نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا تھا جو آزادی کے بعد پہلا بڑا اجلاس تھا، جس سے مسلمانوں کے پست ہورہے حوصلے بلند ہوئے، اور بڑی طاقت ملی، لیکن پھر مسلمانوں کو ایک بڑا جھٹکا حیدرآباد کے واقعہ سے لگا جب وزرات داخلہ نے نظام کی حکومت کے خلاف کارروائی کر کے اس میثاق کو ختم کیا جو نظام حیدرآباد کے ساتھ حکومت ہند کا قائم تھا، اور بڑی کارروائی کی جس سے مسلمانوں کا بڑا قتل عام ہوا، پھر زمینداری کو ختم کرنے کا ایکٹ لا کر ایک دوسری کارروائی پورے ملک میں کی گئی، یہ بھی ملت کے لیے بڑا اقتصادی سانحہ تھا اور یہ سب وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل کے اشارہ پر ہوا تھا، پھر ۱۹۴۹ء میں اجودھیا کے مسئلہ کو اس طرح ابھارا گیا کہ بابری مسجد کے اندر خاموشی سے مورتی رکھ دی گئی، اور جب اس کے خلاف ہنگامہ ہوا تو مسجد میں تالا توڈال دیا گیا مگر مورتی نہیں ہٹائی گئی، اس طرح ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا، مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت بہت باا ثر شخصیت ضرور تھی اور جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی سبھی ان کا لحاظ اور خیال کرتے تھے اور ملک کے پہلے وزیر تعلیم کے طور پر آج بھی ان کا یومِ وفات یوم تعلیم کے طور پر ملک بھر میں سرکاری طور پر منایا جاتا ہے، وہ اپنی سیاسی مصروفیات کے باوجود ندوۃ العلماء اور اس کے ذمہ

داروں اور فرزندوں سے گہرا تعلق رکھتے تھے اور وہ لوگ بھی انہیں اپنا اور ندوہ کا مایۂ ناز فرزند سمجھتے تھے، انہوں نے ایک بار ندوۃ العلماء کو سرکاری گرانٹ میں لے کر اس کو مرکزی تعلیمی ادارہ بنانا چاہا تھا مگر ندوہ کے ذمہ داروں کو یہ بات باعث تشویش محسوس ہوئی، اور ندوہ نے اپنے ایک ممتاز فرزند اور اہم رکن شوریٰ اور مولانا آزاد کے قریبی مولانا مسعود علی ندوی کو ان کے پاس بھیجا کہ وہ ان کو تشویش سے آگاہ کریں کہ ان تک معاملات کے صحیح رہنے کی توقع کی جاسکتی ہے مگر ان کے بعد کوئی ضمانت نہیں کہ کیسے حالات پیدا ہوں اور یہ ادارہ اپنا مقام کھو بیٹھے، اس لئے یہ ادارہ کے لئے ایک طرح کا خودکشی کا عمل ہوگا، مولانا مسعود علی ندوی نے بڑے اچھے اور اچھوتے انداز میں یہ بات مولانا آزاد کے سامنے رکھی، کہ ہم لوگ یہ سوچ رہے ہیں کہ ندوہ کے ذمہ داروں کے سامنے جو تختیاں لگائی جائیں تو کیا لکھا جائے، بانی ندوہ، ناظم ندوہ، حامی ندوہ، معاون ندوہ وغیرہ اور ہمارے اور آپ کے سامنے قاتل ندوہ لکھا جائے، مولانا آزاد نے کہا: بات کیا ہے بتایئے؟ مولانا مسعود علی ندوی بہت بے تکلف تھے، اور پُر مزاح تھے، انہوں نے پوری بات واضح کی، مولانا آزاد کو یہ بات اچھی لگی اور انہوں نے ملی خیر خواہی میں اپنی وہ تجویز واپس لے لی، جس کے نفاذ کا انہیں بلاشرکت غیرے پورا اختیار تھا، مولانا آزاد بلند قامت، بلند کردار، وضع دار، وجیہ و پرشکوہ شخصیت تھے، ان کو ندوہ میں دیکھا بھی اور ندوہ میں ان کا خطاب بھی سنا، لیکن ملاقات یاد نہیں، ۱۹۵۸ء میں ان کے انتقال سے پورا ہندوستان سوگوار ہوا، خود نہرو جو وزیر اعظم تھے، اپنے ان دیرینہ رفیق آزادی کی جدائی پر رو پڑے جن کے مشوروں کو وہ بہت اہمیت دیتے تھے، مسلمانان ہند کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ان کے سر سے سایہ اٹھ گیا اور ملت یتیم ہوگئی، ان کی خدمات کا مسلسل اظہار ہوتا رہا اور ایسا خلا ہوا جو ابھی تک پُر نہیں ہوسکا ہے۔

۱۹۶۴ء میں جواہر لال نہرو وزیر اعظیم ہند کا انتقال ہوا، انہیں بھی بڑی حد تک ان اقدار و روایات کا پاس و لحاظ تھا جو مسلمانوں کے ساتھ جنگ آزادی کی کوششوں میں مسلمان قائدین اور علماء کے ساتھ مشترک جدوجہد میں دیکھیں تھیں اور انہیں مسلمانوں کی قربانیوں کا بھی علم بلکہ مشاہدہ تھا، اقلیتوں کو ان کے وزارت عظمیٰ کے دور میں اپنے تحفظ کا احساس تھا مگر

فرقہ واریت کا زہر جو پھیلایا جارہا تھا، اس سے یہ خدشہ تھا کہ ان کے بعد یہ پاس ولحاظ قائم نہ رہ سکے گا، ان کے بعد عارضی طور پر ملک کے وزیر اعظم گلزاری لال نندا اور تین سال کے عرصہ کے لئے لال بہادر شاستری ہوئے، مگر یہ طاقتور لیڈر کے طور پر نہ ابھر سکے، سیاسی داؤ پیچ سے بھی اگر چہ یہ دور تھے۔ ۱۹۶۵ء میں پڑوسی ملک سے اختلاف اتنا بڑھا کہ جنگ تک کی نوبت آگئی، اور اس سے فرقہ وارانہ ذہن رکھنے والے طبقہ کو منافرت پھیلانے اور دشمنی بھڑکانے کا اور موقع ملا، اسی میں ایک بڑا فساد جمشید پور اور راوڑ کیلا میں بھڑکا، جس نے ہر باضمیر انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اس کے علاوہ مسلمانوں کو تعلیمی، اقتصادی میدان میں کمزور کرنے کے مسلسل عمل اور سازشوں کا کام بھی جاری تھا اس لئے ملت کے ہوشمند، فکر مند اور دردمند حضرات جمع ہوئے کہ ایسا نمائندہ اجتماع منعقد کیا جائے جس میں ہر مسلم جماعت و جمعیۃ کے نمائندے موجود ہوں، ندوۃ العلماء کے لئے اتفاق ہوا اور وہاں ۱۹۶۵ء میں لوگ جمع ہوئے، اس مشاورتی اجتماع کی صدارت اہم ملی وسیاسی رہنما ڈاکٹر سید محمود نے کی جو کانگریس حکومت کے وزیر بھی تھے، اور اہم وباثر شخصیت تسلیم کئے جاتے تھے، سبھی جماعتوں، اداروں، تنظیموں اور جمعیتوں کی اچھی وموثر نمائندگی رہی مگر جمعیۃ العلماء اور جماعت اسلامی کا نظریاتی اختلاف اس حد تک ابھرا کہ ایک پلیٹ فارم پر دونوں کا اجتماع ممکن نظر نہ آیا، بالآخر ڈاکٹر سید محمود اپنی نشست گاہ سے اٹھ کر قیام گاہ چلے گئے، اور خطرہ تھا کہ بلانتیجہ یہ اجتماع ختم نہ ہو جائے مگر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جو کہ اجتماع کے اہم داعی تھے، ڈاکٹر صاحب اور دوسرے حضرات کو اس طرح سمجھایا کہ سب پھر مل جل کر بیٹھ گئے اور آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا اور اس کے بانی صدر ڈاکٹر سید محمود قرار پائے۔ مجلس مشاورت کے اہم ارکان پر مشتمل وفد نے ملک کے اہم حصوں کے دورے بھی کئے اور مسلمانوں میں حوصلے بڑھانے کا کام کیا اور انہیں اس ملک میں قائدانہ اور مصلحانہ کردار پیش کرنے اور عام انسانی سلوک کے ذریعہ برادران وطن میں اپنی افادیت اور اہمیت بڑھانے اور اسلام کی حقانیت واضح کرنے کے کام پر بھی ابھارا، اس کے لئے مراسلات، ملاقاتوں، جلسوں، پروگراموں اور دوسرے ذرائع کے ذریعہ کام کرنے پر آمادہ کیا، اس میں اہم دورہ ریاست میسور کا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا تھا جو "بارہ دن

ریاست میسور" کے نام طبع ہو چکا ہے جس سے مشاورت کے اغراض و مقاصد اور اہداف کو سمجھنے میں بڑی حد تک مدد ملے گی۔

مگر افسوس یہ متحدہ پلیٹ فارم ڈاکٹر سید محمود کی وفات کے بعد اس طریقہ سے قائم نہیں رہ سکا جو اس کے آغاز اور اس کے دور اول کا طریقہ تھا، اور بعض اہم ارکان کی نا اتفاقی بعض امور و مسائل میں ایسی سامنے آئی کہ ان میں سے بعض کنارہ کش ہو گئے اور بعض نے کھل کر اپنا اختلاف ظاہر کیا، ایک اہم رکن ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی نے سیاسی مداخلت پر اتنا زور دیا کہ بالآخر اس پر بات ٹھہری کہ وہ الگ سے یہ کام کریں، مشاورت کے پلیٹ فارم سے یہ کام نہ کریں، اور کسی پارٹی کی صریح مخالفت اور نہ ہی کسی پارٹی کی صریح موافقت کی جائے، انہوں نے مسلم مجلس کی بنیاد ڈالی اور وہ بہت جلد ایک باا ثر سیاسی پارٹی کے طور پر ابھری اور اس نے ۱۹۷۷ء کے عام انتخاب میں برسر اقتدار پارٹی کو سبق سکھانے کے عمل میں اہم رول بھی ادا کیا، مگر یہ پارٹی بھی اپنے قائد کے حیات تک ہی اپنا بھرم قائم رکھ سکی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے پس پشت تائید کی کہ وہ سیاست میں حصہ لینے کو حرام نہیں سمجھ سکتے اور علماء کے ذریعہ بالواسطہ اور پس پشت رہنمائی کو مفید و مؤثر گردانتے تھے کہ علماء کا بذات خود حصہ لینا شاید مفید نہ ہو پھر بھی بعض ارکان نے اس کو اس اصول کے خلاف سمجھا کہ مشاورت سیاست میں حصہ نہیں لے گی تو اس کے بعض ارکان اس اصول کی کیوں خلاف ورزی کر رہے ہیں؟ مسلم سیاسی پارٹی کا قیام اور سیاست میں عمل دخل اور مسلمانوں کی دوسری سیاسی پارٹیوں میں شمولیت اختیار کر کے سیاسی عمل دخل سے دونوں نظریات آج بھی قائم ہیں اور اس کا اختلاف آج بھی باقی ہے۔

ایک بڑا ملی مسئلہ اقتصادی مسئلہ بھی درپیش تھا جو فسادات اور نوکریوں میں حصہ نہ دینے اور کاروبار کی صلاحیت کو کم کرنے، اور خوش حال مسلمانوں کی زمین و جائداد اور ذرائع آمدنی پر قدغن لگانے کا ایسا خاموش انداز سے جاری تھا جس کا بڑی حکمت عملی سے مقابلہ کرنے کی ضرورت کا مسلم علماء و قائدین کو شدید احساس تھا، اور اپنے اپنے طور اور سطح پر اس کی کوششیں بھی کی جا رہی تھیں، ایک کوشش ہمارے بعض احباب، دوستوں اور عزیزوں نے بھی

مقامی وعلاقائی سطح پر چلائی اور مسلم رفاہی سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا تاکہ ایک محفوظ جگہ رقم جمع ہوکر پسماندہ اور غریب طبقہ کی مدد کا سامان ہو سکے اور بلاسودی قرض سے لوگ فائدہ اٹھا سکیں، اس سلسلہ میں ہمارے احباب میں جناب اطہر حسین صاحب سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لکھنؤ، الحاج محمد کلیم اللہ خان، برادر عزیز مولانا سید محمد الحسنی مرحوم، مولانا سید محمد طاہر حسینی وغیرہ کے مشورے اور میٹنگیں بھی ہوئی تھیں اور ہم لوگ بھی شریک ہوتے تھے، ابھی یہ کام بحمد اللہ بند نہیں ہوا، اور اپنی سطح پر جو فائدہ پہونچایا جا سکتا ہے پہونچایا جا تا رہا ہے۔

ایک کوشش رابطہ اسلامی کے نام سے بھی کی گئی تھی جس میں کرنل ڈاکٹر محسن جلیل شمسی مرحوم بھی شریک تھے اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی حال مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی پیش پیش رہے، اس کا ایک بلیٹن انگریزی، عربی، اردو میں کچھ مدت شائع ہوا۔ اس کی وسیع اور عالمی صورت رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے قیام سے جب عمل میں آئی تو وہ اس خواب کی شاندار تعبیر تھی جو اپنے رسائل و ذرائع اور اسباب کی قلت اور ایک حد تک فقدان سے شرمندہ تعبیر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نیتوں اور جذبات کو دیکھتا ہے، اور اس کے خزانہ میں دینے کی کمی نہیں ہے کہ

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیئے حال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

ملی، دینی، رفاہی کاموں اور کوششوں میں جو دعوتی، تعلیمی، سیاسی اور ثقافتی و تربیتی و اصلاحی اس دور میں خاص طور پر لکھنؤ میں ظاہر ہوئیں اور جن سے بڑی بیداری پیدا ہوئی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی، محب مکرم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، جناب سید اصغر حسین ایڈوکیٹ، ظفر احمد صاحب ایڈوکیٹ، اور دوسرے حضرات کے نام بھی اہمیت کے حامل ہیں، اس سے قبل دینی تعلیمی کونسل کا قیام جس میں قاضی عدیل عباسی مرحوم کا اہم اور بنیادی رول تھا اور اس سے قبل ادارۂ تعلیمات اسلام کے قیام اور اس کا تربیتی و تعلیمی کام میں مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی رحمۃ اللہ علیہ پیش پیش تھے، اور مشیر الحق صاحب مرحوم (سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی) ان کے اہم معاون تھے، ان سب

کاموں اور کوششوں سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی وجہ سے ہمیں بھی تعلق اور دلچسپی تھی۔ اسی ضمن میں دیکھا جائے تو رائے بریلی میں جو ہمارا آبائی وطن ہے دارعرفات کا قیام بھی انہی دعوتی تعلیمی وتربیتی ورفاہی کوششوں کا حصہ ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سرپرستی میں اس کا غالباً ۱۹۷۰ء میں آغاز ہوا، اور کئی اہم کتابیں اور رسائل اس سے شائع ہوئے رفاہی کام بھی اس کے ذریعہ انجام پاتے رہے، اور تربیتی پروگراموں کا بھی انعقاد ہوتا رہا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا سیتاپور میں بغرض علاج قیام

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی آنکھ کی تکلیف کا سلسلہ ۶۰-۶۱ء سے شروع ہوگیا تھا، اس سلسلہ میں ۱۹۶۲ء میں علی گڈھ میں بھی عارضی طور پر مقیم ہونا پڑا، جہاں آنکھ کا علاج اچھا ہوتا تھا، اور آنکھ کے آپریشن کے لئے وہاں کا مشورہ دیا جاتا تھا۔ حضرت مولانا کی آنکھ کی تکلیف کی شدت بڑھتی جارہی تھی، طرح طرح کا علاج بھی کیا گیا مگر کارگر نہیں ہورہا تھا، ان سب کے ساتھ ان کی دعوتی، تعلیمی مشغولیتیں جاری تھیں اور اسفار کا سلسلہ بھی قائم تھا، اور ملک کے حالات ایسے دگرگوں تھے کہ خاموش بیٹھا بھی نہیں جاسکتا تھا، ان سب پروگراموں میں جو دین وملت اور ملک کو تقویت پہنچانے کے ہوتے تھے، وہ حصہ لیتے تھے، حجاز کے اسفار، رابطہ عالم اسلامی اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے جلسوں میں شرکت اور محاضرات، پھر ہندوستان میں مسلم کش فسادات میں مسلمانوں کی نصرت اور ''پیام انسانیت'' کی تحریک کے لئے دورے اور ملاقاتیں، مسلم مجلس مشاورت کے قیام کی عملی کوششیں، اس میں قائدین کو جھنجھوڑنے والے خطابات اور دورے اور اس طرح بہت سے پروگراموں کے ساتھ تصنیف وتالیف کا کام، اپنے والد ماجد کی کتابوں کی تحقیق واشاعت کا جذبہ اور عمل جو الثقافة الإسلامية في الهند، الهند في العهد الإسلامي اور نزهة الخواطر (الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام) کے نام سے طبع ہوئیں اور مقبول ہوئیں اور خود اپنی تصنیفات ''الأركان الأربعة'' کی تالیف کا کام جو بہت عرق ریزی اور دیدہ دری کا کام تھا، اس میں ان کے اہم معاون مولانا نذر الحفیظ ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء تھے جو مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے اس وقت رفیق تھے، اور مولانا نیاز

الحق ندوی مرحوم تھے جو کچھ مدت دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمت انجام دے چکے تھے، بالآخر آنکھ کی تکلیف نے اتنی شدت اختیار کی کہ فوری طور پر رائے بریلی سے سیتاپور جانے کا مشورہ ہوا اور وہاں علاج کے لئے قیام اختیار کرنا پڑا، اس دوران سیتاپور کے احباب واہل تعلق میں ایوبی صاحب مرحوم، ظفر احمد صدیقی مرحوم، ڈاکٹر توکل صاحب اور دوسرے حضرات نے بہت خدمت کی، اس کے علاوہ مولانا نذرالحفیظ ندوی، مولانا نثارالحق ندوی، حاجی عبدالرزاق نصیرآبادی اور دوافریقی خادم وعالم دین مولانا علی آدم ندوی، مولانا محمد سعید بنو ندوی نے خدمت کا حق ادا کر دیا اور بہت دعائیں لیں، ہم بھائیوں اور گھر کے افراد اپنی جگہ فکرمند اور پریشان تھے کہ آنکھ کو کوئی ایسا نقصان نہ پہنچ جائے جس کی تلافی نہ ہو سکے، انگریزی علاج کسی طرح سودمند نہیں ہو رہا تھا، ادھر مشہور اور بڑے مشفق بزرگ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری ثم الہٰ آبادی نے یہ کہلوایا کہ دل میں بار بار یہ تقاضا ہو رہا ہے کہ آپ ہومیو پیتھ علاج کرائیں۔ وہ بڑے صاحب فراست وصاحب کشف بزرگ تھے اور بہت ہی خیر خواہ وہمدردی اور محبت رکھنے والے تھے، ان کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے لکھنؤ کے ڈاکٹر شکلا کا علاج ہومیو پیتھ شروع کرایا گیا اور بہت آرام ملا، اس سے پہلے حضرت شاہ وصی اللہ مرحوم اپنے علاج کے لئے لکھنؤ میں سید مظفر حسین صاحب سابق وزیر صوبہ اتر پردیش کے یہاں قیام فرما چکے تھے، اور ان کے معالج خاص حکیم شمس الدین صاحب، حکیم افہام اللہ صاحب وغیرہ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں، اور ان کا قیام اس قیام کی طرح تھا، جیسے ان کے شیخ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے علاج کے لیے لکھنؤ کا قیام اختیار کیا تھا اور ان کا علاج جسمانی کم دوسروں کا علاج روحانی زیادہ ہوا تھا، وہ برکت اہل لکھنؤ کے لیے یادگار رہیں گی، جن کی برکات مجھ ناچیز کو بھی لکھنؤ کے قیام اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے رشتہ ونسبت سے حاصل ہوئیں۔

مرکز دعوت وتبلیغ کچہری روڈ لکھنؤ میں مستقل قیام

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا دعوت وتبلیغ کے کام سے جڑنے اور اس میں انہماک اور وفود سے ملاقاتوں اور ان کی ہدایات کی وجہ سے جن کا سلسلہ صبح سے شام تک رہتا تھا، گھر

یا ندوہ کے بجائے مرکز میں ناگزیر تھا، اس وقت مرکز سے متصل حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی رہائش گاہ بھی تھی، جس سے کام میں رفاقت وشراکت کی وجہ سے بہت سے امور میں بہت سہولت حاصل تھی ندوہ کی مشغولیت کے بعد میرا بھی خاصا وقت وہاں گذرتا، اور ان حضرات کی صحبت سے فائدہ اٹھاتا، جو ہمارے دینی عمل میں بہت مفید ثابت ہوا، اور بڑا تربیتی فائدہ حاصل ہوا، مرکز میں حضرت مولانا کا درس قرآن بھی ہوتا تھا، اور وہ درس قرآن بعض حیثیتوں سے بہت ہی مفید اور بڑے اہم مضامین کی طرف رہنمائی کرنے والا ہوتا تھا کہ انہیں شروع سے عربی زبان وادب اور قرآن مجید سے بڑا شغف رہا تھا اور اس کے ساتھ قوموں کی تاریخ اور ان کے عروج وزوال کے اسباب ودواعی پر گہری اور وسیع نظر تھی، اور تہذیبوں کے آپسی ٹکراؤ اور تصادم سے بھی بڑی واقفیت تھی، قرآن نے جس تہذیب اور دعوت کو اختیار کرنے کی ترغیب دی، اس کی حقانیت کا انہیں دلائل و براہین کے ساتھ ایسا یقین تھا کہ دانشور طبقہ جو مغربی تہذیب کی افادیت کو اہمیت دیتا تھا، وہ اس یقین کے ساتھ ان قرآنی محفلوں سے اٹھتا کہ اس پر اس کا کامل یقین ہوتا، مگر ۱۹۷۰ء کے بعد بعض اسباب کی بنا پر ندوۃ العلماء کا مستقل قیام اختیار کرنا پڑا اور میرا بھی وہاں ساتھ رہا اور تاعمر رہا۔

عالم عربی کا المیہ اور مشرق وسطیٰ کے قابل تشویش حالات

فلسطین کے مفتی اعظم اور عالم اسلام کے ممتاز رہنما اور داعی ومفکر ومصلح مفتی سید محمد امین الحسینی فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت دنیا کے حالات مسئلہ فلسطین سے متعلق گردش کر رہے ہیں، کہیں کوئی قضیہ پیدا ہوتا ہے، اس کا کہیں نہ کہیں سے فلسطین سے تعلق ہوتا ہے، اس لیے کہ یہودی، نصرانی اور مسلمان بھی اس سے جذباتی تعلق رکھتے ہیں اور یہودی دماغ کئی وسائل کے ساتھ بیت المقدس کو اپنے قبضے واختیار میں لینے کے لیے منصوبے بنا رہا ہے، عرب اتحاد کو توڑنے، چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے قیام کے ذریعہ عرب طاقت کو کمزور کرنے اور پھر تعلیم کے ذریعہ سے ایسے افراد کو تیار کرنے کا کام جن سے عربوں سے وہ دینی حمیت وملی غیرت اگر ختم نہ ہو تو کمزور ضرور ہو جائے، اس طرح ذہن سازی، تربیت وتعلیم

اور پھر اقتصادی راستہ سے مختلف ایسی تدابیر اختیار کر کے عربوں کو انہی کی دولت سے کمزور کرنے کا کام، یہ سب کچھ ایک گہرے پلان اور سازش کا حصہ تھا، اور امریکہ و برطانیہ کے مشترک پلان سے ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا وجود ہوا، اور دھیرے دھیرے اس کو مضبوط کرنے اور اس کو مضبوط کرنے کے لئے پڑوسی ریاستوں اور ملکوں کو کمزور کرنے اور وہاں ایسی حکومتیں قائم کرنے کا بھی عمل جاری تھا جن میں فلاحی، دینی، ملی جذبہ کا فقدان ہو، ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ میں یہ بات کھل کر سامنے آگئی، جب مصر اپنی پوری طاقت کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا لیکن مصری صدر جمال عبدالناصر نے عین وقت پر ایسے احکامات جاری کئے کہ فوج بے بس ہوگئی، اور مذاکرات کی بات کی جانے لگی، اور اب تک یہ سلسلہ چل رہا ہے، اور اسرائیل کو تسلیم کرانے کا عمل اس حد تک آگے بڑھ چکا ہے کہ اب اسے وہ حکومتیں بھی تسلیم کر رہی ہیں جو اس کے خلاف سب سے آگے نظر آتی تھیں اور وہ مجبور ہیں۔ اسرائیلی یہودی دماغ اور یورپی نصرانی وسائل کے متعلق رابطہ عالم اسلامی کے ایک اجلاس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بہت صاف اور واضح طور پر یہ بات کہی تھی کہ اس وقت یہ دونوں اسلام، مسلمانوں اور عربوں کے خلاف جمع اور متحد ہو گئے ہیں، اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، ایک عمل ان لوگوں کا یہ بھی ظاہر ہوتا رہا ہے اور خاص طور پر مشرق وسطیٰ اور عالم عربی میں اس پر زیادہ زور دیا گیا کہ ایسی شخصیات کو سامنے لایا جائے جو بلند بانگ دعوے کریں اور نعرے دیں اور انہیں عوام میں مقبول کیا جائے، اور اندر سے ان لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں سے ہمدردی و تعلق نہ ہو، اور پھر اسلام پسند طبقہ کو ان پر بھڑکا دیا جائے، اور اسلامی کاز کے کاموں کو ان کا حریف ومخالف بتا کر نقصانات پہونچایا جائے، ایران، لبنان، عراق، مصر وشام، ترکی، لیبیا، تونس، الجزائر وغیرہ میں ۱۹۵۰ء اور اس کے بعد سے یہ چیزیں زیادہ سامنے آئیں، اور ایسے حکمرانوں کو حکمرانی کا زیادہ موقع دینے کے ساتھ ان سے ظاہر میں امریکہ واسرائیل مخالف نعرے لگوا کر ان کو مقبول ظاہر کرایا گیا اور پھر انہی سے اسلام پسندوں کی بیخ کنی کا کام لیا گیا، سب سے پہلے عربوں میں خلافت عثمانی سے نفرت پیدا کرا کر ترکی کو دور کیا گیا اور کمال اتاترک کے ذریعہ یہ سب کام لیے گئے، پھر

مصر، شام، عراق و ایران میں اب یہ سلسلہ جاری ہے، خلیج کی ریاستوں، سعودی عرب اور یمن وغیرہ ان سب جگہوں پر اب مغربی تسلط کا سایہ صاف نظر آرہا ہے۔

۱۹۶۷ء میں مصر کی شکست اور اس میں اس کے صدر جمال عبدالناصر کا مغربی طاقتوں کا آلۂ کار بن کر سامنے آنا ایسے انکشافات تھے جس نے جمال عبدالناصر کو بھی توڑ دیا تھا، لیکن مغرب کا ایک طریقہ یہ بھی رہا ہے کہ ان کا آدمی اگر کمزور ہوتا ہے تو اسے نظر انداز کرکے دوسرے کو لانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتا، کیونکہ وہ صرف اپنا مفاد پیش نظر رکھتا ہے، ۱۹۷۳ء میں انورالسادات مصر کے حکمران ہوئے اور شروع میں وہ بھی اچھے نظر آئے مگر اسی روش پر جو ان کے پیش رووں کی رہی، چلنے لگے اور ان کا بھی حادثہ قتل پیش آیا، پھر حسنی مبارک کا دور آیا، اور ان کے کمزور ہونے پر پھر دوسرا کھیل کھیلا گیا، اور مصر کو خاص طور پر مرکز توجہ یہ طاقتیں اس لئے بھی بناتی رہیں کہ یہ اسلام پسندوں کا اہم مرکز ہے، اور یہیں سے الاخوان المسلمون اٹھی، اور یہاں کے اہل علم و اہل فکر عالم اسلام میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اس کے ساتھ بڑی فوجی طاقت کا حامل یہ ملک ہے، جس میں بڑا اسلامی عنصر ہے، اور غزہ کا علاقہ اس سے متصل ہے، اسرائیل کے مفادات اس سے گہرے وابستہ ہیں اور مصر سے یہودیوں کا قدیم تعلق بھی رہا ہے، اس طرح بہت سے اسباب و محرکات ودواعی ہیں، اور مصر وہ ہے جو عالم عربی کو افریقہ و یورپ سے جوڑتا ہے۔

دوسری طرف ایران، شام اور عراق کے سیاسی حالات بھی اس سے جڑے ہوئے ہیں، اور اسلامی الفکر لوگوں کے بس میں جو ہے وہ اپنے محدود وسائل و ذرائع سے کام لے کر ایک تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، فکری لڑائی لڑ رہے ہیں، اور اللہ پر اعتماد اور اچھی امید رکھتے ہیں۔ والغیب عند اللہ وان العاقبة للمتقین۔

بعض حوادث ووفیات

جن اہل تعلق، اہل خاندان، اہل فضل وکمال کی وفات کی خبر نے گذشتہ سالوں میں زیادہ متاثر کیا، ان میں حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی کا سانحۂ وفات اس اعتبار سے

بڑا حادثہ تھا کہ دعوت و تبلیغ کا کام ایک ملک سے دوسرے ملکوں میں ہی نہیں؛ ایک براعظم سے نکل کر دوسرے براعظموں میں پہنچ گیا تھا اور صحیح فکر و عقیدہ اور صحیح عمل کی دعوت جگہ جگہ پہونچنے لگی تھی، اور امت کا ہر طبقہ جان و مال سے پوری طرح متوجہ ہو رہا تھا کہ رائے ونڈ کے ایک عالمی اجتماع کے دوران ایک بیان کے بعد دل کا دورہ پڑا اور طبیعت سنبھل نہ پائی، یہاں تک کہ انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی حجاز کے سفر پر تھے اور میں بھی ساتھ تھا جہاں یہ خبر سنی اور ہم سب اہل تعلق دم بخود رہ گئے، یہ واقعہ ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۵ء کا ہے، ان کی جگہ حضرت مولانا محمد انعام الحسن کاندھلوی کی جانشینی عمل میں آئی اور ان کی امارت و رہنمائی میں اس کام نے پھر زور پکڑا اور جن جگہوں پر کام نہیں پہونچا تھا، وہاں بھی پہنچنے لگا اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

دوسرا حادثہ وفات حضرت مولانا شاہ وصی اللہ آبادی کا ہے جن سے ارشاد و سلوک اور اصلاح نفوس کے دائرہ عمل میں بڑا اصلاحی کام ہو رہا تھا، اور ان کی شخصیت مرجع خلائق اور جانشین حکیم الامت حضرت تھانوی کی سمجھی جا رہی تھی وہ عازم سفر حج ہوئے، بحری جہاز سے سفر تھا، راستہ میں ہی وقت موعود آ گیا اور بڑی کوشش کے باوجود کہ حکومت سعودی عرب سے جنت المعلاۃ مکہ معظمہ میں تدفین کی اجازت بھی مل گئی تھی، مگر سمندر کا نصیب تھا کہ وہ انہیں اپنی آغوش میں لے اور مقدر کو جگمگائے، جدہ میں سبھی عقیدتمند سراپا اشتیاق تھے، اپنی محرومی پر بڑے رنجیدہ ہوئے۔

ایک دوسرا حادثہ بھی ہمارے لیے ذاتی طور پر اہمیت کا حامل تھا کہ میرے استاد اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق شیخ الحدیث مولانا حمید الدین صاحب اور بعض اہل تعلق ایک گاڑی سے ایک سفر پر تھے کہ وہ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گئی اور مولانا نے اسی وقت جان جان آفریں کے سپرد کر دی، یہ دونوں واقعے ۱۹۶۷ء کے ہیں۔

خاندان کی بہت ہی بابرکت و بزرگ خاتون کا سانحۂ وفات

۱۳۸۸ھ مطابق ۱۹۶۸ء میں ایک بہت ہی بابرکت ہستی نانی صاحبہ مخدومہ سیدہ

خیر النساء بہتر رحمہا اللہ والدہ معظمہ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے رحلت فرمائی، ان کا دم بڑا مغتنم تھا، جگہ جگہ ان کی دعائے سحر گاہی، توجہ الی اللہ کی برکات ظاہر ہوتی تھیں، بڑی ذاکر شاغل اور بزرگ خاتون تھیں، بڑے تعزیتی خطوط اور پیغامات موصول ہوئے، اور ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ آج بھی ہے، بعد میں جب ان کی دعا و ابتہال کی کتاب ''دعا اور تقدیر'' محبی محمد عثمان حسین نے شائع کی تو مجھ سے مقدمہ کی فرمائش کی اس کا ایک ٹکڑا درج ذیل ہے:

> ''مجھے اپنی نانی صاحبہ سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہ رحمہا اللہ کو دیکھنے کو ملا، انہیں اعلیٰ درجہ کا دعا کا ذوق حاصل تھا، اور ایسی دعائیں کرتی تھیں کہ دوسرے کو محسوس ہوتا تھا کہ ان کا عمل میں آنا بہت مشکل ہے، آسان نہیں، لیکن بعد میں جب ان کے صاحبزادے مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کی خدمت دین و امت کے واقعات اور ان کی مقبولیت و شہرت کے واقعات سامنے آئے تو میں نے دیکھا کہ نانی صاحبہ کی دعائیں حرف بحرف پوری ہو رہی ہیں، اس طرح دعا کی افادیت کا میں نے پورا مشاہدہ کر لیا۔'' (دعا و تقدیر ص ۶، ایچ ایم حسین ٹرسٹ حیدر آباد)۔

والد ماجد کے سفر حج میں رفاقت

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہم سب بھائیوں نے ایک دن طے کیا کہ والد صاحب کو حج کا بڑا تقاضہ اور خواہش ہے مگر پیرانہ سالی اور قوت سماعت و گویائی نہ ہونے اور بصارت کی کمزوری وغیرہ ایسے متعدد اسباب ہیں کہ وہ یہ عمل ہم بھائیوں میں سے کسی ایک کی رفاقت کے بغیر انجام نہیں دے سکتے، ہم تینوں بھائیوں برادر معظم مولانا محمد ثانی حسنی، چھوٹے بھائی مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی نے مشترک رقم کا انتظام کر کے میری رفاقت پر اتفاق کیا اور یہ عظیم سعادت حاصل کرنے کا ایک بار پھر موقع نصیب ہوا، اور والد صاحب کے ساتھ جانے سے یہ سعادت دوبالا ہو گئی، مگر وہاں پہونچ کر والد صاحب کی طبیعت بڑی ناساز ہو گئی تھی، لیکن حرمین شریفین کے اندر قیام سے وہ اپنے قلب و نظر کو سرور بخش رہے تھے، اور اپنی بے بضاعتی و کم مائیگی کے احساس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا بڑا شکر بجا رہے تھے، اس موقع پر ہمیں

مولانا عبداللہ عباس ندوی مقیم مکہ مکرمہ کا بڑا تعاون حاصل ہوا، جن کا مکہ مکرمہ میں گھر گویا ہمارا ہی گھر تھا اور وہاں کوئی تکلف نہ تھا، والد صاحب کے ساتھ ان کا معاملہ بھی ایک فرزند کی طرح تھا، والد صاحب کو اس کی بڑی فکر تھی کہ یہاں حاضری کے بعد بھی یہاں کے قیام سے کیا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکے گا؟ اللہ نے کرم فرمایا اور صحت ہوئی۔

مدینہ پاک کے قیام میں ایک بار ایک بڑے عالم جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں حدیث شریف کے بڑے استاد تھے، شیخ ناصر الدین البانی سے ملنے گئے تو انہوں نے بڑے اخلاق کا معاملہ کیا اور یہ معلوم ہونے پر کہ والد صاحب بھی ساتھ ہیں، ایک دن کھانے پر بھی مدعو کیا، یہ ۱۹۶۹ء کا سال تھا۔

الحمد للہ سارے مناسک اچھی طرح سے انجام پائے اور بخیر و عافیت ہندوستان واپسی ہوئی، مگر افسوس ہے کہ والدہ صاحبہ کو ساتھ نہ لے جا سکے، بعد میں حج بدل کے ذریعہ اس کی تلافی کی کوشش کی گئی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور ہمارے والدین ماجدین "رب ارحمهما كما ربياني صغيراً" کو اس کا بہتر سے بہتر اجر و ثواب اور اپنی کامل رضا نصیب فرمائے، اور ہم بھائیوں کا بھی شمار سعادت مند اولاد میں فرمائے، اور مغفرت فرمائے۔ آمین۔

ایک یادگار خط

کاتب تحریر نے والدہ معظّمہ رحمہا اللہ کو سفر حج سے واپسی پر حجاز مقدس سے ایک عریضہ محفوظ لکھا جسے یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

باسمہ سبحانہ

مخدومہ معظّمہ جناب والدہ صاحبہ مدظلہا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ ہم اور والد صاحب معظم بخیر و صحت ہیں، پرسوں مدینہ منورہ سے واپسی ہوئی، اور کل کے جہاز میں ہندوستان روانہ ہونا تھا، لیکن سامان کچھ مکہ مکرمہ میں رہ گیا تھا، اور کچھ جدہ میں ساتھ تھا، وقت کی کمی کی وجہ سے مکہ مکرمہ فوراً جانا نہ ہو سکا، اس کے علاوہ یہ بھی کسی نے بتایا کہ ماموں جی رحمۃ اللہ علیہ شاید دو چار روز میں آنے والے ہیں، لہٰذا اس

جہاز پر ہم نہ بیٹھ سکے، اب ایک جہاز ۲۱ر اپریل کو اور پھر ۲۸ر اور ۳۰ر اپریل کو جہاز ہیں، ان میں سے جس جہاز سے آسانی ہوگی، انشاء اللہ روانگی ہوگی، ماموں جی مدظلہ کی آمد بھی شاید اسی دوران ہو جائے، ہم نے کئی اشخاص کو بھی لکھا، کہ اگر ماموں جی مدظلہ انہی دنوں میں آرہے ہیں، تو ہم ان کی آمد تک رکیں گے۔ لیکن ابھی تک کسی نے واضح بات نہیں کہی، ماموں جی مدظلہ نے تحریر فرمایا کہ آخر محرم تک چھوٹے بھیا (۱) محمد میاں (۲) نے آخر اپریل کو تاریخیں لکھیں، دونوں تاریخوں میں ۱۰، ۱۲ر روز کا فرق ہے، اس کی وجہ سے بات اور زیادہ مبہم ہوگئی، اور صاف نہ ہوسکی آخر محرم تو اب ہوگیا ہے اگر ماموں جی مدظلہ آخر محرم میں تشریف لانے والے ہیں تو آج ہی کل میں تشریف لے آئیں گے اور اگر اپریل تک تشریف لانا ہے تو دس پندرہ روز میں تشریف لائیں گے، بہر حال ہم اور والد صاحب ۲۱ سے ۳۰ر اپریل تک کے جہاز میں ضرور انشاء اللہ روانہ ہوجائیں گے، کیونکہ اس کے بعد ہندوستانی حاجیوں کو پھر آنے کی اجازت نہیں ہے، امید ہے کہ ہم اور والد صاحب معظم شروع مئی تک انشاء اللہ لکھنؤ رائے بریلی پہونچ سکیں گے، مکہ مکرمہ کے بعد آپ کو عریضہ لکھنے کا اب موقع مل رہا ہے، مدینہ منورہ میں عریضہ اس لئے نہیں لکھا کہ آپ حضرات کے والا ناموں کا انتظار تھا کہ ان سے ہم کو اپنے سفر کے متعین پروگرام طے کرنے میں آسانی ہوتی، اور وہ آخر تک نہیں آئے، اس لئے خط لکھنا نہ ہوسکا، اب آج یہ عریضہ لکھ رہے ہیں۔

مدینہ منورہ کا قیام الحمد للہ بہت اچھا رہا، میاں (۳) بھی خوش رہے اور صحت اچھی رہی کبھی کبھی نزلہ وغیرہ کی شکایت ہوئی اور بس، آپ اور تمام اہل تعلق کا سلام پیش کیا اور برابر ہر مرتبہ سلام اور دعاء میں آپ کو شریک رکھتے رہے قبولیت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، امامہ (۴) میمونہ (۵) نیز دوسرے تمام اہل تعلق کا سلام بھی عرض کرتے رہے۔

مدینہ منورہ میں متبرک اور تمام تاریخی مقامات پہ بھی جانا ہوا۔ احد، قبا، مساجد خمسہ، بقیع جانا ہوا، مدینہ منورہ میں اہل تعلق نے بھی بہت خیال رکھا، متعدد دعوتیں ہوئیں اور اگر

---

(۱) برادر معظم مولانا محمد ثانی حسنیؒ (۲) برادر عزیز مولوی سید محمد الحسنیؒ (۳) والد معظم صاحب مرحوم

(۴) [سیدہ امامہ حسنی مرحومہ بنت برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ (۵) سیدہ میمونہ حسنی (کاتب تحریر کی بڑی بیٹی]

قیام مزید اور زیادہ ہوتا تو مزید لوگ دعوت کرنے کو کہہ رہے تھے۔ اور روک رہے تھے، میاں الحمدللہ بہت خوش رہے اور مدینہ منورہ سے خاص طور پر بہت مانوس ہوئے، حاجیوں کا ہجوم بھی خاصا کم تھا، اس لئے مسجد نبوی میں الحمدللہ کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی، تمام نمازوں میں حاضری دیتے تھے، اور دن میں دو تین بار سلام بھی عرض کرواتے تھے، مدینہ منورہ کا موسم الحمدللہ بہت اچھا تھا، دن میں ہلکی گرمی اور صبح ہوتے خنکی اور ہلکی ٹھنڈک ہوتی تھی، صبح ہوتے کچھ اوڑھنا پڑتا تھا الحمدللہ کوئی زحمت نہ تھی، حرم شریف کے قریب ہی باب مجیدی کے سامنے ایک کمرہ مشترک کرایہ پر لے لیا تھا جس کی وجہ سے مزید آرام رہا۔ اور حرم شریف میں آنے جانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی، آپ حضرات کا والا نامہ ممکن ہے کہ مدینہ منورہ میں آیا ہو اور ہمارے روانہ ہونے کے بعد وہاں پہونچا ہو، اس لئے ہم کو نہ مل سکا ہو، جیسا کہ ممبئی میں ہوا کہ آپ نے خط بھیجے لیکن ہمارے روانے ہونے تک نہیں پہونچے آپ نے لالٹین کے لئے لکھا تھا وہ ہم نے خرید لی ہے، انشاء اللہ ساتھ لائیں گے، آپ اگر اب کوئی والا نامہ لکھنا چاہیں تو مصباح سلمہ کے ذریعہ بھیجیں، کیوں کہ والا نامہ پہونچنے سے قبل ہم اور ہم والد صاحب معظم ہندوستان واپسی کے لئے روانہ ہو جائیں گے کیوں کہ آئندہ جہاز اب ۲۱/اپریل کو ہی ہے۔

تکیہ (رائے بریلی) اور لکھنؤ میں گرمی تو اب خاصی ہونے لگی ہوگی، اور اب تو رات میں بھی ٹھنڈک نہ ہوتی ہوگی ماموں جی مدظلہ آج کل کہاں تشریف رکھتے ہیں، اور سفر کے سلسلہ میں کیا توقع ہے، اگر وہاں تشریف رکھتے ہوں تو یہ خط ان کو بھی دکھا دیجئے۔

مصباح سلمہ (۱)، ماشاء اللہ اچھے ہیں، ہم اور والد صاحب معظم مدینہ منورہ سے واپسی پر انہی کے پاس آئے اور ابھی انہی کے پاس ہیں، شاید کل مکہ معظمہ دوبارہ حاضری دینے کے لیے جائیں، امید ہے کہ روانگی ہندوستان تک یہاں آنا جانا ہوتا رہے گا۔

خالہ جان (۲) مدظلہا کی خدمت میں سلام کے بعد عرض کر دیجئے کہ ان کا والا نامہ ملا تھا، سلام و دعا میں حسب توفیق شریک رکھا، اگر تحریر نہ فرماتیں تو بھی شریک رکھتے، اس

---

(۱) سید مصباح النبی حسنی مرحوم ابن سید سراج النبی حسنی مرحوم قریبی رشتہ میں ہمارے چچازاد بھائی تھے۔

(۲) خالہ محترمہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم مرحومہ۔

وقت علاحدہ عریضہ نہیں لکھ رہے ہیں، یہی عریضہ وہ بھی دکھلالیں، قاری صاحب (۱) کے لیے ایک صاحب سے تو بات کی تھی، ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے، بہرحال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے معلوم نہیں کہ وہ اور فاطمہ سلمہا ابھی تکیہ پر ہیں یا واپس گئے، سنا تھا کہ فاطمہ سلمہا کی طبیعت خراب ہوگئی تھی جس کی وجہ سے سول سرجن کے کہنے سے سفر ملتوی کردیا تھا، اور ۷/مارچ کو جانا تھا، خدا کرے طبیعت اچھی رہی ہو اور کوئی فکر کی بات نہ ہو، (۲) امید ہے کہ سعید نانی مدظلہا بھی بخیر وصحت ہوں گی، ان کی خدمت میں سلام عرض ہے، اور بھی دوسرے تمام حضرات کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

والسلام

خادم

محمد رابع

۱۳/اپریل ۱۹۶۹ء

مصباح کا سلام قبول کریں اور گھر میں کہدیں کہ خط کا جواب نہیں ملا، خیریت سے مطلع کریں، امید ہے کہ گھر چیز پہونچ گئی ہوگی، اس کی اطلاع بھی کریں، فرصت ملتے ہی مفصل خط لکھیں گے۔ کام کی شدت کی وجہ سے وقت نہ مل سکا۔

احقر

مصباح النبی

ایک آزمائش

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لیے ۱۹۶۹ء ۱۳۸۹ھ کا سال ایک آزمائش کا سال رہا جب طلبۂ دارالعلوم نے اپنے ایک مطالبہ میں جو گرمیوں کی چھٹی سے متعلق تھا، اتنی شدت اختیار کی کہ انتظامیہ کو ان کے خلاف کارروائی کرنا پڑی، اور شہر کے بااثر لوگوں کا تعاون لینے پر مجبور ہونا پڑا، پولس کی بھی مدد لی گئی، اور دارالعلوم کو کچھ مدت کے لئے بند بھی کرنا پڑا، حضرت شیخ الحدیث

---

(۱) مولوی قاری سید رشید الحسن الحسینی (کراچی) ابن نواب سید نجم الحسن بن نواب سید نورالحسن بن والاہ نواب سید صدیق حسن جان قنوجی۔ (۲) زوجہ قاری سید رشید الحسن مرحوم کراچی۔

مولانا محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہ کو حالات کا علم ہوا تو انہوں نے بہت سختی سے یہ ہدایت فرمائی کہ جن کا بھی قصور ثابت ہو جائے ان کے ساتھ ذرا بھی رورعایت نہ کی جائے، ہم انتظامیہ اور ہم اساتذہ کے لئے یہ ایک بڑا المیہ تھا کہ بعض بڑے ہونہار اور لائق فائق طلبہ جن سے بڑی توقعات ان کے اساتذہ وابستہ کئے ہوئے تھے، وہ بھی پیش پیش ہو گئے، اور وہ بھی کارروائی کی زد میں آئے، جنہیں ندامت ہوئی تو انہوں نے اس کی تلافی کی کوشش کی اور بعض مصلح ومربی شخصیات اور اہم اداروں سے وابستگی اختیار کر کے اپنی گنوائی ہوئی متاع کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی اور جنہیں ندامت نہ ہوئی ان کے طرز عمل اور زبان سے ادارہ وانتظامیہ اور اساتذہ کے تعلق سے ایسی باتیں سامنے آئیں جو شریفانہ انداز سے جوڑ نہیں کھاتی تھیں، ان کو زیادہ نقصان اٹھانا پڑا، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہ برابر انتظامیہ کی سرپرستی فرماتے رہے اور اسٹرائک کے عمل کو ناقابل معافی جرم سے تشبیہ دیتے رہے، ان کی دعاؤں اور توجہات سے ہم سب کو بڑی قوت ملی۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اس قدر رنج وملال تھا کہ انہوں نے طے کیا کہ دین ودعوت وتربیت کے میدان اور بھی ہیں، ان کے ذریعے خدمت علم دین کی جائے گی اور ندوۃ العلماء کی نظامت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جانا بہتر ہوگا، مگر ندوہ کے فضلاء میں سب سے محترم اور بڑے مولانا شاہ معین الدین ندوی ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے کہا کہ ایسا ہم لوگ نہیں ہونے دیں گے، اس کے بعد سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مستقل قیام اختیار کر لیا کہ تربیت اس کے بغیر صحیح طور پر نہیں ہو سکتی تھی، اس میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کا بھی مشورہ شامل تھا جو مؤقر رکن نظامت وانتظامیہ ندوۃ العلماء میں تھے، حضرت مولانا سے ملے، وہ لکھنؤ کے تبلیغی مرکز واقع کچہری روڈ میں قیام کرتے تھے، اور اس کی وجہ سے شہر کے لوگ زیادہ مستفید ہوتے۔ حضرت مولانا کا قیام زیادہ تر اپنے وطن دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں رہا کرتا تھا اور وہیں انہوں نے یہ فیصلہ لیا تھا کہ نظامت کی ذمہ داری دوسرے کے سپرد کرا دی جائے لیکن بعض موقر ارکان انتظامیہ اور محترم شخصیات اور دارالعلوم کے بعض اساتذہ نے اپنی قوت اس میں صرف کی کہ ایسا نہ ہونے دیا جائے، پھر حضرت مولانا نے لوگوں کی فرمائش کو خاص کر مولانا شاہ معین

الدین ندوی کے احترام اوران کی قدرومنزلت میں اپنی رائے بدلی، پھرانتظامیہ نے ناظم پر نہ صرف پورا اعتماد ظاہر کیا بلکہ ان کے اختیارات میں اضافہ کیا، پھرحضرت مولانا نے بعض فیصلے لیےاور ایسے اقدامات کیے جن کہ بڑے اچھے نتائج اوراثرات سامنے آئے اور ندوہ میں علمی ترقی اور دینی رجحان مین کھلا اضافہ محسوس کیا جانے لگا، اور اس کے بعد بڑی اہم عالمی کانفرنسیں وسیمیناراوراجلاس منعقد ہوئے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

یہ دلخراش واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب مولانا محبّ اللہ لاری ندوی نئے نئے مہتمم ہوئے تھے، اور انہوں نے طلبہ کو خاصی رعایتیں بھی دی تھیں، لیکن اس افسوسناک واقعہ کے پیچھے احاطۂ دارالعلوم سے باہراور غیر متعلق عناصر کی سازش کو بھی دخل تھا، جو اللہ کی تائیدوحکمت سے ناکام رہی۔

بنگلہ دیش کا قیام

۱۹۷۱ء (۱۳۹۱ھ) کا سال مسلمانوں کے لئے بہت تکلیف دہ ثابت ہوا جب لسانی عصبیت کی بنیاد پر بنگلہ دیش وجود میں آیا اسلام کسی بھی عصبیت کو پسند نہیں کرتا ہے، لسانی جاہلی عصبیت کا المیہ سبھی غیوروباحمیت مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت سانحہ اورصدمہ تھا، ایک مسلم ملک کے اسلامی ممالک کے نقشہ میں اضافہ کی بات ظاہر میں تو بہت اچھی اور بھلی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی بنیاد اسلامی فکرو روح سے متضاد ہوتو یہ ایک سانحہ سے کم نہیں، لیکن ایک واقعہ کے پیش آنے کے بعد پھر اس کو نباہنا اور انسانی اخوت اور پھر اسلامی اخوت کی بنا پر اس کو طاقت پہونچانا بھی مسلم ممالک کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جو تقسیم ملک کے نظریہ کے بہت زیادہ خلاف تھے اور متحدہ ہندوستان کو طاقت پہونچانے اور حفاظت میں ان کی جدوجہد مسلسل رہی تھی، ملک کی تقسیم اور پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد وہ صاف کہتے تھے کہ پاکستان بن جانے کے بعد اس کو کمزور کرنے کی بات سوچنا یا کرنا، یہ ایک مسلمان کے لئے درست نہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لسانی عصبیت کے بڑے مخالف تھے اور اردو کو

برصغیر میں زیادہ رواج دینے کے حق میں تھے لیکن بنگلہ دیش بن گیا تو انہوں نے اپنی تقریروں اور مراسلات کے ذریعہ اس کی طاقتور دعوت دی کہ نہ صرف اسلامی لٹریچر بنگلہ زبان میں منتقل کیا جائے، بلکہ اس زبان واسلوب میں بنگلہ مصنفین اور اسکالرز کی چیزیں سامنے آئیں جو دلوں کو موہ لیں، جن میں اچھا اور یقینی مواد ہو اور جس کا اسلوب وقت کے تقاضہ اور لوگوں کے ذہن وفہم کے قبول کرنے کے مطابق ہو، انہوں نے اپنے بنگلہ دیش کے سفر میں جو ۱۹۸۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک وفد کے ساتھ ہوا، اس کی پرزور دعوت دی، اور اسی فکر وخیال کے مطابق جامعہ دارالمعارف کے نام سے چاٹگام میں ان کے ایک تربیت یافتہ عالم وداعی مولانا سلطان ذوق ندوی نے ادارہ قائم کیا اور بھی ادارے قائم ہوئے جیسے دارالرشاد ڈھاکہ وغیرہ، اس کے علاوہ اسلامک فاؤنڈیشن ڈھاکہ میں مولانا محی الدین خان، مولانا عمر علی وغیرہ نے تحریر وتصنیف کے ذریعہ فکر ورجحان کو طاقت پہونچائی اور ملک کی سیاست پر اثر انداز ہونے کے مؤثر اور مناسب طریقہ کار کی طرف توجہ دلائی۔

رابطہ عالم اسلامی کے وفد کا شام، شرق اردن، لبنان، عراق اور کویت کا دورہ

جزیرۃ العرب کی تعبیر ایک طرح سے مجازی ہے، اس لئے کہ وہ جزیرہ نمائے عرب کی حقیقت رکھتا ہے کہ تین طرف سے پانی ہے، اور اس کا ایک کنارہ خشکی سے جڑا ہوا ہے، یہ حصہ جو خشکی سے جڑا ہوا ہے، جزیرۃ العرب کی تعبیر سے الگ سمجھا جاتا ہے، اس کو اصطلاحی طور پر بادیۃ الشام کے لفظ سے بھی تعبیر کرتے ہیں، اس لیے کہ یہ وہ حصہ ہے جو جزیرۃ نمائے عرب سے جڑا ہوا ہے، وہ سب صحرا کا علاقہ ہے، آباد اور زرخیز علاقہ نہیں ہے، اس کے تینوں طرف کے اجزاء آباد علاقے ہیں، مثلاً مشرقی شمالی کنارہ عراق کہلاتا ہے، اور شمالی مغربی علاقہ شام کہلاتا ہے، ان دونوں علاقوں کے کنارے تھوڑی حد تک زرخیز اور متمدن ہیں، اس سے ملا ہوا صحرائی علاقہ ان کا تابع ہے، اپنے اپنے صحرائی علاقے کے ساتھ وہ الگ الگ نام رکھتے ہیں۔ اور تمدنی سطح پر اپنی اپنی کارگزاری رکھتے ہیں۔ اس میں سے عراق کی خصوصیت یہ ہے کہ شمال سے آنے والے دو دریا دجلہ وفرات اس میں سے

گذرتے ہیں اور وہ اپنے قرب و جوار شادابی اور زرخیزی کا ذریعہ ہیں، بڑے شہر انہی دریاؤں پر ہیں۔ اور شامی علاقہ میں بھی دریا گذرتے ہیں۔ ان میں سے ایک شمال سے جنوب کی طرف اُردن کے نام سے آتا ہے۔ جو اپنے دونوں پہلوؤں پر آبادی اور زرخیزی رکھتا ہے، اور اس کا مشرقی علاقہ بھی صحرائی اور بادیۃ الشام کا جزء ہے، دریائے اردن کا جو مغربی جانب علاقہ ہے وہ خاص طور پر زیادہ زرخیز اور زیادہ بہتر حالات کا علاقہ ہے، اور وہ فلسطین کہلاتا ہے، البتہ یہ فلسطینی علاقہ ایک طرح سے اپنے شمال سے چلتا ہے، اور اس کا وہ سارا شمالی علاقہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے، یہیں پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہجرت کر کے ٹھہرے تھے اور ان کے مزارات بھی یہیں ہیں، اور ان کے بعد ان کی اولاد میں حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد کو اللہ تعالیٰ نے نوازا اور ان کو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قیادت میں مصر سے اسی علاقہ میں جس کو وہ اپنا وطن قرار دیتے ہیں، وہاں منتقل ہونے کی توفیق فرمائی اور ترقیات سے نوازا جو بنی اسرائیل کہلائے اور ان میں اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے نبی بھی مبعوث فرمائے جن کا ذکر قرآن مجید میں ملتا ہے۔

اور اللہ نے ان کے لئے معجزاتی طور پر عزت و شرف کے حالات بھی مقدر فرمائے، وہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے واپس ہوتے ہوئے نبی قرار دئے گئے اور ان کو عصا عطا فرمایا گیا، جس کے ذریعہ انہوں نے مصر کے ظالم کو ختم کیا اور وہیں بعض صحرائی علاقوں سے گزرنے پر پانی نہ ملنے پر بارہ چشمے اللہ تعالیٰ نے جاری فرمائے اور وہیں من وسلویٰ کا عطیہ ان کو ملا، اور ان سے جب کہا گیا کہ اب آگے بڑھ کر اس علاقہ کو لے لو جہاں لوگ قابض ہیں۔ تو بزدلی سے کہنے لگے ہم نہیں کر سکتے تو ان کو سزا دی گئی، کہ وہ چالیس سال اسی صحراء میں بھٹکیں گے لیکن ان کی غذائی پریشانی کے لئے من وسلویٰ اور بارہ چشمے عطا ہوئے، اور پھر نئی نسل نے ہمت کی اور ان جگہوں کو انہوں نے حاصل کر لیا جہاں جانے سے ان کی قوم نے انکار کیا تھا، اور یہ وہی جگہ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے باری تعالیٰ کی تجلی ہوئی، ان باتوں کا تذکرہ قرآن مجید میں ملتا ہے، وہاں ترقی اور عروج کے زمانہ میں بنی اسرائیل کو حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام ملے جنہوں نے بڑی زبردست حکومت

پائی، اور حضرت زکریا، حضرت یحیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ملے یہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کا زمانہ ہے، اسی زمانہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس قائم کیا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قائم کردہ مسجد پر مشتمل ہے، وہاں ان کا وہ پتھر بھی موجود ہے جہاں وہ نماز پڑھتے تھے، بعد میں اس سے الگ مگر اس سے متصل با قاعدہ مسجد کی تعمیر اسلام کے اموی عہد میں ہوئی، جہاں با قاعدہ نماز ہوتی ہے اور اس کو مرکزی حیثیت بھی حاصل ہے، اس مسجد کی بنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے وہاں نماز پڑھنے سے ہوئی جب انہوں نے بیت المقدس فتح کیا تھا۔

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تعلق کی وجہ سے بیت المقدس کا علاقہ بعض آسمانی مذہبوں کا مشترکہ علاقہ ہے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کی اولاد کے بزرگوں اور نبیوں کا تعلق رہا ہے۔ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام جو حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے، وہ اپنے بھائیوں کے عمل سے کنویں میں ڈال دئے گئے تھے وہاں سے ان کو اللہ نے نکالنے کا غیبی انتظام فرمایا اور مصر پہونچا دیا تھا اور جہاں ان کو حکومت و اقتدار عطا کیا اور وہاں ان کے بھائیوں نے ندامت کی، ان سب کو حضرت یوسف علیہ السلام نے معاف کردیا تھا، اور فرمایا (لاتثریب علیکم الیوم یغفر اللّٰہ لنا ولکم وھو أرحم الراحمین)

ترجمہ: فرمایا: آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے اور وہ سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔

اور حضرت یعقوب کو بھی بینائی واپس آئی اور روشنی دوبالا ہوئی، حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں اور ان کے والد کو بیت المقدس سے مصر بلا لیا تھا۔

وہاں سے متصل لبنان ایک ملک بن گیا جہاں عیسائی آبادی بڑی تعداد میں ہے اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے اجتماع سے ایک الگ ملک بن گیا جن کی مشترکہ حکومت ہوتی ہے، یہاں کے عیسائی شعراء جو امریکہ میں جا کر مقیم ہوئے، عربی ادب میں ان کی شاعری مہجری قرار پائی، بیروت لبنان کا دارالحکومت ہے اور اس سے ایک پوری اسلامی

تاریخ جڑی ہوئی، اور یہ عملی طور پر بھی اہم شہر مانا جاتا ہے، لبنان میں عربی کتابوں کی سب سے زیادہ نشر واشاعت ہوتی ہے، یہاں کی اہم شخصیت امام ابوعبدالرحمٰن الاوزاعی کی ہے، جو ائمہ اربعہ کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں، اور ائمہ مجتہدین میں بھی ان کا مقام ہے۔

بادیۃ الشام کا مغربی شمالی علاقہ

فلسطین کا وہ حصہ جو دریائے اردن کے مشرق میں ہے، وہ شرق اردن کہلاتا ہے، جس کا دارالحکومت عمان ہے اور یہاں ہاشمی حسنی سادات کی حکومت قائم ہے، شریف مکہ کو خاموش کرنے کے لئے شام کا ایک حصہ کاٹ کر شرق اردن دے دیا جو صحرائی علاقہ بادیۃ الشام کا ایک جزو تھا، اور فلسطین کو دو حصوں میں کر کے ایک اسرائیل کو دے دیا اور ایک حصہ جو بیت المقدس کا تھا، وہ خالی چھوڑ دیا اور فلسطینی آبادی کو مشکل میں ڈال دیا جو اپنے وجود و بقاء کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ اور اسرائیل کو ان کے پیچھے لگا دیا اور اسرائیل اس میں مداخلت کرتا رہا اور اپنی جگہ وسیع کرتا رہا، مصر نے فلسطینیوں کا ساتھ دیا، اور اخوان المسلمون کی مزاحمت سے قریب تھا کہ علاقہ قبضہ میں آجاتا مگر بات چیت کے نام پر جنگ روک دی گئی۔ یہ مصر میں شاہ فاروق کا زمانہ تھا اور امام حسن البنا کو صہیونیوں کے لئے ایک خطرہ سمجھ کر شہید کر دیا گیا، اور دھیرے دھیرے بیت المقدس کے علاقے پر اسرائیل قابض ہو گیا۔ غزہ کا علاقہ بھی عربوں کے پاس ہے مگر وہاں بھی اسرائیل مشکلات پیدا کرتا رہتا ہے۔ غزہ کے جنوب میں جزیرہ نمائے سینا ہے جو فلسطین کا جزو ہے مگر غیر آباد صحرائی و پہاڑی علاقہ ہے، مگر مبارک جگہ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بشارتیں اور عطیات ربانی حاصل ہوئیں، کوہ طور بھی وہاں ہے، غزہ کا شمالی سمندری علاقہ، جو بحرابیض متوسط ہے، جس کے مشرقی کنارہ میں ترکی، لبنان، شام وغیرہ ہے، اور بحرابیض متوسط کا شمال یونان، اٹلی، قبرص، فرانس، پیرس اور اسپین کا علاقہ ہے جو یورپ کہلاتا ہے اور اب مسلمانوں کا علاقہ ہے، اور بحرابیض متوسط کے جنوب میں مصر، لیبیا، تیونس، الجزائر، مراکش جو شمالی افریقہ کے علاقے ہیں اور مسلمان علاقے ہیں۔ پھر وہیں ان کی اولاد پلتی بڑھتی رہی، پھر پانچ سو سال

میں وہ آبادی کا بڑا اجزیہ بن گئے اور غیر ملکی ہونے کی وجہ سے وہاں کی قومی آبادی ان کو غیر سمجھتی رہی، جو فرعون کی قوم قبطی تھے، اس قوم نے ان کے ساتھ بڑی ذلت کا معاملہ روا رکھا، چنانچہ وہ مدین سے اپنے خاندان مقیم مصر اسی طرح واپس ہوئے، اور فلسطین کے جس علاقہ سے گذرے جہاں ان کو نبوت ملی، اور وہاں کے کوہ طور پر تجلی ملی، مدین کے راستہ جہاں ان کا ایک عرصہ گذرا تھا، مصر میں بنی اسرائیل کو عذاب، فرعون سے چھٹکارے کا موقع ملا، اور پھر یہ لوگ اپنے وطن فلسطین واپس ہوئے، وہاں سے ان کی تاریخ کے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال مختلف حالات سے گذرے، جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمتیں بھی ملیں اور ناشکری پر عذاب میں رہے، وہ یہ کہ ان کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بدسلوکی پر ان سے رحمت اٹھا لی گئی۔اور ساڑھے پانچ سو سال سے زائد عرصہ کے بعد خیر البشر سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دور قیامت تک کے لئے عطا ہوا، اور وہ خاتم النبیین کے طور پر رحمۃ للعالمین بن کر مبعوث ہوئے۔

فلسطین کا علاقہ شام کا جزو تھا اور اسی سے متصل دریائے اردن اور اس کا مشرقی علاقہ ملا کر بعد میں اس کو ایک اردنی حکومت قرار دے دیا گیا، لیکن اس کا مغربی علاقہ جو فلسطین کہلاتا تھا، وہ اپنے آثار و مقامات کے لحاظ سے تاحال قائم ہے اور اس کا شرف بھی قائم ہے، سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصیٰ الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَهٗ..........الآخر

وہاں کی سرزمین برکات، انوار، شادابی، زرخیزی، زیتون کی کاشت سے بھری ہوئی ہے جس کا اشارہ قرآن مجید میں بھی سورۂ والتین میں آتا ہے، اور یہیں انبیاء اور اس کے متعلقین کی قبریں ہیں، اور وہاں مذہبی دینی آثار ہیں جن سے مسلمان، یہود اور نصاریٰ سب اپنے اپنے طور سے عقیدت اور جذباتی تعلق رکھتے ہیں، اور اس علاقہ پر ان میں ہر ایک اپنا تعلق جتاتا ہے اور اس پر قبضہ چاہتا ہے۔

یہودیوں نے امریکہ، برطانیہ کی مدد سے اسرائیل کے نام سے ملک قائم کیا، جو عربوں کے لئے ایک مسئلہ بن گیا اور وہاں کے حالات اس کے قیام ۱۹۴۸ء سے برابر پیچیدہ

اور خراب سے خراب تر ہوتے ہی جا رہے ہیں اور پورا خطۂ عرب اس سے متاثر ہے۔ بادیۃ الشام کا مشرقی علاقہ بادیۃ العراق بھی کہلاتا ہے، اس میں عراق دو حصوں میں پایا جاتا ہے، ایک صحرائی حصہ ہے، دوسرا شاداب حصہ ہے، جس سے کویت متصل ہے جسے انگریزوں نے بصری کے ایک ٹکڑا کو الگ دولۃ الکویت کے نام سے بنا دیا تھا۔ عراق کے شاداب علاقہ، بغداد، مصر، کوفہ اور دوسرے علاقے ہیں، اور شمال کے شہر وہ بھی جہاں انبیاء گزرے ہیں، حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی یہیں تیار ہوئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہیں سے شام ہجرت کی، پورا علاقہ چاند کی طرح ایک پٹی کے مثل ہے، اسی خطہ کو ہلال خصب بھی کہتے ہیں، عراق کا شاداب حصہ ایران کے قبضہ میں تھا، اور ایران کا دار السلطنت مدائن بغداد کے پاس تھا، مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا اور یہ علاقے بھی فتح ہوئے جو بغداد، کوفہ، بصرہ، نجف، مدین اور دوسرے علاقے ہیں۔ عراق و خراسان سے متصل علاقہ افغانستان ہے، افغانستان کا ایک علاقہ خراسان ہے جو ایک طرف ماوراء النہر، بخارا وغیرہ سے ملتا ہے، اور دوسری طرف عراق اور ایران سے ملتا ہے اور پھر پاکستانی علاقہ اس سے متصل ہے۔

عراق، شام، جسے بادیۃ الشام بادیۃ العراق کا علاقہ بھی کہتے ہیں، یہ جزیرۃ العرب سے باہر کا علاقہ ہے، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے افغانستان، ایران، عراق، شام کے علاقوں میں ایک تعلیمی، دعوتی، ثقافتی پروگرام کے لئے ایک وفد بھیجا، جس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کو سربراہ بنایا اور سعودی عرب کی ایک اہم شخصیت استاد احمد محمد جمال کو ساتھ کیا، مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کو حضرت مولانا کے مرافق کے طور پر ساتھ کیا گیا، افغانستان اور ایران سے یہ وفد حجاز واپس آ گیا تھا اور وہاں سے یہ وفد شام کے علاقوں میں لبنان، اردن، عراق اور پھر کویت گیا، میں ہندوستان میں تھا، مجھے حجاز مقدس بلایا گیا اور شام اور اس سے متصل علاقوں کے سفر میں مجھے ساتھ کیا گیا، اور مختلف حیثیت سے یہ سفر بہت مفید اور یہ دورہ بڑا کامیاب دورہ رہا، جس میں فلسطین تو نہیں جا سکے لیکن حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ فلسطین کا سفر اور بیت المقدس حاضری اپنے ۱۹۵۱ء کے سفر میں دے چکے تھے، جس میں میں ساتھ نہیں تھا اور مشہور داعی و عالم مولانا عبید اللہ بلیاوی ساتھ تھے۔ جس کی روداد ''شرق اوسط کی

ڈائری" میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

حضرت مولانا کا یہ سفرنامہ "من نہر کابل إلی نہر یرموک" کے نام سے عربی میں اور "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" کے نام سے اردو میں طبع ہوا جو ۱۹۷۳ء میں ہوا تھا، جن علاقوں میں میرا ساتھ رہا تھا اس کی روداد میں نے بھی قلمبند کی تھی، مگر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی چونکہ کتاب سامنے آچکی، اس لئے اسے شائع کرنے کے بجائے کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں محفوظ کرا دیا تھا۔ اس سفر کے آخری حصہ میں میری رفاقت رہی تھی، وہی حصہ حضرت مولانا کی کتاب "کاروانِ زندگی (حصہ دوم)" سے نقل کیا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> "ہمارے اس دورے کی آخری منزل شرق اردن تھا کہ ہم ۱۲/اگست ۷۳ء کو عمان کے لئے روانہ ہوئے، ایک گھنٹہ کے لئے بصرہ کے ہوائی اڈہ پر بھی اترے، جس کو دیکھنے کی ہمیں حسرت بھی رہی، براہ کویت ہم ۱۳/اگست ۷۳ء کو عمان پہونچ گئے، وہاں بھی ہم وزارت اوقاف کی میزبانی میں تھے، اردن کا بھی یہ میرا تیسرا دورہ تھا، جہاں اپنے قدیم دوستوں سے ملاقات کی، اور مشہور اداروں کو دیکھا، ۱۴/اگست ۷۳ء کو شاہ حسین سے ملاقات ہوئی، ۲۲/سال قبل ان کے نامور دادا شاہ عبداللہ بن شریف حسین سے ملے تھے، غالباً شاہ حسین کو اس واقعہ کا علم تھا، انہوں نے اپنی خاندانی شرافت یا گذشتہ ملاقات وتعلق کے احترام میں بڑی تواضع اور انکساری کا مظاہرہ کیا، خود بڑھ کر دروازہ کھولا اور معذرت کی کہ ہم اسی پوشاک میں مل رہے تھے جس میں وہ تھے اور رخصت کرنے کے لیے بھی کچھ دور آئے۔" (کاروانِ زندگی: ۲/۱۶۵، ۱۶۶)۔

اس سفر کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس سعودی فوجی مرکز کا معائنہ بھی کرایا گیا جو سرحد کی حفاظت کے لئے متعین کیا گیا تھا اور فوجیوں نے کا استقبال کیا، اور خطاب سنا، فوج سے خطاب کے متعلق حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ:

> "میری زندگی کا بڑا اہم واقعہ اور دل پر گہرا اثر ڈالنے والا منظر وہ تھا

جو۱۹راگست ۱۹۷۳ء کو پیش آیا، ہمیں موقع دیا گیا کہ اس سعودی فوجی مرکز کا معائنہ کریں جو سرحد کی حفاظت کے لئے متعین ہے اور ان فوجیوں سے خطاب کریں، جب یہ مسلح نوجوان صف بستہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اسلامی طریقہ کے مطابق ہم کو سلامی دی تو جسم میں عزم و ایمان اور سر میں خوشی اور سرشاری کی ایک لہر دوڑ گئی، اور طرب و اہتزاز کی ایسی کیفیت طاری ہوئی جو اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی، آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور ہم نے زبان ذہن کے بجائے زبان دل سے گفتگو کی، اس کے بعد کچھ وقت شہدائے موتہ کے مرقد پر بھی گذارا۔'' (حوالہ سابق)۔

شرق اردن کا یہ سفر ہفتہ آٹھ دن کا تھا جو۱۲راگست سے شروع ہو کر ۲۰راگست کو ختم ہوا، جہاں تک میری رفاقت کا تعلق ہے تو میں ہندوستان سے حجاز مقدس حاضر ہوا اور عمرہ کی سعادت حاصل ہوئی، حجاز سے بیروت گیا، بیروت (لبنان) میں دو روز کے قیام کے بعد پھر دمشق گئے، وہاں مفتی احمد کفتارو سے ملاقات ہوئی، وہ میزبان ہوگئے، انہوں نے وہاں کے مقامات دکھائے اور ملاقاتیں کرائیں، ایک دن ۱۲ربجے رات کو گھنٹی بجی کہ کچھ لوگ آپ لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں، حیرت ہوئی کون لوگ اور اتنی رات میں، باہر سے آواز آنے لگی: کھولو، کھولو، ورنہ دروازہ توڑ دیں گے، داخل ہو کر ان لوگوں نے کہا کہ سامان اٹھاؤ اور یہاں سے روانہ ہو، ان لوگوں نے سامان اتارنے میں مدد کی، اور ہمارے دوسرے رفقاء شیخ احمد محمد جمال وغیرہ دوسرے کمرہ میں تھے، ہم نے کہا ایسا نہیں کریں گے، انہوں نے کہا کہ ہمارے ساتھ بھی ایسا پیش آیا ہے۔ ہم لوگوں نے کہا ہم لوگ سعودی سفارت خانہ کے یہاں ہیں ان کو تو بتایا جائے، ان لوگوں نے ایک نہ سنی اور لے کر چل دیے، محسوس ہوا کہ کہیں جیل تو نہیں لے جا رہے ہیں۔ سرحد پر لے جا کر بیروت پہونچا دیا، وہاں ہوٹل میں جگہ نہ تھی، بڑی مشکل سے کمرہ ملا، اور اس وقت فجر کی اذان ہو رہی تھی، معلوم ہوا کہ رات ہی میں اسرائیل ریڈیو نے خبر نشر کر دی کہ ان لوگوں کو دمشق سے باہر کر دیا گیا ہے، اہل تعلق میں جس کو معلوم ہوا، سب بڑے فکر مند ہوئے، وہاں سے اردن پہونچ گئے، اردن میں بڑا

اکرام ہوا اور وہاں اپنے لوگ تھے، اہم جگہیں دیکھیں اور وہ جگہ دیکھی جہاں مسلمانوں کو تاریخی فتح ہوئی تھی، ہم لوگ پہاڑ پر تھے، سامنے نشیبی میدان تھا، وہاں تک اسرائیلی حکومت آگئی تھی، اور پہاڑ پر کافی ٹھنڈک تھی اور نیچے گرمی تھی، وہ جگہ اربد کی ہے، جہاں سوریا (شام) اسرائیل سے ملتا ہے، شرق اردن میں عمان کے قریب اصحاب کہف کے غار بھی گئے، وہ ایک پہاڑی پر ہے، اس طرح سے ہے کہ نیچے سے غار نہیں معلوم ہوتا، اوپر جا کر معلوم ہوتا ہے کہ غار ہے، پھر غار میں پہونچ کر اس کے غار ہونے کا پورا یقین ہو جاتا ہے، وہ جگہ رقیم کہلاتی ہے اور یہ اصحاب رقیم کہلاتے ہیں، قبر میں ان سب کا رُخ ایک طرف نہیں تھا، جیسا کہ یاد پڑتا ہے۔

ولی عہد امیر حسن بن طلال عقیدت ومحبت کا تعلق ماموں جی سے رکھتے تھے انہوں نے وفد کا خیال کرنے کی ہدایت جاری کر دی تھی، اس سے وفد کو بڑا فائدہ پہنچا، بصرہ وعراق بھی جانا ہوا اور وہاں بھی اہم ملاقاتیں ہوئیں اور اہم خطابات ماموں جی کے ہوئے، وہاں سے کویت گئے۔

والد صاحب کی علالت اور مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کا رائے بریلی میں مستقل قیام

ادھر والد صاحب الحاج سید رشید احمد حسنی پیرانہ سالی، ضعف وعلالت کی وجہ سے کہ سماعت اور نطق کی پہلے ہی قوت نہ تھی اور اب بصارت بھی کمزور ہوگئی تھی، اور چلنے پھرنے کی طاقت بھی متاثر ہوگئی تھی، ضرورت محسوس کی گئی کہ ہم بھائیوں میں ایک رائے بریلی کا مستقل قیام کا فیصلہ کرے، برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی نے اپنی لکھنؤ کی دعوتی وتجارتی مشغولیات پر والدین کی خدمت کو ترجیح دی اور وہ مستقل رائے بریلی میں رہنے لگے اور ان کا وہاں کا قیام دینی، تعلیمی، دعوتی حیثیت سے بھی بہت مفید ثابت ہوا، وہ وہاں دینی مکاتب کے قیام کے لیے بھی کوشاں ہوئے، اطراف ومضافات ہیں دعوتی وتعلیمی دورے بھی شروع کیے اور دینی مدارس کی نگرانی بھی کرنے لگے اور ان کے مشورے اور دینی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے تکیہ شاہ علم اللہ میں لوگوں کی آمد ورفت بھی ہونے لگی اور ۲۷/رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ کو ان کو ان کے

مرشد و مربی حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے اجازت وخلافت سے بھی سرفراز فرمایا اور ان کے حکم سے انہوں نے ۱۴۰۰ھ میں مجلس ذکر وارشاد بھی شروع کی جو الحمدللہ ابھی بھی جاری ہے جو ان کے لیے صدقہ جاریہ ہے، دوسری طرف اپنے گاؤں کے متصل گاؤں میدان پور میں مدرسہ ضیاء العلوم اور ۲۰/۲۵ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع گاؤں تینڈوا میں جس کو امین نگر بھی کہا جاتا ہے اور اب امیٹھی ضلع کا حصہ بن گیا ہے ''مدرسہ فلاح المسلمین'' قائم کیا، اس کے علاوہ دینی تعلیمی کونسل کے ضلعی ادارہ انجمن تعلیمات دین کی نگرانی اور ان کی ترقی واستحکام کی بھی فکر کرتے اور تبلیغی جماعت کے امور کی بھی علاقائی سطح پر سرپرستی فرماتے اور دوسرے اصلاحی کاموں کی طرف بھی توجہ فرماتے جس سے بہت جلد ان کی شخصیت رائے بریلی کے عوام وخواص کے لیے دلآویز ومحبوب شخصیت بن گئی تھی اور توقع کی جانے لگی تھی کہ علاقہ کو بڑا نفع پہونچے گا کہ ۸/۷ سال کے عرصے میں انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا جسکا پورے علاقہ اور قرب وجوار کے لوگوں نے گہرا اثر لیا۔

مولانا واضح رشید حسنی ندوی کی دہلی سے لکھنؤ واپسی

ادھر لکھنؤ میں برادر عزیز مولوی سید محمد واضح رشید حسنی ندوی دہلی سے اپنی ایک اہم ملازمت چھوڑ کر آگئے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمت اختیار کی، مزید انہیں ان کی صحافتی صلاحیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ''الرائد'' عربی جریدہ کی اضافی ذمہ داری بھی دی گئی جس کے ذریعہ انہوں نے افراد سازی کا بڑا کام کیا ہے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا قدس سرہ کے حکم پر انہوں نے یہ قدم اٹھایا تھا اور انہوں نے دعا دی تھی کہ عزیز واضح کو ندوہ سے فائدہ پہونچے اور ندوہ کو عزیز واضح سے فائدہ پہونچے۔ فالحمدللّٰه علی ذلك۔

مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کا واضح رشید حسنی ندوی کے نام ایک مکتوب

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے ساتھ حجاز مقدس کے سفر پر ہم تھے، یہ واقعہ ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹۷۲ء کا ہے اور چھٹی پر دہلی سے لکھنؤ عزیزی مولانا واضح رشید ندوی آئے ہوئے تھے، ہم نے اپنی کتابوں کا درس عارضی طور پر ان کے ذمہ کردیا تھا تاکہ طلبہ کا نقصان نہ

ہو، ادھر واضح رشید کو دہلی کے قیام پر اطمینان نہیں تھا اور انہوں نے دہلی کی ملازمت سے جو آل انڈیا ریڈیو کی تھی، بے اطمینانی کی بات حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کو لکھی کہ وہ ان کے شیخ و مرشد تھے اور حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی وفات کے بعد انہوں نے حضرت شیخ سے اصلاحی وتربیتی تعلق کی تجدید کر لی تھی اور وقتاً فوقتاً حضرت شیخ کی خدمت میں سہارن پور حاضری کا التزام بھی کرتے تھے، حضرت شیخ کے ان کے نام کئی اہم خطوط بھی ہیں جو محفوظ ہیں، انہی میں ایک وہ خط بھی محفوظ ہے جو دہلی کی ملازمت سے تعلق ختم کرنے کے اور ندوۃ العلماء سے استفادہ وافادہ کا تعلق قائم کرنے کے متعلق ہے، وہ درج کیا جاتا ہے، اس میں انہیں حضرت شیخ نے الحاج لکھا ہے اور ان کے لئے دعا کے الفاظ بھی، جو اگلے سال دسمبر ۱۹۸۳ء میں جس کی سعادت حاصل ہوئی اور اس سفر میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ انہوں نے شاہ فیصل مرحوم سے ایک اہم ملاقات بھی کی اور آخر میں وہ ندوہ کے اہم عہدوں پر فائز ہوئے اور معتمد تعلیم بھی ہوئے۔

عزیز گرامی قدر و منزلت! الحاج مولوی واضح سلمہ اللہ تعالیٰ

سلام مسنون، محبت نامہ پہونچا، میرے خیال میں تو آپ کا لکھنؤ واپس آجانا دینی اور علمی حیثیت سے بہت ہی مناسب ہے، تنخواہ ممکن ہے دہلی میں زیادہ ہو مگر علمی مشاغل وہاں کہاں مل سکتے ہیں؟ یہ ناکارہ دل سے دعا کرتا ہے کہ اللہ جلّ شانہ آپ کے فیوض وبرکات سے مدرسہ کو اور مدرسہ کے فیوض وبرکات سے آپ کو متمتع فرمائے، یہ ناکارہ دل سے دعا کرتا ہے کہ اللہ جل شانہ اپنے فضل وکرم سے آپ کے علوم میں برکت عطا فرمائے، اپنی رضا ومحبت عطا فرمائے، مرضیات پر عمل کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے، نامرضیات سے حفاظت فرمائے۔

آپ نے لکھا کہ قوانین ملازمت میں یہ ہے کہ ملازم کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتا یہ تو دوران ملازمت ہی ہوگا، لیکن جب ملازمت سے چھٹی لی جائے، تو پھر ان کو کیا اعتراض ہے؟ آپ کی یہ چھٹی بلا تنخواہ تو ہوگی نہیں، وضع تنخواہ ہوگی، بندہ کے خیال میں علی میاں سے تحریری مشورہ کر کے کہ اگر وہ قبول فرماویں، منظور فرماویں، اور اس سے نہ ڈریں کہ کوئی

یوں کہہ دے گا کہ اپنے بھانجہ کو رکھ لیا تو سابقہ ملازمت کو لکھیں کہ آپ کی علمی صلاحیتیں وہاں ضائع ہو رہی ہیں، اور اگر علی میاں آرہے ہوں تو پھر زبانی ہی مشورہ ہوسکتا ہے۔

بمبئی کے بعض احباب کے خطوط سے معلوم ہوا کہ علی میاں اور مولانا منظور نعمانی نے اجتماع میں شرکت کا وعدہ کرلیا ہے، اجتماع سے پہلے وہاں آجائیں گے، مولانا معین اللہ صاحب کا کوئی خط آپ کے سلسلہ میں تو نہیں آیا، وہاں کے حالات سے تو آپ اور مولانا معین اللہ صاحب اور مولانا سعید الرحمٰن صاحب زیادہ واقف ہیں۔

بندہ کا مشورہ تو یہ ہے کہ جس زمانہ کی تنخواہ سابقہ ملازمت سے ملے، اس زمانہ کی دارالعلوم سے نہ لی جائے، اس صورت میں نہ وہاں والوں کو کوئی اعتراض ہوسکتا ہے اور نہ یہاں والوں کو۔

یہ ناکارہ دل سے دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی ہر نوع سے مدد فرمائے، میرا تو نہایت زوردار مشورہ ہے کہ علمی مشغلہ کو معمولی نقصان کے ساتھ نہیں بلکہ کثیر نقصان کے ساتھ بھی اختیار کرنا چاہیے۔

فقط والسلام

محمد زکریا

۷/ ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی کا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تقرر بہت مفید ثابت ہوا، اور ان کی صلاحیتوں سے ادارہ نے تدریس، صحافت اور دوسرے دائرہ کار میں بھی فائدہ اٹھایا، جریدۃ "الرائد" کی ادارت کی ذمہ داری میرے اوپر تھی، واضح کے آنے سے یہ ذمہ داری ان کے سپرد ہوئی اور "الرائد" کو انہوں نے بہت ترقی دی اور مجھے بالکل فارغ نہ ہونے دیا، اس کے اداریے مجھ سے بھی برابر لکھواتے رہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی کانفرنسوں، سیمناروں میں بھی انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس میں بھی ان کی صلاحیتیں خوب ظاہر ہوئیں، اور پھر دارِ عرفات رائے بریلی کو بھی متحرک کرنے میں انہوں نے حصہ لیا، جس کی کوئی اپنی جگہ نہ تھی مگر ۱۹۷۰ء سے اس

کا کام سامنے آنے لگا تھا اور اس کی کئی مطبوعات اور دوسرے کام سامنے آئے، یہ ادارہ مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کے فکر وخیال اور ان کی کتاب ''الاسلام الممتحن'' کی اشاعت اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ''اذا ھبت ریح الایمان'' کی اشاعت سے سامنے آیا اور بعض رسائل بھی شائع ہوئے جس میں مولانا سید محمد واضح رشید ندوی صاحب کا رسالہ ''منہج علماء الہند فی التربیۃ الاسلامیۃ'' بھی ہے، پھر اس کی باقاعدہ زمین حاصل کی گئی اور اس کو منظم کیا گیا اور اس کی مستقل عمارت اور دفتر بھی وجود میں آئے، جسے ۱۹۸۷ء میں مولوی عبدالرزاق ندوی ممبئی حال مقیم ممبئی دیکھ رہے تھے، ۹۰-۱۹۹۱ء سے مولوی احمد علی ندوی مرحوم کو باقاعدہ اس کا ڈائرکٹر (مدیر) بنایا گیا اور اب ''مركز الإمام أبي الحسن علي الندوي للبحوث والدعوة والفكر الإسلامي'' کا کام بھی اس سے منسلک ہے جس کو مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی پسر مولانا سید محمد الحسنیؒ اور ان کے رفقاء نے کافی ترقی دی۔

عالمِ اسلام کے لیے سخت سانحہ اور صدمہ

اپریل ۱۹۷۵ء مطابق ۱۳۹۵ھ میں عالم اسلام کے لائق افتخار قائد و رہنما اور سعودی عرب کے بادشاہ شاہ فیصل بن عبدالعزیز آلِ سعود کی شہادت کا واقعہ پیش آیا جس نے ہر باحمیت مسلمان کو ہلا کر رکھ دیا، انہوں نے اسلام کی بنیاد پر عالم اسلام کو جوڑنے اور متحد کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا تھا، اس کی ماضی قریب میں نظیر نہیں ملتی، ان کے فکر وعمل رجحان وخیال اور فکر سے اُس فکر کے حاملین کو شکست ہوئی جو قومیت اور وطنیت وشعبیت کی بنیاد پر متحد کرنے کی فکر رکھتے تھے اور یہ فکر ایک عیسائی مفکر میشل عفلق نے دی تھی اور اس کے ذریعہ عرب میں آباد یہودیوں کو جوڑا جا رہا تھا، اس فکر کے بڑے حامل اور داعی کے طور پر مصر کے جمال عبدالناصر سامنے آئے تھے، اس فکر کا پوری قوت سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور حضرت مولانا کے رفقاء خصوصاً برادر عزیز مولانا سید محمد میاں حسنی مرحوم نے ''البعث الاسلامی'' میں اپنے زوردار اداریوں اور مضامین سے کیا تھا۔

شاہ فیصل شہید کے اور بھی کارنامے تھے جن کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔

انہوں نے امریکہ اور اسرائیل کے تئیں بھی ٹھوس قدم اٹھائے تھے کہ ان کو یہ احساس پیدا ہوا کہ عالم اسلام ان کی مرضی پر چلنے والا نہیں ہے۔ بڑی طاقتیں یہ بات کہاں برداشت کرسکتی تھیں؟ ایک سازش کے تحت انہیں ان کے ایک قریبی کے ذریعہ شہید کرادیا اور اُن کے بعد آنے والوں کو اس کے ذریعہ آگاہ کردیا کہ انہیں ان کے مفادات کے تحفظ کو یقینی بنانا ہوگا، بہرحال یہ واقعہ پورے عالم اسلام کے لئے سخت صدمہ کا تھا۔ شاہ فیصل شہید بڑے نیک دل مگر بہت فہیم وذہین اور مدبر بادشاہ تھے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ان سے کئی اہم اور مؤثر ملاقاتیں رہیں۔ جن میں میں ساتھ رہا اور ان کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

ملک میں ایمرجنسی کے حالات، ظلم وتشدد، گرفتاری اور وزیراعظم سے ملاقات

۱۹۶۷ء کے پارلیمانی انتخابات میں وزیراعظم اندرا گاندھی نے رائے بریلی کا حلقۂ انتخاب جیتا تھا، جو ہم لوگوں کا وطن اور مستقر ہے، اور الیکشن میں انہوں نے بسہولت کامیابی حاصل کرلی تھی، ۱۹۷۱ء میں پھر انتخابات ہوئے اور اس میں بھی وہ اپنے قریبی حریف مسٹر راج نرائن سے ایک لاکھ سے زائد ووٹوں سے جیت گئیں، راج نارائن نے اس کے خلاف الٰہ آباد ہائی کورٹ میں رٹ داخل کی جس پر فیصلہ آنے میں چار سال لگ گئے، احتجاجی مظاہروں کا اتنا دباؤ بڑھا کہ ان کے مشیروں نے ایمرجنسی کے نفاذ کی بات کہی اور اسی پر عمل کرلیا گیا، اور اعلان ۲۵ رجون ۱۹۷۵ء کو ہوا، اور اس میں سیاسی اور غیر سیاسی تحریکی مزاج رکھنے والے لوگوں اور بااثر شخصیات کو چن چن کر گرفتار کیا گیا، اور دوسری طرف جبر وظلم وتشدد کا طریقہ اختیار کرکے مکانات کے انہدام اور جبری نس بندی کا عمل کرایا گیا، اور یہ سب کچھ وحشیانہ طریقہ پر کیا گیا، جس سے ملک بھر میں سراسیمگی اور دہشت پھیل گئی۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اہلِ تعلق برابر متوجہ کر رہے تھے کہ ان کا ایوان حکومت میں قدر واحترام ہے، وہ ضرور پرائم منسٹر سے وقت لے کر بات کریں، اور اس کے خراب نتائج سے آگاہ کریں، اس کی وجہ سے مولانا نے اپنے مکتوب بھیجے مگر اس کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نظر نہ آیا، ایک روز ۲۳ راگست ۱۹۷۶ء کی تاریخ رہی ہوگی، وزیراعظم نے ان کو دہلی دعوت دی اور وزیر ریلوے جو مسلمان تھے، محمد شفیع قریشی صاحب کا اصرار تھا کہ

ضرور سفر کیا جائے اور یہ موقع ضائع نہ ہونے دیا جائے، مگر ضعف بصارت کی وجہ سے وہ تنہا نہیں جاسکتے تھے، مجھے اور بھائی عبدالرزاق کو ساتھ لیا اور پہلے سے خط تیار کرلیا، جس کا انگریزی ترجمہ جناب محمد آصف قدوائی مرحوم نے کیا، دہلی میں برادر گرامی مولانا سید ابوبکر حسنی کے یہاں قیام تھا، سرکاری بنگلہ پر قیام اختیار نہیں کیا اور نہ ہوٹل میں قیام پسند کیا، راشٹر پتی بھون میں لنچ تھا، جو مورتیانیا کے صدر مختار ولد دادا صاحب کے اعزاز میں تھا، اور وزیراعظم کی طرف سے تھا، میں ساتھ تھا، وزیراعظم صاحبہ سامنے آئیں مگر ضعف بصارت کی وجہ سے مولانا کو مجھے بلانا پڑا تو حضرت مولانا نے ان کو متوجہ کیا کہ انہوں نے انہیں کئی خطوط رجسٹری بھیجے مگر جواب نہیں آئے، معلوم ہوا کہ ان کو ملے نہیں، پھر ملاقات کا وقت جو آسانی سے مل گیا اور اگلے روز پرائم منسٹر آفس میں وقت تھا، جہاں وہ خط جو ساتھ لے کر مولانا گئے تھے، پیش کیا، وزیراعظم نے اسی وقت پورا پڑھا اور اس کا اچھا اثر لیا اور ان کے رویہ میں کچھ نرمی اور بہتری محسوس کی گئی، نظام الدین مرکز دہلی میں مولانا انعام الحسن کاندھلوی سے ملاقات اور سہارنپور میں حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی خدمت میں حاضری دیتے ہوئے واپسی ہوئی۔

ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن تعلیمی

بعض حالات کی بنا پر اس ضرورت کا احساس بڑھتا جارہا تھا کہ ایک بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس ندوۃ العلماء میں بلائی جائے، تاکہ اس وقت عالم اسلام کو جس ٹھوس نظریہ تعلیم ودعوت کی ضرورت ہے جسے برسر اقتدار طبقہ اپنی دانش گاہوں میں جاری کرسکتا ہے، اور انفرادی طور پر اہلِ فکر ودعوت اپنے اپنے مقام پر اس کے علمبردار ہوسکتے ہیں، اس پر مذاکرہ ومناقشہ سے ممتاز دانشور حضرات اور ماہرین تعلیم اور علماء دین کے درمیان صحیح راستہ نکل سکتا ہے اور یہ اس صورت میں زیادہ مفید ہوگا جب ان کے سامنے ایک واضح پلان رکھا جائے گا۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی سرپرستی اور توجہ ودعا بھی شامل حال تھی، اور انہوں نے اپنے متعلق طبقہ کو اس کی کامیابی کے لئے خصوصیت سے دعا میں لگا دیا تھا، بلاد عربیہ کے اہل فکر ودعوت وماہرین تعلیم نے اس دعوت پر لبیک کہا اور اتنی بڑی اور منتخب تعداد میں ایسا چیدہ چنیدہ مجمع ہوگیا، جس کی

ایمرجنسی کے حالات میں امکان معدوم ہو چکا تھا، شیخ الازہر مصر کی تشریف آوری سے اس اجلاس کی قدر و قیمت میں بڑا اضافہ ہوا اور ان کی صدارت میں افتتاحی اجلاس ہوا، اجلاس، اس کے مندوبین، مقالات، خطابات اور تاثرات کی روداد ''البعث اسلامی''، ''الرائد''، ''تعمیر حیات'' کی خصوصی اشاعتوں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ برادر عزیز مولانا سید محمد میاں حسنی کے قلم سے ''روداد چمن'' کے نام سے ایسی تفصیل بھی تحریر میں آئی جس نے اردو ادب میں ایک صنف کا اضافہ کیا، اس کے اثرات ملک اور بیرون ملک، بلاد عربیہ میں پڑے، اور جلد ہی مکہ مکرمہ میں ایک عظیم تعلیمی کانفرنس رابطہ عالم اسلام مکہ مکرمہ نے بلائی، جن سے ان تجاویز سفارشات کو آگے بڑھایا جو ندوۃ العلماء کے اس اجلاس میں پیش کی گئی تھیں۔

اس اجلاس میں ندوۃ العلماء کے ارکان مجلس انتظامی خصوصا مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ اور دارالعلوم کے ذمہ داران اور ممتاز فضلاء مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا محمد عمران خاں ندوی، مولانا معین اللہ ندوی، مولانا محب اللہ لاری ندوی، مولانا عبداللہ عباس ندوی پروفیسر محمد شبیر ندوی، مولانا ابوالعرفان خاں ندوی اور اساتذہ وکارکنان میں خاص طور پر مولانا مفتی محمد ظہور ندوی، مولانا سعید الرحمٰن ندوی، مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی، مولانا سید محمد الحسنی، مولانا سید محمد مرتضیٰ نقوی، مولانا عبدالسمیع صاحب وغیرہ کے نام بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ شہر کی شخصیات وعمائدین کی بھی ایک لمبی فہرست ہے، جس میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، اطہر حسین مرحوم اور دوسرے حضرات کے نام اور کام ہیں۔

جشن تعلیمی کا دعوت نامہ

مکرمی ومحترمی زادلطفہ

''اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ندوۃ العلماء اپنی عمر کے ۸۵ رسال پورے کر رہا ہے۔ ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں نے خدا کے بھروسے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ۲۵/۲۶/۲۷ اور ۲۸ رشوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۳۱ را کتوبر تا ۳ رنومبر ۱۹۸۵ء بروز جمعہ، شنبہ، یکشنبہ اور دوشنبہ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء بادشاہ باغ میں عالمی سطح پر ۸۵ سالہ اجلاس منعقد کیا

جائے جس میں اس کی عظیم تعلیمی، اصلاحی و دینی تحریک و دعوت کا تعارف کرایا جائے، اس کی خدمات و مساعی اور کام کے پیش رفت کا جائزہ لیا جائے، نئی تبدیلیوں اور جدید حالات کی روشنی میں علوم اسلامیہ اور دینی تعلیم کے مستقبل پر غور کیا جائے اور اندرون و بیرون ملک کے فضلاء و مفکرین و ماہرین تعلیم کے علم و تجربہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے۔

ہم کو بڑی مسرت ہوگی کہ آپ بھی اپنی شرکت سے کارکنان ندوۃ العلماء و داعیان اجتماع کی حوصلہ افزائی فرمائیں اور اجتماع کو کامیاب بنائیں"۔

دعوت نامہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء اور دوسرے ذمہ داروں و ناظم اجلاس اور سبھی ارکان مجلس انتظامی ندوۃ العلماء کی طرف سے تھا۔ بڑی تعداد میں یہ دعوت نامہ ملک و بیرون ملک کی اہم شخصیات اور دینی مراکز، تنظیموں اور اداروں کو بھیجا گیا، اور ملک کے حالات ناسازگار ہونے، ایمرجنسی کے نفاذ کے باوجود بالکل خلاف توقع لوگوں نے اپنی تشریف آوری سے اجلاس کو غیر معمولی طور پر کامیاب بنایا، حضرت مولانا نے اس کے لئے اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا، مسجد دارالعلوم میں فجر بعد کی ان کی تقریریں ہلا دینے اور جھنجھوڑ دینے والی اور دلوں کو گرمانے والی ہوتی تھیں جسے مولوی سعید حسن مرتضیٰ ندوی مرحوم نے قلمبند کر دیا تھا، وہ روداد چمن مؤلفہ مولوی سید محمد الحسنی مرحوم کا حصہ ہیں۔

حضرت مولانا نے دعاؤں کا غیر معمولی اہتمام کیا تھا اور یکسوئی کے لیے مسجد ٹیلہ والی چلے جاتے اور گریہ وزاری کرتے، اجلاس کے ایام میں حضرت مولانا محمد احمد پرتاپگڈھی، حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندوی، حضرت مولانا عبیداللہ بلیاوی جیسے نیک نفس لوگوں کو دعا کے لیے لگا دیا تھا اور دوسری طرف حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی اور حضرت مولانا محمد انعام الحسن کاندھلوی نے اس کے لیے غیر معمولی اہتمام کیا تھا، البتہ اس بات کی کمی محسوس کی گئی کہ اپنے کسی اہم سفر کی وجہ سے جو پہلے سے طے کردہ تھا اور بیرونی ملک کا تھا، مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری طیب قاسمی اجلاس میں شرکت نہ فرما سکے جبکہ ایک اہم نشست کی ضروریات کے لیے ان کی شخصیت اور ان کے ادارے کے احترام میں ان کا نام [illegible] کے علاوہ ملک و بیرون ملک سے ایسی نمائندگی ہوئی جو ہندوستان کے حالات کو

دیکھتے ہوئے ناممکن سی نظر آرہی تھی، اور اجلاس کے غیر معمولی اثرات ملک وبیرون ملک میں ظاہر ہوئے، اور ندوۃ العلماء کی طرف رجوع بڑھا اور اس کے فضلاء کے لیے عمل کے میدان کھلے، فالحمدللہ علی ذلک۔

دو خاندانی حادثے اور ایک بڑا علمی خسارہ

ندوۃ العلماء کے تاریخی اور بین الاقوامی تعلیمی اجلاس سے پہلے اور پھر چند مہینے کے بعد دو عظیم خاندانی حادثوں سے ہمیں گذرنا پڑا، ایک والد ماجد جناب رشید احمد حسنی مرحوم کا حادثہ وفات جو اجلاس سے ایک دو ماہ قبل آبائی وطن تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں پیش آیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۳ رسال رہی۔

والد صاحب مرحوم سننے اور نہ بولنے کے باوجود دین کا ضروری علم حاصل کرلیا تھا اور لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا، دین و دنیا کی مفید اور غیر مفید باتوں کا فرق بھی خوب سمجھتے تھے، مسجد سے بڑا تعلق تھا، اور خود اس کی صفائی کرتے اور خدمت کرتے۔ نمازوں کے بہت پابند، مہمان نواز، اور ایک بزرگ ہستی تھے، مولانا سید عبدالحی حسنی سابق ندوۃ العلماء کو ان کا اتنا ہی خیال رہتا تھا کہ انہوں نے ان کے والد مولوی سید خلیل الدین کو ایک خط میں لکھا تھا کہ ہمیں رشید ویسے ہی عزیز ہیں جیسے عبدو (عبدالعلی) جو ان کے بڑے بیٹے اور بڑی ممتاز صلاحیتوں کے فرد تھے، اور بعد میں ندوہ کے ناظم بھی ہوئے۔ اور دونوں تقریباً ہم عمر تھے، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے غسل دیا، اور خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے نماز جنازہ پڑھائی، ماں باپ کا سایہ بڑے خیر و برکت کا باعث ہوتا ہے، والد صاحب کی وفات سے اس بات کا احساس ہوا، الحمدللہ انہوں نے حج کی سعادت بھی حاصل کرلی تھی، اس سفر میں ان کی رفاقت کا مجھے شرف حاصل ہوا، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے آمین۔

دوسرا حادثہ خالہ صاحبہ محترمہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم مرحومہ کا تھا جو ۲۸ رجنوری ۱۹۷۶ء کو لکھنؤ میں مختصر علالت کے بعد پیش آیا اور اس نے پورے خاندان کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا، وہ

ایک مربیہ، معلّمہ، مصنفہ، شاعرہ وادیب خاتون تھیں، ہفتہ دوشنبہ کو تکیہ رائے بریلی میں اپنے مکان پر ایک اجتماع منعقد کرتیں اور اس مین تعلیم کرتی تھیں، خاندان کی بچیوں کی تعلیم کا بھی انتظام کرتیں، خود پڑھاتیں، قرآن مجید، حدیث اور ضروری مسائل کی تعلیم کے ساتھ تربیت دینی کا بھی اہتمام کرتی تھیں، اور اس میں سنت کا بہت پاس رکھتی تھیں۔ تجارت کی سنت پر بھی عمل تھا اور کچھ ضرورت کا سامان رکھتیں جس سے آس پاس کے لوگوں کو بہت آسانی ہوجاتی تھی، ان کا بیعت وارادت کا تعلق اولاً حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی سے ہوا تھا، پھر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے تجدید کی جو ایک طرح سے خاندانی مرشد تھے، ۱۹۴۷ء میں اپنے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور اپنی والدہ ماجدہ اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ حج کو بھی گئی تھیں۔ عربی جہاز سے سفر تھا، اس میں بھی وقت کو ضائع نہ ہونے دیتیں اور جہاز میں مستورات میں تعلیم کرتی تھیں، حجاز کے قیام میں بھی ان کا یہ معمول رہا، اور تاعمر رہا، ماہنامہ ''رضوان'' نکلا تو اس کی معاون مدیرہ ہوئیں اور ہر شمارہ میں ان کا مضمون ہوتا، امام نووی کی مشہور تربیتی کتاب ''ریاض الصالحین'' کا اردو میں تشریحی عناوین کے ساتھ ترجمہ کیا جو بہت مقبول ہوا، ہماری والدہ صاحبہ سے عمر میں ۳ سال چھوٹی تھیں، ان کی عمر ۷۶ سال ہوئی، غفر اللہ لهما ورحمها رحمةً واسعةً۔

دو ہی دن کے بعد ندوۃ العلماء کی ممتاز وفائق علمی ودینی شخصیت مولانا عبدالباری ندویؒ نے ۳۰ / جنوری ۱۹۷۶ء کو لکھنؤ میں ۸۹ سال کی عمر وفات پائی، وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مجاز بیعت خلیفہ بھی تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

مغرب اقصیٰ (مراکش) میں دو ہفتے

مراکش کا ملک شمالی افریقہ کے مغربی کنارے واقع ہے، اور شروع عہد کے سعی و عمل سے وہ داخل اسلام ہوا، اور وہ بھی اس طرح کہ مسلمانوں کی علو ہمتی، جوانمردی کی ایک ایسی مثال سامنے آئی کہ مسلمانوں کے مجاہد داعیوں نے شمالی افریقہ میں اپنی فتوحات کو

جاری رکھتے ہوئے بالکل ساحل کنارے تک پہونچادیا اور اس کے بعد سمندر میں بھی داخل ہوئے اور کہا کہ اے اللہ! ہم اتنا ہی کر سکتے ہیں آگے جانے کا موقع ہوتا تو ہم آگے بھی جاتے۔ اس جگہ کا نام اسی مناسبت سے ہے اور مراکش کی آبادی مقامی اور عربوں کی آبادی پر مشتمل ہے لیکن اس وقت صرف مقامی آبادی تھی اور وہ سب اسلام کی خوبیوں سے متاثر ہو کر اسلام میں داخل ہوئے تھے، وہ بربر کہلاتے تھے اور بہادری میں وہ امتیاز رکھتے تھے جو ان کی نسلی صفت تھی، اسلام کی یہ تاثیر تھی کہ ایسے اولوالعزم بجائے اپنی بات پر اڑنے کے اچھی بات سن کر اس کو قبول کرلیں، بربر کا لفظ ان کی بہادری اور اولوالعزمی کا عنوان بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اردو زبان میں بربریت، سختی اور ظلم کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے جو اردو زبان میں محاورہ بن گیا۔ یہ اسلام کی خوبی کی بات ہے کہ مشرق سے مغرب تک وہ خاص نسلیں جو بہادری اور اولوالعزمی میں معروف سمجھی جاتی ہیں، وہ سب پوری کی پوری مسلمان ہوگئیں، جیسے مراکش اور اس کے اطراف میں بربر قوم، عراق اور ترکی کے علاقوں میں تاتاری و ترک اور اس کے قرب و جوار میں مغل، یہ مضبوط اور اولوالعزم قومیں ہیں جو اسلام میں داخل ہوئیں، اسی طرح افغانی قوم ہے جو پوری کی پوری اسلام میں داخل ہوئی، ان کے ناموں کے ساتھ اولوالعزمی اور عالی حوصلگی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اسپین، مراکش میں پہلے اموی عہد میں فاتحین کے ذریعہ اسلام داخل ہوا، اور اندلس میں بڑی اسلامی حکومت قائم ہوئی اور کئی سو سال تک مسلم اقتدار اسپین میں رہا اور مراکش جسے مغرب اقصیٰ بھی کہتے ہیں۔ عباسی عہد میں مسلم داعی کے داخلہ سے اسلام پھیلا اور اسلامی اقتدار قائم ہوا، جس کے بانی اور پہلے شخص ادریس اکبر تھے جو حضرت عبداللہ المحض بن حسن مثنی بن سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں۔

تاریخی تصور و مطالعہ سے ہٹ کر دیکھا جائے تو بربر اور عرب قوم کا فرق بھی ختم ہو گیا اور بربر قوم عرب قوم کی طرح ہوگئی۔ یہاں تک کہ خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے گاڑی پر جاتے ہوئے کہا کہ یہاں اتنے دنوں سے ہیں مگر کوئی بربر نہیں دیکھا، ڈرائیور نے کہا: ہمیں دیکھ لیجئے ہم بربر ہیں۔

مراکش مغرب اقصیٰ میں مسلمانوں نے تعلیم کی طرف بڑی توجہ شروع کی اور اس میں انہوں نے دنیا کی رہنمائی کی۔ اندلس اور مراکش کو اس میں سبقت حاصل ہوئی اور دنیا کو خوب فیض پہونچا۔ یہاں کے شروع کے مدرسوں میں جامعہ القرویین کا نام بہت اہمیت سے لیا جاتا ہے جیسے بغداد کا جامعہ نظامیہ تھا مگر وہ باقی نہ رہا، تیونس کا جامعہ زیتونہ، مصر کا جامع ازہر عالم اسلام کے قدیم اور ابتدائی دینی و علمی مراکز ہیں۔

جامعہ القرویین کا کتب خانہ بڑا اہم اور زبردست کتب خانہ ہے، یہاں ہمیں یہ چیز نئی مگر قدیم نظر آئی کہ جب کاغذ ایجاد نہیں ہوا تو کتابیں اور اوراق کے لیے پھیلی ہوئی چیزیں اختیار کی جاتی تھیں، مثلاً ہرن کے بازو کے قریب کی جھلی خاص طور پر استعمال ہوتی تھی، کہتے ہیں کہ ایک ہرن سے دو ایسی جھلی حاصل کی جاسکتی ہیں، ورنہ لکڑی کی تختیاں اور اس طرح پھیلی ہوئی چیزیں استعمال ہوتی تھیں، قابل ذکر بات یہ ہے کہ میں نے وہاں ایسی کتابیں دیکھیں جو ہرن کی جھلی کے اوراق میں لکھی ہوئی ہیں۔ ایک خاص بات وہاں یہ دیکھی کہ اسلام کے وہاں پھیلنے کے بعد قبلہ کا رخ سورج کے طلوع و غروب سے اندازہ لگا کر متعین کیا گیا تھا، اندازہ میں تھوڑی غلطی ہوگئی اور تھوڑا سا ترچھا رُخ ہی سمجھا گیا اور مسجدیں اسی کے مطابق بنادی گئیں، چنانچہ مسجدوں میں صفیں اسی اعتبار سے بنائی گئی تھیں، اس وقت کی جو مسجدیں باقی رہیں تو اس میں قبلہ کا رُخ ترچھا ملتا ہے اور اس کو صحیح کرنے کے لیے نماز سے پہلے جیسا کہ عادت ہے: ''استقیموا و اعتدلوا'' اس کے بجائے وہاں امام اعلان کرتا ہے ''انحرفوا''، کہ ذرا ترچھا ہو کر نماز پڑھیں، وہاں لوگوں کی بڑی خصوصیت یہ دیکھی کہ اپنے عروج کے عہد کی اسلامی خصوصیت کو بعد میں پیدا ہونے والی خصوصیات کے بجائے اختیار کرنے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں، مسلمانوں کے شروع کے عہد کی اصطلاحات کو موجودہ دور کی نئی اختیار کردہ اصطلاحات پر ترجیح دیتے ہیں، مثلاً سابق عہد میں سکریٹری کے لئے کاتب کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا اور عربوں کے مشرقی ممالک میں جہاں انگریزوں کی بھی حکومت رہی، فرانس کی بھی حکومت رہی، بہت سے الفاظ، اصطلاحات کی ایک تعداد پڑوس کی زبانوں کے مزاج کی اختیار کی گئیں، مثلاً مصر وغیرہ میں ٹیلیفون کو التلفون جبکہ

عربی مزاج کے لحاظ سے استعمال کرنے والا لفظ الهاتف اختیار کیا گیا، جو شام وعراق وغیرہ میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح سکریٹری کے لئے امین کا لفظ استعمال کرتے ہیں جبکہ شروع عہد میں ایسے اہم عہدے کے لئے کاتب کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اور سکریٹری جنرل کے لئے کاتب عام استعمال کرتے ہیں اور یہاں عرب ممالک میں امین عام استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح متعدد الفاظ کا فرق ملتا ہے، اس سے اندازہ ہوا کہ عام طور پر مشرقی علاقہ کے لوگوں نے اپنے پڑوس کے یورپین بعض اصطلاحوں کو اپنی زبان میں داخل کرلیا ہے۔ لیکن مراکش (مغرب اقصیٰ) اور الجزائر کے لوگوں نے نہیں قبول کیا، اور یہ بات کسی لحاظ سے صحیح بھی ہے کہ عربوں کی قدیم اصطلاحات جدید کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہیں، مراکش کا علاقہ اسپین کے علاقہ سے بالکل قریب ہے۔ صرف ایک پتلی پٹی دونوں کو جدا کرتی ہے۔ اس لئے مراکش پہونچنے کے بعد اسپین میں داخلہ کا عربوں نے اقدام کیا، اور اس جرأت اور اولوالعزمی وعلو ہمتی کے ساتھ داخل ہوئے جو تاریخ میں قدردانی کے ساتھ ذکر کی گئی ہے، طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر وغیرہ کے اہم نام ہیں، طارق بن زیاد جو بڑا خطیب اور بڑا اولوالعزم شخص تھا، نوجوان تھا جن کشتیوں سے آیا تھا ان کشتیوں کو جلادیا اور فوج سے کہا تم لوگ واپس جانے کو نہ سوچو، ہمیں یہیں رہنا ہے، کامیاب ہوں یا ناکامیاب اور اس طرح عربوں نے فتح حاصل کی اور کئی صدی عرب وہاں حاکم رہے لیکن پھر جو بھی اسباب ہوں، دعوتی کام ایسا سامنے نہ آسکا کہ وہاں سب مسلمان ہو چکے ہوتے، عمارتوں کی تعمیر اور علمی وسائنسی ترقی وغیرہ اپنی جگہ رہیں مگر نتیجہ یہ نکلا کہ صدیوں کے بعد وہ وہاں سے بے دخل کئے گئے، اور یورپی نسل کے لوگ پھر حاکم ہو گئے اور مزید ایک سو سال کے بعد ملک چھوڑ کر اپنی معمولی تعداد کی وجہ سے شمالی افریقہ واپس جانے پر مجبور ہوئے۔

مراکش (مغرب اقصیٰ) درحقیقت ایک بڑا جزیرہ ہے جو شمالی افریقہ کے کئی ملکوں مثلاً مصر کے مغرب میں شمالی افریقہ کا علاقہ ہے۔ اس میں لیبیا سے لے کر تین چار ملک بنتے ہیں۔ جن میں تیونس، پھر الجزائر، پھر مراکش، پھر دوسرے ممالک ہیں، ان میں الجزائر اور مراکش کا رقبہ بہت وسیع ہے، لیکن آبادی کم ہے جو عام طور پر ان کے شمالی حصوں میں پائی

جاتی ہے اور جنوبی حصہ عام طور پر صحرائی ہے، جس میں بڑے شہروں کے اعتبار سے مراکش کو امتیاز حاصل ہے۔ بطور مثال، رباط، فاس اور دار بیضاء ہیں، مراکش میں شاہی نظام ہے، یہاں حسنی سادات کی ایک خاندانی حکمرانی ہے۔ ہم لوگ وہاں گئے تو شاہ حسن کی حکومت تھی۔ باقی ملکوں میں جمہوری نظام ہے، جمہوری نظام والے ممالک جو ہیں وہ عام طور پر یورپ کی حکومتوں کی تابعداری میں رہے ہیں، اور سیاسی وثقافتی لحاظ سے وہ زیادہ متأثر ہیں، اور ان سارے ممالک مراکش، الجزائر وغیرہ میں جو فقہی مسلک رائج ہے وہ بھی اپنا الگ ہے، وہ امام مالکؒ کے شاگردوں کے اثر سے مالکی ہے، امام مالک کا مسلک عام طور پر ایسے علاقوں میں زیادہ پھیلا جہاں کی زمین صحرائی انداز رکھتی ہے، اور ساحلی انداز بھی رکھتی ہے، چنانچہ لیبیا سے مراکش تک عام طور پر مالکی مسلک رائج ہے۔ مسلکوں کے اختیار کرنے میں دو سبب نمایاں رہے ہیں، ایک تو عظیم القدر علماء کی تعلیم وصحبت سے جو مالکی تھے، اور دوسرے یہ کہ مالکی مسلک میں وہ سہولتیں ہیں، جو صحرائی علاقوں میں زیادہ مطابق حال ہیں، اسی لئے جس طرح یہاں مالکی مسلک رائج وغالب ہے، دنیا کے ان علاقوں میں جہاں ندی اور پانی کی فراوانی ہے، وہاں حنفی مسلک عام طور پر رائج ہے اور جو ساحلی سمندری مقام ہیں وہاں شافعی مسلک زیادہ پھیلا، وہاں غذائی لحاظ سے سمندر کی ہر چیز کھائی جا سکتی ہے، اس کا بھی اثر مسلک پر ہوا، یہ کلیہ نہیں ہے، اس کے خلاف بھی نظر آتا ہے، مگر جغرافیائی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ چیز کھلی طور پر نظر آتی ہے۔

حضرت مولانا کے ساتھ سفر میں ہونے کی بنا پر مراکش میں مدارس دیکھنے اور علماء سے ملنے کا موقع ملا، حضرت مولانا نے وہاں کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ناصحانہ تقریریں بھی کیں اور وہاں کے آثار کی سیر بھی کی کہ اس سے ایک پوری علمی، دینی، دعوتی اور فتوحات کی تاریخ وابستہ ہے کہ خاص طور پر جب اسپین میں مسلمانوں کو عیسائیوں کی طرف سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، تو مراکش کے امیر المسلمین یوسف بن تاشفین نے پیش قدمی کی اور مسلمانوں کو استحکام دیا، اس طرح کچھ صدیاں مسلمانوں کو اسپین میں اور مل گئیں۔

ملک حسن سے قصر ملکی میں مہمانوں کے ساتھ ایک اچھی ملاقات ہوئی، وہیں

مہمانوں کا تعارف وہاں کے بڑے عالم شیخ محمد الفاسی نے کرایا اور پھر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے کلمۃ الوفود کہنے کی فرمائش کی، انہوں نے بادشاہ کو خطاب کرتے ہوئے توجہ دلائی کہ:

> ”میں آپ کو عالم اسلام کی طرف سے ایک بہت عزیز پیغام پہونچانے کی سعادت حاصل کرتا ہوں، وہ یہ کہ آج دنیا کے مسلمان بے چینی سے اس کے منتظر ہیں کہ عالم اسلام کے افق سے کوئی نیا ستارہ طلوع ہو، مسلمان اس وقت ایسے غیر معمولی حالات سے گذر رہے ہیں جن میں کوئی غیر معمولی ہی قائدانہ شخصیت ان کی مشکل کشائی کر سکتی ہے، جو غیر معمولی قوت ایمانی، عزم راسخ اور اخلاص کامل سے متصف ہو، اور جو سیاسی اغراض و مفادات سے بلند ہو کر رضائے الٰہی اور خدمتِ اسلام کا عہد کرے۔ اس کے لیے آپ کے والد نامدار سلطان محمد الخامس پر لوگوں کی نگاہیں پڑنے لگی تھیں لیکن ان کو جلد پیام رحیل آ گیا، کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ سے یہ کام لینا چاہتا ہو۔“

اس کے جواب میں شاہ حسن بن محمد الخامس الحسنی نے برجستہ تقریر کی جو صحیح اور فصیح عربی میں تھی اور انہوں نے مسکرایا اور شکریہ ادا کیا۔

مراکش کا یہ سفر دو ہفتے کا رہا، جو مدینہ منورہ سے شروع ہوا تھا اور تیونس، الجزائر کے راستہ سے طے ہوا تھا، تیونس اترنے کا موقع ملا، مگر الجزائر میں اترنے کا موقع نہیں ملا۔ اس سفر میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا وفد بھی ساتھ تھا جس کے سربراہ شیخ الجامعہ، شیخ عبدالمحسن بن عباد تھے اور مشہور اخوانی عالم و مفکر و داعی شیخ محمد الغزالی بھی ہمراہ تھے اور یہ سفر رابطۃ الجامعات الاسلامیہ مراکش کی دعوت پر تھا جس کا جلسہ رباط میں تھا اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس کے رکن تھے، رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل شیخ محمد صالح قزاز بھی مدعو تھے، لیکن وہ کسی دوسری مصروفیت کی وجہ سے شرکت سے معذور تھے، انہوں نے اپنے بجائے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو نمائندہ منتخب کر دیا اور بطور مرافق کے ان کے ساتھ میرے بھی سفر کے سارے

انتظامات کردیے، یہ سفر ۶ رمئی ۱۹۷۷ء سے شروع ہوا اور جدہ سے الدار البیضاء کے لیے روانگی ہوئی، الدار البیضاء میں ایک رات دو دن قیام رہا، جہاں حضرت مولانا کے لئے سب سے اہم ان کے استاد علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی سے ملاقات تھی، ۷ رمئی کو مکناس میں جمعہ پڑھا، یہیں شیخ تقی الدین ہلالی کا قیام تھا، ۸ رمئی کو فاس کا مرجع خیز تاریخی شہر دیکھا۔ جس کی بنیاد سیدی ادریس حسن الثانی نے ۱۹۳ھ میں رکھی تھی، انہوں نے اپنے فاس سے ایک خط کھینچ کر ان الفاظ میں اس کی بنیاد رکھی تھی کہ اے اللہ! اس کو ہمیشہ کے لئے علم وفقہ کا مرکز بنادے جہاں کے لوگ ہمیشہ سنت و جماعت کے حامل و پابند رہیں، اسی لیے اس کا نام فاس پڑ گیا اور یہ دعا ایسی قبول ہوئی کہ آج بھی یہ مرکز علم ودین ہے اور یہیں جامع القرویین ہے۔

۱۰ رمئی دوشنبہ کو دار السلطنت رباط آئے جہاں ۱۱ رمئی سے ۱۳ رمئی تک کانفرنس چلی۔

رابطۃ الجامعات الاسلامیۃ (League of Islamic Universities) کی رباط کانفرنس اور اہم شخصیات سے ملاقات

دار السلطنت رباط میں ۱۰ رمئی دوشنبہ سے ۱۶ رمئی سنیچر تک قیام رہا۔ ۱۱ رمئی منگل سے ۱۵ رمئی جمعہ تک موتمر جاری رہی، جس میں شرکت کے لئے یہ سفر تھا۔ یہاں حضرت مولانا نے "نحن الان فی المغرب" کے عنوان سے ایک تأثراتی ودعوتی مضمون بھی لکھا، جو اسمعیات کے طرز کا تھا۔

جن اہم شخصیات سے یہاں ملاقات ہوئی ان میں سرفہرست استاد محمد الفاسی صدر جمعیۃ الجامعات الاسلامیۃ ہیں جو شاہ مراکش ملک حسن ثانی کے استاد ومربی بھی ہیں، اور جامعہ محمد الخامس کے وائس چانسلر اور وزیر الثقافۃ والتعلیم بھی رہ چکے ہیں، اور یونسکو میں اللجنۃ الوطنیہ کے صدر اور مجمع اللغۃ العربیہ قاہرہ کے رکن ہیں۔

دار الحدیث الحسنیہ کی عمارت بھی دیکھی اور اس کا کتب خانہ دیکھا، افسوس کہ اس ادارہ کے پروفیسر استاذ عمر بہاء الامیری سفر پر تھے اس لئے ملاقات نہ ہوسکی۔

مغرب کی نمایاں شخصیات میں ایک استاذ ابوبکر القادری بھی ہیں جو استاذ علال فاسی

کی سیاسی پارٹی حزب الاستقلال کی مجلس عاملہ کے ممبر ہیں۔ اور جمعیۃ الشباب للنہضۃ الاسلامیہ کے صدر اور مجلّہ ''للایمان'' کے مدیر اور عالمی مسائل وحالات کے بڑے واقف کار ہیں۔ خود ملنے آئے، ان کا حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے قدیم تعلق اور مناسبت رابطۂ عالم اسلامی کے مؤتمرات کے ذریعہ سے ہے اور بعض کمیٹیوں میں ان کے ساتھ رفاقت بھی رہی ہے۔

ایک رات کو ڈاکٹر عبدالکریم خطیب نے اپنے مکان پر مدعو کیا، یہ بھی وہاں کی ممتاز شخصیتوں میں ہیں، اور بڑے ڈاکٹر اور سرجن ہیں۔ اس کے ساتھ اعلیٰ ذوق اور اسلامی وملکی مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں، وزیر بھی رہ چکے ہیں، اور الحزب الدستوری الدیمقراطی کے صدر ہیں، دعوت میں ہم لوگ اور ممتاز اہل علم وفکر جمع تھے، جن میں ایک ڈاکٹر مہدی بھی تھے جو بڑے اسلامی مفکر ہیں اور واشنگٹن میں مغرب (مراکش) کے سفیر رہ چکے ہیں، یہ بھی بڑے ڈاکٹر (میڈیسن) ہیں، اور علم النفس (سائیکلوجی) کے پروفیسر بھی ہیں۔ ڈاکٹر رشدی فکّار مصری بھی تھے اور شام کے ممتاز لبنانی عالم ڈاکٹر صبحی صالح بھی تھے، ڈاکٹر صبحی صالح سے ۱۹۷۳ء میں دورۂ لبنان میں مفتی جمہوریہ لبنان مفتی حسن خالد کے مکان پر اچھی ملاقات ہو چکی تھی جہاں انہوں نے ماموں جی کے تعارف اور خیر مقدمی میں تقریر بھی کی تھی، یہاں ایک واقعہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ کھانے کے بعد کچھ دیر گفتگو اور تبادلۂ خیال بھی آپس میں رہا، موضوع یہ تھا کہ کیا واقعی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے عہد میں وہ اختلاف رونما ہوئے اور انہوں نے خانہ جنگی کی شکل اختیار کی جن کو تاریخ نے بڑی بھیانک شکل میں پیش کیا ہے، اور جن سے ایک خالی الذہن آدمی جو صحبت نبویؐ کی کیمیا گری اور اسلام کی انقلاب آفرینی کی صحیح قدر و قیمت سے واقف نہیں ہے، یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ بشریت کے تقاضے سے ان میں نفسانیت کام کر رہی تھی، اور وہ اس بلند اخلاقی معیار پر باقی نہیں رہے تھے، جس پر مربی اعظم ﷺ ان کو چھوڑ کر گئے تھے، حیرت کی بات یہ ہے کہ رشدی فکّار جو ایک جدید تعلیم یافتہ فاضل اور علم الاجتماع کے پروفیسر تھے، بڑی طاقت اور طلاقت سے اس کی وکالت کر رہے تھے کہ تاریخ نے ان واقعات کے پیش کرنے میں رنگ آمیزی اور مبالغہ سے کام لیا ہے، یہ سب صحابہ اسی بلندی و اخلاقی سطح پر قائم تھے، جن پر رسول اللہ ﷺ نے ان کو تیار کیا تھا، جو کچھ پیش آیا وہ زندگی کی قدرتی علامت تھی جس

سے کوئی زندہ انسانی معاشرہ (اگر وہ مصنوعی نہیں ہے) خالی نہیں رہ سکتا، ان سب باتوں کے معقول وجوہ و منطقی اسباب موجود ہیں، اور وہ مفید نتائج کے حامل ہیں، اگر صحابۂ کرامؓ نفسیات کا شکار ہوئے تو دنیا کا کوئی معاشرہ مثالی معاشرہ کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا، ڈاکٹر صبحی صالح اس پر زور دیتے تھے کہ تاریخی واقعات کا انکار مشکل ہے۔ یہ سب بشریت کے تقاضہ سے پیدا ہوا، ہمیں تاریخ کو غلط رنگ میں پیش نہیں کرنا چاہئے، دعوت سے فراغت کے بعد ہم سب اپنی قیام گاہ آئے، اگلے روز ۱۱ر مئی سہ شنبہ (منگل) سے مؤتمر کا آغاز ہوا افتتاحی نشست میں حضرت مولانا کا بھی خطاب ہوا، جس میں یہ توجہ دلائی کہ:

> ''نبوت محمدیؐ کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے ''حاملین علم نبوت'' کے کاندھوں پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور احتساب کائنات کی ذمہ داری ڈالی، ان کو بگڑے ہوئے حالات سے پنجہ آزمائی پر مامور کیا، اور ان کو عملی زندگی کے میدان میں نکالا، اسی کا نتیجہ تھا کہ ان دانش گاہوں کا جو علوم نبوت کی صحیح بنیادوں پر قائم ہوئی تھیں اور ان کے فضلاء کا جو اپنے کو نائبین انبیاء سمجھتے تھے، زندگی سے رشتہ ہمیشہ استوار رہا، وہ زندگی کے رواں دواں دریا کے ساحل پر کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے والوں میں نہ تھے بلکہ اس منجدھار میں کود کر ڈوبنے والوں کو بچانے والے اور طوفان کا مقابلہ کرنے والوں میں تھے، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ علماء نے اکثر حالات میں نہ صرف یہ کہ جنگ آزادی، استخلاص وطن کی جدوجہد کا ساتھ دیا، بلکہ اس کی قیادت و رہنمائی کی، مغرب میں آپ کا جامعۃ القرویین اور جامعۃ الزیتونہ، مصر میں جامع ازہر اور ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء اس کی زندہ مثالیں ہیں۔''

مؤتمر کے صدر استاذ محمد الفاسی، سکریٹری استاذ محمد البشیر اور کنوینر ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن ترکی وائس چانسلر محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض منتخب ہوئے، سعودی عرب، مصر، لبنان، شام، عراق، شرق اردن، کویت، تونس، افغانستان، ترکی، سویت یونین، روس، نائجیریا، ایران، فلپائن، موریتانیا اور ہندوستان و پاکستان کے نمائندے کانفرس میں شریک ہوئے، کمیٹیوں کا قیام اور ضیافتوں کا سلسلہ بدھ ۱۲ر مئی تک رہا، ۱۳ر مئی جمعرات کو کچھ اہم

ملاقتیں اورزیارتیں ہوئیں،۱۴رمئی رباط کا مصروف ترین دن رہا، اور مؤتمر کی اختتامی نشست بھی جمعہ کوقبیل عصر ہوئی اور بعض دوسرے ذاتی پروگرام اور وزارۃ الثقافۃ کے زیر انتظام بعدعصر حضرت مولانا کا ایک اہم خطاب ہوا، ۱۵رمئی سنیچر کو علامہ علال فاسی جن کا چند دن پہلے انتقال ہوا تھا، کے متعلق الدار البیضاء میں حضرت مولانا کا خطاب ہوااور پھر مراکش شہر تشریف آوری ہوئی،۱۶رمئی اتوار کو وہاں کے اہم مقامات کی زیارت اوراہم شخصیات سے ملاقات کی اور ۱۷رمئی دوشنبہ کوشاہ مراکش سے ملاقات کی اوران کے سامنے اہم خطاب کیا، انہوں نے بڑی تکریم ومحبت کا معاملہ کیا،اس خاندانی نسبت کا بھی پاس رکھا جو ان دونوں میں قدرِ مشترک ہے کہ دونوں حسنی النسب ہیں، یہ شاہی دعوت و ملاقات ۱۷رمئی دوشنبہ کو قصر ملکی میں ہوئی، جہاں ایک مثلث دائرہ میں سب جمع ہوئے، ۱۸رمئی منگل الدار البیضاء روانگی ہوئی جہاں رات گذارکر ۱۹رمئی بدھ کو علی الصباح تبلیغی مرکز مسجد نور میں مختصر خطاب کر کے ایئر پورٹ گئے اور ساڑھے دس بجے پرواز لندن کے لئے ہوئی۔

رباط دارالحکومت مراکش میں رابطۃ الجامعات الاسلامیہ کی کانفرنس میں بلادعربیہ، ممالک اسلامیہ اور دوسرے ممالک کی اہم شخصیات نے شرکت کی تھی، پاکستان سے وہاں کے ممتاز عالم مولانا سید ابوبکر غزنوی مراکش کے لئے روانہ ہوئے مگر اثناء سفر لندن میں ایک موٹر حادثہ میں شہید ہو گئے، حضرت مولانا کوان کے ملنے کا شوق تھا،ان کی وفات کی خبر صاعقہ اثر بن کر گری اور بہت صدمہ ہوا۔حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے رباط کے تبلیغی مرکز مسجد نور میں جمعرات ۱۳رمئی کو خطاب کیا اوران کے ساتھ شیخ ابوبکر الجزائری استاد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ و مدرس مدینہ منورہ کا بھی بیان ہوا،تبلیغی جماعت کے یہاں امیر شیخ حمداوی بڑے فہیم اورمتوازن شخصیت رکھتے تھے،۱۴رمئی کادن جمعہ کا دن تھا جو بہت مصروف دن تھا۔اسی روز مؤتمر کی اختتامی نشست بھی تھی جس میں قراردادیں پیش کی گئیں،اور حضرت مولانا کا خطاب سنجیدہ وتعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے ''ازمۃ العالم الاسلامی الحقیقیۃ'' (عالم اسلام کا حقیقی بحران) پر جمعہ کو بعد عصر رکھا گیا تھا جس کا ریڈیو رباط نے اعلان بھی کردیا تھا، رباط میں متعین ہندوستانی سفیر نے لنچ پر مدعو کرنا چاہا تھا، دوسرے پروگرام سے ٹکراؤ کی وجہ سے معذرت کرنی پڑی اور دوسرے وقت ملاقات

پر اکتفا کیا گیا، سفیر صاحب کا نام ''گویا'' تھا اور وہ مغربی بنگال کے رہنے والے تھے، ہم لوگوں نے سابق بادشاہ سلطان محمد الخامس کی ضریح المسجد اور دوسرے تاریخی آثار کی بھی سیر کی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشغولیت کی وجہ سے نہیں جا سکے، رات کا کھانا مولائی مصطفیٰ علوی کے مکان پر کھایا (یہاں سادات کو مولائی کہا جاتا ہے) جہاں چیدہ و چنیدہ لوگ مدعو تھے، جس میں تونس کے برگزیدہ عالم و محقق علامہ الحبیب الخوجہ عمید کلیۃ الزیتونہ کا نام خاص طور پر اہم ہے اور تعلیم و تدریس میں انحطاط کے تعلق سے تبادلۂ خیال ہوا۔ علامہ حبیب الخوجہ نے اس کا شکوہ کیا، اور علمی بے مائیگی و سطحیت کو اس کا بڑا سبب قرار دیا۔

الدار البیضاء (Casablanca) اور مراکش شہر کی مصروفیت

سنیچر ۱۵ رمئی کو الدار البیضاء میں شیخ علال فاسی کا تعزیتی جلسہ تھا جس میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو خطاب کے لیے کہا گیا، ظہر کی نماز جامع محمد الخامس میں پڑھی گئی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خطاب میں کہا کہ ''مجھے اس کا بڑا قلق ہے کہ میں مغرب اس وقت آیا جب استاذ علال فاسی وفات پا چکے'' ہیں اور کہا کہ ''ان کی عملی زندگی کا آغاز ایک عالم دین سے ہوا، وہ جامع القرویین کے فیض یافتہ تھے، ان کے اور ہمارے ہندوستان کے ان علماء کے درمیان ایک چیز قدر مشترک ہے، جنھوں نے اپنے ملک میں تحریک آزادی کی قیادت و رہنمائی کی، وہ ایک طرف عالم دین دوسری طرف جنگ آزادی کے سپاہی اور رہنما تھے، ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے جدید سیاسی نظاموں اور فلسفوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، ان کی معلومات ''سکینڈ ہینڈ'' نہیں تھیں، تیسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہندوستان اور وہاں کے علماء، مصلحین و مفکرین اور ان کی کتابوں اور افکار سے بہت واقف تھے، خاص طور پر حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلی کی حجۃ اللہ البالغہ سے بہت متاثر تھے''۔

الدار البیضاء سے مراکش شہر کا سفر ہوا، مراکش جسے عربی میں المغرب اور انگریزی میں Morocco کہتے ہیں، دارالحکومت مراکش اور رباط میں تبدیل ہوتا رہا ہے، اتوار ۱۶ رمئی ۷۴ء کو مراکش شہر کے تاریخی آثار کی سیر کی گئی، مولائی حسن ثانی شاہ

مراکش میں موجود تھے، ان سے ملاقات کا بھی وقت نکالا، اور آثار مراکش کی سیر کا بھی وقت ملا، مراکش شہر کی بنیاد امیر المسلمین یوسف بن تاشفین نے ڈالی تھی جو ۴۷۰ھ کی ہے، سلطان محمد غزنوی کی وفات سے ۲۱ رسال قبل کی ہے اور ایک ہی عہد کے یہ دو عظیم مسلم فاتح اور اولوالعزم قائد تسلیم کیے گئے جن کو تاریخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی، دوسرے اہم شہروں طنجہ اور قطوان نہ جانے کا افسوس رہا، قطوان میں شیخ محمد العربی الہلالی اقامت پذیر ہیں، ان کی خواہش تھی کہ قطوان کا سفر ہوتا مگر طے شدہ پروگرام کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا۔

جہاں تک مراکش کے تاریخی آثار کا تعلق ہے، علماء وائمہ کے مقابر میں الشفاء فی حقوق المصطفیٰ کے نامور مصنف فخر نواب قاضی عیاض، سیرت ابن ہشام جس کی تدریس عرصہ سے میرے ذمہ ہے اور اس سے ہمیں بڑا تعلق ہے، اس کے شارح امام سہیلی اور حزب واوراد کی مشہور کتاب ''دلائل الخیرات'' کے مصنف شیخ محمد بن سلمان جزوی اور دوسرے مشائخ واولیاء میں شیخ ابوالعباس اسبقی اور شیخ ابو یعقوب یوسف بن علی کے مقابر پر حاضری دی، سلاطین وملوک میں امیر المسلمین یوسف بن تاشفین بانی مراکش اور مولائی سلیمان موجودہ بادشاہ کے اجداد کی قبر پر حاضری دی اور پوری تاریخ ذہن ودماغ میں پھرنے لگی، مسجد المرابطین، جو مسجد الموحدین میں بدل گئی، یہ یعقوب المنصور الموحد کی تعمیر ہے، دیکھی جو رباط کا بانی تھا، علی بن یوسف کی مسجد سے بھی گذرے اور اس کا مدرسہ بھی دیکھا، منارۂ کتبیہ (Kutubiyya) بھی دیکھا جو سات منزلہ ہے، دوسو ستر فٹ طویل اور پچاس فٹ چوڑا ہے، جبکہ دہلی کا قطب مینار ۲۲۸ فٹ بلند اور ۴۷ ۳/۱ فٹ چوڑا ہے، منارۂ کتبیہ دہلی کے قطب مینار سے چار سال پہلے تعمیر ہوا ہے، یہ جامع کتبیہ کا ہے کتبیہ اس لیے کہتے ہیں کہ ۸۰۰ آٹھ سو کتب فروشوں کی دکانیں تھیں، جیسا کہ قطب مینار مسجد قوت الاسلام دہلی کا مینار ہے، اس طرح اور بہت سے آثار تھے۔ الحمد للہ سفر سے جو دو ہفتے کا تھا، واپسی ہوئی تفصیلی احوال کے لئے ملاحظہ ہو دو ہفتہ مغرب اقصیٰ (مراکش) میں از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی۔

آل ورلڈ اسلامک ایجوکیشن کانفرنس مکہ مکرمہ ۱۹۷۷ء

انٹرنیشنل اسلامی تعلیمی (All world Islamic Education Confrence) کانفرنس کا بادشاہ سعودی عرب شاہ خالد کی سرپرستی وہدایت پر وزارت تعلیم کی زیر نگرانی اور جامعہ ملک عبدالعزیز کے زیر انتظام مکہ مکرمہ میں ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء میں انعقاد ہوا، ایسی بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس کے انعقاد کی تجویز ندوۃ العلماء کی بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۱۹۷۵ء/۱۳۹۵ھ میں آئی تھی۔ سعودی عرب اور پھر مکہ معظّمہ میں اس کے انعقاد سے بہتر جگہ اور اس سے بہتر داعی کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا، اس بات کا بھی ان لوگوں نے اہتمام کیا کہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے رائے ومشورہ بھی لیں اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ سعودی عرب کے وزیر تعلیم حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بڑی قربت رکھتے تھے، اور ان کا ان کے دل میں بڑا احترام تھا، ندوۃ العلماء کے کئی اساتذہ اور مستند فضلاء اپنے بحوث ومقالات کے ساتھ شریک ہوئے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مختلف ممالک کے ذمہ دار اور نمائندہ اہل علم واہل فکر کے سامنے بڑی قوت وصراحت سے یہ بات رکھی جس کو اگلے سال پاکستان کی کانفرنس کے دورے میں ایک جگہ بھی دوہرائی کہ ''معاملہ کہیں زیادہ سنگین اور نازک ہوجاتا ہے جب کسی اسلامی ملک کا معاملہ ہو، اسلامی ملک میں وہ مسلمان آبادی ہے جو اپنی ایک شخصیت رکھتی ہے، اُس کی ایک ملی شخصیت ہوتی ہے، اور ایک پیغام ہوتا ہے کہ دنیا میں ایک فرض انجام دینا ہے، اگر تعلیم کا نتیجہ بس اپنی فکر، اپنے جذبات، اپنی شخصیت، آپسی ٹکراؤ، ذہنی انتشار اور صرف اپنی ترقی اور خوشحالی کے لئے ایک دوڑ ہو، نہ ملک کی تعمیر اور نہ ملک کی آبادی کی فلاح وبہبود کی فکر اور نہ دوسروں کی خیر خواہی اور ان کے جذبات واحساسات کا خیال ہو تو یہ نصاب و نظام تعلیم کا خطرناک پہلو ہے جس پر ہمارے دینی مدارس اور اسکول وجامعات کے ذمہ داروں کو بھی غور کرنا چاہئے کہ قدیم نظام تعلیم کے لوگ جدید نظام تعلیم کے لوگوں میں اور جدید نظام تعلیم کے لوگ قدیم نظام تعلیم کے لوگوں میں فٹ نہیں ہو پاتے، اور ان کے

درمیان ایک زبردست خلیج ہوتی ہے، اس خلیج کو پاٹنے کی ضرورت ہے، ہمارے اسلامی نظام تعلیم کے لوگ عصری نظام تعلیم کے لوگوں میں بیگانہ نہ ہوں اور پھر یہ کہ دانش گاہوں سے نکلنے والے کم سے کم اپنے دینی معتقدات سے بیگانہ ہوں، اس کانفرنس کا اثر عالمی پیانہ پر پڑا اور یہ ایک نتیجہ خیز کانفرنس ثابت ہوئی، کانفرنس کے اختتام پر مکہ معظمہ میں چند دن گذار کر مدینہ طیبہ حاضری دی گئی اور سلام پیش کیا، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کا بھی وہیں قیام تھا، ان کی شفقت حاصل ہوئی۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ وکناڈا کا دورہ (اواخر مئی تا اوائل اگست ۱۹۷۷ء)

ریاستہائے متحدہ امریکہ وکناڈا کا یہ دورہ وہاں کی مشہور تنظیم ایم.ایس.اے. (Muslim Association America and Canada) کی دعوت پر ۱۹۷۷ء کے موسم گرما میں کیا گیا جو اس کی سالانہ کانفرنس منعقدہ بلومنگٹن (Bloomington) انڈیانا (Indiana) کے موقع پر کیا گیا جس کی تفصیل ''دو مہینے امریکہ'' میں ایک مستقل کتاب کے نام سے راقم کے قلم سے نکلی جس کے تین ایڈیشن الحمدللہ نکل چکے ہیں۔

یہ سفر ۲۷رمئی ۱۹۷۷ء سے شروع ہوکر ۶رگست ۱۹۷۷ء کو ختم ہوا، دہلی واپسی پر معلوم ہوا کہ ہمارے قریبی عزیز اور رشتہ کے ماموں جناب سید محمد یامین حسنی نہیں رہے جس کا طبیعت پر اثر پڑا، اس سفر میں چوں کہ خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی آنکھ کا آپریشن تھا اور سفر کے وقت دہلی میں نظام الدین مرکز میں وہاں کی ایک مؤثر شخصیت ترجمان تبلیغ مولانا محمد عمر پالنپوری نے یہ بات تاکیداً کہی تھی کہ کسی یہودی ڈاکٹر سے آپریشن نہیں کرایئے گا، ان کا اعتبار نہیں ہوتا، عیسائی ڈاکٹر کا انتخاب ہوا اور اس ڈاکٹر نے یہ شرافت کا معاملہ کیا کہ آپریشن کی فیس بھی نہیں لی، یہ کہہ کر کہ ہم اسکالروں سے فیس نہیں لیتے، ایک تجربہ اور بھی ہوا جس سے انسانوں کے طبائع کے فرق اور کسی بات کو محسوس کر کے دل پر لے لینے اور انتقام کے جذبہ کی بات ظاہر ہوئی کہ ایک پروگرام جو فلاڈلفیا میں تھا جہاں آپریشن طے تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بیان رکھا گیا، اسلام اور مسلمانوں کو جس طبقہ

سے زیادہ نقصان پہونچا اس کا بھی ذکر کیا، ہم نے اس شبہ میں کہ اس طبقہ کا بھی کوئی فرد یہاں موجود ہوسکتا ہے، ماموں جی کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر روکنا چاہا، ماموں جی سمجھ گئے اور رُک گئے، مگر وہ بات جوان صاحب نے محسوس کی وہ نکل چکی تھی، وہاں تو وہ بہت اخلاق سے پیش آئے اور جب اسپتال میں زیر علاج رہے تو وہاں بھی بہت اخلاق برتتے مگر ان کے زیادہ اخلاق برتنے سے ہمیں اور شبہ ہوا کہ کہیں یہ وہی صاحب نہ ہوں اس لئے کہ ہم لوگوں کا تعلق لکھنؤ سے ہے جہاں اس معاملہ میں ایک خاص طبقہ وفرقہ کے تعلق سے بڑی حساسیت پائی جاتی ہے، وہ اہتمام سے کھانا لاتے تھے مگر ایک دن بھی اس کھانے کو استعمال میں نہیں لائے، اور ان کو بعد میں برتن صاف کر کے دے دیئے جاتے تھے، وہ سمجھے کہ ان کا کھانا ہم لوگوں نے بہت شوق سے کھایا ہوا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ بھی کہ وہ کھانا بہت اچھا پکاتے ہیں اور ان کے گھر کے لوگ باہر ہیں اس لئے وہ خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر لا رہے ہیں، ہم لوگوں کی جب لکھنؤ واپسی ہوئی تو ماموں جی کے نام ان کا کھرّا آیا کہ جس میں ابتدائی جملوں کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سخت گالی لکھی تھی، اور پھر اس کے تعلق سے بھی لکھا تھا کہ کھانے میں یہ یہ ملایا تھا، نجاست کی طرف اشارہ تھا، ہم لوگوں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ایک بار بھی ہم لوگوں نے وہ کھانا نہیں کھایا۔

یہ دورہ علاج ومعالجہ کے علاوہ دعوتی وفکری اعتبار سے بھی مفید ثابت ہوا اور اس دورہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی مجموعی طور پر بیس تقریریں ہوئیں، جن میں سے عربی اردو تقریریں نصف نصف تھیں، عربی مجموعہ "أحاديث صريحة في أمريكا الشمالية" کے نام سے اور اردو مجموعہ "نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں" کے نام سے طبع ہوا، جہاں تک اردو مجموعہ کا تعلق ہے، اس کے جمع وترتیب اور قلمبند کرنے کا کام عزیز گرامی مولوی قاضی سید مشتاق علی ندوی بھوپالی نے کیا، اور عناوین مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم نے قائم کئے، یہ مجموعہ جب حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کو پہونچا تو انہیں اس قدر پسند آیا اور اس کے عام ہونے کا ان کے اندر ایسا شدید تقاضا ہوا کہ بڑی تعداد میں اپنے ذاتی خرچ پر نسخے حاصل کر کے تقسیم کرائے۔

اس دورۂ امریکہ میں وہاں کی پانچ مشہور یونیورسٹیوں کولمبیا یونیورسٹی نیویارک، ہارورڈ یونیورسٹی کیمبرج، وٹرائٹ یونیورسٹی آن آربر، جنوبی کیلیفورنیا یونیورسٹی لاس اینجلس اوراوٹا پورتی یونیورسٹی سالٹ لیک سٹی میں بھی حضرت مولانا کا خطاب ہوا، اس کے علاوہ ٹورنٹو اورڈٹرائٹ کی جامع مسجدوں میں جمعہ کا خطبہ بھی دیا، اردو کی اہم تقاریر میں ایک اہم تقریر مسلم کمیونٹی سینٹر شکاگو (Muslim Community Centre Chicago) کی بھی تھی، جو امریکہ میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایک مجمع کے سامنے ہوئی، یہ تقریر مجموعہ تقاریر میں ''امریکہ میں مجھے کیا ملا، کیا نہیں ملا؟ مشینوں کی بہار، علم وصنعت کی ترقی، آدمیت کا زوال'' کے عنوان سے مجموعہ کی پہلی تقریر ہے:

ایک تقریر ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کے ڈیونٹی کالج (Divinity College) کے ہال میں کی گئی، جس کا ترجمہ عزیز فاضل مولوی مزمل حسین صدیقی ندوی نے کیا، اس سے قبل تعارفی تقریر ان کے بھائی مدثر حسین صدیقی نے کی، جلسہ میں یونیورسٹی کے اساتذہ، اسکالرز اور طلبہ نیز مختلف علاقوں سے آئے ہوئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کثیر تعداد شریک تھی، جلسہ کا آغاز قاری نے جو ایک امریکی نژاد بلالی مسلمان تھے، سورۂ والتین کی تلاوت سے کیا، یہ تقریر اردو مجموعہ تقاریر کی دوسری تقریر ہے جس کا عنوان ہے، ''اس خطۂ زمین کو دین فطرت کی نعمت ملتی تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی''، امریکہ بیک وقت خوش قسمت، بدقسمت ملک اور پھر اس کی وضاحت کی ہے کہ یہ بڑا خوش قسمت کیوں ہے؟ اور بڑا بدقسمت کیوں ہے۔ یہ تقریر بھی ایک طرح کی پیشین گوئی تھی جو آج چالیس سال سے زائد عرصہ گذرنے پر ہر ایک پر آشکارہ ہے۔

اسلامک سنٹر واشنگٹن کی تقریر بھی بہت اہم تھی جس میں ہندوستانی، و پاکستانی طلبہ اور عرب طلبہ وفضلاء اور امریکہ کے دارالحکومت میں کام کرنے والے مسلمان اور خواتین موجود تھیں، جلسہ کا آغاز ایک مصری قاری نے سورہ کہف کے رکوع ''واضرب لهم مثلاً رجلين جعلنا لأحدهما جنتين من اعناب الخ'' سے کیا، اور اسی کو موضوع بنایا گیا، اور بتایا گیا کہ ''امریکہ کی مشینیں اور فیاضیاں ضائع ہو رہی ہیں اور سخت خطروں سے دوچار ہیں، اس کو آج نبوت کی دی ہوئی تعلیمات کی ضرورت ہے، اور بتایا گیا کہ یہاں

سب کچھ ہے مگر کمی کس چیز کی ہے اور کوئی امریکہ کا دوست اور اس کا مخلص نہیں، اس لیے کہ امریکہ اپنے دوستوں کے لئے مخلص نہیں، اور یہ توجہ دلائی گئی کہ ان سب ترقیات کے ساتھ جن پر امریکہ کو فخر اور جن کے ذریعہ امریکہ کی دنیا پر حکومت ہے، ایک بات کا اضافہ کرلیا جائے تو بات بن جائے گی، وہ ہے "ماشآءَ اللّٰہ لاقوۃ الا باللّٰہ"۔

۳؍جون ۱۹۷۷ء کو اقوام متحدہ (United Nation) نیویارک کی عظیم عمارت کے ایک ہال میں جمعہ کا خطبہ دیا گیا تھا، جہاں مسلم وعرب ممالک کے دفاتر میں کام کرنے والے نماز جمعہ ادا کرتے ہیں، نماز میں شریک ہونے والوں میں عربوں کی تعداد غالب تھی، جن میں رابطۂ عالم اسلامی کے دفتر کے اور اقوام متحدہ کے ذمہ دار کارکن نمایاں نظر آتے تھے، نماز کے بعد خطبہ کا ترجمہ انگریزی میں مولوی مزمل حسین صدیقی ندوی رام پوری نے کیا، عربی تقریر کا اردو ترجمہ کا مجموعہ چھپا، یہ مولانا شمس الحق ندوی مدیر تعمیر حیات کے قلم سے ہے، جس کا عنوان ہے ''مسلمان کا مقام اور پیغام''۔

۴؍جون ۱۹۷۷ء کو شمالی امریکہ کے شہر نیوجرسی (New Jersey) کے اسلامک سنٹر میں تقریر ہوئی، جس سے قبل حضرت مولانا کا تعارف فاضل مصری عالم ڈاکٹر سلیمان نے کرایا، جس میں حضرت مولانا کی دینی ودعوتی خدمات کے ساتھ برصغیر کے مسلمانوں کی خدمات کا بھرپور تعارف کرایا، اور بتایا کہ عجمی مسلمان عرب مسلمانوں سے کم نہیں بلکہ کہیں کہیں بڑھ چڑھ کر سامنے آئے ہیں، اس پروگرام میں عرب اور برصغیر کے مسلمان ایک بڑی تعداد میں موجود تھے، اس عربی تقریر کا اردو ترجمہ مجموعہ تقاریر میں مولانا شمس تبریز خاں سابق رفیق مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے قلم سے ہے، جس میں خبردار کیا گیا کہ کوئی امریکی یا یورپی اسلام پیدا نہ ہوجائے۔

۱۰؍جون ۱۹۷۷ء کو ٹورنٹو کناڈا کے سفر میں وہاں مقیم مسلم نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ سے خطاب کیا گیا، جس میں امریکہ اور کناڈا میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داریاں اور فرائض یاد دلائے گئے کہ یہاں آپ اپنے کو اللہ کی طرف سے ہدایت خلق اور نور اسلام کو پھیلانے کے لئے منتخب سمجھئے، اور نئی نسل کے ایمان وعقیدہ کی فکر اور تعلیم کو سب پر ترجیح دیجئے، ورنہ محض تنخواہ

کی زیادتی، اچھے مکان، اور بہتر خورد ونوش کے لئے یہاں آنا سمجھ میں نہیں آتا۔

امریکہ اور کناڈا کے مسلم طلبہ کی تنظیم (.M.S.A) کے پندرہویں سالانہ سہ روزہ کنونشن کے اختتامی اجلاس میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے کارکنوں کے باہمی تعلقات وروابط کے موضوع پر ایک اہم خطاب حضرت مولانا کا ہوا، اس موقع پر مختلف ممالک سے اسلامی اسکالرز، ماہرین تعلیم، مصنفین، تاریخ داں اور ماہرین اقتصادیات موجود تھے، اس تقریر کا انگریزی ترجمہ جناب ممتاز احمد نے کیا جس میں بتایا گیا کہ مصنوعی کوشش کارگر نہیں ہوتی ہے اور باہمی محبت کسی خارجی ذریعہ سے نہیں پیدا کی جاسکتی اور یہ کہ محبت کا سرچشمہ ہمارے دل میں ہے، خارج میں نہیں، اللہ تعالیٰ کی محبت کے بغیر کسی خارجی چیز سے باہمی الفت و محبت نہیں پیدا کی جاسکتی اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کا ذریعہ نماز پڑھنا، آنسو بہانا، دعا کرنا، راتوں کو اٹھ کر اپنے رب کے حضور اپنے بھائیوں اور اسلاف کے اعلیٰ مراتب کی دعا کرنا ہے اور یہ کہ اسلام کے نفاذ کو، اسلام کی مصلحت کو، ہر مفاد اور ہر مصلحت پر ترجیح دیجئے، اور یہ کہ ہمارے سامنے ایک نمونہ اور کچھ مثالیں ہونی چاہئیں، یہ مثالیں ہمیں سیرت نبوی اور حالات صحابہ میں ملیں گی، اس کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا جائے۔

۱۹؍جون ۱۹۷۷ء کو مسلم کمیونٹی سنٹر شکاگو میں خواتین کے ایک سیمینار میں خطاب فرمایا، جس میں اسلامی معاشرت کے خدوخال واضح کئے، اور بتایا کہ خدا کا نام بیگانوں کو یگانہ بناتا ہے، اور یہ کہ ازدواجی زندگی کا عمل مسلسل ایک عبادت کا عمل ہے، دونوں طرف سے حقوق کا خیال اور اس کی ادائیگی تقرب الی اللہ کا بڑا ذریعہ ہے، اور یہ کہ مغربی تہذیب تیزی سے روبہ زوال ہے، اسلامی تہذیب کو پوری قوت سے سامنے آنا چاہئے، آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرت کا ایسا نمونہ پیش کریں جو دلکش ثابت ہو، ایسا اگر آپ نے کیا تو یہ صرف اسلام کی نہیں، ملک کی بھی اور انسانیت کی بھی بڑی خدمت ہوگی۔

۲۰؍جون ۱۹۷۷ء کو مسلم کمیونٹی سنٹر (.M.C.C) شکاگو امریکہ میں ایک اہم خطاب فرمایا، اس موقع پر امریکہ میں اسلامی تنظیموں اور اداروں کے کارکن بڑی تعداد میں موجود تھے، یہ دورہ امریکہ کی آخری تقریر تھی، جس میں صاف طور سے کہا گیا کہ:

''ہر ترقی پر ایمان کی سلامتی کو ترجیح دیجئے، سلف صالحین کی خدمت کا اعتراف کیجئے اور ان سے حسن ظن رکھئے، اور یہ بتایا گیا کہ اس میں مبالغہ نہیں کہ آپ حضرات امریکہ میں رہ کر ولایت کا اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ حاصل کر سکتے ہیں، اور اللہ کے یہاں آپ کا عمل کہیں زیادہ عزیز ہوگا، اور یاد رکھیئے کہ فقر و فاقہ کی حالت میں ایمان لاکھ درجہ بہتر ہے اس دولت و سلطنت سے جو ایمان کے بغیر ہو، ''ولا تموتن الا وانتم مسلمون'' (البقرہ:۱۳۲)۔ دوسری بات یہ کہ اپنی نیت صحیح کریں، جو کریں رضائے الٰہی کے واسطے کریں، اور کسی جاہ و منصب اور عہدہ وغرض کو بیچ میں نہ لائیں، دنیا کا فائدہ محنت اور قابلیت کے مطابق ان شاء اللہ ملے گا۔ لیکن نیت ہمیشہ درست رکھیں، تاکہ عمل کا صحیح ثواب ملے، اور یہ کہ وقتاً فوقتاً اپنی نیت کی تصحیح کر لیا کریں، سب کاموں میں نیت اللہ کی خوشی اور اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ہو، ان شاء اللہ آپ کو جہاد کا اور بعض مرتبہ شہید کا ثواب ملے گا۔

تیسری بات یہ کہ ایمان و احتساب یعنی خدا کے وعدوں پر یقین اور اس کے اجر و ثواب کے لالچ میں کام کرنے کا اہتمام کریں تاکہ عمل وزنی ہو، خدا کے یہاں وہی عمل وزنی ہوتا ہے جو حمد ایمان و احتساب کے ساتھ ہو، یہ نہ ہو کہ کسی عمل کے موقع پر سرے سے غور ہی نہیں کیا کہ یہ عمل رضائے الٰہی کی نیت سے کر رہے ہیں یا عادۃً اور ارادۃً، میکینکل طریقہ پر عمل ہونا کچھ سودمند نہیں۔

چوتھی بات یہ کہ اپنی طرف سے غافل نہ رہیئے، بلکہ اپنے دل کا، اعمال کا، نفس کا محاسبہ کرتے رہیں۔ خود اپنے ممتحن بن جائیں، اور اس کو ٹٹولتے رہیں، میرا ایک مشورہ یہ بھی ہے کہ اپنے وطن سے رابطہ رکھئے، اور سال دو سال میں وہاں جاتے رہئے، اور اس سے بڑھ کر عمرہ اور حج کا سفر بھی ہوتا رہے، ہم نے یہ دیکھا ہے کہ ہمارے ہندوستان و پاکستان میں دینی، علمی و روحانی مراکز ہیں، جہاں جا کر خدا ترسی پیدا ہوتی ہے، اور حرمین شریفین تو ہم سب کا سب سے بڑے مرکز ہیں، ہم نے دیکھا ہے جو حضرات وہاں زیادہ جاتے ہیں، عمرہ زیادہ کرتے ہیں، ان میں مدینہ طیبہ کی حاضری کا زیادہ شوق اور وہاں کا ادب زیادہ پایا جاتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ فداہ ابی و امی کی ذات گرامی سے عاشقانہ تعلق ان میں ہوتا ہے۔

پانچویں بات یہ کہ سلف سے حسن ظن رکھئے کہ انہوں نے کن کن سخت حالات میں کام کیا۔ یہ خیال آپ کے دل میں نہ آئے کہ سب ناقص تھے، کسی نے اسلام کو سمجھا ہی نہیں، کسی نے پورے اسلام کو قائم کرنے کی کوشش نہیں کی، یاد رکھئے سب لوگ اپنے امکان واستطاعت کے مطابق دین کی خدمت اور اس کی حفاظت میں لگے ہوئے تھے، کوئی وعظ کہہ رہا تھا، کوئی تقریر کر رہا تھا، اور کوئی حدیث پڑھا رہا تھا، کوئی فتوے دے رہا تھا، اور کوئی کتابیں لکھ رہا تھا، اپنی اپنی جگہ اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کی تربیت کا کام کر رہے تھے، اور ہر ایک نے الگ الگ محاذ سنبھال رکھا تھا اور جن لوگوں نے اپنی جگہ بیٹھ کر اللہ کا نام سکھایا اور لوگوں کی تربیت کی، ان کے کام کی تحقیر نہ کی جائے، نقص تاریخ اسلام کا نہیں ہے، تاریخ نویسی کا ہے کہ تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے کہ وہ سرکار دربار کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ اس میں ان اصلاحی کوششوں کا پورا جائزہ نہیں لیا گیا ورنہ کوئی خلا نہیں، جب جیسے کام جیسے اشخاص کی ضرورت ہوئی اللہ نے وہ پیدا کر دئے، اور ان سے کام لیا۔

چھٹی بات یہ کہ یہ نہ سمجھئے گا کہ اسلام کو اب کچھ لوگ سمجھے ہیں اس سے پہلے کوئی پورے اسلام کو سمجھا ہی نہیں، یہ اسلام پر بڑا الزام ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ایک سنت بھی نہیں ہے جو پورے طور پر عالم اسلام سے کلیتاً اٹھ گئی ہو، اگر اس کونے پر موجود نہیں تھی تو اس کونہ پر موجود تھی۔

ساتویں بات یہ کہ اپنے لئے اور اپنے اسلاف کے لئے دعا کا اہتمام رہے۔

آٹھویں بات یہ کہ نمازوں کا اہتمام ہو وقت پر ان کی ادائیگی ہو، کہ تمام امور و معاملات میں سب سے اہم نماز ہے۔ بازار میں ہوں، کہیں ہوں، وقت ہوا، نماز ادا کر لی، سنتوں کی ادائیگی کی بھی کوشش رہے، یہ سنتیں اور نوافل فرائض کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔

نویں بات یہ کہ مغربی تہذیب سے جو اپنے نقطۂ عروج پر ہے اپنی حفاظت کیجئے، مردوں اور عورتوں کا اختلاط یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، مخلوط محفلوں اور مجالس سے دور رہئے، حدیثوں میں مردوں اور عورتوں کے تخلیہ کے لئے بہت سخت الفاظ آئے ہیں۔

دسویں بات یہ کہ اسلامی تمدن اور اسلامی معاشرت کی حفاظت کیجئے اور اس کی

اچھی خصوصیات اوران کے اچھے اجزاء کو باقی رکھنے کی کوشش کیجئے۔

جہاں تک حضرت مولاناؒ کے آپریشن کا تعلق ہے جب آپریشن کا نظام بن گیا تھا اور فلاڈلفیا میں ڈاکٹر شئےؔ سے وقت طے ہوا تھا جن کی امریکہ میں بڑی شہرت تھی، خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو سخت تردد ہوا کہ اس کو ملتوی کردیا جائے، کہ خدانخواستہ صحیح شکل سامنے نہ آئی تو مراجعت وطن کا عمل بہت دشوار ہوجائے گا، انہیں میرا بھی خیال آتا کہ میں تنہا نہ پڑجاؤں، متعدد بار استخارہ اور محبین و مخلصین سے مشورہ کے بعد جن میں ڈاکٹر احمد مطیع صدیقی (فرزند جناب محمد سمیع صدیقی استاد انگریزی دارالعلوم ندوۃ العلماء) اور جناب پروفیسر انیس احمد جو اس سفر کے داعیوں اور میزبانوں میں بھی تھے، نے آپریشن کا اصرار کیا اور اس پر شرح صدر ہوگیا، ادھر حرمین شریفین میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے دعاؤں کا خاص اہتمام کرایا جنہیں وقت پر اطلاع مل گئی تھی، اور خود بھی بہت متوجہ رہے اور مرکز نظام الدین دہلی میں مولانا انعام الحسن کاندھلوی اور ندوۃ العلماء میں مولانا معین اللہ ندوی نے ختم ودعا وغیرہ کا اہتمام کرایا، گھر میں بھی مستورات نے اس کا بڑا التزام کیا اور اللہ تعالیٰ نے روشنی عطا فرمائی۔ ۲۹/جون ۱۹۷۷ء کو آئی انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ ہوا، اور یکم جولائی ۱۹۷۷ء کو آپریشن کا عمل ہوا۔ ڈاکٹر شئےؔ کو غیر معمولی ہمدردی ہوئی تھی جو من جانب اللہ تھی، ۱۲/جولائی کو اسپتال سے چھٹی ملی، اور ایک تعلق والے جناب سید صفوت علی خیرآبادی ثم پاکستانی کے فلیٹ میں آگئے، ماسٹر محمد سمیع صدیقی اور ان کے دونوں صاحبزادے ڈاکٹر احمد مطیع اور جناب محمد رضی بھی ساتھ آئے، ایک ہفتہ کے بعد پھر آنکھ کا معائنہ ہوا اور ٹانکے کاٹے گئے، پھر دو ہفتہ کے لئے شکاگو کا سفر ہوا، اور ایک مخلص ومحبّ سید عظمت اللہ قادری کے مکان پر قیام رہا، جہاں دوسرے اہل تعلق ڈاکٹر عبادالرحمٰن نشاط حال مقیم اوکلاہومائی دہلی سابق پروفیسر ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ، اور ڈاکٹر عبدالسلام انصاری، عرفان احمد خان وغیرہ کے ساتھ مجلسیں بھی ہوئیں، محبّ مکرم سید طارق حسن عسکری قادری مدینہ منورہ کے ساتھ وقت گزارنے آگئے تھے۔ ۲/اگست ۱۹۷۷ء کو فلاڈلفیا واپسی ہوئی اور ڈاکٹر شئےؔ نے آنکھ کا معائنہ کرکے اطمینان ظاہر کیا اور بقیہ ٹانکے نکالے، اور سب سے بڑھ

کر یہ کہ فیس بھی نہیں لی، اور اسپتال ودوا کے اخراجات میں ممکن حد تک کمی کی، پھر نیویارک آ کر دو دن ٹھہرے، پروفیسر انیس احمد (برادر پروفیسر خورشید احمد صاحب) نے بہت اظہار تعلق کیا، اور آپریشن کے انتظامات اور آمد و رفت کے خرچ میں حصہ لیا جو ایم. ایس. اے. کی طرف سے ان کے مفوضہ فرائض سے زیادہ تھا، ایئر انڈیا کی فلائٹ سے بمبئی تک ۱۷ر گھنٹے لگے، راستہ میں ایک رفیق حسن عسکری طارق کو مدینہ طیبہ جانا تھا، انہوں نے لندن سے دوسری پرواز لی، اور بمبئی سے دہلی نظام الدین مرکز روانہ ہوئے جہاں مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ سے ملاقات کی اور پھر لکھنؤ واپسی ہوئی۔

جنتا پارٹی کا اقتدار، مسز اندرا گاندھی کی تکیہ کلاں رائے بریلی آمد

جنوری ۱۹۷۷ء میں ایمرجنسی کے خاتمہ کا اعلان کیا گیا، جس کا لازمی نتیجہ جنرل الیکشن کا اعلان بھی تھا۔ ایمرجنسی کا نفاذ عارضی طور پر حکومت کے لیے تو مفید رہا کہ ایک سال یا اس سے کچھ زیادہ مدت مزید حکومت کا موقعہ مل گیا، مگر ردّ عمل یہ سامنے آیا کہ جنرل الیکشن میں برسر اقتدار پارٹی کو بڑی ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، جو ایمرجنسی کے ساتھ جبری نس بندی کے عمل کا بھی ردّ عمل تھا، اور ان دونوں کے نقصانات سے خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے وزیر اعظم کو دہلی کی ایک ملاقات میں اپنی گفتگو اور تفصیلی خط پیش کر کے جو ان کے سامنے ہی پڑھ بھی لیا گیا تھا، آگاہ کر دیا تھا، اندرا گاندھی کا حلقۂ انتخاب رائے بریلی تھا جو ہم لوگوں کا بھی حلقہ ہے اور امیٹھی جو اس سے متصل حلقہ ہے، ان کے لئے سنجے گاندھی کا حلقہ تھا۔ ۲۲ر مارچ کو جب نتیجہ سامنے آیا تو دونوں کو شکست ہوئی، جس سے ہر طبقہ میں مسرت کی لہر دوڑ گئی، اندرا گاندھی کچھ مدت اپنے حلقہ میں نہیں آئیں لیکن ۶ر مہینے کے قریب مدت میں غالباً ۱۶ر ستمبر ۱۹۷۷ء کو جو عید ۱۳۹۷ھ کا دوسرا دن تھا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے ان کے مکان پر آئیں، اور یہ حسن اتفاق تھا کہ اس روز مولانا ابواللیث اصلاحی امیر جماعت اسلامی ہند، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی معتمد تعلیم ندوۃ العلماء اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم. اے. ناظم دارالمصنفین اعظم گڈھ بھی عید کی مناسبت سے ملاقات کے لئے آئے ہوئے تھے، حضرت مولانا نے ان لوگوں کا تعارف

کرایا اور مولانا ابواللیث کے تعارف کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایمر جنسی کا واقعہ یاد دلایا کہ یہ بھی جیل میں رہ کر آئے ہیں، ان کے ساتھ دو سابق وزیر اعلیٰ یوپی کملاپتی ترپاٹھی اور وزیر اعلیٰ نرائن دت تیواری اور محسنہ قدوائی صاحبہ بھی تھیں، جن کی مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم سے دور کی عزیز داری بھی تھی، اور دارالمصنفین کا تعلق نہرو گاندھی خاندان سے قدیم رہا ہے، اس لئے سید صباح الدین عبدالرحمٰن سے تعارف بھی آسان تھا، حضرت مولانا نے ان کو پھر احساس دلایا اور کہا کہ میں آپ کو ایک طرح سے مظلوم سمجھتا ہوں کہ لوگوں نے حقائق و واقعات کو آپ کی نظر سے اوجھل رکھا اور آپ کو ملک کے صحیح حالات اور لوگوں کے جذبات سے واقف ہونے نہیں دیا کہ نوبت یہاں تک پہونچ گئی، وہ اور محسنہ قدوائی صاحبہ گھر بھی گئیں اور ممانی صاحبہ و والدہ صاحبہ سے ملاقات کی اور دعا کے لئے کہا، اور پھر یہ قافلہ روانہ ہو گیا، مگر افسوس کی بات یہ ہوئی کہ مرکز و ریاست میں جو حکومتیں قائم ہوئی تھیں وہ اپنی پانچ سالہ مدت اس لئے پوری نہ کر سکیں کہ ان کا اتحاد قائم نہیں رہ پایا، اور کانگریس اپنی واپسی کی تیاری میں لگی رہی، تین سال کے عرصہ میں دو وزیر اعلیٰ ہوئے اور پھر حکومت گر گئی اور نئے الیکشن ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں پھر کانگریس اقتدار میں آ گئی۔

ندوہ میں وزیر خارجہ اٹل بہاری واجپئی کی آمد وملاقات

جنتا پارٹی حکومت میں وزیر خارجہ کے منصب پر آر. ایس. ایس. کی ذہنیت رکھنے والے لیڈر اٹل بہاری واجپئی تھے۔ چونکہ اُن کا لکھنؤ سے قدیم تعلق تھا اور حضرت مولانا اور ندوہ کے کام اور عرب ممالک میں اس کے تعارف وشہرت سے واقف تھے۔ ایک دن ندوہ حضرت مولانا سے ملنے آئے اور حضرت مولانا نے ان کو بھی ملت وانسانیت کی بہی خواہی کی نصیحت کی کہ صرف ایک طبقہ کو دیکھنا اور دوسرے کو نظر انداز کرنا ملک کی سالمیت کے لئے نقصان دہ ہے۔ اور پڑوسی ممالک سے تعلقات کو بہتر بنانے کی فکر کرنی چاہئے جو ملک کی سالمیت کے لیے ضروری ہے، انہوں نے توجہ سے بات سنی اور ہمیشہ قدر کی۔

امام حرم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل الشیخ کی ندوۃ العلماء تشریف آوری

فروری ۱۹۷۸ء میں خطیب عرفات وامام حرم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن حسن

آل الشیخ کی پاکستان ہوتے ہوئے ہندوستان آمد تھی۔ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں نے ان کے خاندان کے ندوۃ العلماء سے قدیم تعلق اور سب سے بڑھ کر حرم شریف کی نسبت اور اس پر مستزاد عرفات کے خطیب کی حیثیت سے ان کے مقام وعلومرتبت کا خیال کرتے ہوئے ندوۃ العلماء کی طرف سے مدعو کرنا اور لکھنؤ کی دعوت دینا ضروری سمجھا اور اس سلسلہ میں ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا گرامی نامہ لے کر دارالعلوم کے دو موقر استاد مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی (حال مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء) اور مولانا سید محمد واضح رشید ندوی (سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء) دہلی گئے اور کسی طرح ان سے ملاقات کا وقت لیا، اور دعوت نامہ پیش کیا تو انہوں نے اپنے قدیم تعلق کی بنا پر اُسے منظور کرلیا جبکہ یہ ان کے طے شدہ پروگرام میں پہلے سے شامل نہیں تھا اور بہت کم وقت میں ان کی تشریف آوری اور ان کے شایان شان استقبال وترحیب کی تیاری کی گئی اور یہ اعلان کرادیا گیا کہ جمعہ کی نماز ندوۃ العلماء کی مسجد میں وہ ادا کرائیں گے اور خطاب بھی فرمائیں گے،لوگوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور تھوڑے وقت میں اتنا بڑا مجمع اکٹھا ہوگیا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے،تل رکھنے کی جگہ نہ تھی، ہر طرف آدمی ہی آدمی تھے،جس کو جہاں جگہ ملی وہ کھڑا ہوگیا۔ان کے ساتھ ندوۃ الشباب ریاض کے سکریٹری جنرل استاذ احمد تنوخی اور ادیب وصحافی عمادالدین خلیل بھی تھے۔جمعہ سے پہلے انہیں ندوۃ العلماء کے وسیع سبزہ زار پر استقبالیہ بھی دیا گیا، جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی طرف سے تھا جواب میں انہوں نے ندوۃ العلماء کی خدمات وکارناموں کی تحسین کرتے ہوئے اس کے ناظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے اپنے اور اپنے خاندان کے مؤثر دیرینہ ومخلصانہ تعلقات کا والہانہ انداز سے تذکرہ کیا، دوسرے دن اخبارات نے بڑی اچھی رپورٹنگ کی،اس کے بعد ریاض کے سفر میں مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ومولانا سید محمد واضح رشید ندوی نے جو اس کے چند ماہ بعد ہوا تھا،ان سے ملاقات کرکے ان کی تشریف آوری کے اثرات اور لوگوں میں اس کے چرچے اور خوشی کا اُن سے تذکرہ بھی کیا،اور انہوں نے اپنی پرانی نسبت اور تعلق کا مزید اظہار کیا۔
اس کے بعد امام حرم شیخ عبدالرحمٰن سدیس اور پھر دوبارا امام حرم وصدر شئون حرمین شیخ سبیل

بھی تشریف لائے اور آخری بار امام حرم کی حیثیت سے ندوہ کی دعوت پر شیخ خالد غامدی تشریف لائے اور انہوں نے سب سے زیادہ لکھنؤ میں ایک ہفتہ قیام کیا اور مختلف جگہوں پر کئی پروگرام ہوئے۔

متحدہ عرب امارات، سعودی عرب وقطر کا ایک طویل سفر

متحدہ عرب امارات کی طرف سے اہلِ تعلق کی دعوت برابر آرہی تھی، اور ادھر سعودی عرب میں بھی مختلف کمیٹیوں کے جلسے تھے۔ بعض سے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو معذرت بھی کرنی پڑی، یہ سفر اواخر جنوری اور اوائل فروری ۱۹۷۹ء/۱۳۹۹ھ میں ہوا، حضرت مولانا کے ساتھ میں بھی اس سفر میں تھا اور عزیزی مولوی سید محمد حمزہ حسنی ندوی پسر برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس سفر میں ہمراہ تھے، یہ سفر بمبئی سے ابوظہبی کا ہوا تھا اور ابوظہبی میں وہاں کی سرکردہ شخصیات خصوصا قاضی القضاۃ احمد عبدالعزیز المبارک بھی استقبال میں تھے، مولانا تقی الدین صاحب بھی پیش پیش تھے، جو ان کے معاون اور وہاں علمی کاموں میں مشیر تھے، ابوظہبی میں فندق خالدیہ پیلس میں قیام رہا، استاذ محمود قضیہ ندوی کی بھی آمد ورفت رہی جو پہلے سے بڑا تعلق رکھتے تھے اور دار العلوم ندوۃ العلماء سے اتنا نہیں تعلق کہ وہاں کچھ تعلیمی وقت بھی ندوہ سے انتساب کی خاطر گذارا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی صحبت حاصل کی جو ان کے قیام کی سب سے اہم وجہ تھی، ابوظہبی میں ۳-۴ دن گذار کر جہاں اہم جلسے اور پروگرام اور ملاقاتیں ہوئیں اور لوگوں کا ایک ہجوم رہتا تھا، پھر شارجہ گئے، وہاں بھی ایسی ہی مرجعیت رہی اور لوگ ٹوٹے پڑتے تھے، حاکم شارجہ شیخ سلطان بن محمد القاسمی نے اپنے غایت تعلق کی وجہ سے حکومت کا مہمان بنایا تھا، حالانکہ وہ سفر پر تھے لیکن حضرت مولانا کے ایک بہت ہی قدردان اور شارجہ کے شیخ الاسلام کی حیثیت رکھنے والے عالم دین شیخ عبداللہ علی المحمود نے فندق الاندلس میں ہمارے ٹھہرنے کا انتظام کیا، اور اپنا مہمان بنایا کہ وہ حضرت مولانا کا یہ مزاج سمجھتے تھے کہ وہ سرکاری مہمان بننا پسند نہیں کرتے ہیں اور اپنے قریبی کسی دوست یا محبّ کا مہمان بننا پسند کرتے ہیں، پھر دبئی بھی جانا ہوا، وہاں بھی اہم شخصیات مولانا سے ملاقات کے

لئے آتی رہیں، عرب امارت کے اس سفر میں اصل قیام ابوظبی کا تھا اور وہاں سے اس کی ریاستوں میں آنا جانا ہوا، ان ریاستوں میں ایک ریاست فجیرہ بھی ہے، وہاں بھی پروگرام ہوئے، جس کے ایک پروگرام میں حاکم فجیرہ کے ولی عہد نے بھی شرکت کی۔

پھر ابوظبی سے ریاض کا سفر ہوا، جہاں ۳-۴ روز قیام رہا اور مفتی عام مملکت و صدر رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ علامہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز نے ظہرانہ پر ایک دن مدعو کیا، پہلے ان کی مسجد گئے، پھر وہاں ان کے ساتھ ان کے دولت خانہ گئے، اور مختلف امور پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا ان کے ساتھ تبادلۂ خیال بھی ہوا، ریاض میں ان کے علاوہ بڑی مقتدر شخصیات ملنے آتی رہیں۔

ریاض جو سعودی عرب کا دارالحکومت ہے، وہاں سے مکہ مکرمہ کے مقابلہ مدینہ منورہ زیادہ قریب ہے، پہلے مدینہ منورہ کا سفر اختیار کیا گیا۔ اور دربار نبوت میں حاضری کی سعادت حاصل کی گئی، ایک ہفتہ یہاں قیام رہا، مدینہ منورہ میں مقیم برصغیر ہندوستان و پاکستان کی اہم شخصیات اور مدینہ منورہ کے عمائدین اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے اساتذہ وطلبہ بھی ملنے آتے رہے، ان میں عزیز گرامی مولانا خلیل الرحمٰن سجاد ندویؒ اور مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی، مولانا محمد رضوان ندوی مرحوم کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہ کا قیام بھی مدینہ منورہ میں تھا، ان کی شفقتیں بھی حاصل ہوئیں، برادر معظم مولانا محمد ثانی حسنی کی نسبت سے مولوی سید محمد حمزہ حسنی ندوی کی حاضری سے انہیں خوشی تھی اور انہیں حضرت کی شفقت بھی حاصل ہوئی۔

مدینہ منورہ سے جدہ کا سفر ہوا اور پھر وہاں ایک پروگرام البنك الإسلامي للتنمية کا تھا، حضرت مولانا نے اس کے اختتامی جلسہ میں شرکت فرمائی اور پھر جدہ سے احرام باندھ کر مکہ معظّمہ حاضری کی سعادت حاصل کی گئی، اور عمرہ کے ارکان ادا کئے گئے، عزیزی مولوی سید محمد حمزہ حسنی ندوی کا اور مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء کا یہ پہلا عمرہ تھا، جس کی بات ہی الگ ہوتی ہے۔ مولانا محمد برہان الدین البنك الاسلامی کے پروگرام میں مدعو تھے اور ان کا اسی لیے لکھنؤ سے سفر ہوا تھا، مولانا برہان مکہ مکرمہ قیام کے بعد مدینہ منورہ گئے اور ہم لوگ

قطر کے ایک پروگرام میں شرکت کے لیے دوحہ گئے۔

حجاز مقدس کے سفر کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ: البنك الاسلامی للتنمية (جدہ) کے ڈاکٹر احمد محمد علی کا اصرار تھا کہ اس کانفرنس میں جو البنك الاسلامی للتنمية ۶-۷-۸ر فروری ۱۹۷۹ء کو جدہ میں منعقد کر رہا ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ضرور شرکت فرمائیں اور اگر ایسا کسی صورت میں ممکن نہیں ہے تو اپنے کسی معتمد کو نائب بنا کر بھیج دیں، اس کے لیے مشورہ سے مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء کا انتخاب ہوا اور وہ متعلقہ موضوع پر مقالہ تیار کر کے عازم سفر ہوئے، مگر کچھ ایسا ہوا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی بھی کانفرنس کی آخری تاریخوں میں پہونچ گئے اور میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ڈاکٹر احمد محمد علی ڈائرکٹر البنک الاسلامی جدہ کا شدید اصرار و تقاضہ ہوا کہ آخری دن اور اختتامی نشست میں حضرت مولانا ضرور شرکت فرمائیں۔ جس کے لئے انہوں نے خصوصی اہتمام کیا، اور اس کانفرنس میں جو اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم اور اقتصادی، فقہی اور فکری قضایا کی حامل کانفرنس تھی، حضرت مولانا کی شرکت سے اسے مزید اہمیت حاصل ہوئی، ملک و بیرون ملک کی اہم شخصیات سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کا موقع ملا، عمرہ کی سعادت حاصل ہوئی اور مدینہ منورہ حاضری ہوئی، جہاں صلوۃ وسلام کا ترانہ پیش کیا اور مختصر قیام کیا۔ اور مخدومنا حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی خدمت میں حاضری ہوئی، جدہ میں قدیم میزبان الحاج محمد نور عبدالغنی نے ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا، جس میں عمائدین کو بھی مدعو کیا، مکہ معظمہ میں ایک شب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے اور ایک شب مدرسہ صولتیہ کے ناظم مولانا مسعود شمیم مکی نے عشائیہ کا اہتمام کیا، اور حضرت مولانا کی تکریم میں علماء و عمائدین اور برصغیر کی اہم شخصیات کو مدعو کیا، اس طرح ایک اچھی ملاقات اور تبادلۂ خیال کا موقع فراہم کیا۔ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی کا قیام تین ہفتے رہا اور انہوں نے اس کی تفصیلی روداد بھی قلمبند کی جو الفرقان لکھنؤ کے مئی-جون کے شماروں میں شائع ہوئی۔

مولانا تقی الدین ندوی صاحب کے نام راقم کا ایک مکتوب

امارات سے سعودی عرب پہونچ کر کاتب تحریر نے جو خط مولانا تقی الدین ندوی

صاحب کو امارات ارسال کیا تھا اس سے دونوں سفروں پر روشنی پڑتی ہے اس مناسبت سے وہ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

برادرم مولانا تقی الدین صاحب ندوی زید لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ آپ بخیر وصحت ہوں گے، ہم لوگ بفضلہ تعالیٰ خیر وصحت کے ساتھ ریاض ہوتے ہوئے سہ شنبہ ۳۰ رجنوری کو مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور ایک ہفتہ قیام کے بعد کل ان شاء اللہ ۷ رفروری کو مکہ مکرمہ وجدہ جانے کا قصد ہے، وہاں سے غالباً ۱۴، ۱۵ رفروری کو قطر دوحہ جانا ہوگا اور ممکن ہے کہ شارقہ کا بھی دوروزہ پروگرام، وہاں سے واپسی ہندوستان کے دوران رکھ لیا جائے؛ لیکن یہ باتیں ابھی صرف تخمینی ہیں، یقینی نہیں۔

امارت کے سفر میں آپ نے جس تعلق اور خیال کا ثبوت دیا اس سے آپ کی محبت اور تعلق خاطر کا پورا اظہار ہوتا ہے، آپ نے اپنے اوقات کا حرج کیا اور تکلیف اٹھائی؛ لیکن چوں کہ آپ سے ایسا تعلق ہے کہ آپ کو ان باتوں سے روکنا صحیح نہ تھا، آپ کے ساتھ رہنے سے انس وتقویت حاصل ہوتی تھی اور پردیش پردیش نہیں معلوم ہوتا تھا، آپ کا ان محبتوں اور خاطروں پر بہت بہت شکریہ، اللہ تعالیٰ آپ کو بہت خوش رکھے۔

ریاض میں قیام بہت مختصر رہا، ٹھیک سے لوگوں سے ملاقات نہ ہوسکی، حضرت شیخ کی ناسازیٔ طبع کے خیال سے مدینہ طیبہ جلدی پہونچنے کا تقاضہ تھا، چنانچہ صرف ڈھائی روز ریاض ٹھہر کر مدینہ طیبہ حاضر ہوگئے، یہاں مواجہہ شریف پر اپنا اور اپنے تعلق والوں کا بہ شمول آپ کے سلام پیش کیا، حضرت شیخ سے ملاقات ہوئی، الحمدللہ طبیعت پہلے سے بہتر ہے، آپ کا خط پیش کردیا، حضرت شیخ مدظلہ کو نسیان کا بھی عارضہ ہے، کبھی کبھی اس کا اظہار ہوجاتا ہے، امارات کے سفر کے تذکرہ میں کل آپ کو دریافت کرنے لگے، ماموں جی مدظلہ نے آپ کی خیریت بتائی اور امارات کے سفر میں آپ نے جس محبت وتعلق کا ثبوت دیا اس کا تذکرہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ ان کا خط پیش کیا جاچکا ہے، حضرت کو کمزوری اور نیند کی شکایت عموماً رہتی ہے، اگرچہ حرم شریف میں بعض نمازوں میں جاتے ہیں، حضرت خاطر وشفقت حسب

سابق فرماتے ہیں، البتہ کمزوری کے باعث مجلسوں کے اوقات کم رہ گئے ہیں، جعفری صاحب کے مدرسہ میں جو تقریر ہوئی تھی اس کا عربی نص ماموں جی مدظلہ نے دیکھ کر پاس کر دیا ہے اس کو صاف کروا کر ہم آپ کو ان شاء اللہ جلد روانہ کر دیں گے تاکہ آپ جہاں مناسب سمجھیں دیدیں، ''الرائد'' میں بھی ان شاء اللہ شائع ہو جائے گا۔

آپ نے جن لوگوں کو شکریہ کے یا کسی یاددہانی کے خطوط لکھنے کی یادداشت لکھائی تھی وہ محفوظ ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ ہندوستان پہونچ کر تعمیل کی جائے گی۔

برادر محترم مولانا معین اللہ صاحب کے لڑکے عبید اللہ کے سلسلہ میں آپ نے جو مشورہ دیا ہے ہم نے مولانا معین اللہ صاحب کو لکھ دیا ہے، آپ تکلیف کر کے ان کے لئے ویزہ بھجوانے کی فکر کر دیں، وہ اب کمپالا یوگنڈا پہونچ گئے ہوں گے اس لئے وہاں کے سفارت خانے کے نام ویزا بھجوا دیجئے۔

آپ نے اپنے محکمۂ قضا کے لیے جو دو تین نفر جن کے نام طلب کیے ہیں ان شاء اللہ ہندوستان پہونچ کر ان کی درخواستیں ارسال کروادی جائیں گی، خدا کرے آپ بکمال صحت وعافیت ہوں، دعاؤں میں یاد رکھئے، ہم لوگ بھی دعا کرتے ہیں۔

والسلام

محمد رابع حسنی ندوی

۹؍ربیع الاول ۱۳۹۹ھ

۶؍فروری ۱۹۷۹ء

حجاز مقدس کا دوبارہ سفر اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی رفاقت

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا شروع سے یہ جذبہ اور فکر رہی کہ حرمین شریفین اسلام کا سرچشمہ اور مسلمانوں کا دینی، علمی، روحانی، سیاسی مرکز ہے، یہاں جو بات ہوگی اس کا اثر پورے عالم میں پڑے گا، اگر یہاں خرابی ہوئی تو اس کا اثر بھی پورے عالم پر پڑے گا۔ اس لئے انہوں نے اپنے سفروں، ملاقاتوں، اور دوسرے ذرائع

سے جو محسوس کیا اس کا ایک تاثر اور علاج وہ حکومت تک پہونچانا چاہتے تھے، اور بانی سلطنت شاہ عبدالعزیز، شاہ سعود، شاہ فیصل سبھی کو عمائدین اور بڑے علماء کے ذریعہ متوجہ کرتے رہے تھے، شاہ فیصل سے ان کی اچھی ملاقاتیں بھی رہیں، اوران میں کئی ملاقاتوں میں میں بھی ساتھ رہا۔ وہ حضرت مولانا کی تحریر وفکر کو پڑھتے اور توجہ دیتے تھے۔ اوران کے بے لوث ومخلصانہ تعلق کی قدر بھی کرتے تھے۔ ان کے بعد ان کے بھائی شاہ خالد آئے۔ شاہ خالد بڑے نیک طبیعت کے ایک اچھے انسان تھے۔ حرم شریف میں ہی وقت گزارنے کا خصوصاً رمضان میں اہتمام کرتے تھے، ان سے ملنے کا ایک پروگرام ۱۹۷۹ء/۱۳۹۹ھ میں طائف میں طے ہوا تھا، جو شیخ محمد علی الحرکان سکریٹری جنرل رابطۂ عالم سلامی مکہ مکرمہ کا بنایا ہوا تھا، حضرت مولانا نے اس کے لئے طائف کا سفر بھی کیا لیکن بادشاہ اردن شاہ حسین کے پہنچ جانے سے اس میں تاخیر کی وجہ سے وہ واپس مکہ مکرمہ آگئے اور جو تحریر لکھی تھی وہ مملکت کی دوسر برآوردہ شخصیات جن کا حکومت بھی احترام کرتی تھی، اور بادشاہ کی نظر میں بھی ان کی بڑی وقعت تھی۔ ایک شیخ عبداللہ بن حمید رئیس القضاۃ ومحاکم شرعیہ، دوسرے مفتی اعظم مملکت ورئیس رابطہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کو اس تحریر ومکتوب کی ایک ایک کاپی الگ الگ طور پر اس طرح پہونچادی کہ دوسرے کو خبر نہ ہو اور ان دونوں شخصیتوں نے پورے اہتمام سے شاہ خالد بن عبدالعزیز کو یہ مکتوب اپنی تحریر کے ساتھ روانہ کیا کہ بادشاہ اسے خود ملاحظہ فرمالیں، اور معلوم ہوا کہ بادشاہ نے اس کا اہتمام کیا، اوران کے ولی عہد شاہ فہد بن عبدالعزیز اور وزیر داخلہ نائف بن عبدالعزیز نے بھی اسے ملاحظہ کیا، مگر کہیں سے یہ تحریر لیک ہوگئی، اور اخوان المسلمون کے ترجمان ''الدعوۃ'' قاہرہ کے اس دن کے شمارہ میں شائع ہوگئی جس دن حرم کا واقعہ پیش آیا تھا، مگر حضرت مولانا کا جو مخلصانہ تعلق اہل حرم و والیان سلطنت سے رہا تھا اس کی وجہ سے کوئی غلط پیغام نہیں گیا۔ مگر بعض ذرائع سے معلوم ہوا کہ یہ بات اچھی نہیں سمجھی گئی کہ ذاتی خط عام کیسے ہوا؟ اہل تعلق نے اس غلط فہمی کو بھی دور کیا۔ اس تحریر کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں اولاً سرزمین مقدس سے اپنے رابطہ کی ابتدا، واقفیت کے ذرائع ومواقع اور مملکت کے بانیوں کے مقاصد وجذبات کے ساتھ ہم آہنگی،

جذباتی و دینی تعلق اور اس خاندانی ماحول واثرات کا (جن میں اور اس دعوت میں جس پر اس مملکت کا قیام عمل میں آیا بڑا اشتراک تھا) ذکر کیا تھا، اور بتایا تھا کہ اس مملکت کے قیام اور اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ عقیدۂ توحید کی دعوت واشاعت کا بے نظیر اور امن وتحفظ، پانی کی توفیر، رسل ورسائل ومواصلات کی سہولت، غارت گر بدوؤں کی سرکوبی، حجاز کی حفاظت وراحت کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دلایا، جس کی نظیر پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی، اس پر ہندوستان کے صحیح العقیدہ اور صاحب شعور مسلمانوں نے اور ہمارے بزرگوں، اساتذہ اور شیوخ نے بے پایاں مسرت محسوس کی اور اللہ کا شکر ادا کیا، اور اس مملکت کے بانیوں کے حق میں دعائیں کیں، اس کے بعد اچانک وسائل دولت کی فراہمی، داخلی و خارجی حالات کی تیز رفتاری، بے لوث اور عمیق الفکر مشیران سلطنت کی کمیابی، اور طویل المیعاد اور گہری منصوبہ بندی کے فقدان سے حکومت کو جن مشکلات اور ملک ومعاشرہ کو جن خطرات کا سامنا کرنا پڑا، ان کی طرف اشارہ کیا گیا، اور اس کے نتیجہ میں اچانک جو صورت حال پیدا ہوئی اس کی عکاسی کی گئی، اس تبدیلی میں جو ادارے اور ذرائع مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں، ان کا ذکر کیا گیا، جیسے ذرائع ابلاغ، ٹیلی ویژن، فلمیں، صحافت ومیڈیا، ایجوکیشن اور کھیل، سامان تعیش کی فراوانی، تقریبات میں اسراف وتبذیر وتفریحی رجحان کا بڑھنا، پھر ان کے مضر انفرادی واجتماعی، داخلی وخارجی اثرات کا بھی جائزہ پیش کیا گیا، آخر میں ان حقائق وواقعات کو پیش کرنے کے بعد کہا گیا تھا کہ جزیرۃ العرب پر فقر اور ذرائع آمدنی کی کمی کا ایک دور گزرا ہے، جو صدیوں قائم رہا، لیکن اس سے اسلام کا یہ مرکز خطرہ سے دوچار نہیں ہوا جو دولت کی اس فراوانی، معیار زندگی کی بلندی اور خوش حالی ورفاہیت سے پیدا ہو گیا ہے، بلکہ اس فقر وپسماندگی کے دور سے یہ فائدہ ہوا کہ بداندیشوں اور توسیع پسندوں کی نگاہوں اور ان کے دندان آز سے یہ ملک محفوظ رہا، اور انہوں نے کبھی اس پر اپنی توانائیاں صرف کرنے اور ڈورے ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی جس کے نتیجہ میں ان کو کسی مادی فائدہ کے حاصل کرنے کی امید نہیں تھی، لیکن اب صورت حال مختلف ہے۔

اس میں یہ ذکر تھا کہ انہیں حقائق وخطرات کے پیش نظر اس کی جرأت کی جا رہی

ہے کہ یہ تحریر جو عام اشاعت کے لئے نہیں ہے، ذمہ داروں کی خدمت میں شخصی طور پر پیش کی جائے، تا کہ یہ حقائق ان کے سامنے متعین و مدلّل طریقہ پر اور مستند ذرائع کے حوالہ سے آجائیں اور وہ صورت حال کی نزاکت کا احساس اور اس کے تدارک کے لئے کوئی اقدام کرسکیں۔ یہ تحریر "إلى أين تتجه الجزيرة العربية و إلى أيّ غاية تنتهي؟ " کے عنوان سے فل اسکیپ کے ۱۸ صفحات پر مشتمل تھی کہ جزیرۃ العرب کس طرف جا رہا ہے اور کہاں جا کر رُکے گا؟ اندازہ ہوا کہ ایک داعی اور خیر خواہ امت ومملکت کے لئے اپنی بات قوت سے پہونچا دینا ہی اس کا فریضہ وادائیگی ذمہ داری ہے کہ و ما علینا الا البلاغ کہ حکومتیں کچھ اس طرح بڑی طاقتوں اور سپر پاور سے وابستہ ہوتی ہیں کہ بہت کچھ چاہنے کے باوجود اقدام کرنے سے انہیں گریز کرنا پڑتا ہے جس میں سیاسی، تہذیبی اور اقتصادی، تجارتی دباؤ بھی ہوتا ہے، اور بہت سے دوسرے اسباب وموانع بھی ہوتے ہیں، حضرت مولانا نے اہل کرسی (طاقت واختیار والوں) تک صحیح بات اور ایمان وحکمت کی بات پہونچانے کا انبیاء کے طرز وطریقہ پر چلتے ہوئے جو روش اختیار کی، اور "لا أسئلكم عليه أجراً، اور "ان اجری الا علی اللّٰہ رب العالمین"، والا انداز اختیار کیا، وہی آج بھی مفید اور دوسرے طریقوں کے مقابلہ جو بدنام کرنے اور ٹکراؤ کا ہے، زیادہ کارگر اور صحیح ودرست ہے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ان ہستیوں اور مصلحین و داعیوں میں حضرت خواجہ عبید اللہ احرار سمرقندی، اور انہی کے سلسلہ کے بزرگوں حضرت مجدد الف ثانی، امام احمد بن عبد الاحد سرہندی (۹۷۱ء-۱۰۳۴ھ) اور حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ) کی اہم مثالیں اور نمونے تھے، اور خود امیر المومنین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۰۱ھ-۱۲۴۶ھ) جنہوں نے پہلے ذاتی اصلاح وتربیت کا عمل اختیار کیا اور پھر اصلاح معاشرہ وتربیت نفوس کا طریقہ اپنا کر احیاء فرائض وسنن کا عمل اور آخر میں ہجرت اور عملی طور پر جہاد کا طریقہ اختیار کیا، اس میں بھی انہوں نے حکومت اور مادی منافع سے بے نیازی کا انداز اختیار کیا، اور امت وانسانیت کی خیر خواہی سامنے رہی۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی ندوہ تشریف آوری اور محاضرات

مئی ۱۹۷۹ء کے آخری ہفتہ میں ریاض (سعودی عرب) کی جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ کی طرف سے استاد زائر Visiting Professor کی حیثیت سے حلب شام کے مشہور عالم و محدث و محقق علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ جو جامعۃ الامام میں مؤقر استاد حدیث تھے، دارالعلوم میں دو ہفتے کے لیے اسلامی موضوعات پر لکچر دینے کے لئے تشریف لائے، یہ موقع دارالعلوم کے اساتذہ کے لئے بہت ہی اچھا تھا، اساتذہ وطلبہ سب نے پورا استفادہ کیا، اور طلبہ میں علم حدیث سے شوق اور تحقیق کا جذبہ پروان چڑھا، اجازت حدیث کی مجلس بھی ہوئی، اور مجھ ناچیز کو ان سے اجازت حدیث حاصل ہوئی، ان کے مجیزین و مستجیزین اور اسانید پر کتاب ''امداد الفتاح'' منظر عام پر آچکی ہے جو ان کے ایک شاگرد نے بڑی محبت سے مرتب کی ہے۔

علامہ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کی ندوۃ العلماء یہ پہلی تشریف آوری نہیں تھی۔ پہلی بار ان کی تشریف آوری ۱۹۶۲ء میں تبلیغی جماعت کے ساتھ دہلی مرکز نظام الدین میں جو اواخر اگست میں ہوئی تھی اور وہ دیوبند، سہارنپور اور لکھنؤ بھی تشریف لائے تھے۔ اواخر اکتوبر ۱۹۷۵ء میں وہ ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ تعلیمی جشن میں بھی آئے تھے اور اپنا مقالہ پیش کیا تھا، لیکن اس بار وہ زیادہ ٹھہرے اور ان کے محاضرات کا ایک سلسلہ رہا، اس کے بعد بھی ان کی تشریف آوری ہوئی جو آخری نومبر ۱۹۹۲ء میں ہوئی اور ہتھورا باندہ کا بھی سفر کیا۔

برادر عزیز سید محمد الحسنی کی وفات اور بعض دوسرے حوادث

ہمارے لیے اور پورے خاندان کے لئے ہی نہیں، ندوۃ العلماء اور اس کے متعلقین کے لئے بھی مولانا سید محمد الحسنی بن خال مخدوم و معظم مولانا ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی حسنی کا انتقال ایسا حادثہ فاجعہ تھا جس سے سنبھلنے میں ایک ڈیڑھ سال کا عرصہ لگ گیا اور وہ منصوبے، ارادے جو دعوتی، فکری صحافتی دائرے کے تھے اور ندوہ کی تحریک کو زیادہ سے

زیادہ موثر وطاقتور بنانے کے تھے جس کی ضرورت روز افزوں بڑھتی محسوس ہورہی تھی، ان کی وفات سے ایک طرح سے ٹھہر گئے۔

یہ حادثۂ وفات ۱۳/جون ۱۹۷۹ء کو چند گھنٹوں کی مختصر علالت کے بعد میڈیکل کالج لکھنؤ میں مغرب کے وقت پیش آیا، ان کے عم مکرم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی جن کے وہ قوت بازو، اور فکر وتحریر میں ایک طرح ثنی تھے، ایک سفر پر تھے، جو تدفین کے بعد پہونچ سکے جن کے لئے یقینی طور پر یہ حادثہ برداشت کی طاقت سے باہر کا حادثہ تھا، اور گویا ایک فرزند کا حادثہ تھا۔ ان کے صاحبزادگان سے مل جل کر جذبات پر قابو مشکل ہو گیا، نماز جنازہ لکھنؤ میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے اور رائے بریلی میں برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی نے پڑھائی، انتقال کے وقت ان کی عمر ۴۴ سال تھی، انتقال سے ایک ہفتہ یا کچھ دن پہلے انہوں نے اپنے وقت کے بڑے بزرگ و مصلح حضرت مولانا محمد احمد پرتاپگڈھیؒ کو ایک خط لکھا تھا جس پر ۱۰/رجب ۱۳۹۹ھ /۷/جون ۱۹۷۹ء کی تاریخ درج ہے، جس میں ان کے شعری مجموعہ کی ترتیب وکتابت وطباعت کے مراحل کا تذکرہ جو انہوں نے اپنے ذمہ لیا تھا، اور پھر یہ عبارت ہے۔

"جناب کی توجہ اور دعاؤں کا حسب دستور محتاج ہوں اور میری خوش نصیبی ہے کہ اس سے محروم نہیں ہوں اور الحمد للہ اس کا اثر پاتا ہوں، اپنے کو دیکھتا ہوں اور حضرت کی شفقتوں اور الطاف کو تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ:

کلاہ گوشۂ دہقان بآفتاب رسید

اللہ کی ذات عالی سے قوی امید ہے کہ ان توجہات عالیہ کا خاطر خواہ اثر اور ثمرہ ظاہر ہوگا۔"

مستحق کرامت گناہ کار اند

(مکتوب سوانح محمد الحسنی، ص ۱۵۷-۱۵۸)

ان کی وفات سے ایک دو دن پہلے ہی البعث الاسلامی کا وہ تازہ شمارہ آیا تھا جس کا افتتاحیہ بڑا طاقتور اور غیر معمولی تھا، جس کو پڑھ کر عالم جلیل مولانا محمد منظور نعمانیؒ بہت

متاثر ہوئے تھے اور اسی وقت انہیں فون کیا تھا کہ اس کو جلدی سے اردو میں لے آئیں، جسے 'الفرقان' کے تازہ شمارہ میں شائع کریں گے، اور یہ سعادت ان کے خلف الرشید مولوی سید عبداللہ حسنی ندوی کے حصہ میں تھی اور وہ اردو میں بھی شائع ہوا، اس مضمون میں جوان کا آخری مضمون تھا، ممالک اسلامیہ عربیہ اور اس کے ذمہ داروں سے صاف صاف باتیں کہی گئی تھیں، بقول مولانا محمد منظور نعمانیؒ، یہ ایک ''ندائے غیب'' ہے۔

مولانا سید محمد الحسنی مرحوم ایمان کے تقاضوں کو سمجھنے والے اور امت کو درپیش مسائل اور معاملات کی سمجھ رکھنے والے اور اپنی ادبی وتحریری صلاحیتوں سے امت کی تقویت اور اس کو خطرات سے بچانے کے لئے جو ان کی صلاحیت میں تھا، وہ کرتے رہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی علمی وفکری خصوصیات وطریقۂ دعوت سے متاثر تھے اور ان ہی کی راہ کو اپنانے کی کوشش کی اور ان ہی کے طرز پر کام کیا اور ان کے کام میں شرکت کی، ان کی کتابوں کے اردو ترجمے جو اصل کتاب سے کم نہیں ہیں، اور خود ان کی تصانیف اور ندوہ کے مجلّات وجرائد 'البعث الاسلامی'، 'الرائد'، اور اردو ترجمان 'تعمیر حیات' کے ذریعہ ان کی آواز دور دور تک پہنچی اور سنی گئی، 'البعث الاسلامی' کو انہوں نے توکلا علی اللہ نکالا اور 'تعمیر حیات' کے بھی وہ بانی ومدیر تھے، پیام انسانیت کی تحریک میں ان کا دماغ بہت کام کرتا تھا، جس میں ان کے عملی معاون مولانا اسحاق جلیس ندوی تھے اور 'تعمیر حیات' کے بھی وہ مدیر ہو گئے اور ایک ممتاز ذہنی وعملی صلاحیت رکھنے کے ساتھ بڑا صحافتی تجربہ اور صلاحیت رکھتے تھے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی پیام انسانیت کی تحریک کو بہت فعال بنا دیا تھا۔ ان کا سانحہ وفات بھی جو ۸/ جولائی ۱۹۷۹ء کو لکھنؤ میں پیش آیا، بہت صدمہ کا باعث ہوا، اور سبھی اہل تعلق پر اس کا بھی بہت اثر پڑا، دوسرے حوادث میں ایک اہم حادثہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی وفات کا تھا جو ندوہ کے معتمد تعلیم تھے اور مجھے ان کی بڑی شفقت حاصل تھی، عید کے روز یہ واقعہ پیش آیا اور ان کے وطن تھلینڈی ہی میں تدفین عمل میں آئی، اس کے علاوہ ہمارے مشفق بزرگ مولانا اسعد اللہ رام پوری ناظم مظاہر علوم سہارن پور کا حادثہ وفات ہے جو رجب یا شعبان میں سہارن پور میں پیش آیا، انہوں نے ایک موقع پر از راہ

شفقت مجھے سبق بھی پڑھایا تھا اور بہت شفقت کرتے تھے، مشہور اسلامی مفکر و مصنف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اسی سال وفات پائی۔ رحمهم الله تعالىٰ جميعاً.

حرم شریف کا حادثہ، اور مہدویت کا دعویٰ

حرم شریف کا وہ واقعہ جس کا تصور بھی محال تھا، نئے سال کے آغاز یکم محرم الحرام ۱۴۰۰ھ میں پیش آیا کہ محمد بن عبداللہ القحطانی نامی شخص نے بھی مہدی ہونے کا دعویٰ کیا اور لوگوں سے بیعت لینی شروع کی، حرم شریف اس وقت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جس سے حرم میں ہیجان اور پوری مملکت میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی، یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا، اور ایسی ہنگامی صورت حال تھی کہ جس پر قابو پانا خاص طور پر حرم کی نسبت سے جہاں قتل وخون کی ممانعت ہے، آسان نہ تھا، علماء بھی حیران و پریشان تھے، آخرکار جو بھی کارروائی کا فتویٰ مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز نے دیا اور حکومت نے سخت کارروائی کی جس کے نتیجہ میں یہ مدعی مہدویت مقتول ہوا، مگر حرم شریف کے دروازے معتمرین اور نمازیوں کے لیے بھی بند رہے، یہاں تک کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جو وزارت اوقاف کی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے عزیزی سید عبداللہ حسنی ندوی مرحوم کے ساتھ پہنچے ہوئے تھے، عمرہ نہ کر سکے، اور کانفرنس میں شرکت کر کے قطر روانہ ہو گئے جہاں ۵-۹ محرم ۱۴۰۰ھ/۲۶-۳۰ نومبر ۱۹۷۹ء کو انٹرنیشنل سیرت کانفرنس کا انعقاد حکومت قطر کی سرپرستی میں ہو رہا تھا، جدہ سے ان کے ساتھ رابطے کا وفد بھی دوحہ کے لئے روانہ ہوا جس کے سربراہ رابطہ کے جنرل سکریٹری شیخ محمد علی الحرکان تھے۔ اس سفر میں اگرچہ میں ساتھ نہیں تھا لیکن اس کی تفصیلات اور جزئیات اتنی عام ہوئیں کہ کوئی چیز مخفی نہ رہی۔

حرم کا واقعہ دیکھا جائے کہ تو وہ قرامطہ کے مذموم واقعہ و حرکت کے بعد نہایت مذموم واقعہ تھا جس سے عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کی گردنیں شرم و ندامت سے جھک گئیں اور حرم شریف کچھ وقت کے لئے اپنے ماحول اور سارے مکہ سے کٹ گیا، اور وقت پر کارروائی نے بڑے فتنہ اور آزمائش سے مملکت اور امت کو بچایا کہ جیسا کہ معلوم ہوا

خاموشی سے جہازوں کے ساتھ حرم کے اندر اسلحہ کی سپلائی کا عمل بھی جاری تھا، حرم کا کامیابی سے انخلا ہوا، اور ادب وسکون کا ماحول پھر واپس آگیا، لیکن اس کے بعد حکومت کو زیادہ چوکسی دکھانی پڑی اور ایسی احتیاطی تدابیر بھی اختیار کرنی پڑیں، جن کی علماء کی طرف سے اجازت نہیں مل پا رہی تھی جیسے کیمرے وغیرہ لگائے گئے، اور اندر سامان وغیرہ سے جانے میں سختی سے کام لیا جانے لگا، لیکن یہ سب کچھ حرم کے ادب وسکون اور حرمت وتعظیم کو قائم رکھنے، حجاج ومعتمرین اور اہل حرم کے تحفظ ومفاد میں کیا گیا، یہ شاہ خالد بن عبدالعزیز کے دور کا واقعہ ہے جب شاہ فہد بن عبدالعزیز ولی عہد تھے، عزیزی مولوی عبداللہ حسنی مرحوم مارچ ۱۹۸۰ء میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ایک دوسرے سفر حجاز میں ساتھ آئے اور پھر عمرہ کی سعادت حاصل کی اور واپس دیوبند کے اجلاس میں شرکت کے بعد لکھنؤ آئے، ہم لوگ لکھنؤ سے دیوبند کے اجلاس میں شرکت کے لئے پہونچے تھے۔

شاہ فیصل ایوارڈ کے لیے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے نام کا اعلان

گذشتہ دو تین سال سے سعودی حکومت نے ایک ایسے عالمی ایوارڈ کا نظام بنایا جس کی عالم اسلام میں نوبل انعام کی سی حیثیت ہو کہ نوبل انعام ایسی کسی عالمی شخصیت کو دیا جاتا رہا ہے جس کا کام ومقام امریکی ومغربی ایجنسیوں کا طے کردہ ہوتا ہے، اور ایسے نام اور انعام سے عالم اسلام کو ٹھیس پہونچتی رہی ہے۔ سعودی عرب کے بادشاہ شاہ خالد اور پھر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے کاموں کا فیصل ایوارڈ کے لئے اعلان ہوا اور اس کی تقریب ان کے لیے منعقد ہوئی، اس بار سال ۱۴۰۰ھ / ۱۹۸۰ء کے لئے علمی، دینی ودعوتی حیثیت سے انڈونیشیا کے صدر ڈاکٹر محمد ناصر اور ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ناموں کا مشترک اعلان ہوا، جبکہ علم وتحقیق، ادب، سائنس، طب وغیرہ کے لئے الگ کاموں اور شخصیات کا انتخاب اور اعلان تھا۔ مولانا کے نام کا جب اعلان ہوا تو وہ اپنے وطن تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں مقیم تھے، ان کے نام ایوارڈ کمیٹی کے صدر امیر خالد بن فیصل بن عبدالعزیز آل سعود کی طرف سے اطلاعی تار تھا، اور ریاض آکر اسے وصول کرنے کی دعوت تھی، جو مبارکباد کے تار تھے، ان میں سب سے اہم تار

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنیؒ کا تھا اور بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے مزاج کے خلاف اس میں اتنی جلدی کیوں کی تھی کہ کہیں حضرت مولانا اپنے مزاج وافتادِ طبع سے انکار نہ کردیں، اور ایوارڈ قبول کرنے کے بہت سے فوائد ہیں کہ جن میں ان کی صحیح فکر ودعوت کا اچھا تعارف بھی ہے اور اونچے طبقے میں بات پہونچانے کا ایک ذریعہ بھی، یہ سب تار اور اطلاعی تار میں، ہی لکھنؤ سے لے کر رائے بریلی حاضر خدمت ہوا، جہاں ان کی ہمشیرہ صاحبہ جو میری والدہ ہیں اور اہلیہ صاحبہ اور بھانجہ مولانا محمد ثانی حسنی اور دیگر اہلِ خاندان موجود تھے، سبھی کے لئے یہ خوشی ومسرت کی بات تھی، یہ اعلان ۲۶/صفر ۱۴۰۰ھ/۱۶/جنوری ۱۹۸۰ء کو ہوا، اور وزیر تعلیم معالی شیخ حسن بن عبداللہ آل الشیخ کا خصوصی وپرزور تار آیا کہ حضرت مولانا تقریب میں ضرور شرکت فرمائیں، مگر حضرت مولانا نے شاہ فیصل کی نسبت سے ایوارڈ تو قبول کرلیا، مگر جلسہ میں شرکت سے معذرت کی اور جو رقم کا اعلان ہوا اس کو وہاں کے حفظ قرآن کے اداروں، مدرسہ صولتیہ، اور افغان مجاہدین کے لئے دئے جانے کا اعلان کردیا، اور جو طلائی تمغہ تھا تو وہ بھی خود نہیں رکھا، نہ اس کی قیمت لی، اور توصیفی سند کو ایک مقام پر محفوظ کرادیا، حضرت مولانا کی طرف سے مکہ مکرمہ میں مقیم ان کے میزبان مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے یہ ایوارڈ وصول کیا اور حسب ہدایت عمل کیا۔

دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس اور اس کے اثرات

۲۱، ۲۲، ۲۳/مارچ ۱۹۸۰ء کو دارالعلوم کا عظیم اور وسیع وتاریخی اجلاس سرزمین دیوبند میں منعقد ہوا، ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے جن کی تعداد لاکھوں سے متجاوز تھی اور برصغیر کی مقتدر شخصیات کے علاوہ اہم عرب علماء بھی شریک اجلاس تھے، سعودی عرب کے بادشاہ شاہ خالد کی نمائندگی ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی وائس چانسلر جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ نے کی، مصر کے عظیم اور مشہور قاری شیخ عبدالباسط عبدالصمد اور سابق وزیر شیخ دکتور عبدالمنعم النمر سابق استاد دارالعلوم دیوبند، قطر سے شیخ یوسف القرضاوی، کویت سے شیخ یوسف قاسم الحجی وزیر اوقاف کویت، اور مستشار عبداللہ العقیل بھی شریک اجلاس تھے، اس موقع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن

علی ندویؒ کو عربی میں خطاب کی دعوت دی گئی کہ ممتاز عرب فضلاء ومفکرین کے سامنے اس کی ضرورت تھی کہ انہیں دارالعلوم کا پیغام ومنہج جس عمدہ طریقہ سے اس مناسبت سے حضرت مولانا سمجھا سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں اور اس کے لئے اس سے بہتر اسٹیج بھی نہیں، مگر حضرت مولانا نے اردوداں طبقہ کی اکثریت اور ٹھاٹھیں مارتا سمندر دیکھ کر مختصر عربی خطاب کے بعد اردو خطاب شروع کردیا جو زیادہ مفید ہوا اور اس خطاب کو حاصلِ اجلاس سمجھا گیا جس کا اظہار اسی وقت ممتاز دیوبندی فاضل اور پاکستان کی اہم سیاسی وقدآور علمی، دینی شخصیت مفتی محمود مرحوم سابق وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد (حال خیبر پختونخواہ) نے ببانگ دہل کہا، اور خواص وعوام میں اس بات کی گونج بھی رہی، جس کا سب سے اہم حصہ اور پیغام یہ تھا کہ:

> ''اس درسگاہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اختلافی مسائل کے بجائے توحید وسنت پر اپنی توجہ مرکوز کی اور یہ وراثت اور امامت ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کے وسیلہ سے اس کو ملی اور ابھی تک اس کو عزیز ہے، دوسری خصوصیت اتباع سنت کا جذبہ اور فکر ہے، تیسری خصوصیت تعلق مع اللہ کی فکر اور ذکر وحضوری اور ایمان واحتساب کا جذبہ ہے، چوتھا عنصر ہے اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ اور کوشش اور دینی حمیّت وغیرت۔
>
> یہ چار عناصر مل جائیں تو دیوبندی بنتا ہے، اگر ان میں سے کوئی عنصر کم ہوجائے تو دیوبندیت ناقص ہے، فضلائے دارالعلوم دیوبند کا یہی شعار رہا ہے، اور وہ ان چار چیزوں کے جامع رہے ہیں۔''

یہ تقریر مکتبہ حرا لکھنؤ سے ''زندہ رہنا ہے تو میر کارواں بن کر رہو'' کے عنوان سے مستقل رسالہ کے طور پر شائع ہوکر عام ہوئی۔

اجلاس اپنی کمیت کے اعتبار سے عدیم النظیر اجلاس تھا، اور مجمع کی غیر معمولی تعداد اور ہجوم کی وجہ سے نظم ونسق بھی متاثر ہوا، افتتاحی اجلاس میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کی شرکت سے بھی تھوڑی بدمزگی ہوئی، جو ایک دینی اجلاس کے لئے پسندیدہ نہیں سمجھا گیا مگر

منتظمین کی کچھ مجبوریاں رہی ہوں گی، اجلاس کے بعد لکھنؤ واپسی ہوئی جہاں بلاد عربیہ اور پاکستان کے مہمانوں کی ندوۃ العلماء بھی آمد تھی، اور بعض بڑی اہم شخصیات اور وفود ندوۃ العلماء اس موقع پر آئے، جس کی تفصیلات ناظرین 'الرائد'، 'البعث الاسلامی' اور اردو ترجمان پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ انہی میں ایک اہم دینی شخصیت جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی کی بھی تھی مگر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور ہم لوگ رائے بریلی کے سفر پر تھے، اس لئے ملاقات نہ ہوسکی کہ ان کا ویزہ رائے بریلی کا نہیں تھا۔

مصر کے ڈاکٹر عبدالمنعم النمر سابق وزیر اوقاف مصر اور مشہور قاری شیخ عبدالباسط عبدالصمد مصری بھی آئے، اور قاری عبدالباسط نے ندوہ کی مسجد میں جمعہ کی اذان دی جس کا بہت اثر پڑا اور شیخ عبدالمنعم نے النمر جمعہ پڑھایا۔ شہر میں بھی قاری عبدالباسط کا پروگرام ہوا، شیخ یوسف القرضاوی کی تشریف آوری ہوئی اور ان کے خطابات ہوئے۔

ندوۃ العلماء میں عربی واسلامی ادب پر بین الاقوامی مُذاکرہ

ندوۃ العلماء نے ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا تھا، جس کا موضوع عربی ادب میں خصوصاً اور دوسری زبانوں کے ادبیات میں اسلامی عناصر کی تلاش تھی، یہ سیمینار ۱۷/اپریل ۱۹۸۱ء سے ۱۹/اپریل ۱۹۸۱ء تک جاری رہا اور مثالی وتاریخی کامیابی سے ہمکنار ہوا۔

اس مذاکرہ علمی میں حصہ لینے کے لئے متعدد عرب ممالک کے مُمتاز فضلاء وادباء نے شرکت کی جن میں دورِ حاضر کے بلند پایہ مصنفین، فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین، شعراء اور ادباء نے حصہ لیا اور پوری دلچسپی اور سرگرمی کے ساتھ مباحثات میں شریک ہوئے۔ عام طور پر عرب ممالک کے وفود جس معیار کے ہوتے ہیں، ان سے ان ادباء کا علمی درجہ مختلف تھا، یہاں آنے والوں میں بیشتر وہ حضرات تھے جو یا تو کانفرنسوں میں شرکت کے لئے نہیں جایا کرتے، اور اگر ملک سے باہر کہیں جاتے ہیں تو بہت ہی بامقصد، متعین علمی موضوع پر مباحثہ میں شرکت کے لئے جاتے ہیں۔ حکومت قطر کے بزرگ عالم، اور بڑے دینی منصب پر فائز شخصیت شیخ عبداللہ ابراہیم الانصاری بھی شریک ہوئے، جن کا اگرچہ کسی یونیورسٹی سے تعلق نہیں تھا، لیکن ادبی ذوق، اور دینی واسلامی ادب کے فروغ میں ان کا بڑا حصہ ہے، اس طرح عرب ممالک کے ادباء کی

تعداد تین درجن سے زیادہ تھی، جن میں عالی مرتبت سید عبدالعزیز رفاعی سابق سکریٹری مجلس الوزراء (مملکت سعودیہ) بھی شامل ہیں، جنہوں نے عربی ادب وتاریخ کے ذخیرے سے صحابہ کرامؓ کی ان شخصیتوں کے ادبی پہلو پر ایک سلسلۂ کتب تیار کر دیا ہے، جو ادیب وشاعر تھے اور جن کو کبھی اس نظر سے دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت الباشا بھی قابل ذکر ہیں جنہوں نے الشعر الاسلامی، النثر الاسلامی، اور ادب الدعوۃ کے موضوع پر بالواسطہ اور بلاواسطہ (اپنے قلم سے یا تحقیقی کام کرنے والے فضلاء کے ذریعہ جو ان کی زیرنگرانی کام کر رہے تھے) ایک مستقل کتب خانہ تیار کر دیا ہے جو بڑی ادبی قدروقیمت کا حامل ہے، نیز جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، جامعۃ الملک عبدالعزیز (جدہ ومکہ) جامعۃ الامام محمد بن سعود، جامعۃ العین (امارات عربیہ) جامعۃ قطر، جامعۃ عمّان (شرق اردن) کے عربی شعبوں کے سربراہ شریک تھے۔ مصر کا ایک ممتاز وفد جس کی قیادت مصر کے وزیر اوقاف ڈاکٹر زکریا برّی، نائب وزیر اوقاف ڈاکٹر عبداللہ عبدالشکور کامل کر رہے تھے، اُن کے علاوہ شارقہ، دبئی کے فضلاء وادباء شامل تھے، جامعۃ الملک عبدالعزیز کی طرف سے شام کے مشہور فاضل اور کثیر التصانیف عالم استاد عبدالرحمٰن حسن حبنّکہ شریک تھے، جو ادیب وشاعر ونقاد، اور بلند پایہ عالم دین ہیں، سلطنت عُمان کے مفتی احمد حمد الخلیلی بھی تشریف لائے تھے، جو عمان کے بڑے ادیب وشاعر ہیں۔

دوسری طرف تقریباً ہندوستان کی نامور جامعات (یونیورسٹیز) اور اسلامی درسگاہوں کے اساتذہ شریک ہوئے، اُردو، انگریزی، فارسی کے مقالات کی علیحدہ تنظیم تھی، اور عربی کا علیحدہ سمینار رہا، اور دونوں بیک وقت دو مختلف ہالوں میں پوری سنجیدگی، علمی فضا، اور شغف وانہماک کے ساتھ انجام پاتے رہے۔ عربی مذاکرہ کے ہال میں جایئے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپ لکھنؤ میں نہیں بلکہ قاہرہ، دمشق یا حجاز کے کسی عظیم الشان علمی و ادبی اجتماع، یا کسی نامور خطیب وادیب کے لکچر میں ہیں، بلکہ صحیح تر الفاظ میں عربی زبان و ادب کا عہد بہاراں واپس آ گیا ہے جب اس کا طوطی بولتا تھا۔ جس وقت قصیدوں اور نظموں کے پڑھنے کا وقت آیا، جو مہمان ادباء وفور جذبات میں کہہ کر لائے تھے، یا یہاں کی فضا سے متاثر ہو کر فی البدیہہ کہا تھا تو سوق عکاظ کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا، ان شعراء و

ادباء میں ہمارے استاد مولانا محمد ناظم ندوی، سابق مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء، شیخ الجامعۃ العباسیہ بہاول پور (پاکستان) بھی تھے۔

افتتاحی تقاریر میں امام محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض کے پروفیسر ڈاکٹر فتحی عثمان کی نہایت مؤثر اور طاقتور تقریر تھی جس کو حاضرین نے بہت تاثر و ذوق سے سُنا۔

ندوہ کی خدمات اور اس کی اس فکر کو تمام علمائے ادب نے سراہا کہ ادبیات میں اصلاحی تصور اور اخلاقی قدروں کے کافی خزانے موجود ہیں، ان کو منظر عام پر آنا چاہئے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں بتایا کہ صرف قرآن کریم کا یہ احسان ہے کہ عربی زبان زندہ ہے، اور اپنے مرکز سے ہزاروں میل کی دوری پر آج اس کے ادب پر مباحثہ ہو رہا ہے۔ مولانا نے تفصیل سے بتایا کہ اس ملک اور اس برصغیر میں عربی زبان و ادب، تاریخ و سیر، حدیث و تفسیر پر کیا کام ہوئے ہیں، جن کی مثال دوسرے کسی غیر عرب ملک میں مشکل سے ملے گی۔ نیز یہ کہ یہاں کے علماء نے ملک کے زبان و ادب کی ترقی اور سرگرمی میں قائدانہ و رہبرانہ حصہ لیا ہے (جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں ملنی مشکل ہے) اور وہ یہاں کی علمی و ادبی زندگی میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ زبان و ادب کا کوئی مؤرخ ان کا ذکر کئے، ان کی خدمات کا اعتراف کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ مولانا نے اس پہلو کو بھی واضح کیا کہ ندوۃ العلماء کے بانیوں اور اس کے نامور فضلاء نے عربی ادب اور دین کو ہم آہنگ بنانے اور ایسا نصاب تعلیم مرتب کرنے کی سب سے پہلے دعوت دی جس میں دین و ادب پہلو بہ پہلو اور ایک دوسرے کے معاون نظر آئیں۔

ندوہ کا یہ سمینار اپنے حُسن انتظام، سنجیدہ علمی مقالات اور عرب ادباء کی دلچسپی و سرگرمی کے لحاظ سے بے مثال سمجھا جا رہا ہے، عرب وفود نے پوری وسعت قلبی سے اس کا اعتراف کیا اور نظم و نثر دونوں میں ندوہ کے فضلاء و ادباء کو خراج عقیدت پیش کیا، جنہوں نے عربی نثر و مقالہ نگاری کا ایک ایسا اسلوب پیش کیا ہے، جو عربی زبان و ادب کی حلاوت و فصاحت اور دعوت کی رُوح و طاقت دونوں کا بیک وقت مظہر اور نمونہ ہے۔

اس مذاکرہ میں عربی کے ۴۰ مقالات پڑھے گئے، ۱۰ قصیدے سنائے گئے، اُردو سیکشن

میں ۴۴ مقالات پیش ہوئے، جن میں پانچ انگریزی، ایک فارسی اور بقیہ اُردو کے تھے۔

مذاکرہ علمی کا اختتام ایک سفارش پر ہوا، جس میں ادبیات کے اندر اسلامی تصورات کی تلاش اور مزید ادبی کاموں میں اخلاقی و مذہبی عناصر کو اُجاگر کرنے کی تدابیر شامل ہیں۔ نیز یہ کہ ایک مستقل سکریٹریٹ قائم کیا جائے جس کا صدر مقام دارالعلوم ندوۃ العلماء ہو، یہ سفارشات ایک کمیٹی نے مُرتب کیں جو عرب اساتذۂ ادب پر مشتمل تھی۔ ندوۃ العلماء کی طرف سے اس کے رکن مولانا واضح رشید ندوی تھے۔ کمیٹی کے ایک معزز رکن ڈاکٹر فتحی عثمان نے سفارشات مرتب کرنے کا بنیادی رول انجام دیا، اور انہوں نے ہی سفارشات سمینار کے جلسہ عام میں پڑھ کر سُنائیں اور منظور کرائیں۔

شیخ محمد المجذوب (جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ) نے اجلاس کے آغاز میں تجویز پیش کی کہ صدر میزبان ادارہ کے سربراہ کو ہونا چاہئے، جیسا کہ عام بڑی مؤتمروں اور کانفرنسوں میں ہوتا ہے، اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مہمانوں میں سے کسی کو صدر بنایا جائے تو دوسرے مہمانوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کو کم درجہ دیا گیا، عربی کے اس سمینار کے لیے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بالاتفاق صدر منتخب ہوئے، جلسوں کو کنڈکٹ کرنے کی خدمت علامۂ ادب استاد رأفت باشا نے انجام دی، جو جامعہ امام محمد بن سعود میں (جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے) ایک قدیم، تجربہ کار مربی اور استاد ہیں، اور ان کی سرکردگی میں متعدد طلباء نے اسلامی ادبیات پر ایم۔اے۔، پی۔ایچ۔ڈی۔ کیا ہے۔ اور جن کے محققانہ مقالات کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

اُردو سیکشن کی صدارت جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ نے کی، ان کے مددگار اور شریک کار پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی (جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) تھے، اور کنڈکٹ کرنے کے فرائض ڈاکٹر محمد اقبال انصاری (ندوی) علی گڑھ یونیورسٹی نے انجام دیئے۔

مجلس مذاکرہ کے انتظامات اور مشوروں میں ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی (استاد جامعۃ الملک عبدالعزیز مکہ مکرمہ و استاد زائر ندوۃ العلماء) مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی (مدیر "البعث الاسلامی" و استاد ادب عربی دارالعلوم) مولانا سید واضح رشید ندوی (مدیر عربی جریدہ "الرائد" و استاد ادب عربی ندوۃ العلماء) اور مولانا ابوالعرفان ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء

پیش پیش تھے۔ سمینار کے انعقاد سے کئی روز پیشتر پروفیسر محمد شبیر ندوی (جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) دار العلوم میں آگئے تھے، جن کا ۱۹۷۵ء کے ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن کے کامیاب بنانے میں خاص حصہ تھا، عزیزان مولوی شفیق الرحمٰن ندوی اور مولوی محمود الازہار ندوی نے دفتر کی ذمہ داری سنبھالی اور مراسلت و رابطہ کا کام بڑی تندہی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ سمینار کی کامیابی میں ان کی کوششوں، تجربہ اور تنظیمی و انتظامی صلاحیت کو بھی خاص دخل تھا، اس تاریخی اور نازک موقع پر دار العلوم کے ہر عمر کے طلباء نے جس سعادت و صلاحیت اور سرگرمی و جانفشانی کا مظاہرہ کیا، وہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے، عرب مہمان اور غیر ملکی فضلاء (جو کثرت سے کانفرنسوں میں جاتے رہتے ہیں، اور ملک ملک دیکھے ہوئے ہیں) جہاں دار العلوم کی پُر سکون و پُر وقار علمی و ادبی فضا سے متاثر ہوئے، اور انہوں نے ایک سے زائد بار اپنے اس گہرے تاثر کا اظہار کیا، وہاں ان طلباء کی سعادت و نظم و اطاعت سے بھی بڑے متاثر ہوئے۔ اس سمینار کا انعقاد اور اس کی غیر معمولی کامیابی (جو محض تائید الٰہی اور توفیق خداوندی کا کرشمہ تھا) نہ صرف ندوۃ العلماء بلکہ پورے ہندوستان کے لئے موجب شکر اور سرمایہ فخر ہے، اور مدتوں اس کو یاد رکھا جائے گا۔

امید ہے کہ یہ مذاکرہ علمی ایک نشان راہ، اور ایک عظیم سفر کا آغاز ہوگا، جس کا فائدہ پورے دین و ادب اور ان کے مرکزوں کو پہونچے گا۔

یہاں سب سے پہلے وہ دعوت نامہ درج کیا جاتا ہے جو عربی اور اُردو دونوں زبانوں میں مدعوئین کو بھیجا گیا تھا، اور جس میں اس مجلس مذاکرہ کے مقاصد و موضوع کو مفصل تعارف اور اس کے انعقاد کی ضرورت کا واضح بیان آگیا ہے، اور تجاویز و سفارشات کا خلاصہ بھی پیش کیا جاتا ہے، مجلس مذاکرہ کے عربی خطبۂ صدارت کا ترجمہ جو ڈاکٹر مولانا عبد اللہ عباس ندویؒ کے قلم سے تھا، نیز صدر مجلس مذاکرہ کی وہ تقریر جو انہوں نے سمینار کے اُردو سیکشن میں کی اور اسی وقت ریکارڈ کر لی گئی تھی، وہ بھی بڑی اہمیت کی حامل تھی، ڈاکٹر فتحی عثمان کی ولولہ انگیز تقریر کا ترجمہ مختلف رسالوں میں چھپ چکا ہے، اس کی گونج بہت دنوں تک کانوں اور مجلسوں میں باقی رہی اور اس سے اس علمی و ادبی مجلس مذاکرہ میں ایک جوش پیدا ہو گیا تھا، آخر میں مجلس مذاکرہ کے لائق کنوینر اور فاضل مندوب علامہ ڈاکٹر عبد الرحمٰن رأفت الباشا کا فاضلانہ پُر مغز و فکر انگیز مقالہ اور شیخ

عبداللہ ابراہیم انصاری کا رُوحِ اسلامی سے معمور خطبہ بھی ہے، جو انہوں نے مجلس میں پڑھ کر سُنایا اور جس میں ادب اسلامی کے صحیح خدوخال اور اس کا صحیح تخیل اور منصوبہ آ گیا ہے، اور جو اس مجلس کے بہترین مقالات میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔

دعوت نامہ

مکرمی ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہم آپ کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرنا چاہتے ہیں کہ ادب اور بالخصوص ادب عربی کے ذخیرہ کا نئے سرے سے جائزہ لینے پھر سے اس کا مطالعہ کرنے اور نئے انداز سے پیش کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ ہر قوم کے ادب کی طرح یہ بھی ابتلاء وآزمائش کے دور سے گذرتا رہا ہے، ابتلاء وآزمائش کا یہ مرحلہ تقریباً فطری ہے اور اس سے ہر زبان وادب کو گذرنا پڑا ہے البتہ اس کی مدت میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے، کسی قوم کے ادب میں آزمائش کا دور طویل ہوا ہے تو کسی کا مختصر، دراصل اس کا تعلق معاشرتی حالات، سیاسی عوامل ومحرکات اور اصلاح وتجدید کی تحریکوں سے ہے، جہاں یہ چیزیں پورے طور پر میسر آ گئیں وہاں آزمائش کا دور مختصر ہو گیا اور جہاں یہ چیزیں میسر نہ آئیں یا کم آئیں اس ادب اور قوم کی آزمائش اور زبوں حالی کا دور طویل ہو گیا۔

"کسی بھی ادب کی آزمائش اور ابتلاء یہ ہے کہ اس پر ایسے لوگ حاوی ہو جائیں جو ادب کو بطور فن اور پیشہ کے اپناتے ہیں اور اس کو صرف اپنے ساتھ مخصوص ومحدود بنا لیتے ہیں، اس کو بنانے سنوارنے اور عبارت آرائی کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں کہ اس طرح کمال ومہارت کا سکہ جما کر اپنی مقصد برآری کریں۔ یہ صورت حال مسلسل ترقی پذیر ہوتی ہے، یہاں تک کہ ادب صرف انہی افراد کی میراث بن کر رہ جاتا ہے اور ایک ایسا وقت آتا ہے کہ ادب کا تصور ان ہی کے نگارشات قلم تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے، جو محض صنعت وفن کاری اور تقلیدی ادب کا مجموعہ ہوتا ہے، اس کے اندر زور ہوتا ہے نہ رُوح، جدّت وندرت ہوتی ہے اور نہ دل آویزی کا کوئی سامان۔

یہ مصنوعی اور تقلیدی ادب اس فطری، رواں اور سلیس ادب اور اس کی بلیغ تعبیرات

پر، جن پر انسان جھوم اُٹھے، اور اس کے ذہن وفکر کے اندر وسعت پیدا ہو جو کسی اسلوب کی اندھی تقلید سے روکے، اور انسان کے اندر خود اعتمادی پیدا کرے، وہ ادب جس سے اس قوم کا کُتب خانہ بھرا پڑا ہے، اس ادب پر یہ تقلیدی اور مصنوعی ادب چھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس رواں اور سلیس ادب میں اس کے سوا اور کوئی عیب یا نقص نہیں کہ وہ ان افراد کے قلم سے نکلا ہے جنہوں نے ادیبوں کی وردی نہیں پہنی اور انہوں نے ادب وانشاء کو پیشہ یا ذریعۂ معاش نہیں بنایا، اور ان کے دل کش ودلنواز ادبی خوش بیانیوں کو کسی ادبی عنوان سے موسوم نہیں کیا گیا اور نہ اس کا ادب کے سیاق میں ذکر کیا گیا ہے، بلکہ اس کی کسی دینی بحث، عالمانہ اور فکر انگیز کتاب اور فلسفیانہ یا معاشرتی موضوع کے سلسلے میں جلوہ نمائی ہوئی ہے۔ یہ سب ادبی شہ پارے دینی و اخلاقی اور علمی کتابوں کے انبار میں دبے ہوئے ہیں، روایتی ادب نے خود پسندی کی بنا پر اسے اپنی صف میں جگہ نہیں دی اور مؤرخین ادب نے اپنی فکر ونظر کی کوتاہی کے سبب ادھر توجہ نہیں کی اور نہ اُسے وہ مقام دیا جس کے وہ شہ پارے جا بجا طور پر مستحق تھے۔

یہ فطری، دلآویز اور طاقتور ادب، عربی کے معمور کتب خانہ میں بہت وسیع ہے اور اس کی تاریخ مصنوعی وتقلیدی ادب سے زیادہ قدیم ہے، کیوں کہ مکاتیب وخطوط اور قصہ کہانیوں اور اس طرح کے تقلیدی ادب کے مدون ہونے سے بہت پہلے حدیث وسیرت کی کتابوں میں یہ فطری اور طاقت ور ادب مدون ہو چکا تھا، لیکن ادب کے مؤرخین اور تحقیق اور ریسرچ کا کام کرنے والوں نے جتنی توجہ تقلیدی ادب پر صرف کی اتنی اس قدیم اور فطری ادب پر نہیں کی جس سے عربی زبان کی صلاحیت وبرتری اور اس کی گہرائی ظاہر ہوتی ہے اور اہلِ زبان کا کمال فن، ملکہ اور زبان پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے اور درحقیقت وہی ادب کا پہلا اور اصل مدرسہ ہے۔

ان کی دینی اور علمی تحریروں کی برتری، اثر انگیزی، قوت اور دلآویزی کا راز صرف اس حقیقت میں مضمر نہیں ہے کہ یہ مسجع اور محاسن بدیع کی قیود سے پاک ہیں، سلیس اور رواں ہیں، بلکہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان تحریروں کا باعث ومحرک عقیدہ اور جذبہ دل ہے، یہ تحریریں ایک مسئلہ پر مکمل اطمینانِ قلب ہو جانے کے بعد، پورے جوش اور لگن کے ساتھ لکھی گئی ہیں، ان کے برعکس جو تحریریں صرف مظاہرۂ ادب کے لئے لکھی گئی ہیں، وہ کسی بادشاہ ووزیر یا دوست کی فرمائش

پر یا اپنے ادبی ذوق کی تسکین یا معاشرہ کی خواہش کی تکمیل یا حصول شہرت اور اپنی برتری وتفوق کا سکہ جمانے کی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے محرکات سطحی ہیں، ان کے اندر یہ صلاحیت کہاں کہ کسی تحریر کے اندر قوت اور روح پیدا کر سکیں یا اس کو زندۂ جاوید بنا سکیں، اس مصنوعی ادب اور قلب اور عقیدہ کی زبان سے نکلنے والی تحریروں کے درمیان وہی فرق ہے جو انسان اور اس کی تصویر کے درمیان ہوتا ہے یا کرائے پر رونے والی اور اس چوٹ کھائی ہوئی ماں کے درمیان ہوتا ہے، جس کا اپنا بچہ موت کا شکار ہو گیا ہو۔ یہ پیشہ ور ادیب اپنی تحریروں میں ان بہروپیوں کے مشابہ نظر آتے ہیں جو کبھی بادشاہوں کا رول ادا کرتے ہیں تو شاہانہ جاہ وجلال کا نقشہ پیش کرتے ہیں، کبھی فقیروں کا کردار ادا کرتے ہیں تو فقیروں کا لباس پہن لیتے ہیں، کبھی کسی قسمت کے دھنی کا پارٹ ادا کرتے ہیں اور کبھی قسمت کے مارے کا، لیکن نہ تو سعادت وخوش بختی کا سایہ ان کو نصیب ہوتا ہے اور نہ فقر وفاقہ اور بدبختی کی آنچ ان تک پہونچتی ہے، کبھی کسی غمزدہ کے غم کی کسک محسوس کئے بغیر اس کے غم میں شریک ہوتے ہیں اور کبھی کسی خوش نصیب کی مسرتوں کے احساس مسرّت میں شرکت کے بغیر اس کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

یہاں ادب کی ان قدیم کتابوں کی جو خطوط اور قصہ کہانیوں، نیز دیگر اصناف پر مشتمل ہیں، تحقیر مقصود نہیں اور نہ زبان وادب اور ان کی فنی قدر و قیمت کو گھٹانا مقصود ہے، مقصد یہ ہے کہ ادب اور زبان کے مختلف مراحل میں یہ ایک فطری مرحلہ ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت ہے کہ ادب صرف یہی نہیں ہے اور نہ وہ ادب عالی کی نمائندگی کرتا ہے جو دُنیا کا بہت وسیع اور بڑا دلآویز ادب ہے۔

ان کتابوں نے تحریر و نگارش کی فطری صلاحیتوں اور وہبی قوتوں کو بڑا نقصان پہونچایا ہے۔ ان کی وجہ سے عربی زبان کی صلاحیت پر حرف آیا ہے۔ انہوں نے فکر و ذہن کے اندر وسعت پیدا کرنے اور حقیقت وخیال کی دنیا میں پرواز کرنے سے باز رکھا۔ اس عظیم قوم کی جو بے مثل زبان وادب عالی کی حامل ہے، ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گئیں، لہٰذا ہمارے لئے بہتر یہ ہے کہ ہم ادب اور ادباء کی صف میں انہیں وہ مقام دیں جن کی وہ مستحق ہیں اور ان پر وہ توجہ صرف کریں جو ان کا حق ہے اور از سرِ نو عربی ذخیرۂ کتب کو

کھنگالیں اور اپنے نونہالوں اور نئی نسل کے سامنے قدیم کتابوں سے ادب کے نئے نمونے پیش کریں تاکہ وہ اس زبان کی چاشنی اور حلاوت سے لُطف اُٹھائے، اس کی نشو ونما اس طرح ہو کہ وہ صحیح اور بلیغ اسلوب میں مافی الضمیر کی ادائیگی پر قادر ہو، ساتھ ہی ساتھ وسیع کُتب خانے سے آگاہ ہو، اور اس سے استفادہ کر سکے۔"

روز اوّل ہی سے ندوۃ العلماء کے پیش نظر یہ کام رہا ہے اور اس نے اس کا خاص اہتمام کیا، اس کے ثبوت میں ندوۃ العلماء کے کارکنوں اور فضلاء کی تحریری کاوشیں پیش کی جاسکتی ہیں جو ادب، تنقید، تاریخ ادب اور منتخبات کے شرح و بیان کے سلسلے میں ہیں، اس طرح اس کے ذریعہ ایک خاص مکتبِ فکر وجود میں آیا ہے، اس مکتب فکر کے اثرات ونتائج گذشتہ اسی (۸۰) برس کی مدت میں خاص طور پر اُردو زبان میں ظاہر ہوئے ہیں جو برصغیر کے مسلمانوں کی زبان ہے۔ علاوہ ازیں ندوہ کے ادباء (جو عربی سے اشتغال رکھتے ہیں، اور اس میں تصنیف وتالیف کا کام کرتے ہیں) کی کتابوں اور تحریروں میں بھی اس کی چھاپ نمایاں طور سے نظر آئے گی۔

ہم اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور اس کا شکر ادا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ادبی تصوّرات کا جائزہ لینے اور اس پر غور کرنے کے لئے ایک علمی مذاکرہ منعقد کرنے کی توفیق دے رہا ہے جس میں ہم ادب عربی کے ان تمام پہلوؤں کا جائزہ لیں گے جو ادب کے اسلامی مفہوم سے ہم آہنگ ہیں، نیز دوسری اسلامی ونیم اسلامی زبانوں اور ادیبوں پر عربی ادب واسلوب کا جو اثر پڑا یا تعلق قائم ہوا، وہ بھی مذاکرہ کا موضوع ہوگا۔

ہم آپ سے توقع کرتے ہیں کہ آپ اس مقصد کے حُصول میں ہمارے ساتھ تعاون کریں گے، اور مذاکرہ میں شرکت فرمائیں گے۔ آنے والے حضرات قیام وطعام کی حد تک دارالعلوم کے مہمان ہوں گے۔

والسلام
ابوالحسن علی حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ
(یوپی)

تجاویز وسفارشات

مذاکرۂ علمی بسلسلہ ادبیات اسلامی کے جلسہ کے آخری روز ادبیاتِ اسلامی کے سلسلہ میں ضروری سفارشات وتجاویز مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی، جس نے ان تمام مقالات اور موصول شدہ تجاویز کا مطالعہ کر کے سفارشات مرتب کیں جو اس روز شام کے جلسہ کے اختتام پر تمام حاضرین کے سامنے سنائی گئیں، اور جلسہ نے تصدیق کی۔

ان سفارشات کو مرتّب کرنے والی کمیٹی میں حسب ذیل ارکان تھے:-

(۱) شیخ عبدالعزیز الرفاعی نائب صدر مذاکرہ علمی ریاض۔

(۲) ڈاکٹر محمد فتحی عثمان ڈائرکٹر شعبۂ تحقیقات امام محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض۔

(۳) ڈاکٹر یحیٰی جبوری صدر شعبہ علوم لسانیہ قطر یونیورسٹی، دوحہ قطر۔

(۴) ڈاکٹر عبداللہ عبدالشکور کامل نائب وزیر اوقاف وامور اسلامی مصر۔

(۵) ڈاکٹر عجاج الخطیب صدر شعبۂ حدیث ابوظہبی یونیورسٹی عرب امارات۔

(٦) مولانا واضح رشید ندوی استاد شعبۂ عربی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

الحمدللہ والصلوٰۃ والسلام لرسول اللہ! ادب اسلامی پر بین الاقوامی مذاکرات دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (انڈیا) میں ۱۱ر سے ۱۳ر جمادی الآخرہ ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۷ر سے ۱۹ر اپریل ۱۹۸۱ء تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کی دعوت پر لکھنؤ میں منعقد ہوتا رہا۔

اسلامی ادب پر اس بین الاقوامی مذاکرہ میں شرکت کرنے والے ارکان مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی مدظلہ العالی کی خدمت میں خراج عقیدت دلی جذبۂ شکر گذاری کے ساتھ پیش کرتے ہیں، اور اس مذاکرہ کی دعوت دینے اور ادب اسلامی کی اہمیت کو واضح کرنے کے سلسلے میں، جو انہوں نے پیش قدمی کی ہے، اس کو عظمت واحترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ارکان دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اعلیٰ مہمان نوازی، گرانقدر ضیافتوں اور کریمانہ برتاؤ سے ہماری پذیرائی کی، اور ہم اراکین

بین الاقوامی مذاکرۂ علمیہ، اللہ تبارک وتعالیٰ سے التجاء کرتے ہیں کہ مفکر ومربی عظیم المرتبت شیخ (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) کو تادیر سلامت رکھے، صحت وعافیت سے نوازے تاکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی خاطر اپنی مبارک جدوجہد جاری رکھ سکیں۔

اس مذاکرہ میں شرکت کرنے والے ہم اراکین دارالعلوم ندوۃ العلماء کی کوششوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں کہ اس نے آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے اسلامی کردار کی حفاظت کرنے میں کامیاب کوششیں کیں اور اسلام کی دعوت، اسلامی علوم اور عربی زبان کو پھیلانے میں قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے، نیز اس ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں اور مدارس کی خدمات کو بھی خراج عقیدت پیش کرتے ہیں جنہوں نے اس ملک میں اس طرح کی کوششیں انجام دی ہیں، اور ہم اراکین عرب اور مسلم حکومتوں اور تعلیمی اداروں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ لکھنؤ کے دارالعلوم ندوۃ العلماء کو مضبوط کریں اور ہندوستان کے دوسرے تعلیمی اداروں کی مدد کریں جو دینی تعلیم اور عربی زبان کی خدمت انجام دیتے ہیں اور اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ ان اداروں کی ایسی مدد کرتے رہیں جس سے ان کی سرگرمیوں کا دائرہ اور وسیع ہو، امکانیات میں اضافہ ہو اور معیار بلند ہو۔

اراکین مذاکرہ نے جمعہ ۱۱ر جمادی الاخریٰ کی صبح سے لے کر ۱۳ر کی شام تک ہونے والے صبح وشام کے جلسوں میں شرکت کی اور جو مقالات اراکین مذاکرہ نے پیش کئے انہیں سُنا اور ان پر جو بحثیں ہوئیں ان میں دلچسپی لی اور ان کی روشنی میں حسب ذیل سفارشات پیش کرتے ہیں۔

اوّل: اسلامی ادب کے دائرۂ کار میں توسیع اور اُس کی عُمومی ہمت افزائی

(۱) ادب کے محققین اور اسکالرس کو متوجہ کیا جائے کہ وہ ادب اسلامی کے مفہوم کو نمایاں کریں اور ادب کے بارے میں اسلام کے موقف کو واضح کریں اور یہ دکھائیں کہ سوسائٹی اور طرز فکر کی تعمیر کے لئے اسلام کے ڈھانچے میں ادب کا کیا مقام ہے۔

(۲) ان محققین اور اسکالرس کو متوجہ کیا جائے کہ اسلامی صحیح نظریہ کے مطابق ادب عربی

کی تاریخ مُرتب کریں اور اسلامی ادب کی تاریخ پیش کریں اور تنقید کے اسلامی طرز کو واضح کریں۔

(۳) اس بات کی کوشش کی جائے کہ ادب اسلامی کی جو کتابیں ہیں، عربی یا دوسری زبانوں میں شائع ہوں یا موجود ہوں، ان کی فہرست شائع کی جائے اور لائبریری کے تعارفی کیٹلاگس اور ببلیوگرافی کو وقت کی پابندی کے ساتھ شائع کیا جائے اور یہ ششماہی اور سالانہ پرچے نئے کاموں سے آگاہ کریں اور ان کی جستجو جاری رکھیں۔

(۴) معاصر اسلامی ادب پر توجہ دینے اور ان کو پھیلانے، پیش کرنے اور ان کا فنی جائزہ لینے، اور بامقصد تنقید کے ذریعے ان کو نکھارنے کی پوری کوشش کی جائے اور ان کو ہر ممکن وسائل سے عام کرنے اور ان کی ہمت افزائی کی کوشش کی جائے۔

(۵) تعلیمی اور ثقافتی اداروں خواہ وہ حکومت کے ہوں یا عوامی ہوں، انہیں اس پر مائل کیا جائے کہ افراد کی انفرادی ادبی قوتوں کو بروئے کار لانے کے لئے ان کی ہمت افزائی کریں اور انہیں اسلامی رُخ پر لگائیں اور ایسے افسانے، ڈرامے اور سلسلہ وار ادبی تحریروں کو پیش کرنے کے لئے انعامی مقابلے ترتیب دیئے جائیں جن کا اسلامی قدروں پر دارومدار ہو اور کامیاب ہونے والے کی ادبی کاوشوں کو شائع کرنے اور اس پر انعام دینے کا سلسلہ جاری کیا جائے۔

(۶) ادب اسلامی کو فروغ دینے کے لئے ایک مستقل سکریٹریٹ قائم کیا جائے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء سے گذارش کی جائے کہ وہ اس کی ذمہ داری قبول کرے، اور یہ سکریٹریٹ اس مذاکرہ اور آئندہ ہونے والے اجتماعات کی تجاویز و سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے نیز مناسب مدت کے بعد اس طرح کے ادبی اجتماعات مختلف اسلامی ملکوں میں کرنے کا خاکہ بنائے اور تمام ادبی، ثقافتی اور علمی محکموں سے جو مختلف اسلامی ملکوں میں ہیں، یہ اپیل کرے کہ اس طرح کے ادب اسلامی پر مذاکرات کی مجلسیں منعقد کرنے کی سہولتیں فراہم کریں۔

دوم: ادب اسلامی کی تعلیم کا میدان

(۱) اسلامی ممالک کی یونیورسٹیز کو اور دوسرے تعلیمی اداروں کو دعوت دی جائے کہ نصاب تعلیم کی پلاننگ میں ادب اسلامی کے مجوزہ مواد کو جگہ دی جائے اور اس کے تفصیلی اصول واضح کئے جائیں جن میں ادب اسلامی کا مفہوم، اس کا دائرہ کار اور اس کا رُخ متعین ہو اور ایسے حقیقی نمونے پیش کئے جائیں جو اسلامی ادب کی صحیح نمائندگی کرتے ہوں، ان یونیورسٹیز کو اس بات کی بھی دعوت دی جائے کہ اعلیٰ ڈگری کے حُصول کے لئے جو طلباء کام کرنا چاہیں انہیں ایسے موضوع کو منتخب کرنے پر مائل کیا جائے جن کا تعلق اسلامی ادب سے ہو۔

(۲) مسلم اور عربی ممالک کی یونیورسٹیز کو دعوت دی جائے کہ اسلامی ادب کے شعبے یا سنٹر کھولیں جو تحقیق کے لئے عملی خاکہ (Synopsis) تیار کرے اور اس موضوع پر سمینار اور کانفرنس بلائے جو اس سلسلہ کے مسائل پر بحث کرے اور طریق کار کا تعین کرے، اور یہ درسگاہیں اس معاملہ میں ایک دوسرے کا آپس میں تعاون کریں، مزید یہ کہ عرب یونیورسٹیز کے متحدہ ادارے اور اسلامی یونیورسٹیز کے متحدہ ادارہ سے اپیل کی جائے کہ وہ تعاون کے جتنے ممکن پہلو ہیں، ان کے ذریعہ اس مقصد کو کامیاب کرنے میں مدد دیں۔

(۳) اسلامک ممالک کی یونیورسٹیز کو دعوت دی جائے کہ مسلم اقوام کی زبانوں اور ان کے ادب کو درسیات میں جگہ دیں، اور تقابلی مطالعہ کیا جائے تاکہ آنے والی نسلوں کو مسلمانوں کے ادب و ثقافت کا علم رہے اور ان کی مختلف زبانوں اور مقامی تہذیب کو سمجھیں اور خاص طور سے تہذیب و ثقافت کے وہ پہلو جن کا اسلامی قدروں سے تعلق ہے۔

(۴) ادب کے نصاب پر نظر ثانی کی جائے اور ہر مرحلہ تعلیم کا علیحدہ نصابی پروگرام تجویز کیا جائے تاکہ یہ نصاب اور تعلیمی پروگرام نوخیز مسلمان طالب علم کے اندر اسلامی

احساس کو بڑھانے اور دین کی عظمتوں سے واقف ہونے کے جذبہ کو فروغ دے سکے اور ان میں تندرست ذوق جمال پرورش پائے جوان کی عمر کے مطابق اور فکری اور نفسیاتی ضرورت کو پورا کرنے والا ہو۔

سوم: اسلامی ادب کی اشاعت اور اسلامی ادباء کی کوششوں کو ہم آہنگ کرنا

(۱) اسلامی ادب کے ایسے بلند نمونے منتخب کئے جائیں جو ہماری ادبی وراثت کے نمائندہ ہوں، اور ان قدروں کو سامنے لے آیا جائے جو اس کی اصل رُوح ہے اور اس کے علامتی نشان اور خدوخال کو واضح کیا جائے، جو اُسے دوسرے ادبی نمونوں سے ممتاز کرتا ہو تاکہ یہ نمونے بیک وقت تہذیب اخلاق اور تعلیم ادب دونوں کا کام کریں۔

(۲) اسلامی ادیبوں کو دعوت دی جائے کہ فنون ادب میں جو مفید اور قابل قبول چیزیں ہیں ان سے فائدہ اُٹھائیں، علمی مقالے، افسانے، ناول اور ڈرامے جو اسلامی ادب کو پیش کریں انہیں اختیار کیا جاسکتا ہے اور نشر و شاعت کے ذرائع (Information Media) خواہ وہ صحافت ہو یا باتصویر یا بے تصویر ریڈیو ہو، اور ادباء اس کے ساتھ اپنے فرض کو صحیح طور پر انجام دیں جس سے مسلمانوں کے ذہن کی نگہداشت ہو اور ان کے فہم میں کوئی کجی نہ پڑنے پائے اور اسلامی فکر اور اس کی مجتہدانہ شان باقی رہے، اور ادب اسی مرکز سے پھوٹے۔

مبلغین اسلام کو یاد دلایا جائے کہ حکمت و موعظت حسنہ کا مطلب ادب ہے، لہٰذا انہیں اپنے وعظ و نصیحت کے موقعہ پر خوش گفتاری، شگفتہ بیانی اور فصاحت و بلاغت کے راستے نہ چھوڑنا چاہئے تاکہ ان کی باتیں کانوں کو بھلی معلوم ہوں اور دلوں کو پسند آئیں، اور ان کا دائرہ عمل وسیع ہو، اور انہیں چاہئے کہ حُسن تعبیر اور حسین طرز بیان کو نفس پرستوں اور شر و فساد کے داعیوں کے لئے نہ چھوڑ دیں کہ وہ اپنی من مانی کریں بلکہ اسلامی ادب کے حامیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے حق کے ذریعہ غیروں کے باطل کا مقابلہ کریں اور اُسے شکست دیں اور موجودہ ادبی انحراف کو کارآمد ادب کے ذریعہ بدل دیں جو لوگوں کے لئے نفع بخش ہو اور دُنیا میں زیادہ پائدار ثابت ہو۔

(۳) نشر و اشاعت کے جو مسلم ادارے موجود ہیں، ان کے ذریعہ قدیم ادبی سرمائے اور معاصر ادبی کاوشوں کو شائع کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس بات کو ذہن میں رکھا جائے کہ ہمارا اگلا قدم یہ ہوگا کہ ہم ایک مخصوص دارالنشر اس غرض کے لئے قائم کریں اور ایک اسلامی ادب پر رسالہ نکالیں، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے رسالہ البعث الاسلامی کو اس کام کی انجام دہی میں مدد دی جائے۔

(۴) کوشش کی جائے کہ ادب اسلامی کے شہ پاروں کو عربی سے ترجمہ کر کے دوسری مسلم زبانوں میں پیش کیا جائے اور جوان زبانوں میں ادبی سرمائے ہیں، انہیں عربی میں منتقل کیا جائے اور ان کو دوسری زندہ زبانوں میں روشناس کرایا جائے۔

(۵) اہلِ خیر مسلمانوں کو متوجہ کیا جائے کہ نیکی اور ثواب کے کاموں کے مختلف راستے ہیں اور اللہ کے نزدیک سب سے بڑا ثواب کا کام یہ ہے کہ اسلام کی دعوت و تبلیغ پر پیسہ خرچ کیا جائے اور اسلامی علوم، مسلم زبانوں اور دینی کتابوں کے پھیلانے پر اور جو ادارے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں ان کے استحکام پر خرچ کیا جائے۔

(٦) اسلامی ادیبوں کو اس بات کی دعوت دی جائے کہ وہ اپنے آپس کے تعلقات کو مستحکم کریں اور اپنی ادبی کاوشوں کو باہمی اتفاق سے اس طرح مربوط رکھیں کہ ایک دوسرے سے ضد اور ٹکراؤ کی شکل نہ پیدا ہو، اور اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ایک بین الاقوامی اتحاد قائم کیا جائے جس کی سرگرمیوں میں یہ بات داخل ہو کہ ادب اسلامی پر ممتاز کام کرنے والوں کو اعتراف اور ہمّت افزائی کے طور پر انعامات دیں اور یہ انعامات سالانہ ہوں، یا مناسب مُدّت مقرر کی جائے اور انعامات کے لئے رقم حکومتی اداروں اور خصوصی چندوں اور دوسرے جائز آمدنی کے ذریعہ فراہم کی جائے۔

چہارم: دینی تربیت کا میدان، بچوں نوخیزوں اور نوجوانوں کے لئے اسلامی لٹریچر

(۱) ایک منصوبہ کے تحت اسلامی کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کیا جائے جن میں اسلام کے بنیادی امور، عقیدہ اور شریعت کا بیان ہو اور اسلامی اخلاق اور تاریخ اسلام کے مضامین

ہوں، تاکہ جہاں جہاں بھی مسلمان خاندان آباد ہیں خصوصاً جہاں وہ اقلیت میں ہیں یا دور دراز غیر مسلم حکومت کے تحت مہاجر بن کر زندگی گزار رہے ہیں، ان کی دینی ضرورتوں کو یہ کتابیں پوری کرسکیں۔ اس مقصد کے لئے جدید ذرائع ابلاغ اختیار کئے جاسکتے ہیں، جیسے ٹیپ، کیسٹ، یہ اب دو قسم کے ہوتے ہیں ایک میں صرف آواز ہوتی ہے، دوسرے مع تصویروں کے ہوتے ہیں، (ویڈیو)، اسلامی تہذیب اور دینی دعوت کو ذہن نشیں کرنے کے لئے ان ایجادات سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اس سلسلہ میں جو پیش قدمی کی جاچکی ہے، اس کی ہمت افزائی کی جائے۔

(۲) غیر مسلم ممالک میں جہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے وہاں دینی مدارس قائم کئے جائیں جن کا معیار بلند ہو اور ان کے اندر دینی جذبہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہو، ان مدارس کا نصاب ایسا تجویز کیا جائے جس میں اسلامی تعلیمات اور عربی زبان کو مرکزی حیثیت حاصل ہو، جن غیر مسلم ممالک میں یہ مدارس قائم ہوں وہاں کے مقامی قوانین اور ضروریات کا بھی لحاظ رکھا جائے (بشرطیکہ وہ دینی مطالبات کے خلاف نہ ہوں) بچوں کے لئے 'کنگ گارڈن اسکول' کے طرز کے مکتب قائم کئے جائیں جہاں اسلامی اخلاق وآداب کی تربیت کا نظم ہو اور جہاں معصوم بچے ہوش سنبھالتے ہی دین کو عملی شکل میں دیکھیں، اس غرض کے لئے اسلامی ممالک سے اپیل کی جائے کہ وہ افراد اور مال دونوں ذرائع سے ایسے مراکز کی مدد کریں۔

(۳) بچوں، نوعمر لڑکوں اور نوجوانوں کے لئے خصوصی طور پر اسلامی ادب پر کتابیں تیار کی جائیں اور متنوع قسم کے ذرائع ابلاغ سے کام لیا جائے، جن لوگوں کو اس فن میں مہارت ہے یا جن کے اندر قدرتی طور پر نوخیز نسل کی نفسیات سے آگاہ ہو کر لکھنے کا سلیقہ ہے، ان سے اس طرح کے سلسلۂ کتب تیار کرنے یا اس میں حصہ لینے کی اپیل کی جائے، دوسری طرف نئی نسل کے نوجوانوں کو اس طرح کی چیزیں پڑھنے کی ترغیب دی جائے اور اسلامی ادب وثقافت پر جو مواد کسی اور ذریعہ سے پیش کیا جائے اس سے فائدہ اٹھانے کا شوق ان کے اندر پیدا کیا جائے۔

پنجم: عربی زبان کی تعلیم اوراُس کی نشرواشاعت

(۱) عربی زبان اور اسلامی ثقافت کو عموماً ساری دُنیا میں رائج کرنے کی جدوجہد کی جائے اور خصوصاً اسلامی ممالک میں اس کی حیثیت مضبوط ترین بنانے کی کوشش کی جائے کیوں کہ یہ قرآن کی زبان ہے اور چونکہ ہر مسلمان کو اس قدر جاننا ضروری ہے کہ وہ اپنی نمازیں صحیح طریقے پر ادا کر سکے، اور اپنے دین کے احکام سے واقف رہے، عربی زبان کی نشرواشاعت کا کام اگر مسلمان انجام دیں گے اور اگر حکومتوں نے اس مہم کی سرپرستی کی، عوام نے دلچسپی لی تو وہ دن دور نہیں جب کہ عربی زبان مسلمانوں کی واحد علمی اور ادبی زبان ہوگی، ان کی تصنیف وتالیف اور ان کی کانفرنسوں اور مؤتمرات میں یہی زبان سرکاری سمجھی جائے گی، اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہلاکت آفریں تحریکوں کا پورا مقابلہ کیا جائے اور ان کو ناکام بنایا جائے، جیسے یہ تحریک کہ عامیانہ لہجے (Dailects Colloquials) کو فصیح قرآنی زبان پر ترجیح دی جائے یا عربی رسم الخط کو ختم کر کے لیٹن حروف استعمال کئے جائیں، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وہ زبانیں جو پہلے عربی حروف میں لکھی جاتی تھیں اب کچھ عرصے سے لیٹن حروف میں لکھی جارہی ہیں، ان کو پھر دوبارہ قدیم رسم الخط یعنی عربی حروف استعمال کرنے کی دعوت دی جائے۔ یہ زبانیں ترکی، ملاوی انڈونیشی اور سواحلی ہیں۔

(۲) مسلم یا غیر مسلم ممالک میں جو لوگ عربی زبان نہیں جانتے، ان کے حالات کا مطالعہ کیا جائے اور پلاننگ کی جائے کہ ان کے اندر عربی زبان کس طرح رائج کی جائے، اور ایک خصوصی عملے کے ذریعے اس مقصد کے حُصول کی کوشش کی جائے، نیز اسکالرشپ، انعامات اور مالی یا معنوی ہمّت افزائی کے طریقے اختیار کئے جائیں اور جدید ٹکنالوجی اور زبان سکھانے کے ذرائع اختیار کئے جائیں۔

(۳) اس بات کے امکان کا جائزہ لیا جائے کہ قرآن کے الفاظ سے عربی زبان سکھلائی جائے اور قرآنی الفاظ پر مشتمل ڈکشنری اور تعلیم کی کتابیں مرتب کی جائیں، اس

سلسلہ میں جو پیش قدمی برادر ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے اپنی کتاب "تعلم لغة القرآن الکریم" میں کی ہے، اس تجربہ سے استفادہ کیا جائے۔

(۴) غیر عرب کو عربی سکھانے کے لئے درسگاہیں قائم کرنے کی جو کوششیں ہوں، اس کی پیروی کی جائے اور اس کام کے لئے مدرس تیار کئے جائیں اور جو ادارے قائم ہیں ان کو مالی استحکام کے ذریعہ بڑھایا جائے اور ان کا معیار بلند کیا جائے۔

(۵) جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کے لئے سفر کے ایسے انتظامات کئے جائیں کہ وہ مسلمانوں کی سوسائٹیوں کو قریب سے دیکھیں اور زبان وثقافت کا مطالعہ کرسکیں اور مسلم ممالک کے محکمے جیسے رعایۃ الشباب کا محکمہ ہے، یا وہ ادارے ہیں جن کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ہے، ان کو چاہئے کہ مسلم ممالک کے نوجوانوں کو اپنے محکموں کی طرف سے ان ممالک میں بھیجیں جہاں مسلمانوں کی تعداد کم ہے تا کہ ایک دوسرے سے متعارف ہوں اور ان کے حالات کا مطالعہ کرسکیں، اور ان مقاصد کے لئے جن لوگوں کو بھیجا جائے ان کی سیرت واخلاق اور اسلامی آداب پر کاربند ہونے کا پہلے سے اطمینان کرلیا جائے۔

اس مذاکرہ میں شریک ہونے والے ممبران، اسلامی ممالک کے ان عہدہ داروں سے اپیل کرتے ہیں جو تبلیغ و دعوت، تعلیم وتربیت اور وسائل ابلاغ کے ذمّہ دار ہیں یا جو اکیڈمیوں اور علمی اداروں کے سربراہ ہیں کہ وہ ان تجاویز کو بروئے کار لانے اور اس کی تائید کرنے میں پوری سرگرمی سے کام لیں، اگر یہ لوگ متعلقہ محکموں سے جو مسلم ممالک میں قائم ہیں، ان سفارشات کا ذکر کریں گے اور تائید کرتے رہیں گے تو ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کوششیں بارآور ہوں گی۔

ہم اللہ تعالیٰ سے ہدایت وتوفیق اور مدد کے ملتجی ہیں۔

"وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ (سورۃ التوبۃ: ۱۰۵)

والحمدللّٰه! أولاً وآخراً، وبنعمته تتم الصّٰلحٰت۔

صدر جمہوریہ ایوارڈ جنوری ۱۹۸۲ء

سماجی وملی کاموں اور علوم وفنون میں امتیازی حیثیت اور کام کے حامل لوگوں کے لئے حکومت ہند کی طرف سے مختلف ایوارڈ دیئے جانے کا ایک سلسلہ ہے جو حکومت ہند کی طرف سے یوم جمہوریہ کے موقع پر سامنے آتا ہے، اس میں سب سے بڑا انعام بھارت رتن کا ہے جو ہر سال نہیں دیا جاتا ہے اور بسا اوقات پس از مرگ دیا گیا۔ ملک کی کوئی بہت نمایاں شخصیت کا اس کے لئے نام آتا ہے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کو ملک کی آزادی کے لئے نمایاں خدمات پر اس کی پیشکش ہوئی مگر انہوں نے معذرت کردی تھی کہ دنیا میں اس کا صلہ لینے کے لئے ہم نے یہ قربانیاں نہیں دیں۔

دوسرے نمبر کا ایوارڈ پدم بھوشن ہے اور پھر پدم شری ہے جس کے لئے اہم شخصیات کے ناموں کا اعلان ہوتا ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو بھی وزیر اعظم چندر شیکھر کی طرف سے پیشکش ہوئی تھی مگر انہوں نے بھی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے معذرت کردی تھی، وزیر اعظم نرسمہا راؤ کے زمانہ میں مولانا عبدالکریم پاریکھ نے بعض ملکی وملی مصلحتوں سے اسے قبول کیا تھا جب انہیں اس کی پیشکش ہوئی۔

ایک ایوارڈ صدر جمہوریہ ایوارڈ بھی ہے جو مختلف زبانوں میں امتیازی کام پر ہر زمانہ کے کسی ماہر وصاحب تصنیفات کو دیا تا ہے، عربی زبان کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا اور میری لاعلمی میں بعض اہل تعلق نے نام پیش کردیا، اور پھر ان کے عزت ووقار کا خیال کرتے ہوئے مجھے اس مسئلہ میں خاموش ہونا پڑا، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی فرمایا لے لو، تمہارے لئے کوئی حرج نہیں ہے، بالآخر اس کا اعلان ہوگیا، اور روزنامہ ''قومی آواز'' نے اس خبر کو اہتمام سے پہلے صفحہ پر شائع کیا، پھر اس کی تقریب میں شرکت کے لئے دہلی کا سفر بھی کرنا ہوا، اور صدر جمہوریہ نیلم سنجیوا ریڈی کے ذریعہ یہ ایوارڈ وصول کیا گیا، پھر کئی سال مسلسل ہمارے ندوہ کے متعلقین کو یہ حاصل ہوا، اس کا بڑا فائدہ یہ سامنے آیا کہ عربی زبان وادب کی طرف لوگوں کی توجہ بڑھی، اور اس میں لوگوں کا اچھا کام سامنے آیا۔

بڑا خاندانی حادثہ، برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی کی وفات

برادر اکبر سید محمود حسن مرحوم (متوفی ۱۹۴۲ء) کی وفات کے بعد برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی ہم بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، ہمارے دادا مولانا سید خلیل الدین حسنی کو محمد نام بہت پیارا اور عزیز تھا اور ان کا جذبہ یہاں تک تھا کہ جتنے بھی پوتے ہوں گے سب کا نام محمد رکھیں گے، بڑے پوتے کا نام بھی محمد رکھا مگر ان کا نام ان کے نانا مولانا سید عبدالحیٔ حسنی (والد ماجد مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی و مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی) نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی عقیدت و محبت میں اور نیک فال لیتے ہوئے محمود حسن رکھا تھا، اسی سے وہ مشہور ہوئے، پھر ہمارے سب بھائیوں کے نام عدد کے لاحقہ کے ساتھ محمد ہی رکھے گئے۔

سب سے چھوٹے بھائی مولوی محمد واضح مرحوم کا نام بھی محمد رکھا گیا اور خامس لاحقہ تھا، مگر انہوں نے قلمی و کاغذات میں واضح رشید اختیار کیا، اسی سے وہ مشہور ہوئے، لیکن ان کے بڑے انہیں محمد واضح ہی کہتے تھے۔

مولانا محمد ثانی حسنی ایک طرح سے ہم لوگوں کے مربی بھی تھے، اور شروع سے اپنے بڑوں کے اپنی صفات وخصوصیات کی بنا پر منظور نظر رہے تھے، خاندان کے ایک بڑے مولانا سید طلحہ حسنی ان کی نیک طینتی کو دیکھ کر ان کو "شکر" کہتے تھے، مولانا سید ابوالخیر محدث حسنی کو بھی ان سے بہت لگاؤ تھا، مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کو بھی ان سے تعلق خاطر تھا اور فرمایا تھا کہ علی سفر پر رہتے ہیں وہ نہ ہوں تو محمد ثانی حسنی نماز جنازہ پڑھائیں انہوں نے عربی، اردو اور دینیات کی اچھی صلاحیت کے ساتھ شعر وسخن کا بھی اچھا ذوق حاصل کرلیا تھا، خاندانی اور موروثی وتاریخی چیزوں سے بڑی واقفیت رکھنے کے ساتھ علم الفرائض (میراث) کے بھی ماہر تھے، اور لکھنے کا بھی اچھا ذوق تھا جو ماہانہ ''رضوان'' میں بہت جھلکا، اور تصنیفی وتاریخی ذوق کی شاہکار ان کی کتابیں "حیات خلیل" (سوانح حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری) اور سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی، سوانح مولانا سید محمد الحسنی،

تذکرہ مولانا محمد ہارون اور خاندانی تاریخ وحالات پر خانوادہ علم اللّٰہی ہیں۔ ان سب کے ساتھ وہ ایک دارالاشاعت مکتبہ اسلام رکھتے تھے، جہاں سے خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اہم کتابیں ہی شائع ہوکر عام ہوئیں، بزرگوں، مشائخ اور اہل فکر ودعوت سے بھی ان کا اچھا تعلق تھا، حضرت مولانا الیاس کاندھلویؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کی ان کو شفقت حاصل ہوئی تھی، مزید حضرت وصی اللہ فتح پوریؒ اور حضرت مولانا محمد احمد بھولپوریؒ کی بھی توجہ ملی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے شرف تلمذ حاصل تھا اور انہی سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کیا، اور مجاز وخلیفہ بھی ہوئے، خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے انہیں حضرت شیخ قدس سرہ کی خدمت میں بھیجتے ہوئے یہ خط لکھا تھا کہ اپنے خاندان کی طرف سے محمد ثانی سلمہ کو آپ کی نذر کررہا ہوں، ندوہ اور مظاہر سے تعلیم پوری کرکے کچھ وقت نظام الدین مرکز دہلی میں حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی کے پاس لگایا اور ان کو ان سے بڑی مناسبت ہوگئی تھی۔

۱۹۴۷ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے سفر حجاز میں جو دعوتی وتبلیغی مقصد سے کیا گیا تھا اور گھر کی خواتین بھی تھیں، حضرت مولانا کو دعوت کے کاموں میں یکسوئی کے لئے برادر معظم کو ساتھ کیا گیا تھا پھر دوسرا سفر حج ۱۹۴۹ء میں مولانا محمد منظور نعمانی کے ساتھ کیا، اس حج میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ بھی تشریف لے گئے تھے، اور اس سفر میں حضرت تھانوی کے ایک خلیفہ شاہ محمد موسیٰ مہاجر مدنی نے انہیں ان کے باطنی خصائص کا اندازہ کرکے اور اخلاق سے متاثر ہوکر اجازت بیعت دی تھی۔

برادر معظم کا زیادہ قیام مکتبہ اسلام، ماہانہ رضوان اور دعوتی تبلیغی مقصد سے لکھنؤ میں رہا کرتا تھا مگر ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ ہم بھائیوں میں ایک کوئی والدین ماجدین کے پاس تکیہ رائے بریلی میں رہے، اس کے لئے برادر معظم نے ایثار کیا، اور ۱۹۷۴ء سے تا عمر ۱۹۸۲ء تک وہیں مقیم رہ کر والدین کی خدمت، زمین وجائداد، باغات، کھیت وغیرہ کی دیکھ ریکھ، مہمانوں کی تکریم، کمزوروں کی حاجت روائی اور دعوتی محنت جو مضافات میں تکلیف اٹھا کر

کرتے تھے، کی بنا پورے خطے میں ایک دلآویز ومقبول ومحبوب شخصیت کے طور پر سامنے آئے تھے، اور علاقہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نائب کی حیثیت سے دیکھے جاتے تھے، تکیہ سے متصل میدان پور میں مدرسہ ضیاء العلوم کے معتمد تعلیم اور ۲۰۔۲۲ کلومیٹر فاصلہ پر واقع مدرسہ فلاح المسلمین کے ناظم اور انجمن تعلیمات دین رائے بریلی کے صدر تھے، اور ان سب کو پورا وقت دیتے تھے، اپنی ان تمام مشغولیتوں ومصرفیتوں کے ساتھ حمد ونعت ومناجات اور ملی احساسات کے اشعار اور بچوں کے لئے دوسروں کی فرمائش پر دعائیہ اشعار وغیرہ بھی کہے، اشعار کا مجموعہ ''میزاب رحمت'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے امید تھی کہ آگے چل کر ان کی ذات بابرکات سے بڑا نفع پہونچے گا کہ اچانک ایک کتا کے حملہ سے کھروچ لگی اور زیادہ توجہ نہ کی گئی جس سے مرض ایک ماہ کے بعد ابھر آیا، ۱۳؍فروری ۱۹۸۲ء کو لکھنؤ لایا گیا اور گھر میں ان کے علاج کی ساری ممکنہ تدابیر اختیار کی گئیں مگر اب زندگی پوری ہو چکی تھی کہ منگل ۱۶؍فروری ۱۹۸۲ء ۲۱؍ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ کو ۱۱ بجے دن کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے جس کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے اور دعوت دینے کا یہ تین چار دنوں میں غیر معمولی اظہار ان کی طرف سے ہوا، اور ذکر وتلاوت سے عشق ابھر کر سامنے آیا، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کو مدینہ منورہ مولانا تقی الدین ندوی نے اطلاع بھیجی، شیخ نے وہاں ایصال ثواب کا اہتمام کرانے کے ساتھ غیر معمولی تعلق کا خط بھی ارسال کیا جو تعزیتی خطوط میں امتیازی شان رکھتا ہے اور ان کے صاحبزادہ مولانا طلحہ مرحوم، مولانا انعام الحسن کاندھلوی، مولانا عبید اللہ بلیاوی اور مولانا عمر پالن پوری وغیرہ تعزیت کے لیے آئے، بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڈھی بھی تشریف لائے اور بیان بھی کیا، مولانا قاری صدیق احمد باندوی، مولانا محمد مرتضی مظاہری بھی بہت متاثر تھے جو ان کے مظاہر کے زمانہ کے دوست ورفیق تھے، ہم سب کے لیے یہ ایک جاں گسل حادثہ تھا خاص طور پر والدہ ماجدہ کے لئے جنہیں اپنے ایک صاحبزادے کا صدمہ پہلے پہونچ چکا تھا، لکھنؤ میں مولانا محمد منظور نعمانی نے بڑے مجمع کو اور تکیہ رائے بریلی میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور روضہ شاہ علم اللہ میں مولانا سید محمد الحسنی کے پہلو میں تدفین کی گئی، ۵۷؍سال کی عمر پائی۔

برادر معظم مرحوم کی وفات پر راقم کی ایک تحریر

مولوی سید محمد سالم حسینی ہسوی مرحوم نے اپنے دادا مولانا سید ابوالقاسم ہسوی کی قلمی بیاض میں بعض تواریخ ولادت ووفات کا جو اضافہ کیا ہے، برادر معظم مولانا محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر میرے ان سے قریبی تعلق کی بنا پر تاثرات تحریر کرائے تھے، وہ حسب ذیل ہیں۔

برادر معظم مرحوم مولانا سید محمد ثانی حسنی جنہوں نے شمسی حساب سے صرف ۵۶ سال ڈھائی ماہ کی عمر میں اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کیا، بظاہر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس قدر جلد انتقال نہ کریں گے لیکن خدا کی مرضی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

برادر معظم بڑی سادہ اور متواضع طبیعت کے انسان تھے یہی سب سے بڑے بھائی سید محمود حسنؒ کے انتقال کے بعد سے وہی ہم سب میں بڑے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس بھی سب سے زیادہ تھا، اس کی وجہ سے وہ گھر کی فکر بھی زیادہ کرتے تھے، چھوٹوں بڑوں کے آرام اور فائدے کی فکر بہت زیادہ رکھتے تھے، خاندان میں اور خاندان سے باہر ان کی گوناگوں صفات کی وجہ سے ان کو مقبولیت حاصل تھی، وہ ایک عرصہ تک لکھنؤ میں بسلسلہ معاش رہے، ان کی کتابوں کی دوکان تھی، اور ایک دینی مجلّہ بھی نکالتے تھے، لیکن والدین کی ضعیفی کے احساس سے وہ وطن تکیہ کلاں رائے بریلی میں آکر مقیم ہوگئے، والد صاحب مرحوم کی زندگی میں باغات اور زمینوں کی دیکھ ریکھ میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے، اور ان کے انتقال کے بعد خود اس بوجھ کو سنبھالنے لگے، اور اس طرح انہوں نے بھائیوں کو اور گھر کو اس بوجھ سے ہلکا رکھا، ان کو اپنے مؤقر ماموں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا بھی بڑا اعتماد حاصل تھا، وطن میں ان کے گھر کے مسائل کی بھی وہ فکر رکھتے، نیز شہر رائے بریلی کے ملی کاموں میں اور دعوتی کوششوں میں شرکت کرتے تھے اور اس میں ان کو شہر کے مسلمانوں کا احترام ومحبت حاصل ہوئی، چنانچہ ان کے انتقال سے صرف ایک محدود حلقہ میں نہیں بلکہ گوناگوں حلقوں میں ان کی وفات کا غم محسوس کیا گیا، وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے، لیکن ان کی شاعری صرف ملی اور دینی نیز مدارس کے ترانوں پر مشتمل تھی، جو خاصے مقبول ہوئے۔

وہ ایک اچھے مصنف تھے، ان کی کئی موقر کتابیں شائع ہوئیں، جن میں تذکرہ مولانا محمد یوسفؒ، سوانح مولانا خلیل احمد سہارنپوری، سوانح مولوی محمد ہارون کاندھلوی، زبان کی نیکیاں نیز بعض دوسری غیر مطبوعہ کتابیں ہیں، اوران کی یادگار ان کا مسلم خواتین کے لئے نکالا ہوا مجلّہ ''رضوان'' ہے، جواب ان کے اکلوتے صاحبزادے مولوی سید محمد حمزہ حسنی نکالتے ہیں، وہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، شیخ الحدیث جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے خلیفہ مجاز اور اس سے قبل ندوۃ العلماء اور مظاہر العلوم دونوں میں تعلیم حاصل کر چکے تھے۔

اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے، آمین۔

دارالمصنفین کا اسلام اور مستشرقین پر بین الاقوامی سیمینار

دارالمصنفین اعظم گڑھ نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اشتراک وتعاون سے ایک بین الاقوامی کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے لئے ۲۱، ۲۲، ۲۳ رفروری ۱۹۸۲ء کی تاریخیں طے ہوئی تھیں کہ اچانک ہم لوگوں کو برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی کی بیماری اور پھر وفات کے صدمہ سے گذرنا پڑا، اور اسی کے قریب دارالمصنفین کے سیمینار کی تاریخیں بھی طے تھیں، ندوۃ العلماء سے کئی اساتذہ اور طلبہ کی ایک جماعت سیمینار کی تیاری کے لئے چلی گئی تھی اور خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ راقم السطور نے بھی رائے بریلی سے اعظم گڑھ کا سفر کیا جہاں مہمانوں کی آمد ورفت کی وجہ سے قیام تھا، بلاد عربیہ کے ممتاز دانشور، محقق فضلاء اور استشراق کے ماہر علماء کانفرنس میں مقالات کے ساتھ شرکت نے سیمینار کو بہت کامیاب سیمینار بنا دیا تھا، ہندوستان کے بھی ممتاز اہل علم وناقدین تشریف لائے تھے، بعد میں دارالمصنفین سے سات حصوں میں اس کی مفصل روداد شائع ہوئی جو لائق مطالعہ ہے، عرب مندوبین میں ڈاکٹر یوسف القرضاوی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

۲۱ تا ۲۳ رفروری دارالمصنفین اعظم گڈھ میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی، اس موضوع پر یہ پہلی مجلس تھی جو دارالمصنفین کی دعوت پر بلائی گئی تھی۔

دعوت نامہ میں دارالمصنفین کی مجلس منتظمہ کی طرف سے ناظم دارالمصنفین سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے مذکورہ بالا موضوع پر دارالمصنفین کا جو کام رہا ہے اور علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی اور ان کے رفقاء نے جو علمی کاوشیں کی ہیں، ان کا حوالہ دیتے ہوئے اس موضوع پر ایک مجلس مذاکرہ منعقد کیے جانے کی ضرورت ظاہر کی تھی اور اس کے لیے ملک و بیرون ملک کے ممتاز ترین اہل فکر و قلم کو دعوت دی تھی، چنانچہ اندرون و بیرون ملک سے مندوبین بڑی تعداد میں آئے، اور اپنے مقالات نیز زبانی بحث و تمحیص سے مذاکرہ کو کامیاب بنانے میں مدد کی۔

اندرون ملک سے یونیورسٹیوں کے اسلامی و مشرقی شعبوں کے اساتذہ اور ذمہ داروں نے شرکت کی، جن میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے موجودہ وائس چانسلر سید حامد صاحب اور سابق وائس چانسلر پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب قابل ذکر ہیں، عربی و اسلامی اداروں اور جامعات کے اہل علم و فکر بھی شریک ہوئے جن میں خاص طور پر مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی، مولانا معین اللہ صاحب ندوی اور ندوہ کے متعدد اساتذہ ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے اس لئے وہ میزبان اور مندوب دونوں حیثیت کے مالک تھے۔

بیرونی ممالک سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ، ابوظبی یونیورسٹی اور قطر یونیورسٹی کے شعبہ ہائے اسلامیات کے پروفیسروں نے شرکت کی، پاکستان سے مندوبین تشریف لائے جن میں ہمدرد کے اسلامی فاونڈیشن کے صدر حکیم محمد سعید صاحب، اور ادارہ تحقیقات اسلامی پاکستان کے صدر جناب ڈاکٹر ہالی پوتہ مع اپنے متعدد رفقاء کے، نیز اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے بعض پروفیسروں نے بھی شرکت کی، پاکستان سے آنے والوں میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی، مولانا مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل، اردو انسائیکلوپیڈیا کے مدیر جناب شیخ نذیر حسین، ادارہ تحقیقات اسلامی کے ناظم جناب شرف الدین اصلاحی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، شرکاء میں جنوبی افریقہ سے

ڈربن یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر علامہ سید سلیمان ندویؒ کے فرزند ڈاکٹر سید سلمان ندوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جاپان کی انجمن اسلامیات کے نمائندہ اور رکن شوریٰ عالمی مجلس اعلی برائے مساجد (مکہ مکرمہ) جناب عبدالکریم صاحب ساتو بھی قابل ذکر ہیں، مکہ مکرمہ سے ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق، قطر یونیورسٹی سے علامہ یوسف القرضاوی مجلس مذاکرہ کے اہم ترین شرکاء میں تھے۔

مجلس مذاکرہ کے افتتاحی واختتامی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر علامہ یوسف القرضاوی صدر شعبہ اسلامیات قطر یونیورسٹی نے کی، دیگر اجلاسوں کی صدارت مختلف فضلاء نے کی، جن میں ہندوستان سے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثانی اور جناب سید حامد صاحب کے نام قابل ذکر ہیں۔

مجلس مذاکرہ میں ۴۰ سے زیادہ مقالات پیش کئے گئے جن میں مختلف مستشرقین کی تصنیفات اور خیالات کا جائزہ لیا گیا، اور ان پہلوؤں کی وضاحت کی گئی جن میں مستشرقین نے علمی غلطیاں کی ہیں یا اسلام سے اپنے معاندانہ رویہ کا ثبوت دیا ہے۔

مستشرقین کی محنت اور ان کے خالص علمی کام کو سراہا گیا، اور عام طور پر اس خیال کا اظہار بھی کیا گیا کہ اس سلسلہ میں ہماری ذمہ داری کم نہیں ہے کیونکہ ہم نے علم کے بعض میدانوں کی طرف بے توجہی کی، اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے خلاء کو مستشرقین نے غنیمت جانا اور اس کو اپنے مقاصد اور ذوق ورجحان کے مطابق پر کرنے کی کوشش کی۔

مجلس مذاکرہ نے اپنے اختتامی اجلاس میں متعدد سفارشات منظور کیں:

۱۔ مستشرقین کے کاموں کا جائزہ لینے اور کمزور مقامات کو نمایاں کرنے کی ضرورت پر دیا گیا تا کہ ان کے ضرر سے محفوظ رکھا جا سکے۔

۲۔ ایسی کتابوں کے تیار کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی جو اس ضرورت کو پورا کرسکیں جو مستشرقین کی کتابوں سے پوری کی جاتی ہیں۔

۳۔ اسکول کی سطح سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک طلباء کی ثقافتی وفکری ضرورت کے لئے کتابیں تیار کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی۔

۴۔ دارالمصنفین نے اسلامی تاریخ وثقافت پر جو عظیم علمی سرمایہ تیار کیا ہے دیگر زبانوں میں خصوصاً عربی انگریزی میں اس کے ترجمہ کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے اس کام کو انجام دینے کی سفارش کی گئی۔

۵۔ اسلام و مستشرقین کی مجلس مذاکرہ کے سلسلہ میں کام کے جو تقاضا سامنے آئے ہیں، ان کے سلسلہ میں دارالمصنفین میں ہی ایک رابطہ دفتر قائم کرنے کی تجویز منظور کی گئی، اس دفتر کے ذمہ دار ناظم دارالمصنفین جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب منتخب کئے گئے، اہم امور میں مشورہ کے لیے علمی واسلامی تعلیم گاہوں، یونیورسٹیوں اور اداروں کے چند منتخب افراد وممتاز اہل علم کے نام طے کیے گئے، ان ناموں میں ہندوستان سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی اور دیگر ملکوں سے اسلامی یونیورسٹی، مدینہ اسلامی یونیورسٹی، ریاض مکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور دیگر یونیورسٹیوں اور علمی اداروں کے بعض پروفیسر شامل ہیں۔

۶۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ اس موضوع پر کام کا جائزہ لیتے رہنے کے لیے ہر دو سال پر ایک مجلس مذاکرہ منعقد کی جایا کرے، اس سلسلہ میں قطر یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے صدر نے اگلی مجلس مذاکرہ منعقد کرانے کی پیش کش کی جس کو مجلس مذاکرہ نے پسند کیا اور سراہا۔

دارالمصنفین کی اس مجلس مذاکرہ کو شرکاء نے بہت پسند کیا اور اس کی کامیابی وافادیت کے ساتھ انجام پانے پر خوشی کا اظہار کیا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تعاون کو بھی سراہا گیا، مجلس مذاکرہ کے کاموں میں تعاون کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے شعبہ ادب عربی اور دیگر شعبوں کے اساتذہ وذمہ دار اور ذی استعداد وباصلاحیت طلباء کی ایک تعداد اعظم گڈھ گئی تھی اور ان سب نے اپنے مفید تعاون سے مجلس مذاکرہ کو کامیاب بنانے میں نمایاں حصہ لیا تھا، عربی سے اردو، اردو سے عربی ترجمہ کی ذمہ داری انہی نے انجام دی۔

مجلس مذاکرہ کا افتتاحی اجلاس ۲۱ر فروری کو ۱۰ بجے دن میں شروع ہوا تھا جو ڈیڑھ بجے دن تک جاری رہا، اس میں استقبالی وصدارتی خطبہ کے علاوہ متعدد مندوبین نے خطاب کیا، اس کے بعد سے ۲۳ر فروری کو ۱۲ بجے دن تک مقالات کے پانچ اجلاس ہوئے،

دارالمصنفین کی عمارت میں علمی نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا تھا، جس کو مندوبین نے دیکھا اور دارالمصنفین کے کام کو بہت سراہا، وزیر اعلی یوپی کے نمائندہ کی حیثیت سے ڈاکٹر عمار رضوی وزیر حکومت یوپی بھی آئے اور علمی نمائش کو دیکھا اس کا افتتاح کیا۔

مجلس مذاکرہ کا اختتامی اجلاس ۲۳ رفروری کو دوپہر ۲ بجے دن میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کی دعا پر ختم ہوا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس سمینار میں عرب فضلاء کو بلانے کی وجہ بتاتے ہوئے اپنی تقریر میں فرمایا کہ:

''ہم نے اس سمینار میں شرکت کے لیے عرب فضلاء کو بلایا ہے، تاکہ آپ کے سامنے شہادت دیں کہ علامہ شبلی نے غلطی نہیں کی، انہوں نے سفر کا رخ غلط طریقہ سے متعین نہیں کیا، انہوں نے اورگاہ برآورن کا عمل نہیں کیا تھا اور جو لوگ کشتیاں جلا کر دنیا سے آنکھیں بند کر کے اور دنیا کی تمام ترقیوں اور آسائشوں سے انکھیں بند کر کے اس آستانہ پر، آستانہ شبلی وسلیمان پر بیٹھے ہیں وہ غلطی نہیں کر رہے ہیں، آپ انہیں حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں، وہ عالم اسلام کی طرف فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں اور انہیں ہمت افزائی کی ضرورت ہے، میں دارالمصنفین کے ذمہ داروں کو جن میں خوش قسمتی سے میں بھی شریک ہوں اور خود بھی اس مبارک باد کو بلا کسی تواضع، انکساری کے قبول کرتا ہوں، اور اپنے رفقاء کو اور پورے ضلع اعظم گڈھ اور شہر اعظم گڈھ اور ان سب لوگوں کو جن کو علامہ شبلی ور مولانا سید سلیمان ندوی سے جذباتی اور دینی تعلق ہے مبارکباد دیتا ہوں کہ آج مدتوں کی یہ تمنا پوری ہوئی، اللہ تعالی اس کو مبارک فرمائے، اور اس سے علم کا کارواں آگے بڑھے۔''

ہمارے لیے اور خود حضرت مولانا کے لیے جن کی صدارت میں یہ سمینار منعقد ہو پایا تھا، شرکت آسان نہ تھی کہ برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی کی علالت اور وفات کا سانحہ چند روز پیشتر ہی پیش آیا تھا اور جس نے پورے خاندان اور متعلقین کو ہلا کر رکھ دیا تھا مگر پروگرام کی اہمیت اور عالم اسلام کے مشاہیر کی شرکت جس میں موضوع کی اہمیت کے ساتھ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے تعلق اور دارالمصنفین کی کشش کو بھی دخل تھا ہم لوگوں نے شرکت کا ارادہ کیا اور رائے بریلی سے اعظم گڈھ کا یہ سفر کرلیا گیا حالانکہ تعزیت میں آنے والے مہمانوں کا سلسلہ

جاری تھا، اس کی وجہ سے برادر عزیز مولوی محمد واضح رشید ندوی نے سفر نہیں کیا، اور والدہ صاحبہ کے پاس رہنے کو ترجیح دی جن کے لیے یہ سانحہ عظیم اور بہت زیادہ متاثر کرنے والا تھا۔

دار العلوم ندوۃ العلماء میں حاکم شارقہ شیخ سلطان بن محمد القاسمی کی آمد

شعبان ۱۴۰۲ھ (۱۹۸۲ء) میں حاکم شارقہ شیخ سلطان بن محمد القاسمی ندوۃ العلماء کی زیارت اور اس کے ناظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے ملاقات کے لیے لکھنؤ پہنچے، مہمان کے استقبال کے لئے حضرت مولانا اپنے رفقاء کے ساتھ ایئر پورٹ گئے، چونکہ مہمان کی حیثیت سرکاری بھی تھی اس لئے حکومت اتر پردیش کے بعض وزراء بھی استقبال کے لئے ایئر پورٹ گئے، شیخ سلطان کا حضرت مولانا سے قدیم محبانہ ومخلصانہ تعلق ہے جس کا وہ بار بار اظہار کرتے رہے ہیں، حضرت مولانا نے ندوۃ العلماء میں ان کے خیر مقدم کے وقت جو بات فرمائی وہ بڑی اہم تھی کہ:

"نعم الأمير على باب الفقير وبئس الفقير على باب الأمير"

کہ عربی میں مثل مشہور ہے، وہ حاکم بہت اچھا ہے جو غریب کے دروازہ پر جائے، اور وہ غریب برا ہے جو حاکم کے دروازہ پر جائے۔

مولانا نے فرمایا کہ یہ بات شیخ پر منطبق ہو رہی ہے کہ امیر وحاکم ایک غریب کے دروازہ پر آیا ہے۔

شیخ سلطان عرب امارات فیڈریشن کے امراء میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ شخص سمجھے جاتے ہیں، انہوں نے حال ہی میں برطانیہ کی ایک یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی بھی مکمل کی، انہوں نے خلیج کے ساحل پر بسنے والے عربوں کے متعلق تھیسیز بھی تیار کی، جس میں انہوں نے ثابت کیا کہ تاریخی وعلمی بنیاد پر مغرب کا یہ نقطہ نظر بالکل غلط ہے کہ ان ساحلوں پر بسنے والے اچکے اور ڈاکو رہے ہیں، انہوں نے ثابت کیا ہے کہ مغرب کے استعماری ذہن نے یہ مفروضہ بنا کر تاریخ میں داخل کر دیا، حالانکہ اس بات کا کوئی علمی ثبوت نہیں، مغرب کے اس نظریہ کے برعکس اس علاقہ میں علمی واخلاقی اعتبار سے صورت حال

اچھی رہی ہے، خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کی تھیسیز کامیاب قرار پائی اور وہ اس پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے مستحق ہوئے۔

ندوۃ العلماء ان کی آمد ان کے دینی وعلمی تعلق کی ایک واضح مثال ہے جو انہوں نے پیش کی، شیخ سلطان ادھر حضرت مولاناؒ کو اپنے زیر اقتدار ریاست شارقہ آمد کی دعوت دے رہے تھے مگر حضرت مولانا اپنی مصروفیات اور حکمرانوں سے اپنے استغناء کے وصف کی بنا پر گریز کر رہے تھے کہ انہوں نے خود حاضر ہو کر اپنے مخلصانہ تعلق کو ظاہر کیا۔

کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی کے زیریں ہال میں خیر مقدمی جلسہ ہوا جس میں معززین شہر، اساتذہ وطلبہ ندوۃ العلماء کے علاوہ حکومت کے لوگ بھی اس پروٹوکول میں تھے جو حکومت کا دوسری حکومت کے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کا حادثہ وفات

یکم شعبان المعظم ۱۴۰۲ھ ۲۴ رمئی ۱۹۸۲ء کو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ مہاجر مدنی کا حادثہ وفات پیش آیا اور ایک بابرکت ہستی کے اٹھنے سے ہم لوگوں کو یتیمی کی کیفیت محسوس ہوئی، الفرقان لکھنؤ کے خصوصی اشاعت کے لئے اس کے عالی مرتبت مدیر مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ نے ازراہ شفقت کاتب تحریر کو مضمون نگاروں میں جگہ دی جو یہاں نقل کی جارہی ہے۔

''حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی ثم مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے پہلی بار آج سے ۳۶ رسال قبل ۱۹۴۶ء میں زیادہ قریب سے دیکھا۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب میری مدرسی تعلیم کا زمانہ تھا اور اسی سلسلہ میں مجھے میرے خال معظم مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ اور خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ العالی نے سہارنپور بھیجا کہ میں حضرت شیخ کی سرپرستی میں رہ کر وہاں بھی کچھ تعلیمی وقت گزاروں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف یہ کہ سرپرستی قبول فرمائی بلکہ اپنی قیام گاہ سے متعلق رکھا اور کھانے میں مہمان بنایا۔ مجھے اس کی وجہ سے سرپرستی اور قریبی شفقت دونوں حاصل

ہوئیں، مجھے اس موقع پر سہارنپور رہنے کی سعادت حاصل ہوگئی جو برابر قائم رہی اور حضرت برابر شفقت وعنایت فرماتے رہے۔ عریضوں کے جواب سے شاد فرماتے اور میری صلاح و فلاح کا خیال فرماتے۔ میرے تعارف سے قبل ہی میرے بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو تعارف و تعلق حاصل ہو چکا تھا اور انہوں نے پورے ایک سال حضرت کے سامنے زانوئے تلمذ بھی طے کیا تھا بعد میں یہ تعلق حضرت کے خصوصی اعتماد پر بھی منتج ہوا، میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ سب تعلقات بھی میرے لئے حضرت کی شفقت کے حصول کا سبب بنے۔

مخدوم معظم مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ العالی نے مجھ سے فرمایا کہ میں بھی حضرت سے متعلق اس نمبر کے لئے جو رسالہ الفرقان کا نکلنے والا ہے کچھ تحریر کروں۔ اگر چہ حضرت کی شخصیت و مقام پر میرے لکھنے سے کوئی نئی روشنی نہ پڑے گی ان کا مقام اس سے پہلے بلند اور مستغنی ہے لیکن میں نے اپنی سعادت سمجھ کر مخدوم معظم مولانا نعمانی مدظلہ کے حکم کی تعمیل کو قبول کیا، چنانچہ ذیل میں جو میرے خیال میں آسکا وہ درج کر رہا ہوں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کی زندگی خیر و برکت، علم و دعوت کا ایک دور تھا جو اُن کی رحلت پر ختم ہوا، ان کی متعدد صفات ایسی تھیں کہ کہنا مشکل ہے کہ کب اور کہاں دیکھنے میں آسکیں گی۔ ان کی پاکیزہ زندگی کے متعدد انداز ایسے تھے جن میں حضرت شیخ اپنے دور میں بالکل منفرد تھے اور وہ اوصاف صرف بزرگ اسلاف ہی میں ملتے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیثؒ کی مشغولیت علمی، تربیت دینی اور فہم و فراست اور اسی کے ساتھ ساتھ غیر معمولی اخلاق و محبت ایسی صفات تھیں جو نہ صرف یہ کہ ان کی عظیم شخصیت کا مظہر تھیں بلکہ ان سے خلق خدا کو بہت زیادہ دینی نفع پہنچا اور ہزاروں لاکھوں کی زندگیوں کے سنورنے میں مدد ملی اور اس طرح حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی رحلت کے وقت اصلاح یافتہ افراد کی ایک بڑی جماعت چھوڑی۔

حضرت شیخ الحدیث نے اپنی زندگی کی مصروفیات کو دو اہم مقاصد میں تقسیم کر رکھا تھا، ایک تربیت دینی اور دوسری خدمت علمی۔ انھوں نے ان دونوں صفات کو بہت اچھے

طریقہ سے جمع کر رکھا تھا، جب کوئی ان کی علمی مشغولیت پر نظر ڈالتا تو اس کو ایسا محسوس ہوتا کہ اس مشغولیت کے علاوہ ان کا کوئی اور کام نہیں۔ علمی مشغولیت کے جو آداب و شرائط ہیں وہ حضرت میں بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے۔ اس میں تحقیق و استناد کی طرف پوری توجہ رہتی، بلکہ یہ بات بعض وقت اس حد تک پہنچ جاتی کہ حضرت اپنے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں اور متوسلین سے علمی تعاون طلب کرنے میں بھی تکلف نہ فرماتے اور پھر پوری وسیع القلبی سے اس کا تذکرہ وصراحت بھی فرما دیتے۔ اس طرح ایک وسیع القلب محقق کی بہترین مثال تھے۔ چنانچہ کیسی کیسی ٹھوس علمی کتابیں فن حدیث میں ان کے قلم سے نکلیں اور اسی کے ساتھ نہایت مؤثر اور دینی جذبہ پیدا کرنے والی کتابیں بھی تحریر فرمائیں۔ دوسری طرف جب ان کی تربیت دینی پر کوئی نظر ڈالتا تو اس کو نظر آتا کہ گویا اس کے علاوہ کوئی اور کام حضرت شیخ کا نہیں ہے، فکر و توجہ، فہم و فراست، غیر صالح باتوں پر روک ٹوک اور زندگی کو سنوارنے والی باتوں کی طرف توجہ دہانی یہ آپ کی وہ خصوصیات تھیں کہ مسترشدین ڈرتے رہتے کہ کب ان کی کس بات کی پکڑ ہو جائے گی اور تنبیہ ہوگی۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا درمیانی دور متعدد بزرگ معاصرین کے ساتھ گزرا۔ یہ بزرگ معاصرین حضرت ہی کے صف کے اور حضرت کے دوستوں اور مثل دوستوں کے تھے، ان میں خاص طور پر قابل تذکرہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ اور حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری تھے، یہ حضرات جب اکٹھا ہوتے تو مجلس روحانیت کا زعفران زار بن جاتی، ایک دوسرے سے ربط و بے تکلفی اور اس بے تکلفی کے ساتھ ساتھ محبت و احترام دیکھنے کی چیز ہوتی۔ اسی دور میں کچھ فاصلہ پر مرکز تبلیغ نظام الدین دہلی میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی مقیم تھے، اور ہزاروں اور لاکھوں بندگان خدا کو دینی زندگی سے وابستہ کرنے کی انتھک جدوجہد میں مصروف تھے۔ وہ حضرت شیخ کے چچازاد بھائی تھے اور عمر میں خاصے چھوٹے تھے، اور اپنے بزرگ والد حرکت تبلیغ کے داعی اوّل حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ کی رحلت کے بعد جو کہ ۱۹۴۴ء میں ہوئی تھی حضرت شیخ ہی کو اپنے والد کے مثل سمجھتے تھے اور حضرت شیخ ان کا بہت

خیال بھی رکھتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ دینی خصوصیات کے لحاظ سے ایک طرح سے معاصر اور ہم جماعت تھے، اس سلسلہ کی ہم جماعتی کا تعلق ایک طرف ان کو حضرت شیخ سے حاصل تھا اور دوسری طرف یہی تعلق حضرت شیخ کو ان کے والد یعنی اپنے چچا حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے حاصل رہ چکا تھا اس طرح ہم جماعتی کتنی قوی اور منضبط کیوں نہ ہو لیکن موت و زندگی کے لحاظ سے اس کا تسلسل ضروری نہیں ہوتا، چنانچہ حضرت شیخ کے احباب و ہم جماعت لوگوں کی یہ محفل ایک ایک کر کے وفات پانے سے سونی ہوتی گئی، چنانچہ ۱۹۴۴ء میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ کی رحلت ہوئی۔ ۱۹۵۸ء میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی رحلت ہوئی، ۱۹۶۲ء میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کی رحلت ہوئی، اور ۱۹۶۵ء میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ بھی رحلت کر گئے، اور اس محفل کے ارکان میں سے صرف حضرت شیخ رہ گئے، جنہوں نے ۱۹۸۲ء میں رحلت پائی، اس طرح حضرت شیخ کو اپنے قریب ترین دوستوں ہی کا نہیں؛ بلکہ اپنے متعدد قریب ترین عزیزوں کا غم بھی برداشت کرنا پڑا۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ کا غم معمولی غم نہ تھا جو ان کے کم عمر معاصر، بزرگ بھتیجے اور داماد تھے، اور جنہوں نے عام انداز سے کم عمر پائی اور جلد ہی محفل کو سونا کر گئے، لیکن حضرت شیخ نے باوجود ایسے بڑے بڑے حوادث سے سابقہ پڑنے کے ان غموں کو ایسی پامردی اور سکینت نفس کے ساتھ برداشت کیا کہ ناواقف آدمی یہ محسوس کرتا کہ گویا حضرت شیخ کو کوئی خاص رنج ہی نہیں ہوا۔ بزرگوں کا رنج بھی عام انسانوں کے رنج سے مختلف ہوتا ہے، وہ باہر کم ہی ظاہر ہوتا ہے، اندر ہی اندر ابھرتا اور دبتا رہتا ہے اور وہ مایوسی کا حامل نہیں ہوتا کیوں کہ ان حضرات کے یہاں اصل زندگی آخرت کی ہوتی ہے، اور یہ دنیا ان کی نظر میں واقعی ایک گزرگاہ کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں کسی کا زیادہ ساتھ رہنا اور کم ساتھ رہنا کوئی زیادہ فرق نہیں رکھتا۔

ایسے حادثات پر حضرت شیخ کا انداز نہایت پرسکون اور اپنے معمولات پر قائم رہنے کا ہوتا تھا۔ ایصال ثواب اور تلاوت کی طرف متوجہ فرماتے ارو واقعہ کو کوئی اہم مسئلہ نہ بناتے،

چنانچہ ایسے واقعات پر حضرت شیخ کے خطوط تعزیت سے اس کا پورا پتہ چلتا ہے، حضرت شیخ کی رحلت میں مذکورۃ الصدر بزرگوں کی رحلت میں ایک خاص فرق یہ ہے کہ مذکورۃ الصدر بزرگوں میں سے ہر ایک کی رحلت کے بعد ان کی صف کے ایک یا کئی ساتھی باقی تھے، لیکن حضرت شیخ کی رحلت سے یہ صف ختم ہوگئی اور مختلف بزرگوں سے فائدہ اٹھانے والے جو سمٹتے سمٹتے حضرت شیخ پر جمع ہوتے چلے گئے تھے، بالآخر اس شخصیت سے بھی محروم ہوگئے۔

حضرت شیخ متعدد قریبی دوستوں اور عزیزوں کی جدائی کا غم سہنے کی حالت میں بھی دینی مقاصد عالیہ کی خاطر دنیا والوں کے ساتھ دنیاوی معاملات میں ایسا رویہ رکھتے کہ معلوم ہوتا کہ آپ شاید صرف دنیا کے آدمی ہیں۔ مہمانوں سے بے تکلفی، ان سے خوش اخلاقی، مختلف کاموں سے بھرپور دلچسپی، لطف و ملاطفت، مشورہ، گفتگو یہ سب طلاقت اور انشراح کے ساتھ کرتے، جس کی وجہ سے ان سے لوگوں کا تعلق صرف استرشاد ہی تک محدود نہ ہوتا بلکہ زندگی کے مختلف معاملات میں بھی ان سے مشورہ چاہا جاتا، اور ان سے ان معاملات میں بھی بڑی صائب اور دور رس رائے ملتی۔ حضرت شیخ زندگی کے ان تمام کاموں سے بھی دلچسپی لیتے جن میں دین کا جذبہ یا دین کا تعلق ہوتا اور ان میں پوری مدد دیتے اور مشوروں سے اور خبر گیری سے نوازتے۔ حضرت کے ان اوصاف کی اتنی مثالیں ہیں کہ ان کا بیان کرنا طول حدیث کا باعث ہے۔

حضرت شیخ کی اہم اور مشہور صفات میں سے ایک صفت متوسلین اور مہمانوں کی فکر و ضیافت تھی، چنانچہ ہمہ وقت ان کے یہاں مہمانوں کا ہجوم رہتا، گویا کوئی تقریب ہے۔ اور کوئی خاص موقع آجاتا تو ایک بڑا ولیمہ معلوم ہوتا، حضرت کے یہاں مہمانوں کی آمد صرف ان کی کثرت ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ ان کی خبر گیری اور بوقت تناول طعام ان کی فکر اور مہمانوں کے فرق مراتب کے لحاظ سے ان کا اکرام خاصے اہتمام سے ہوتا۔ مہمانوں کی فکر و خدمت کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ کے یہاں اس بات پر بھی پوری نظر تھی کہ ان کی اس خوش اخلاقی سے کوئی غلط فائدہ نہ اٹھا سکے، چنانچہ معتقدین و متوسلین پر تربیت کی نظر بھی رکھتے کہ جب کہ وہ دینی استفادہ کے لئے آئے ہیں تو وہ کسی موقع پر اکرام ضیف کو اپنا مستقل حق سمجھ کر کسی عُجب و خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں، چنانچہ کسی مسترشد سے اس سلسلہ

میں کوئی غلطی ہوجاتی تو اس کو برملا تنبیہ فرما دیتے اور اس سلسلہ میں بالکل مروت نہ کرتے۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت شیخ کے مسترشدین حضرت سے پوری محبت کرنے کے باوجود ڈرتے بھی بہت تھے، ان کے پاس حاضری کے موقع پر بازاروں میں پھرنا یا بے مقصد کاموں میں وقت گزارنا اور لایعنی باتوں میں پڑنا یہ حضرت شیخ کے یہاں ناقابل معافی جرم تھا۔ اور یہی نہیں کہ معلوم ہوجانے پر تنبیہ فرماتے بلکہ برابر فکر و جستجو رکھتے کہ کون کس طرح وقت گزار رہا ہے اور کس کام میں ہے۔ حضرت کا یہ فقرہ تو مشہور تھا کہ ''سونے اور کھانے پر کوئی پابندی نہیں، ہاں ادھر اُدھر پھرنے اور باتوں میں وقت گزارنے کی بالکل اجازت نہیں۔'' حضرت کے مستقل خدام اس کی فکر رکھتے اور حضرت شیخ ان سے معلومات حاصل کرتے رہتے۔ چنانچہ بارہا یہ ہوا کہ کسی نے یہ سمجھ کر کہ حضرت کے معمولات کے مطابق یہ وقت حضرت کی خاص مصروفیت کا ہے، کسی خلاف مقصد کام میں مشغولیت اختیار کرلی، مثلاً بازار چلے گئے، یا شہر کے لوگوں سے ملنے جلنے میں لگ گئے، اسی وقت حضرت کے یہاں سے طلبی آئی اور راز کھل گیا اور پکڑ ہوئی، حضرت کی یہ خصوصیت کہ بڑی خاطر تواضع اور فوراً بلا رعایت تنبیہ وہ اہم خصوصیت تھی جو مسترشدین کی تربیت کا بڑا ذریعہ تھی، اس سلسلہ میں حضرت کی ذہانت، دور بینی، دقت فہم کا پورا اظہار ہوتا تھا اور حضرت کی مشغولیت، خوش اخلاقی، نیک نفسی سے کوئی غلط فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا، اچھے اچھے ذہین لوگ حضرت کی فہم و فراست سے گھبراتے اور احتیاط کرتے تھے۔

حضرت کا رویہ اپنے اہل تعلق کے ساتھ بہت محبت و شفقت کا تھا اور مسترشدین کے لئے تو آپ ایک شفیق باپ کی حیثیت رکھتے تھے کہ دین و دنیا دونوں کی فکر و غم میں شریک اور غم گسار۔ چنانچہ طرح طرح کے مسائل میں لوگ ان سے رجوع کرتے اور ہی صائب رائے سے نوازے جاتے اور حضرت بھی اگر بالمشافہ مشکل ہوتا تو خط و کتابت کے ذریعہ اپنی رائے و ہمدردی سے نوازتے۔

حضرت کا تعلق ملک کے مختلف اداروں سے خاص طور پر مظاہر العلوم، دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء تینوں سے تھا، ان تمام اداروں کے معاملات و حالات سے ایک شفیق

سرپرست کی طرح دلچسپی لیتے اور اپنی حد تک جو تعاون و ہمدردی ہو سکتی تھی وہ عنایت فرماتے۔

ہندوستان کے صحیح العقیدہ مسلمانوں میں حضرت شیخ کی شخصیت اس آخری دور میں مرجع بن گئی تھی، جوق در جوق لوگ پہنچتے، حضرت کا حجاز کا سفر ہو یا حجاز سے واپسی ہو، یا مسلسلات حدیث کے درس کا پروگرام ہو، مسترشدین و شائقین کا ازدحام ہو جاتا اور سہارنپور یا دہلی یا جہاں یہ موقع ہوتا حضرت کی اقامت گاہ کے اردگرد ایک جلسہ وجلوس کی کیفیت ہوتی، یہ شان کتابوں میں اسلاف کی پڑھنے میں آتی ہے جس کے مناظر اس دور میں حضرت شیخ کے یہاں دیکھے۔ رمضان کا مہینہ حضرت شیخ کے یہاں عظیم روحانی جشن کا زمانہ معلوم ہوتا۔ سیکڑوں اور ہزاروں اہل دین و حاملین جذبۂ دین حضرت کی قیام گاہ پر پہنچتے اور حضرت بھی پورا مہینہ اعتکاف میں گزارتے اور یہ لوگ بھی پورا مہینہ، اور اگر نہ ہو سکتا تو اس کا حسب استطاعت ایک حصہ حضرت کے ساتھ گزارتے، سب کی ضیافت اور فکر و تربیت حضرت خود فرماتے، اور یہ مہینہ اس طرح ایک سالانہ تربیتی کیمپ بن جاتا جس کو دیکھنے کے لئے بھی لوگ دور دور سے آتے۔

حضرت شیخ نے اپنی زندگی میں تربیت و اشتغال علمی کی راہ میں بڑی قربانیاں اور بڑے مجاہدے کئے، کچھ ابتدا میں یہ سخت تربیت ان کو ان کے عظیم والد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب سے ملی، پھر حضرت شیخ کے اپنے مرشد حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری ثم مہاجر مدنی سے ملی، حضرت شیخ نے اپنے مرشد کے دل میں ایسا تعلق واعتماد حاصل کیا جس سے وہ ان کے جانشیں قرار پائے اور خلق خدا کا مرجع بنے۔ ان کی کتابوں کی تیاری میں ملن کے ساتھ تعاون کیا اور ان کی وفات کے بعد ان کتابوں کی تکمیل واشاعت فرمائی۔

حضرت شیخ الحدیث نے خود تصنیفات کا ایک ذخیرہ چھوڑا جو تقریباً سارا کا سارا خود ان کی حیات میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس ذخیرہ میں حدیث و کتب حدیث کے موضوعات پر نیز متعدد علمی و تحقیقی موضوعات پر خاص طور پر اور مواعظ و تربیت باطنی کے موضوع پر بہت سی کتابیں ہیں جن کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی، اور آج وہ تمام عالم اسلام میں مشہور و معروف و رائج ہیں اور خاص طور پر اہل علم میں اور تبلیغی جماعتوں میں ان سے

استفادہ بہت عام اور وسیع ہے۔

آج حضرت شیخ ہم میں نہیں ہیں؛ لیکن ان کی چھوڑی ہوئی مفید و موثر تصنیفات نیز ان کے چھوڑے ہوئے مسترشدین و خلفاء کی ایک بڑی تعداد آج بھی ان کی قائم مقامی کر رہی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کا ان کو بہترین صلہ عطا فرمائے۔(ماخوذ از الفرقان لکھنؤ شیخ الحدیث نمبر)

الجزائر کا سفر اور عالمی کانفرنس تلمسان میں شرکت

فکر اسلامی کے موضوع پر سولہویں بین الاقوامی کانفرنس الجزائر میں منعقد ہوئی جو ۱۰ رشوال ۱۴۰۲ھ سے ۱۳ رشوال ۱۴۰۲ھ تک چلی، طول مسافت کا تقاضہ تھا کہ عید کے فوراً بعد سفر کا پروگرام بنایا جائے، پہلے تو عید سے متصل دوسرے عید سے متصل دوسرے ہفتہ میں کانفرنس کا انعقاد اور دار العلوم میں نئے داخلہ اور مہمانوں کی آمد اور نئے سال کا نظام بنانے کا عمل کسی بھی سفر کی اجازت نہیں دیتا تھا لیکن کانفرنس کے منتظمین کا حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی کے لیے شرکت کا تقاضا تھا اور ان کی وجہ سے کچھ تاریخ آگے بڑھادی تھی، مجھے بھی مستقل مندوب کی حیثیت سے دعوت دی تھی، میں نے "لمحات شعورية ونفسية في كلام الرسول صلى الله عليه وسلم" کے عنوان سے مقالہ تیار کیا تھا، ۲۹ ر جولائی کو الجزائر پہنچے، کانفرنس تلمسان میں رکھی گئی تھی جو الجزائر دارالحکومت سے ۳۵۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر اہمیت کی حامل جگہ ہے، پہونچے میں تاخیر ہوگئی تھی اس لئے کہ استقبال کرنے والا کوئی نہ ملا، بعض تبلیغی حضرات کے تعاون سے تلمسان کی راہ لی گئی، معلوم ہوا کہ عالم اسلام کا بڑا منتخب مجمع یہاں موجود ہے، اگر یہ موقع ضائع کردیا جاتا تو بہت افسوس کی بات ہوتی، خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اپنے پرانے اہل تعلق کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، اور وہ حضرات حضرت مولانا سے بڑا محبانہ اور عقیدت کا تعلق رکھتے تھے، ان سے مل کر بہت خوش ہوئے، اور تبادلہ خیال کا اچھا موقع ملا، چونکہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو موضوع وہ دیا گیا تھا جس پر رابطہ عالم اسلامی کی حدیث کانفرنس میں مقالہ پیش کرچکے تھے اس لئے انہوں نے اس کے بجائے

دوسرا موضوع اختیار کیا، حضرت مولانا کا ان کی کتابوں کی ذریعہ یہاں اچھا تعارف تھا خاص طور پر ''الصراع بين الفكرة الإسلامية والفكرة الغربية في الأقطار الإسلامية'' کا بڑا استقبال تھا اور مدارس وجامعات کے طلبہ اور نوجوان بڑے گرویدہ تھے۔

دینی امور کے وزیر شیخ عبدالرحمٰن الشیبان نے بڑی تکریم کی، تلمسان کے تاریخی مقامات کی بھی زیارت کرائی گئی، وہاں سے الجزائر کے دارالحکومت میں دوروز ٹھہر کر فرانس ۱۰ اراگست کو گئے اور پھر ہندوستان واپسی ہوئی، یہ ایک یادگار سفر تھا۔

الجزائر شمالی افریقہ کا حصہ ہے جو اس کی ساحلی پٹی پر آباد ہے اور یورپ سے جڑتا ہے، وہ فرانس سے متصل ہونے کی وجہ سے اس کے انقلاب سے متاثر رہا ہے، ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کے موقع پر عالم اسلام کی بھرپور نمائندگی ہوئی تھی، اس میں الجزائر کی بھی اچھی نمائندگی تھی، الجزائر کی نمائندگی احمد حمانی صدر مجلس اعلی الجزائر ورکن رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے کی اور وزیر تعلیم الجزائر جناب مولود قاسم کی بھی نمائندگی کی اور کہا کہ ندوہ کی اساس تقوی اور رضائے الہی ہے، اور اس کا طرز فکر حکیمانہ تربیت وتعلیم ہے، انہوں نے ہندوستانی علماء کی الجزائر کے اہم انقلابی رہنما شیخ عبدالحمید بن بادیس اور شیخ محمد البشیر الابراھیمی کا ہندوستانی علماء سے استفادہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک واقعہ سنایا تھا کہ:

''الجزائر کے انقلاب اور جہاد آزادی اور دینی ودنیاوی اصلاح میں ہندوستان کے ایک عالم ربانی کا بھی کچھ حصہ ہے، جس سے شاید آپ واقف نہ ہوں، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء میں ہمارے شیخ اور الجزاء کی اصلاحی تحریک کے مشہور رہنما شیخ عبد الحمید بادیس ایک ہندوستانی عالم سے مدینہ منورہ میں ملے، جو مسجد نبوی میں درس دیتے تھے، شیخ عبدالحمید بن بادیس اس وقت نوجوان اور گمنام شخص تھے، لیکن اسلامی جوش وغیرت ملی سے ان کا سینہ معمور تھا، انہوں نے حرم نبوی میں ان ہندوستانی عالم سے کچھ اسباق بھی پڑھے، استاد کو بھی اپنے نوجوان شاگرد کی صلاحیت کا اندازہ تھا، اس موقع پر ایک مرتبہ شیخ عبدالحمید بن بادیس نے اپنے استاد سے اس خیال کا اظہار کیا کہ جس طرح دوسرے ہزاروں الجزائری ہجرت کر کے یہاں آگئے ہیں وہ بھی مستقل مدینہ منورہ میں قیام کی نیت کرلیں، اس لئے کہ ۱۹۱۲ء

میں فرانس کی طرف سے جبری بھرتی کا اعلان ہو چکا تھا اور اندازہ تھا کہ یہ مسلمانوں کو قربانی کا بکرا بنانے کی ایک چال ہے، ہندوستانی عالم نے ان کے خیال کو پسند نہیں کیا بلکہ ان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے وطن واپس جائیں اور وہاں دین وعلم کی خدمت کریں جس کی ان کے ملک اور قوم کو اس وقت سخت ضرورت ہے، اور اسی میں اسلام اور مسلمانوں کا زیادہ فائدہ ہے، یہ مخلصانہ مشورہ شیخ عبدالحمید بن بادیس کی واپسی کا سبب بنا، واپس آتے ہی انہوں نے علم دین کی خدمت اور دینی اداروں اور مکاتب کے قیام کی طرف فوری توجہ دی، انہوں نے علماء ندوہ کے طرز اور ان میں مطلوبہ صفات وشرائط کی بنیاد پر علماء کی ایک علمی ودینی انجمن قائم کی جو ندوۃ العلماء سے بہت مشابہ کہی جاسکتی ہے اس کے صدر خود شیخ عبدالحمید بن بادیس اور ارکان میں علامہ محمد البشیر الابراھیمی جیسے ممتاز اہل علم اور اسلامی رہنما تھے"۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جو ان کی بات کو سن رہے تھے اسی موقع پر مداخلت کرتے ہوئے واضح کیا تھا کہ اس قصہ سے واقف ہوں، یہ بزرگ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھے، مولانا محمد الحسنی مرحوم نے بھی اجلاس کی روداد میں اس کا ذکر کیا ہے، شیخ عبدالحمید بن بادیس، شیخ البشیر الابراھیمی کی خدمات الجزائر میں اسلام کے بقاء وتحفظ اور مسلمانوں کی تقویت کی ناقابل فراموش خدمات ہیں، اور وہاں جو اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا عمل انجام پایا ہے ان کے خدمات وکارنامے اس کا پشتہ ہیں، اور اس سے پہلے امیر عبدالقادر الجزائری کی شخصیت اور لیبیا میں امام سنوسی کی شخصیت اور مصر میں امام حسن البناء کی شخصیت، اسی طرح تونس، مراکش وغیرہ میں فرانسیسی انقلاب سے مقابلہ کی جو کوششیں سامنے آئیں وہ اس کی واضح دلیل ہیں کہ جب حالات خراب ہوتے ہیں تو اللہ تعالی ایسے رجال عزیمت سامنے لاتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ علم وحکمت، تدبیر اور دوسری خصوصیات کے ساتھ جرأت وشجاعت وغیرہ اوصاف بھی پیدا فرماتا رہا ہے۔

الجزائر کا ملک افریقہ کے شمال مغربی علاقے کے وسط میں ساحل سمندر سے اندرونِ صحراء تک پھیلا ہوا ہے، اس کا کل رقبہ ساڑھے آٹھ لاکھ مربع میل اور آبادی ایک کرور بارہ لاکھ ہے لیکن ملک کا ۹/۱۰ علاقہ نہایت بنجر اور تقریبا غیر آباد ہے اور یہ ہے اس

کے جنوب کا صحرائی و نیم صحرائی علاقہ۔

الجزائر اس اہم خطہ کا اہم جزء ہے جس کو عربی اصطلاح میں بلاد المغرب یا المغرب العربی کہا جاتا ہے، اس کے مشرق میں طرابلس، لیبیا، شمال میں بحر روم، مغرب میں بحر اٹلانٹک اور جنوبی سمت افریقہ کا صحرائے اعظم ہے، بلاد المغرب کا خطہ اپنے چہار جانب سے ایسے علاقوں سے گھرا ہوا ہے جو اس کو قرب و جوار کی آباد دنیا سے علاحدہ کر کے اس کو ایک جزیرہ کی صورت میں کر دیتے ہیں، وہ مشرق و شمال و مغرب میں سمندروں سے اور جنوب میں ایسے زبردست صحرا اور ریگستان سے گھرا ہوا ہے جس سے گزرنے میں ماہر صحراءنورد بھی دقت محسوس کرتے ہیں۔

طبعی و موسمی حالات کے لحاظ سے یہ خطہ یورپ سے بہت مشابہ ہے، مزید یہ کہ یورپ سے بہت قریب بھی ہے، اس کے اور یورپ کے درمیان بحر روم ہے جس کا عرض بہت زیادہ نہیں ہے اور ہر جگہ یکساں بھی نہیں، اس طرف المغرب العربی کے دوسرے ملکوں کے ساحل اور اس طرف اٹلی، فرانس اور اسپین کے ساحل ہیں، جغرافی اصطلاح میں بلاد مغرب افریقہ کو چک بھی کہلاتا ہے بلاد المغرب کا شمال مغربی گوشہ اسپین کے بہت قریب تک پہنچ گیا ہے، درمیان میں سمندر کی صرف ایک پتلی پٹی ہے یہیں پر جبل الطارق یا جبر الٹر ہے جس پر طارق بن زیاد کی قیادت میں مسلمان فوجیں اسپین فتح کرنے کے لئے اتری تھیں۔

المغرب العربی کے طبعی حالات اور یورپ سے اس کا قرب یہ وہ باتیں ہیں جو اٹلی، فرانس اور اسپین کے لئے المغرب کو زیر اقتدار رکھنے کا اصل محرک رہیں اٹلی نے المغرب کے مشرقی جانب کے ملک طرابلس کو عرصۂ دراز تک اپنے زیر اقتدار رکھا، اسپین نے المغرب کے شمال مغربی گوشہ ریف کو اپنے زیر انتظام رکھا اور فرانس نے تمام بلاد مغرب پر قبضہ کیا، اس میں اس کا مشرقی گوشہ تونس بھی تھا جو چند سال قبل آزاد ہو چکا ہے اور مغربی علاقہ مراکش تھا جس نے بھی چند سال آزادی حاصل کی اور وسطی علاقہ الجزائر ہے جو بے مثال قربانیوں کے بعد آزاد ہوا ہے۔

الجزائر مغرب عربی کا صرف جغرافی جزء نہیں بلکہ طبعی اور موسمی حالات کے لحاظ سے

بھی وہ بلاد مغرب کا تابع ہے، وہ اس کے نصف سے زائد علاقہ میں پھیلا ہوا ہے اور اس کی سرزمین پر بھی پہاڑوں کا وہی سلسلہ ہے جو بلاد مغرب کے تمام علاقوں میں پھیلا ہوا ہے۔

المغرب العربی کے پورے خطہ میں جو بات مشترک ہے وہ یہ ہے کہ اس کے شمالی علاقے پہاڑی اور شاداب اور جنوبی علاقے صحرائی اور بنجر ہیں اس کے پہاڑ دو سلسلوں پر مشتمل ہیں ایک ساحل کے قریب سے گزرتا ہوا اور الحلس التل کہلاتا ہے دوسرا درہ جنوب سے گزرتا ہے اور الحلس الصحراء کہلاتا ہے اور یہی پہاڑ شاداب اور غیر شاداب علاقوں کے درمیان حد فاصل ہے ان دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک مسطح مرتفع ہے وہ التل کہلاتی ہے۔

الحلس نامی یہ پہاڑ المغرب کے مشرقی سرے تونس سے مغربی سرے مراکش تک بتدریج بلند ہوتے چلے گئے ہیں، مراکش میں یہ پہاڑ نسبتاً زیادہ رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور پورے بلاد المغرب کی خوشحالی کا باعث ہیں، اس کے علاقوں میں خوب بارشیں ہوتی ہیں، موسم ٹھنڈا اور زمین شاداب گلزار رہتی ہے، اس کے برعکس جنوب کا علاقہ ریگستانی، بنجر اور تکلیف دہ موسم کا علاقہ ہے۔

اسلام کے آنے سے قبل بلاد المغرب میں بربر کی نام قوم آباد تھی، یہ قوم دنیا کی جنگجو اور بہادر ترین قوموں میں شمار کی جاتی تھی حتی کہ اس کا نام بھی سفا کی اور سخت مزاجی میں ضرب المثل بن گیا، اسلام لانے کے بعد اس قوم کی صلاحیتیں افساد کے بجائے اصلاح، تخریب کے بجائے تعمیر میں صرف ہونے لگیں، یہی وہ لوگ تھے جن کے تعاون سے عربوں نے اسپین فتح کیا تھا اور یورپ میں اپنی فتوحات سے ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔

عربوں کے اختلاط سے بربر قوم کا مذہب مکمل طور پر متاثر ہوا اور وہ سب مسلمان قوم بن گئے، لیکن ان کی زبان اور ثقافت پوری طرح متاثر نہ ہوسکی، اب بھی بربر قبائل میں بربری زبان ایک حد تک رائج ہے اور ان میں بعض قبائل تو عربی سے بالکل نابلد ہیں، جو عرب یہاں آئے تھے وہ یہاں عموماً آباد بھی ہوگئے اور بعد کی صدیوں میں مزید آتے بھی رہے، اس کے نتیجہ میں پورے المغرب العربی میں عرب باشندے بڑی تعداد میں ہیں، یہ

لوگ البتہ اپنی زبان اور ثقافت پر بھی قائم ہیں۔

یورپ کے سامراجیوں نے بلادالمغرب کے چار حصے کردیئے تھے، ایک شمال مشرقی اور مشرقی یعنی تونس اور الجزائر، دوسرے مغربی اور شمال مغربی یعنی مراکش اور ریف، ان میں سے ریف اور مراکش آزادی حاصل کر کے ایک دوسرے میں ضم ہو چکے ہیں، تونس آزاد ہے اور مستقل جمہوریہ ہے، الجزائر کی آزادی کی باری اب آئی ہے، تونس اور الجزائر در حقیقت اپنے اپنے علاقوں کے مشہور شہر ہیں جن کے نام پر ان کے ملک بھی موسوم کئے جاتے ہیں۔

الجزائر بلاد مغرب کا سب سے بڑا اور ممتاز علاقہ ہے اس کا رقبہ بھی پورے بلاد المغرب میں سب سے زیادہ وسیع رقبہ ہے لیکن اس کا بھی اصل علاقہ صرف شمالی ہے جو محدود رقبہ رکھتا ہے اور عملاً الجزائر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس کو شامل کر کے پورے ملک کا رقبہ آٹھ لاکھ ۴۷ ہزار مربع میل سے زیادہ ہے اور اس کی آبادی ایک کرور ۱۲ لاکھ بتائی جاتی ہے جن میں سے ۷-۸ لاکھ یورپین اور بقیہ اصل باشندے ہیں۔

لیکن شاداب الجزائر کا رقبہ، کل رقبہ کا تقریباً ۱/۱۰ یعنی ۸۰-۹۰ ہزار مربع میل اور آبادی ایک کرور سے زیادہ ہے بقیہ آبادی جو آٹھ نو لاکھ ہے وہ جنوب کے صحرائی منطقہ میں رہتی ہے، یہ منطقہ پونے آٹھ لاکھ مربع میل پر مشتمل بتایا جاتا ہے۔

یورپین آبادی جس کے اکثر و بیشتر افراد فرانسیسی ہیں، اور تھوڑے افراد یورپ کے دوسرے ملکوں کے اور یہودی ہیں، تقریباً کل کی کل شاداب الجزائر میں رہتی ہے، اور وہاں کی زرخیز اور زیر کاشت زمینوں کی عام طور پر مالک ہے، ان میں زیادہ تر زمیندار ہیں اور تھوڑے بہت کارخانہ دار اور تاجر ہیں، ملک کے اصل باشندے عام طور پر کاشتکار اور مزدور ہیں، کچھ تاجر اور زمیندار ہیں، جو عرب ملک کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہر طرح کے پیشے کرتے ہیں، ان میں کچھ صحرائی علاقوں میں قبائلی طرز پر بھی زندگی گزارتے ہیں، البتہ بربر قبائلی عام طور پر باغبانی کرتے ہیں اور ملک کے مخصوص خطوں میں رہتے ہیں۔

یورپین باشندے عام طور پر ساحلی شہروں میں آباد ہیں، ان شہروں کے تمدن و تعمیرات پر ان کا اثر واضح طور سے ملتا ہے، ملک کے دوسرے شہروں خصوصاً بلند خطوں میں

آباد شہروں میں عرب آبادی اور عرب تمدن کے آثار زیادہ نمایاں ہیں۔

پیداوار کے لحاظ سے الجزائر دولت مند ملک ہے، یہاں ہر طرح کے پھل، میوے اور غلہ ہوتا ہے، میوں میں خاص طور پر زیتون اور انگور اور غلہ میں گیہوں قابل ذکر ہے، زیتون کے درختوں کی تعداد ڈیڑھ کرور بتائی جاتی ہے، انگور سے بڑی مقدار میں شراب تیار کرائی جاتی ہے جو عام طور پر یورپ کو سپلائی کی جاتی ہے یہاں کے انگوروں سے تیار کی جانے والی شراب کی مقدار ہزاروں لیٹر بتائی گئی ہے۔

شاداب علاقوں میں جنگلات بھی بکثرت ہیں، معدنیات کے لحاظ سے الجزائر کا تما علاقہ بڑا زرخیز ہے، اس وقت ملک کی تقریباً ڈیڑھ سو کانوں میں کام ہو رہا ہے، ملک کے شمالی حصہ میں لوہا بھی خاصا پایا جاتا ہے۔

صحرائی علاقہ بھی زرخیزی سے خالی نہیں، یہاں کھجور کی خاصی پیداوار ہے، اس کے علاوہ اس کے سینے میں تیل کا انکشاف کیا گیا ہے، اس کی مقدار پورے مشرق وسطی کے تیل کی مقدار سے زیادہ بتائی گئی ہے۔

ملک کی قومیت اور زبان عربی ہے، اگرچہ فرانس اپنے دور حکومت میں قوم کو مذہباً اسلام سے اور لساناً عربی سے دور کرنے کی پوری کوشش کرتا رہا ہے۔

ملک کے شاداب اور شمالی منطقے کو انتظاماً تین صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک مشرقی، دوسرا وسطی اور تیسرا مغربی، ان میں سے ہر ایک صوبہ اپنے ایک پرانے شہر کے نام پر موسوم ہے، مشرقی قسطنطنیہ، وسطی الجزائر، مغربی دہران جس کو انگریزی میں اوران کہا جاتا ہے، ان میں سے شہر الجزائر اور شہر دہران ساحل پر اور قسطنطنیہ تل کے علاقہ میں آباد ہیں، صوبہ قسطنطنیہ کے ساحل پر قابل ذکر شہر فلب ویل اور صوبۂ دہران کے ساحل پر شہر مستغانم ہے، دہران میں اس کے علاوہ اندرون ملک میں کئی مشہور شہر ہیں جو بعسکرہ سیدی بلعباس اور تلمسان کہلاتے ہیں۔

ملک کا سب سے بڑا اور مشہور شہر الجزائر ہے جو اپنے صوبہ اور ملک دونوں کا دارالسلطنت ہے، یہ پورے الجزائری ساحل پر سب سے بہتر بندرگاہ بھی ہے آبادی دس

لاکھ افراد پر مشتمل ہے اور شہر نہایت خوبصورت اور تقریباً پورا شہر یورپین اسٹائل پر آباد ہے، شہر کے جنوب میں پہاڑی بلندیاں ہیں اس لئے وہ جنوبی جانب نہیں پھیل سکا اور یہی وجہ ہے کہ پورا شہر ساحل سمندر پر پٹی کی شکل میں پھیلتا چلا گیا، بحر روم میں گزرنے والے جہاز اس کی بندرگاہ کو ضرور اسٹیشن بناتے ہیں، شہر میں حکومت کے دفاتر، فرانس اور یورپ کی مختلف ایجنسیاں، الجزائر کی یونیورسٹی جو اس پورے علاقہ کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ یونیورسٹی مانی جاتی ہے، الجزائر کا دوسرے نمبر کا شہر وہران ہے جس کی آبادی کا بڑا حصہ یورپین ہے، اس کے بعد قسطنطنیہ ہے، جو مشرقی طرز کی ہے، اس کے بعد تلمسان ہے یہ اندورنی ملک کا پہاڑی علاقہ ہے اور اس کا طرز مشرقی ہے، شہر الجزائر کے جنوب میں ملیدہ نامی ایک شہر الجزائر کا ہل اسٹیشن سمجھا جاتا ہے۔

الجزائر کا ایک مرکزی شہر ''سطیف'' ہے جو دار السلطنت الجزائر سے سمت مشرق میں تین سو کیلومیٹر پر ہے، یہ شہر روی عہد سے آباد ہے، اور نام بھی روی عہد کا رکھا ہوا ہے، اس شہر کو الجزائر کی تحریر آزادی اور احیائے اسلامی کے جلیل القدر رہنما شیخ بشیر الابراہیمی کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے، اور اپنی ولایت (صوبہ) کا صدر مقام بھی ہے۔

شیخ بشیر الابراہیمی سے ہم ہندوستان کو یک گونہ تعلق اس لئے بھی ہے کہ جب ہم سب کے مخدوم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا جب مدینہ منورہ میں قیام تھا اور ان کا مسجد نبوی شریف میں درس ہوتا تھا اور شیخ بشیر الابراہیمی ان کے مستفیدین اور حلقہ تلمذ میں تھے اور بہت جلد انہوں نے حضرت مدنی سے خاص تعلق پیدا کرلیا تھا، اور حضرت کی ہدایت پر انہوں نے الجزائر کا قیام اختیار کیا، اور ایک ایمانی جماعت تیار کی جس سے اس پورے خطہ کو دین وایمان، جہاد وعزیمت اور دعوت الی اللہ کی روشنی اور مدد ملی۔

اس طرح یہ سفر ایک اہم اور تاریخی نوعیت کا تھا، جس نے اپنے نقوش چھوڑے، بعد میں الجزائر کا ایک سفر اور ہوا اور وہ بھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی سرپرستی میں ہوا تھا جو تلمسان میں ملتقی کی مناسبت سے تھا اور راقم بھی مدعو تھا، جس کی تفصیلات کاروان زندگی مصنفہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

حیدرآباد (دکن) واورنگ آباد (مراٹھواڑہ) کا علمی ودعوتی سفر

یوں تو قدیم وعزیز روابط کی بنا پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے سفر حیدرآباد کے لئے برابر تقاضے اور تحریکیں ہوتی رہیں، لیکن وہ سفر جو ۱۱ تا ۱۵/ اکتوبر ۱۹۸۲ء میں قیام حیدرآباد کا تھا، اس کی خاص تقریب یہ تھی کہ ۱۱-۱۳/ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو بیرونی زبانوں کی تعلیم کے مرکزی ادارہ (Central Institue of English and Foreign Languages) کی طرف سے عربی زبان کی تعلیم اور اس کی مشکلات ومسائل کے موضوع پر ایک آل انڈیا سمینار منعقد ہو رہا تھا، ادارہ کے صدر پروفیسر عبدالحلیم ندوی نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اس مجلس مذاکرہ کے افتتاح کی دعوت دی، جس کو مولانا نے موضوع کی اہمیت وافادیت اور عزیز داعی کے تعلق کی بنا پر منظور کرلیا اور اپنے چند عزیز رفقاء کے ساتھ جن میں مولانا سید ابوبکر حسنی ایم اے اسسٹنٹ پروفیسر جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی، مولانا قاضی محمد معین اللہ ندوی اندوری نائب ناظم ندوۃ العلماء، مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدیر "البعث الاسلامی" اور راقم الحروف تھا، ۱۰/ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو حیدرآباد پہونچے، اور اپنی قدیم قیام گاہ عبداللہ بھائی پٹنی مالک بمبئی آندھرا ٹرانسپورٹ کی کوٹھی بنجارہ ہل پر قیام فرمایا، اس سمینار میں مقالات کے دوران حضرت مولانا کی ایک وہ اہم تقریر بھی ہوئی جس میں انہوں نے اپنی تدریسی وتعلیمی زندگی کے بڑے گراں قدر لیکن دلچسپ وسبق آموز تجربے بیان کئے، اور عربی زبان وادب میں کمال پیدا کرنے کے خواہش مندوں اور اس کو اہل زبان وماہر فن کی حیثیت سے پڑھانے والوں کو مفید مشورے دیئے، افسوس کہ وہ تقریر منضبط نہ ہوسکی، البتہ دوسرے خطابات محفوظ کرلئے گئے، ان میں سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لنگویجز حیدرآباد کے آل انڈیا عربک سمینار منعقد ۱۱/ اکتوبر ۱۹۸۲ء میں کی تھی جس کے آغاز میں انسٹی ٹیوٹ کے صدر شعبہ عربی ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی نے عربی میں محاضرین کا خیر مقدم کیا تھا، پھر انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر رمیش موہن نے سمینار کے اغراض ومقاصد انگریزی میں بیان کئے، ڈاکٹر اعجاز احمد ریڈر لکھنؤ یونیورسٹی نے مولانا کے تعارف

میں انگریزی میں مضمون پڑھا اور صدارت نواب میر اکبر علی خاں سابق گورنر اتر پردیش نے کی تھی، حضرت مولانا کا اختتامی خطبہ ''عربی زبان کی تحصیل ومہارت کا سب سے طاقتور محرکات اور اس کے محیر العقول نتائج'' کے عنوان سے مجموعہ خطبات ''تحفہ دکن'' کا پہلا خطبہ تھا، اور ''ہندوستان میں مسلمانوں کی ذمہ داری'' کے عنوان سے خطاب اس مجموعہ کا دوسرا خطبہ ہے جو ۱۳؍اکتوبر کو مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ باغ عامہ حیدرآباد میں ایک بڑے اجتماع میں کیا، اس میں فاضل مقرر کا تعارف نواب میر اکبر علی خاں صدر انسٹی ٹیوٹ نے کرایا، تیسرا خطبہ مجلس علمی حیدرآباد میں ۱۴؍اکتوبر کو پیش کیا گیا، جس کے داعی ایڈوکیٹ سید جمیل الدین تھے، اس میں خیر مقدمی تقریر مولانا محمد رضوان القاسمی ناظم سبیل السلام حیدرآباد نے کی، یہ تقریر "علمائے دین کا منصب استقامت اور حقیقت پسندی کا جامع" کے عنوان سے ہے اور ''غیر اسلامی شعائر ورسوم کی نقل وتقلید سے احتراز کی ضرورت'' پر ایک اہم خطاب جامعہ عربیہ دارالعلوم میر عالم تالاب حیدرآباد میں فرمایا، یہاں خیر مقدمی تقریر جناب سید لطیف الدین قادری صدر کمیٹی بلڈنگ فنڈ دارالعلوم ومینجنگ ایڈیٹر "رہنمائے دکن" نے فرمائی۔

اس کے بعد اورنگ آباد مہاراشٹر کا سفر ہوا جو نظام کے عہد میں حیدرآباد دکن کی ریاست کا ہی حصہ تھا، اب مراٹھواڑہ کا اہم شہر ہے، یہاں اورنگ آباد آزاد کالج میں اساتذہ، طلبہ اور معززین شہر کے بڑے اجتماع میں حضرت مولانا نے خطاب کیا اور تعارفی تقریر کالج کے جنرل سکریٹری ذوالفقار حسین صاحب نے کی، اور کالج کے پرنسپل ڈاکٹر مظہر محی الدین نے شکریہ ادا کیا جبکہ صدارت جناب سکندر علی وجد (سابق ممبر راجیہ سبھا) نے کی، اس کا موضوع تھا" سورۃ الکہف میں اصحاف کہف کا قصہ، ایک تقریر ۱۷؍اکتوبر کو جامع مسجد اورنگ آباد میں ''سیرت کردار کی تبدیلی کی ضرورت'' پر فرمائی۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ حیدرآباد کے دوستوں، اداروں وتحریکات کے سربراہوں، تعلیمی، اصلاحی وسماجی کام کرنے والوں کو جب مولانا رحمۃ علیہ کی حیدرآباد تشریف آوری کا علم ہوا تو انہوں نے مولانا کے اس قیام سے فائدہ اٹھانے کے لئے مختلف

تقریبات واجتماعات کا انتظام کیا، بعض حضرات نے بذریعہ تار اور بعض نے خطوط کے ذریعہ مولاناؒ کے سفر حیدرآباد کی اطلاع پاکر پہلے سے لکھنؤ دعوت بھیج دی تھی اور درخواست کی تھی کہ وہ ان کی دعوت قبول کرکے ان کے ادارے یا مرکز عمل میں ہی کوئی خطاب فرمائیں، مولانا کا قیام حیدرآباد میں ۵/ دن رہا، جس میں کسی دن تین، کسی دن چار پروگرام ہوئے، لیکن بعض جگہ مختصر خطابات رہے، بعض جگہ خطابات ٹیپ نہیں ہوسکے، لیکن ان میں جو باتیں کہیں گئیں وہ اکثر ان تقریروں میں آگئی ہیں جو ''تحفۂ دکن'' میں ہیں، مولانا کے یہ خطابات مروجہ لگے بندھے ڈھنگ سے ہٹ کر عملی وحقیقت پسندانہ تھے، جن میں دین وزندگی کے حقائق پیش کیے گئے، ان خطابات کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان سے مقام وزمانہ کا تعین آسانی سے ہوجاتا ہے، اور پڑھنے والا آسانی سے اندازہ لگالیتا ہے کہ یہ خطابات کس ماحول، کس سرزمین اور کن حالات میں کئے گئے، وہ ان عام دینی مواعظ اور خطیبانہ بیانات سے مختلف ہیں جن کو کسی زمانہ اور کسی ملک وماحول کے چوکھٹے میں فٹ کیا جاسکتا ہے، اور جن میں وقت ومقام کی جھلک اور مقرر کے تأثرات ومطالعہ کا عکس نظر نہیں آتا، یہ بھی پیش نظر رہے کہ ریاست حیدرآباد سے (جس کو اپنے رقبہ کی وسعت، خوشحالی وترقی وآبادی کی بنا پر سلطنت آصفیہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا) مسلمانوں کی ایک باعزت وطویل تاریخ وابستہ ہے، سلطنت آصفیہ نے علم پروری، معارف نوازی، حمیت دینی اور اہل کمال کی سرپرستی وقدردانی کی وہ مثال پیش کی جس کی نظیر بڑی بڑی اسلامی سلطنتوں اور عرب ملکوں کی تاریخ میں بھی ملنی مشکل ہے، خصوصیت کے ساتھ دائرۃ المعارف العثمانیہ (جس نے بیسیوں کی تعداد میں علماء ومحققین سلف کی ان نایاب وعلمی کتابوں کو چھاپ کر وقف عام کیا، جن کو دیکھنے کے لئے اساتذہ کبار کی آنکھیں ترستی تھیں) دارالترجمہ (جس نے اردو زبان وغیر ملکی زبانوں کو تحقیقات ومعلومات سے مالا مال کردیا اور جامعات میں اردو کو ذریعہ تعلیم بننے کے قابل بنادیا) نیز جامعہ عثمانیہ (عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو کو پہلی مرتبہ ذریعہ تعلیم بنایا اور دینیات کو اس کا مقام عطا کیا، اور ممتاز ترین اساتذہ اور نامور علماء کی تدریسی خدمات حاصل کیں) سلطنت آصفیہ کے ان روشن کارناموں میں ہے جن پر صرف حیدرآباد ہی کو

نہیں مسلمانان ہند کو فخر ہے، ایک زمانہ میں یہ ریاست اس برصغیر کے اہل کمال (بالخصوص ان مسلمان اہل کمال کے لئے جو برطانوی ہند میں نظرانداز کئے جارہے تھے) کے لئے مقناطیس کا اثر رکھتی تھی، اور نواب محسن الملک میر مہدی علی، نواب وقارالملک، مولوی مشتاق حسین، عماد الملک سید حسین بلگرامی، مولوی سید علی بلگرامی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حمیدالدین فراہی، مولانا عبداللہ عمادی، عزیز مرزا اور معلوم نہیں کتنے اہل کمال اور عالی دماغ لوگوں کو اپنے آغوش میں جگہ دی، اور ان کے ذہنی وعلمی وانتظامی کمالات کو منظر عام پر آنے کا موقع دیا۔

جب اس سلطنت نے بیرون ریاست کے لائق افراد کو ان کا صحیح مقام عطا کیا، تو خود اس ریاست کے مسلمان شہریوں اور باصلاحیت لوگوں کے لیے وہ قدرتاً ملجأ وماًوی بلکہ آغوش مادری بنی ہوئی تھی، اس وقت مسلمانوں کے لئے شریفانہ وباعزت زندگی کے دو ہی راستے تھے، جاگیریں، منصب اور عہدے اور ملازمتیں، ۱۹۴۸ء میں جب پولس ایکشن کے نتیجہ میں ریاست کا مرکز سے انضمام ہوا اور ریاست کی حیثیت ختم کردی گئی تو ایسا معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی، اور وہ ہوا میں معلق رہ گئے، لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور خدا کا خاص فضل واحسان ہے کہ مسلمانوں نے بہت جلد اپنے کو سنبھال لیا، اور بڑی حد تک وہ مایوسی، بے بسی وبے دلی سے محفوظ رہے، جو اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ تھا، اور بہت جلد اس کا ظہور ہوا، کوئی شبہ نہیں کہ اس میں ان دینی تحریکوں ودعوتی کوششوں کا بہت بڑا حصہ ہے، جو ریاست کے انضمام کے فوراً بعد سرگرم عمل ہوگئیں، اور انہوں نے مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک نئی دینی روح اور جذبہ پیدا کردیا، سیاسی وتنظیمی کوششوں کو بھی اس سلسلہ میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، جنہوں نے مسلمانوں میں کسی حد تک خوداعتمادی اور مخالف حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کی، اس میں حیدرآبادی مسلمانوں کی زندہ دلی اور قوت عمل واخوت ایمانی کا بھی حصہ ہے، جنہوں نے اپنے آپ کو حالات میں تحلیل ہونے سے باز رکھا، اور شریفانہ زندگی کے لئے جدوجہد جاری رکھی۔

ان حقیقتوں کے باوجود جن کا اعتراف ضروری ہے، حیدرآباد کے مسلمانوں کو

اس حقیقت کی طرف بار بار متوجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ داعی وقائد کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اسی داعیانہ حیثیت وقائدانہ صلاحیت سے وہ نہ صرف اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرسکتے ہیں، بلکہ پورے ملک کی خدمت کرسکتے ہیں، آزادی کے بعد ریاست میں جو سیاسی تبدیلی آئی، اس نے مسلمانوں کی اجتماعی وثقافتی حالت پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے، ہر شخص زندگی کی تمام قدروں کو نظر انداز کرکے صرف اقتصادی ضروریات پوری کرنے کی طرف متوجہ ہوگیا ہے، مسلمان خیرامت ہونے کی وجہ سے اس کے مستحق ہیں کہ ان سے موجودہ بگڑے ہوئے حالات میں اپنے شاندار ماضی کے دہرانے کی توقع کی جائے، جب انہوں نے اپنی آمد کے موقع پر بے غرضی، انسان دوستی، خدمت خلق، اور اصلاح سیرت کے کام کو بحسن وخوبی انجام دیا تھا، یہ اقدام نہ صرف ملک کو انتشار وبدنظمی سے بچائے گا، بلکہ مسلمانوں کے وقار کو بلند کرے گا، اور ملک میں ان کی ضرورت واہمیت کو منور کرے گا، یہی وہ مرکزی مضمون تھا جس کو حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے علی العموم اپنے خطابات میں مؤثر الفاظ ودلنشیں انداز میں بیان فرمایا اور ان تقریروں کو حیدرآباد کے اس پس منظر میں پڑھنے کی ضرورت ہے، جو ''تحفۂ دکن'' کے نام سے ہے، اس میں اورنگ آباد کے آزاد کالج کی دو اہم تقریروں کا بھی اضافہ ہے، اورنگ آباد کی یہ خصوصیت ہے کہ سلطان محی الدین اورنگ زیب عالم گیر کی آخری سرگرمیوں کا وہ مرکز بنا اور اس کے دامن میں خلدآباد جو اولیاء، وعلماء کے قیام گاہ ومرقد ومدفن ہے بہت مشہور جگہ رہی ہے، ان کا مرقد بنا، یہاں کی ملک عنبر کی جامع مسجد میں کاشف العلوم کے نام سے بڑا مدرسہ ہے جہاں عالمیت تک تعلیم ہوتی ہے اور پھر اس کے فارغین فضیلت کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء آتے ہیں۔

یہ ادارہ وہاں کے ایک بڑے دیندار بزرگ حاجی سعید خاں صاحب کا قائم کردہ ہے جسے مولوی ریاض الدین فاروقی ندوی مرحوم دیکھتے رہے ہیں، اور اس کی ایک کمیٹی ہے جو اس کی نگرانی کرتی ہے، حضرت مولانا کے قدیم میزبان غلام محمد بھائی پٹنی کا یہاں مکان وکاروبار ہے، اس لیے قیام کے لیے ان کی جگہ اختیار کی جاتی ہے، اور رابطۂ ادب اسلامی اور خود حضرت مولانا کی شخصیت کے متعلق اہم پروگرام بعد میں اس ادارے نے کئے، اور مختلف

مناسبتوں سے بار بار یہاں آنا جانا ہوا، حیدر آباد ۱۰؍اکتوبر ۱۹۸۲ء کو پہونچنا ہوا تھا، پھر اورنگ آباد کا دو روزہ قیام رہا، اور لکھنؤ واپسی ہوئی جہاں ۱۹؍اکتوبر کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قدیم استاد انگریزی جناب محمد سمیع صدیقی کا سانحۂ وفات پیش آیا جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے استاد تھے اور خود راقم الحروف کو بھی ان سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کا اسلامک سنٹر اور حضرت مولانا کا مقالہ اسلام اور مغرب

۲۰، ۲۱؍جولائی ۱۹۸۳ء کی درمیانی شب میں لندن کا اہم سفر ہوا جس کے داعی ومحرک پروفیسر خلیق احمد نظامی تھے، ان کا دردمندانہ خط حضرت مولاناؒ کے نام آیا، جس میں دنیا کی مشہور وعظیم یونیورسٹی آکسفورڈ لندن میں ایک اسلامک مرکز (Islamic Center) کے قیام کی بات کی گئی تھی، اور اصل محرک ان کے صاحبزادے ڈاکٹر فرحان احمد نظامی تھے جو اس وقت یونیورسٹی میں اپنے تحقیقی مقالہ کی تکمیل میں مشغول تھے، ہمارے استقبال کے لیے لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ پر ڈاکٹر براؤننگ اور ڈاکٹر فرحان احمد نظامی موجود تھے، پروفیسر خلیق احمد نظامی پہلے سے آکسفورڈ پہونچ گئے تھے اور دستور ساز مجلس میں شرکت کے لیے پاکستان کے مشہور ماہر قانون اے، کے بروہی صاحب (سابق وزیر امور مذہبی حکومت پاکستان وچانسلر اسلام آباد یونیورسٹی) بھی پہونچ گئے تھے۔

۲۳، ۲۴؍جولائی کو اس زیر تجویز اسلامی مرکز کے بارے میں بنیادی باتیں طے کی گئیں اور مقاصد وضوابط پر مشورہ ہوا اور طے پایا کہ پہلے ڈائرکٹر ڈاکٹر فرحان احمد نظامی اور پہلے رجسٹرار ڈاکٹر براؤننگ ہوں گے، اس کے ارکان میں ہمیشہ ممتاز مسلم فضلاء رہیں گے تاکہ اس کا مزاج اسلامی رہے، اور کسی غلط مقصد یا گمراہی کا آلۂ کار نہ بنے، اس تقریب سے فراغت کے بعد مزید چھ دن انگلستان میں قیام رہا اور وہاں کے اسلامی مراکز، تبلیغی مراکز، دینی مدارس کے بھی دورے ہوئے اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ہر مقام پر قابل اصلاح امور کی طرف متوجہ کیا، اور ان کی خوبیوں اور خدمات کا پورا اعتراف کیا۔

یہ بات جماعت اسلامی کے فکر سے قریب اسلامک فاؤنڈیشن سینٹر، اور تبلیغی

مرکز لندن، اور ہولکمب بری کے دارالعلوم میں خاص طور پر دیکھنے میں آئی، کہ یورپ میں کام کا طریقہ برصغیر میں کام کے طریقہ سے مختلف ہے، مولانا نے برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داری، صحیح طریق عمل اور خطرات وفوائد کی نشاندہی فرمائی، پھر ۱۳؍جولائی کو یہاں امریکن طیارہ سے دہلی کے لیے واپسی ہوئی۔

اس سفر کا اہم خطاب ومقالہ "اسلام اور مغرب" کے عنوان پر حضرت مولانا نے دیا جو بہت پسند کیا گیا، یہ خطاب جو اگزامینیشن ہال میں دیا، اور وہ حاضرین سے بھر گیا تھا، خطاب عربی میں تھا جس کی انگریزی میں ترجمانی ہوئی، اس میں اقبال کے حوالے سے یہ بات کہی گئی کہ مغرب میں خدا کی معرفت کے اسباب اور اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں، لیکن کوئی ایسا باتوفیق انسان نہیں جو آسمانی تعلیمات سے فیضان وعرفان حاصل کر کے شان کلیمی کے ساتھ دعوت الی اللہ اور خلق کی ہدایت کا کام انجام دے، یہاں مادیت کا طوفان اور أنا أحی و أمیت (میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں) کے مدعی موجود ہیں، لیکن ابراہیم خلیلؑ کا سچا پیرو نہیں جو اس کے ماننے سے صاف انکار کر دے، اور اعلان کرے کہ ربی الذی یحی ویمیت (میرا پروردگار ہی ہے جو جلاتا اور مارتا ہے) پھر امتحان کی آگ میں بے محابا کود پڑے اور اس کو گل وگلزار کر دے(۱)۔

حضرت مولاناؒ کا امارات، سعودی عرب اور کویت کا دورہ

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ۱۶؍نومبر سے ۱۲؍دسمبر ۱۹۸۳ء کو مختلف اداروں کی دعوت پر متحدہ عرب امارات، کویت اور سعودی عرب کا دورہ کیا، اس سفر میں تینوں ممالک کی کئی یونیورسٹیوں، علمی اداروں اور انجمنوں میں مقالے پڑھے اور تقریریں کیں، ۲۳؍نومبر ۱۹۸۳ء کو کویت کی قومی مجلس برائے ثقافت وفنون وادب کی دعوت پر الاسلام والحضارۃ الانسانیۃ کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھا جو "اسلام اور انسانی تہذیب وتمدن" کے نام سے مولانا عبدالنور ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ترجمہ سے "تعمیر حیات" شمارہ ۲۵؍جنوری ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا، یہ مقالہ بڑا تحقیقی، پراز معلومات اور مدلل

(۱) بحوالہ کاروان زندگی جلد دوم، ص ۳۷۹۔

تھا، اس میں بعض ممتاز مستشرقین کی تحریروں کے اہم اقتباسات بھی دیئے گئے تھے، اور ممتاز علماء اور مسلم دانشوروں کی بھی تحریروں کے نمونے پیش کیے گئے اور ان سب کی روشنی میں یہ بات پوری وضاحت اور قوت سے کہی گئی تھی کہ:

''قومیں صرف تاریخ کے سہارے زندہ نہیں رہتیں، عہد ماضی کی کامرانیاں، گذشتہ کسی زمانہ کے کارنامے، تاریخ کے کسی دور میں انجام دیا ہوا کوئی کردار خواہ کتنا ہی اہم ہو، کسی قوم کی زندگی کی اساس نہیں بن سکتا، قومیں زندہ رہتی ہیں عمل پیہم، جہد مسلسل، ہمہ وقت حرکت ونشاط، احساس ذمہ داری، جان ومال کی قربانی، جدت ونادرہ کاری، قوت وصلاحیت کے اظہار اور اپنی ضرورت واہمیت تسلیم کرانے سے، لیکن کوئی قوم اپنے خول میں بند ہو جائے اور اپنے منصب سے ہٹ جائے، تو وہ تاریخ کی داستان بن کر رہ جاتی ہے، اور اسے زمانہ فراموش کر دیتا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ امت اسلامیہ اپنا منصب سنبھالے اور دوبارہ دعوت، اصلاح امت اور قیادت کا فریضہ انجام دے۔

ایک تاریخی حقیقت اور ہے کہ امت اسلامیہ جب تک دوسری تہذیبوں کی خوشہ چیں اور دوسروں کے دسترخوان کی زلہ ربا رہے گی، جب تک غیر اسلامی تمدن کے موجوں میں الجھتی اور ان کے سمندر میں گلے تک ڈوبی رہے گی، وہ انسانی تہذیب وتمدن میں اثر اندازی اور ان کی اصلاح ورہنمائی کی صلاحیت پیدا نہیں کر سکتی، اس میں اتنی بھی صلاحیت نہ ہوگی کہ کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکے، یہ امت دوسروں کو اپنی تقلید پر اسی وقت آمادہ کر سکتی ہے جب اس کو مضبوط ایمان اور پختہ یقین ہو، اس کی تہذیب مستقل وجود اور دوسری تہذیبوں سے الگ اور ممتاز شناخت (Personality) رکھتی ہے، وہ ربانی اور آسمانی تہذیب ہے، ہر زمانہ اور ہر علاقہ کے لئے ہے، مضبوط ومستحکم بنیادوں پر قائم ہے، کتاب وسنت سے ماخوذ ہے، الٰہی دعوتی اور نبوی تعلیمات سے وجود میں آئی ہے، اسلام طہارت اور عفت کا مخصوص تصور رکھتا ہے، اس کے یہاں طہارت، نظافت اور عفت صرف بڑے بڑے اخلاقی جرائم کے احتساب کے مرادف نہیں بلکہ ان سے کہیں زیادہ وسیع، عمیق اور ہمہ گیر ہے، اس کی زندگی اس مغربی تہذیب سے میل نہیں کھاتی، جس کا نشو ونما اور ارتقاء خاص تاریخی عوامل کے ماتحت ہی کبھی خالص مادہ

پرستانہ ماحول اور بعض اوقات دشمن دین ومذہب اور دشمن اخلاق فضا میں ہوا ہے، اور جس کی حقیقت اس کے ایک رمز شناس اور اس کی تاریخ اور اس کے مزاج وطبیعت سے واقف ڈاکٹر محمد اقبال نے ایک مصرعہ میں بیان کر دیا ہے:

کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

آخر میں فرمایا کہ:

حضرات! مجھے اجازت دیں کہ اسلامی فتوحات اور اسلامی دعوت کے ان انقلاب آفریں اثرات کی کچھ قیمتی شہادتیں نقل کروں جو برصغیر ہند میں رونما ہوئے، جبکہ ہندوستان خود کسی زمانہ میں، ریاضی، فلسفہ اور تہذیب وتمدن کا مرکز رہ چکا ہے، لیکن بعد میں بت پرستی، ہندوستانی دیومالا، ظالمانہ طبقاتی نظام اور قدامت پرستی میں ڈوب گیا، اپنے عقائد، اپنے نظام اور اپنے رسم ورواج پر مضبوطی سے قائم اور ان کو دانتوں سے پکڑنے والے اس خطۂ زمین میں اسلام کی اثر آفرینی، اس کی فطرت میں پوشیدہ قوت ونشاط کی ان کے فیض اثر سے اس کے روئے زیبا سے، جہالت وجاہلیت کا گرد وغبار چھٹ گیا جس کے بعد وہ روشناس عالم ہوا، علوم وفنون زندہ ہوئے، اور تہذیب وتمدن نے برگ وبار پیدا کیے، ان کے حلقہ بہ گوش وہ اولعزم فاتح، ابطال اور قائدین پیدا ہوئے جنہوں نے حق وباطل کی جنگ میں حق وصداقت کو فیصلہ کن کامیابی عطا کی، انہوں نے دنیا کو خدا شناس مجاہد دیئے جو دن کو میدان جنگ کے شہسوار اور رات کے اندھیروں میں عابد شب زندہ دار بن کر رہے، جنہوں نے تلواروں کی چھاؤں میں اذانیں دیں اور عین معرکۂ حرب وضرب میں نماز شوق ادا کی، بطل غیور صلاح الدین کی تلوار اور زاہد کامل بایزید بسطامی کی نگاہ، تقوی شعار، دنیا وآخرت کے لیے شاہ کلیدی تھے:

از دم سیراب آں امی لقب — لالہ است از ریگ صحرائے عرب
حریت پرورد آغوش اوست — یعنی امروز امم از دوش اوست
او ولے در پیکر آدم نہاد — او نقاب از طلعت آدم کشاد
سطوت بانگ صلوۃ پیکر آدم نہاد — قراء ت والصافات اندر نبرد
تیغ ایوبی، نگاہ بایزید — گنج ہائے ہر دو عالم را کلید

ندوۃ العلماء میں مدارس عربیہ کے نظام ونصاب پر مذاکرہ علمی اور دوسرے پروگرام

ندوۃ العلماء کے تاسیسی مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جس طرح ہمارے اسلاف، بزرگان دین، علماء ربانیین نے علوم وفنون کی تدریس وتعلیم اور خود علوم وفنون کی تاسیس وتدوین میں وقت اور زمانہ کے تقاضوں کا لحاظ رکھا ہے، اس طرح اس وقت بھی اس کی ضرورت شدید ہے کہ ہم بدلتے ہوئے حالات میں ایسے نصاب ونظام تعلیم کی ترتیب واشاعت کریں جس کو پڑھ کر اس کے فضلاء امت کی صحیح دینی خدمت کرسکیں اور ان فتنوں کا مقابلہ کرسکیں جو علمی اور فکری راہ سے مسلمانوں میں وقتاً فوقتاً پھیلتے رہتے ہیں، ضرورت سمجھی گئی کہ ہندوستان کے مختلف مکاتب فکر، ماہرین تعلیم، علماء ودانشوروں کو جمع کرکے باہمی غور وخوض اور مشورہ کے بعد مشترکہ جدوجہد اور تعاون کے ساتھ اس ضرورت کو پورا کیا جاسکے اس لئے ماہ شوال ۱۴۰۳ھ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کو اس کا شدید تقاضہ ہوا اور انہوں نے مشورہ کے بعد اس کا فیصلہ کیا کہ ۲۸، ۲۹ر فروری وکیم مارچ ۱۹۸۴ء (جمادی الاولی ۱۴۰۴ھ) کو ندوۃ العلماء میں مذاکرہ علمی کا انعقاد ہو، اور اس کے لئے دعوت نامہ جاری کیا، چنانچہ مذکورہ تاریخوں میں ملک بھر سے اچھی نمائندگی ہوئی جن میں دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارن پور، مصباح العلوم مئو، دارالعلوم مئو، فیضان عام مئو، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعۃ الفلاح بلریا گنج، مظہر الاسلام بنارس، جامعہ رحمانیہ مونگیر، جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں، کاشف العلوم اورنگ آباد، تاج المساجد بھوپال، سبیل السلام حیدرآباد، جامعہ اسلامیہ بھٹکل، ندوۃ المجاہدین کیرالا، نور الاسلام نیپال، احمدیہ سلفیہ دربھنگہ، اصلاح المسلمین پٹنہ، مدرسہ فتحپوری دہلی، فلاح دارین ترکیسر، دارالعلوم چھاپی گجرات، اور دیگر مدارس ومکاتب فکر، یونیورسٹیز کے نمائندے شریک ہوئے، مقالات، تقریریں، سفارشات، تجاویز پیش ہوئیں، اور اسے اچھی سمت میں اچھا قدم قرار دیا گیا۔

اس تین روزہ مجلس علمی کے پروگراموں میں ایک پروگرام نصاب ونظام تعلیم کے مسئلہ پر تھا، اس کے ساتھ ہی چند اور پروگرام تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ

کی مستقل عمارت نہیں تھی، دار العلوم کی مرکزی عمارت کا پرشکوہ عباسیہ ہال اور اس سے ملحق چند کمرے اس کے لیے مختص چلے آرہے تھے، ۱۹۷۵ء کے جشن تعلیمی کے موقع پر کتب خانہ کی مستقل عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور اس موقع پر امارات کے قاضی القضاۃ شیخ احمد عبدالعزیز آل مبارک نے بڑی پراثر دعا کرائی تھی۔

عمارت مکمل ہونے کے موقع پر جس میں تقریباً ۹ سال کا عرصہ لگ گیا، سمینار کے اندر اس کی افتتاحی تقریب عمل میں آئی، اور پورا کتب خانہ نئی عمارت میں منتقل ہو گیا، اور اسی طرح تاریخ ندوۃ العلماء کا رسم اجرا عمل میں آیا جو دو جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد مولانا اسحاق جلیس ندوی کے قلم سے اور دوسری جلد مولانا شمس تبریز خاں کے قلم سے ہے۔

الحمدللہ یہ ساری تقریبات پرامن، پرسکون انداز میں انجام پائیں، یہ ہفتہ ہم سبھی کارکنان ندوۃ العلماء کے لئے بہت ہی مسرت وخوشی کا تھا کہ ہندوستان گیر پیمانہ پر علماء کرام کی تشریف آوری اور اہل علم واہل دین کا اتنی بڑی تعداد میں اجتماع اور اس کے نتیجہ میں خیر وبرکت سے مستفید ومحظوظ ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔

کتب خانہ ندوۃ العلماء کا انتساب ندوۃ العلماء کے اول معتمد تعلیم مولانا شبلی نعمانی کی طرف کیا گیا، اس مناسبت سے علامہ شبلی نعمانی پر ایک اہم مقالہ مولانا نذرالحفیظ ندوی ازہری استاد دار العلوم نے پیش کیا اور کتب خانہ ندوۃ العلماء کا تعارف اس کے ناظر مولانا سید محمد مرتضی مظاہری بستویؒ نے کرایا جو مولانا عبد النور (نور عظیم) ندوی استاد دار العلوم کا مرتب کردہ تھا، اور یہ حوالہ بھی دیا گیا کہ علامہ شبلی کی وفات کے بعد ۱۹۱۵ء میں نواب سید علی خاںؒ نے مجلس انتظامی میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ علامہ شبلی کی یادگار احاطہ دار العلوم میں قائم ہو، اور اس کی بہترین شکل یہ ہے کہ کتب خانہ کی عمارت تعمیر ہو اور اسے ان کی طرف منسوب کیا جائے، اس کی زبردست تائید علامہ سید سلیمان ندوی نے کی تھی اور تائید میں ایک بھرپور تقریر بھی کی تھی، اس موقع پر سید صباح الدین عبد الرحمٰن ناظم دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ اور مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ امیر شریعت بہار نبیرہ حضرت محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء نے تائیدی تقریر بھی فرمائی۔

افتتاح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے کیا اور جلسہ کی صدارت مولانا شاہ منت اللہ رحمانی نے کی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے آج کے اس پروگرام اور ندوہ کی ترقی کو بانیان ندوۃ العلماء کے اخلاص کا ثمرہ اور حضرت مونگیری کی دعاؤں کا نتیجہ قرار دیا، اور آخر میں فرمایا:

جب تک کم سے کم ہم اور ہمارے ساتھی ہیں، ہم اپنے بزرگوں کو نہیں بھولیں گے، اور ہم اپنے اپنے درجہ کے مطابق سب کا احسان مانتے ہیں، سب کے لئے اللہ کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں، اور اس پر شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم سب کے درجہ کو دینی استطاعت کے مطابق پہچانیں اور اپنی صلاحیت وتوفیق کے مطابق ان کے لئے دعا کریں۔

کتب خانہ کی سہ منزلہ عمارت کے افتتاح کے بعد اسی روز پھر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی جدید عمارت کا افتتاح بھی حضرت مولاناؒ کے ہاتھوں انجام پایا، اس تقریب کی صدارت جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دارالمصنفین نے کی۔

یہ دو منزلہ عمارت ہے، پہلی منزل استقبالیہ اور دفاتر اور کتابوں کا اسٹاک رکھنے کے لئے بڑے ہال پر مشتمل ہے، اس میں مجلس کا منتشر اسٹاک جو دارالعلوم کی مختلف عمارتوں میں تھا، راتوں رات منتقل کر دیا گیا، اور اس کے مغربی جانب پریس کی گنجائش نکالی گئی، بالائی منزل میں کانفرنس ہال اور اس کے متعلقات ہیں جو تکمیل کے مراحل میں ہے مجلس کے منتظمین نے استقبالیہ میں مجلس کے مقاصد اور شائع شدہ کتابوں کا باعتبار زبان و سنہ چارٹ لگا رکھے تھے، سکریٹری مجلس کی حیثیت سے راقم السطور نے مجلس کے ۲۵ سالہ علمی وتحقیقی کارکردگی پر روشنی ڈالی، اور بتایا کہ اس ادارے سے انگریزی، عربی، اردو، گجراتی، تامل، بنگالی زبانوں میں کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اور اسلامیات کے موضوع پر انگریزی میں اس ادارے نے جو کچھ پیش کیا اور اسلامی دعوت وفکر رکھنے والی گراں قدر جو کتابیں شائع کی ہیں، اس کی نظیر دوسرے اداروں میں بہت کم ملتی ہے۔

اس کے علاوہ مولانا شمس تبریز خاں رفیق مجلس و مولانا عتیق احمد بستوی استاد دارالعلوم نے طویل مقالات پیش کیے، صدر جلسہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دارالمصنفین

نے کہا کہ:

یہ عمارت مٹی چونے اور گارے کی عمارت نہیں ہے، بلکہ ایک تاج محل ہے جس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی چودھویں کے چاند کی طرح ضیاء افشانی کر رہے ہیں۔

یہ تقریب ۲۸/فروری ۱۹۸۴ء بعد مغرب دیر تک چلی اور بہت پر اثر انداز سے چلی، اس کے علاوہ النادی العربی، جمعیۃ الاصلاح کے پروگرام بھی ہوئے، تفصیلات ''تعمیر حیات'' ۱۰ و ۲۵/ مارچ ۱۹۸۴ء کے شمارے میں ملاحظہ کریں۔

حضرت مولاناؒ کا پانچ ملکوں کا سفر اور رابطۂ ادب اسلامی عالمی کی تشکیل

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ۲۰/ رجب ۱۴۰۴ھ کو اسلامی تہذیب وتمدن اکاڈمی ''مؤسسہ آل البیت'' کے سالانہ جلسہ جو ۲۳ تا ۲۸/ رجب ۱۴۰۴ھ کو اردن کے دارالحکومت میں منعقد ہوا، شرکت کے لئے تشریف لے گئے، برادر عزیز مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ اس سفر میں ہمراہ تھے۔

اردن سے حجاز مقدس، پھر یمن، پھر حجاز مقدس واپسی اور کویت کا مختصر قیام اور واپسی میں کراچی پاکستان کا مفید دورہ اور وہاں صدر ضیاء الحق سے ملاقات، یمن میں صدر علی عبداللہ صالح سے ملاقات اور فوج میں خطاب، اردن میں امیر حسن سے ملاقات اور خطاب اہم پروگرام رہے، اردن ویمن کے خطابات کا مجموعہ ''نفحات الایمان بین صنعاء و عمان'' برادرم مولانا واضح رشید ندویؒ کے مقدمے کے ساتھ شائع ہو چکا ہے، اور اس کے ایک عرصہ کے بعد اس سفر کی تفصیلات ''اصحاب کہف کے غار سے یمن کی وادیوں میں'' کے عنوان سے سامنے آچکی ہیں۔

اس دور کی ایک خاص بات حجاز مقدس کے سفر میں مکہ مکرمہ میں رابطۂ ادب اسلامی کی تشکیل تھی جس کا سربراہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو مقرر کیا گیا، اور راقم السطور کو غائبانہ طور پر ندوۃ العلماء کے صدر دفتر کی ذمہ داری اور نائب سکریڑی مقرر کیا گیا، جس کی تفصیل ''تعمیر حیات'' سے ماخوذ ہے، جو حسب ذیل ہے:

''مکۃ المکرّمہ۔ ۹؍مئی ۱۹۸۴ء کو مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے آج عربی ادب کے ممتاز علماء کا یک وفد مکہ مکرمہ میں ملا، جہاں مولانا پانچ روز کے لئے شرق اردن سے واپسی میں عمرہ وزیارت کے لیے تشریف لائے ہوئے ہیں، یہ وفد ریاض کی امام محمد بن سعود یونیورسٹی اور مدینہ (منورہ) یونیورسٹی کے اساتذہ ڈاکٹر عبدالباسط بدر، استاد حیدر الغدیر اور ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح پر مشتمل تھا، اور یہ حضرات ریاض سے خاص اسی غرض سے مکہ مکرمہ آئے تھے، اس وفد نے مولانا کی خدمت میں رابطۂ ادب اسلامی کے اغراض ومقاصد اور اس کے آئین کا مسودہ پیش کیا اور مولانا سے درخواست کی کہ اس کی سربراہی قبول فرمائیں، اور اس رابطہ کو ایک بین الاقوامی تنظیم کی حیثیت سے قائم کئے جانے کی اجازت دیں، کئی گھنٹوں کی گفتگو اور تمام امور کا جائزہ لینے کے بعد مولانا کی منظوری سے طے پایا کہ عرب دانشوروں کی ایک کمیٹی بنادی جائے اور مراکش والجزائر سے لے کر خلیج کی ریاستوں کے ادباء اور اہل قلم کو شرکت ورکنیت کی دعوت دی جائے، اور آئندہ سال شوال ۱۴۰۵ھ مطابق جولائی ۱۹۸۵ء میں اس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہو، اس کا دفتر ندوۃ العلماء ہی میں رہے گا، اور مولانا محمد رابع حسنی ندوی پرنسپل کلیۃ اللغۃ العربیہ اس کے جنرل سکریڑی ہوں گے، اس کمیٹی میں ۵ نکاتی اغراض ومقاصد اور ۱۸ اصفحات پر مشتمل لائحۂ عمل منظور کیا گیا''۔

یہ دعوت دراصل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے آج سے برسہا برس پہلے عربی ادب کے علماء کی خدمت میں پیش کی تھی کہ عربی ادبیات کا از سرنو جائزہ لیا جائے اور اسلامی ادب کو ممتاز کر کے پیش کیا جائے، چنانچہ آپ نے اسی مقصد سے ''مختارات'' کے نام سے عربی نثر کے نمونے جمع کئے تھے، جس کو عربی ممالک میں بھی قبول کیا گیا، اور ابتدائی ومتوسط تعلیم کے لیے آپ نے عربی کی ابتدائی ریڈرس تالیف کیں، جو ہندوستان کے علاوہ ممالک مصر وشام اور حجاز میں بھی خوب مقبول ہیں۔

۱۹۵۷ء میں جب آپ کو دمشق کی مشہور علمی اکاڈمی المجمع العلمی کا ممبر منتخب کیا گیا، تو وہاں کی روایات کی پابندی میں آپ کو ایک مقالہ دینا تھا چنانچہ اس مقالہ کا عنوان بھی یہی تھا، واضح رہے کہ یہ مقالہ ''مختارات'' کے جدید ایڈیشن میں مقدمہ بنادیا گیا ہے۔

دار العلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ کا تعلیمی اجلاس

شمالی بہار کی مشہور عربی واسلامی درسگاہ دار العلوم احمدیہ سلفیہ کے زیر اہتمام جلسۂ مذاکرہ علمیہ کا پچیسواں اجلاس ۲۴، ۲۵، ۲۶ / مارچ ۱۹۸۴ء میں مشہور عالم دین ومحقق شیخ عبد الصمد شرف الدین کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں ملک کے متعدد ممتاز علمائے کرام نے شرکت فرمائی، یہ ایک قدیم دینی تعلیمی مدرسہ ہے جو ممتاز اہل حدیث عالم مولانا ابو محمد ابراہیم آروی نے قائم کیا تھا جو حضرت سید احمد شہید کے سلسلہ کے بزرگ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نانا حضرت شاہ ضیاء النبی حسنی کے تربیت یافتہ اور خلیفہ تھے، ان کی نسبت سے حضرت مولانا اور ان کے رفقاء نے شرکت فرمائی اور ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۳ء تک فارغ ہونے والے فارغین کی دستار بندی فرمائی اور حضرت مولانا کے ہاتھوں ہی مسجد کی تعمیر جدید اور توسیع کے لئے سنگ بنیاد رکھا گیا۔

حضرت مولاناؒ نے اس موقع پر فارغ ہونے والے علماء کو جو خصوصی خطاب فرمایا، اس کا مرکزی عنوان تھا کہ آج آپ حضرت سید احمد شہید کی دعوت کے امین بنائے جا رہے ہیں، اور فرمایا کہ حضرت سید صاحب کی تحریک چار چیزوں کی جامع تھی:

۱۔ توحید خالص (الا للہ الدین الخالص)

۲۔ اتباع سنت

۳ نسبت مع اللہ، دوام ذکر اور خدا کے ساتھ ہر وقت تعلق

۴۔ اعلاء کلمۃ اللہ جو اگر کبھی جہاد بالسیف کا تقاضا کرے، تو جہاد بالسیف، جہاد وقتال میں جو نسبت ہے عموم وخصوص کی، وہ اہل علم جانتے ہیں، قتال اخص ہے جہاد سے، اور جہاد کبھی کبھی قتال کی نوع میں ظاہر ہوتا ہے، وہی اس وقت افضل جہاد ہوتا ہے، لیکن جہاد اس سے وسیع ہے، وہ بغیر سیف کے بھی ہوتا ہے، اور مدتوں ہوتا رہتا ہے، یہ سب جہاد میں شمار ہوتا ہے۔

غرض ان چار چیزوں کا حضرت سید احمد شہید کی تحریک وجماعت مجموعہ تھی،

اللہ سے ایک طرح تعلق اور عمومی ولایت تو ہر مسلمان کو حاصل ہے جیسا کہ محققین وعارفین کہتے ہیں، کہ ہر مسلمان کو ولایت عامہ حاصل ہے، لیکن اللہ کے ساتھ خصوصی ولایت اور اس کے ساتھ محبت جیسے قرآن میں کہا گیا ﴿ویحبھم ویحبونہ، رضی اللہ عنھم ورضوا عنه﴾ اور ﴿ والذین آمنوا أشد حبا للہ ﴾ یہ حضرت سید احمد شہید کی جماعت کا شیوہ تھی، اسی جماعت سے حضرت مولانا محمد ابراہیم آروی کو نسبت حاصل ہوئی۔

مولانا ابراہیم آروی کے رائے بریلی کے قیام اور اپنے پرنانا مولانا سید سعید الدین صاحب (جو کاتب تحریر کے دادا کے دادا تھے) کے مظفر پور بہار کے قیام کے تعلق سے کہا کہ:

"حضرت مولانا ابو محمد ابراہیم آروی کا ہمارے خاندان سے بڑا تعلق رہا، ہمارے جد مادری حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ کے آخری بزرگوں میں سے صاحب نسبت وصاحب باطن تھے، ان کے پاس وہ آیا کرتے تھے اور خود میرے خاندان میں جو انقلاب آیا، وہ حضرت مولانا ابراہیم کی تقریر سے آیا، میری والدہ سناتی تھیں کہ ہمارے خاندان میں جدید تعلیم کا رواج ہوگیا تھا، میرا ددیہال الحمدللہ مولویوں کا خاندان ہے، اور اس میں جائداد وزمین نہ ہونے کے برابر ہے، لیکن میرے نانیہال کا بڑے زمینداروں میں شمار ہوتا ہے، اگرچہ بزرگوں کے اثرات چلے آرہے ہیں، لیکن پھر بھی ہر چیز ایک ایک اثر رکھتی ہے، اذا ثبت الشی ثبت بلوازمہ، زمینداری آئی اور بڑی زمینداری آئی، اس زمینداری کا شجرہ نسب بھی بہار سے اور آپ ہی کے قریبی ضلع مظفر پور سے ملتا ہے، میرے جد مادری میری والدہ کے حقیقی دادا مولوی سید سعید الدین رائے بریلوی جو حضرت سید صاحب سے بیعت کا تعلق رکھتے تھے، وہ یہاں رہے، احتیاط کے ساتھ وکالت یہاں کی، جو اس زمانہ میں ممکن تھی پھر اس سے جائیداد پیدا کی، اسی سے ہمارا نانیہال صاحب جائیداد ہوا، پھر مولانا ابراہیم آروی کی تقریروں سے اس کا اثر کم ہوا۔

اور تقریر کا اختتام اس پر فرمایا کہ:

''میں اسی طرح آپ سے خطاب کررہا ہوں جس طرح اپنے ندوہ کے طلبہ سے خطاب کرتا ہوں، اور دار العلوم دیوبند کے طلبہ سے خطاب کرتا ہوں، جامعہ رحمانی کے

طلبہ سے خطاب کرتا ہوں، صاف سن لیجئے اور یاد کر لیجیے کہ آپ کے لیے کام کام کا میدان یہ ہندوستان ہے، صرف مسلمانوں میں ہی نہیں غیر مسلموں میں بھی کام کیجئے اور اسلام کا صحیح تعارف کرائیے، رسوم و بدعات، جہیز تلک وغیرہ اور دوسرے مظالم کو چھڑائیے، اچھا سماج قائم کیجئے، دیکھئے کیسی کیسی اللہ کی رحمتیں نازل ہوں گی''۔

خوش آئند الفاظ موجودہ تمدن کا فریب

اچھے الفاظ و تعبیرات و اصطلاحات سے متأثر کر کے لوگوں کو فریب دینے کا عمل آج کے قائدین، لیڈران اور حکام کا شیوہ بن گیا ہے، ضرورت سمجھی گئی کہ اس تعلق سے کچھ لکھا جائے، عربی کے اس مضمون کا ترجمہ ''تعمیر حیات'' شمارہ ۲۵ راگست ۱۹۸۴ء میں ہی شائع ہوا، جس میں بتایا گیا تھا کہ:

''سب سے بڑا فریب جس سے آج دنیا کا واسطہ ہے اور جسے اس کا سب سے بڑا خسارہ کہنا چاہئے، وہ آج کے قائدین'' لیڈروں اور حکام کا اپنے سیدھے سادھے جمہور اور عقیدت مند عوام کو ذرائع ابلاغ اور صحافت کی مدد سے نفسیاتی اثر ڈالنے والی اصطلاحات کے ذریعہ فریب میں مبتلا کرنا ہے، جسے غلامی کی زندگی گزارنے والوں کے لئے حریت اور آزادی کے الفاظ، ظلم و زیادتی سے دوچار افراد کے لئے امن و سلامتی کے کلمات اور طاقتور پارٹیوں اور حاکم طبقہ کے ظلم اور دباؤ کے شکار لوگوں کے لئے جمہوریت کا نام لیا جاتا ہے، موجودہ تہذیب کے داعی اور قائدین، ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ان کلمات اور اصطلاحات کا بار بار ذکر کرتے ہیں، اور حق و ناحق کا لحاظ کئے بغیر اپنے اغراض و خواہشات کے مطابق مختلف طریقوں سے ان کا استعمال کرتے ہیں، وہ درحقیقت عوام کے ذہنوں پر ان اصطلاحات کے اثر کا غلط فائدہ اٹھاتے ہیں، اس بارے میں عوام کا مزاج بچوں کا سا ہے، کہ آپ ان سے دو چار آنے کی مٹھائی کا وعدہ کر کے ایک بڑی رقم اینٹھ سکتے ہیں یا گیند یا اس جیسا کوئی معمولی کھلونا دکھا کر کوئی بھی قیمتی چیز حاصل کر سکتے ہیں، اہل سیاست اور نام نہاد قائدین عوام کی اس نفسیاتی کمزوری سے خوب واقف ہیں، اسی لئے اس سے غلط

فائدہ اٹھاتے ہیں، اور کچھ میٹھے بول اور تسلی بخش اصطلاحات کے ذریعہ عوام کے جذبات کو بھڑکاتے ہیں، اوران کے تأثرات سے فائدہ اٹھاتے ہیں چہ جائیکہ اس کے پیچھے کوئی عملی اقدام ہو، اس طور پر وہ سچ وجھوٹ کا خیال کیے بغیر اپنے مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں، اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ذرائع ابلاغ وصحافت سے کام لیا جاتا ہے اور یہ ذرائع ابلاغ طاقتور اور دولتمند کے ساتھ ہی رہتے ہیں، یا دھوکہ بازی کا ذریعہ بنتے ہیں، اور نقصان بے چارے عوام ہی کا ہوتا ہے اوران کو خالی ہاتھ رہنا پڑتا ہے۔

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی نئی عمارت کی تکمیل وافتتاح

۲۸ر فروری ۱۹۸۴ء دار العلوم ندوۃ العلماء میں منعقد تعلیمی مذاکرہ کے موقع پر کتب خانہ کی نئی عمارت کا افتتاح، اس اس نئی عمارت میں کتب خانہ کی منتقلی کا کام انجام پایا تھا اور ساتھ ہی مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی نئی عمارت کا بھی ایک طرح سے افتتاح ہوا تھا، اوراس کی مختصر تقریب بھی ہوئی تھی مگر ابھی وہ عمارت پوری مکمل نہ ہو پائی تھی، اس کے مکمل ہونے پر ۲۷ر ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۴ر ستمبر ۱۹۸۴ء کو اس مناسبت سے ایک اہم پروگرام منعقد ہوا جس میں مصری سفیر ڈاکٹر عمرو موسی نے شرکت کی، صدر مجلس حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے فرمایا کہ مصری سفیر کو یوں ہی ہم نے دعوت نہیں دی، یہ انتخاب سوچ سمجھ کر کیا ہے، جس کے پس پردہ مختلف سیاسی، ثقافتی اور دینی اسباب کارفرما ہیں، ایک تو مصر ہر زمانہ میں فکر اسلامی اور دینی وعلمی موضوعات پر صحت مند وتعمیری لٹریچر تیار کرتا رہا ہے، اور دوسرے یہ کہ ہندوستان اور مصر کا برابر اچھا ثقافتی وعلمی تبادلہ ہوتا رہا ہے، تیسرے یہ کہ مصر کا خمیر اسلامی ہے، اس کا جوہر اسلامی ہے، یہاں سے زبردست اسلامی تحریکیں اٹھی ہیں، وہاں کے ادیبوں کی کتابیں بھی ہم نے پڑھی ہیں، ان سے زبان، اسلوب واسٹائیل سیکھا ہے، اس طرح ہم اس کے فرزند ہیں، دوسری طرف سفیر نے بھی جواب میں اپنے تعلق کا اظہار کیا، اور صحیح فکر ولٹریچر کی افادیت بڑھانے کے لئے جدید وسائل وٹکنالوجی سے بھی استفادہ کی طرح توجہ دلائی، مجلس کے سکریٹری کی حیثیت سے راقم السطور نے تمہیدی

گفتگو کی اور مجلس کے تعارف، اس کی اہمیت وافادیت اور متعدد زبانوں میں مختلف اسلامی موضوعات پر اس کے تیار کردہ ٹھوس ومفید لٹریچر پر عربی میں ایک مقالہ پیش کیا، جس میں مغربی تہذیب کی پیدا کردہ جدید مسائل اور اس سلسلہ میں اکاڈمی کی خدمات پر روشنی ڈالی، اس کا انگریزی ترجمہ سید غلام محی الدین صاحب نے پیش کیا۔

پروگرام میں لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر آر ایس مشرا اور دوسرے پروفیسران اور اسکالر و دانشوران بھی شریک تھے۔

وزیر اعظم ہند کا حادثۂ قتل: اسباب ومحرکات

ماہ اکتوبر ۱۹۸۴ء کے آخری دن ہندوستان ایک المناک حادثہ سے گذرا کہ اس کی وزیر اعظم کو ان کے محافظوں نے ہی قتل کر دیا۔

مسز اندرا گاندھی جو جواہر لال نہرو کی بیٹی تھیں اور وراثت میں انہیں سیاست ملی تھی، پہلی بار ۱۹۶۶ء میں برسر اقتدار آئیں، اور بعض اقدامات کی وجہ سے جس میں ایمرجنسی کے نفاذ اور نس بندی پر اصرار کا عمل خاص سبب تھا، انہیں ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں شکست اٹھانی پڑی تھی مگر ۱۹۸۰ء کے انتخابات میں پھر وہ اقتدار میں اکثریت کے ساتھ آگئیں، مگر پوری مدت مکمل کرنے سے پہلے وہ ۳۱؍ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو قتل کر دی گئیں، جس سے پورے ملک میں بڑی ہیجانی کیفیت پیدا ہوئی، اور قتل وخون کا بازار گرم ہوا۔

مسز اندرا گاندھی کو اپنی وزارت عظمی کے دوران ہندوستانی سیاست کے ایسے سرد وگرم حالات سے گذرنا پڑا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد کسی شخصیت کو ایسا نہیں پیش آیا تھا، وہ وطن میں ایک طرف مقبولیت کی چوٹی پر پہونچیں تو پھر یہیں نامقبولیت کا بھی شکار ہوئیں، حکومت کے معاملات میں ان کو ایسے پیچیدہ اور رنگا رنگ مسائل کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کا حل بظاہر ان کے قابو سے باہر معلوم ہونے لگا، آسام کا مسئلہ کئی سال سے جوں کا توں تھا، مگر وہاں ہونے والے سخت فرقہ وارانہ کشت وخون سے وہ اور خراب ہو گیا، پھر پنجاب کی بدامنی اور خوں ریزی نے علیحدہ سخت اور پیچیدہ مسئلہ پیدا کر دیا، ہندوستان کے متعدد شہری اور دور دراز کے

صوبے مرکزی دباؤ سے نکلنے پر کمر بستہ ہوئے، سیاسی مبصرین حیران تھے کہ مسز اندرا گاندھی کی سیاسی فراست اور حکومتی تجربہ کاری کیا حل نکالے گی کہ ان کی زندگی کی کتاب ان ہی کے حفاظتی عملہ کے دو سکھ ارکان کے بے درد ہاتھوں نے بند کردی، اور اندرا گاندھی دنیا کی بے ثباتی اور قدرت کی بے نیازی کا نشانہ بن گئیں، اندرا گاندھی کے سیاسی اثرات اور شہرت صرف ہندوستان ہی تک محدود نہ رہی تھی، بلکہ دنیا کے مختلف ممالک سے ان کے قریبی روابط ہو گئے تھے، کچھ ملکوں کو اندیشے تھے، اور کچھ کو توقعات، دنیا کی دو بڑی طاقتیں بھی ان کی اہمیت تسلیم کرنے لگی تھیں، مشرقی طاقت یعنی روس سے بھی ان کے قریبی روابط تھے، بین الاقوامی مسائل میں ان کا رجحان روس کی طرف ہوتا تھا، اور جنوبی ایشیا کے منطقہ میں روس کو اپنی مرضی کے چلانے میں ہندوستان سے مدد ملتی تھی، اس کی وجہ سے امریکہ سے روابط رکھنے والے ممالک کو پریشانی لاحق ہوتی تھی، جس کے اثرات ہندوستان اور اس کے پڑوسی ملکوں کے درمیان اٹھنے والے مسائل میں برابر نظر آتے تھے، مسز اندرا گاندھی نے اپنے دور اقتدار میں ملک کے اندر و باہر جس حد تک مقبولیت حاصل کرلی تھی، اس کو ملک کا کوئی دوسرا قومی لیڈر نہیں پہونچ سکا، سیاسی زندگی میں بھی وہ دوسرے تمام سیاسی لیڈروں پر فائق ثابت ہوئیں، انہوں نے تنہا تمام لیڈروں کو ناکام بنا رکھا تھا، اور وہ سب ان کو اپنی کامیابی کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے، اور ان کی شکست کے لئے کامیاب تدابیر کی فکر میں رہتے تھے، مسلمانوں کو جس پیچیدہ صورت حال سے سامنا تھا، وہ یہ تھی کہ ایک طرف تو یہ دیکھتے تھے کہ اندرا گاندھی سیکولرزم کے دستوری حوالہ سے ان کی سب زیادہ مدد کا وعدہ کرتی ہیں جبکہ ملک کی دوسری پارٹیوں کا حال یہ نہیں ہے، اور متعدد متعصب ہندو جماعتوں کا حال اور زیادہ خراب ہے، اور یہ بات بھی سامنے تھی کہ دعدوں کا ایفاء جیسا ہونا چاہئے وہ نہیں ہے، اور پھر ایسی صورت حال سامنے آتی رہتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے ملی تشخص اور سیاسی تحفظ کا خطرہ درپیش ہوجاتا ہے، اس سے مسلمانوں میں بددلی پیدا ہونے لگی، ادھر سکھ اقلیت کی بے چینی اور تشدد نے صورت حال میں مزید ابتری پیدا کردی، ان حالات میں اچانک وزیر اعظم کے قتل کا حادثہ پیش آیا، مگر وہ جس دردناکی سے قتل کی گئیں اس سے ان کے مخالفین نے بھی درد محسوس کیا، اور عام ہمدردی کے جذبات پیدا ہوگئے، اور ملک کو دنیا کے ملکوں میں اونچا مقام

دلانے کی کوشش میں ان کے کردار کی تعریف کی جانے لگی اور ان کے قاتلوں کو ملک دشمن کے طور سے دیکھا جانے لگا اور ان کا جس کمیونٹی سے تعلق تھا ان کے خلاف بھی غم وغصہ اس حد تک پھیلا کہ لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا، جس کا پورے ملک میں اثر تھا، دارالحکومت دہلی میں سب سے زیادہ اثر ظاہر ہوا، اور قتل وغارت گری کی ایسی صورت حال سامنے آئی جس نے تقسیم ملک ۱۹۴۷ء کے واقعات کی یاد تازہ کردی، جب ان لوگوں نے مسلمانوں کے خلاف ایسا غصہ کا اظہار کیا تھا آج انہیں کسی سبب سے سہی ان حالات سے گزرنا پڑا جو ایک عبرتناک پہلو ہے جس سے سب کو عبرت حاصل کرنی چاہئے، ہمدردی کے جذبات کا یہ انداز بہت نامناسب ناپسندیدہ سمجھا گیا، جس سے یہ پیغام گیا کہ ملک نے جو ترقی کی ہو مگر ملک کی تربیت کا کام نہیں ہوا۔

خمینی اور اسلام کے نام پر ایران میں انقلاب: اسباب ونتائج

اقتصادی اور سیاسی نظام پر جب سے سامراج کا قبضہ ہے، وہ عوام کے جذبات کو دیکھ کر ان نعروں کا استعمال کرتے ہیں جس سے جمہوری نظام میں ووٹ کا فائدہ اور شرعی نظام میں فرد کی تبدیلی سے فائدہ ہو اور ایسے شخص کو لایا جائے جو ظاہر میں ان کا مخالف نظر آئے، اور اندر سے ان کے مفادات کا محافظ ہو، اسلامی ملکوں میں شاہی اور فوجی حکومتوں میں ان کا یہ عمل بہت پہلے سے جاری ہے، اور جو صاحب اقتدار ان کے مفادات کا محافظ ہوتا ہے اس کے ساتھ ان کی میڈیا، ورلڈ بینک، مذہبی کونسل، سبھی ساتھ رہتے ہیں، عراق، تیونس، لیبیا، الجزائر، مصر، شام، سب جگہ انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا اور اگر صحیح اسلام پسند اور مسلم عوام مفاد کے محافظ لوگ برسراقتدار آبھی گئے تو زیادہ دن انہیں رہنے نہیں دیا گیا، ایران میں بہت سے سیاسی اور اقتصادی مفادات ایسے تھے جس کی وجہ سے ایران پر اپنا اقتدار جمانے کے لیے ایسی طاقت کو برسراقتدار لانا چاہتے تھے جو اندر سے ان کا ساتھ دے اور باہر سے ان کی مخالفت کرے، تاکہ اس طرح ان کا مخالف سمجھ کر عوام کے جذبات حاصل کیئے جاسکیں، ایران میں خمینی صاحب کی مذہبی مقبولیت دیکھ کر ان کو آگے بڑھانے کا کام کیا گیا، اور ان سے ایسے نعرے لگوائے گئے جو ان کے ملک کے عوام کو خوش کرنے

والے ہی نہ ہوں، بلکہ دنیا کے مسلمان جو صحیح حقائق سے واقف نہیں ہیں ان کو بھی خوش کرنے والے ہوں، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے اثرات بہت دور تک پھیلے اور اس کی وجہ سے شیعی افکار کو بھی رواج ہوا اور اس کی قباحت دلوں سے نکلنے لگی، اور صحابہ کی عظمت کا احساس بھی جاتا رہا جو دین کے اولین محافظ ہیں اور ان کی عدالت وعظمت کے متاثر ہونے سے دین پر اعتماد کم ہوتا اور کتاب وسنت سے تعلق کمزور ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے علماء نے اس ضرورت کا احساس کیا کہ ایسا لٹریچر بھی سامنے آئے جس سے ان نعروں کے کھوکھلے پن اور فریب کو واضح کرنے کے ساتھ نئی نسل کے لئے دین پر اعتماد اور کتاب وسنت سے تعلق کو مضبوط کیا جاسکے۔ اس سلسلہ میں دو اہم کتابیں ہمارے حلقہ سے سامنے آئیں۔ ایک ذرا تفصیلی وتحقیقی اور تجرباتی تھی جو حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے ''ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت'' کے نام سے نکلی اور اس کے کسی غلط عقیدہ اور دعوے پر سکوت جائز نہیں سمجھا، چہ جائیکہ مسلمانوں کے دنیاوی منافع اور اختلاف وتفریق سے بچنے کی لالچ میں قبول کر لیتے یا ہمنوائی کرتے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''حقیقت میں اسلام کی حقیقی تعلیم اور صحیح عقیدہ وہ دریا ہے جو کبھی اپنا رُخ نہیں بدلتا اور کبھی پایاب نہیں ہوسکتا، سیاسی طاقتیں، وقتی انقلابات، حکومتوں کا قیام وزوال اور دعوتیں اور تحریکیں موجیں ہیں جو آتی اور گزر جاتی ہیں، دریا اگر صحیح رُخ پر بہہ رہا ہے اور آب جاری ہے تو کوئی خطرہ نہیں، لیکن اگر عقیدہ میں خرابی آگئی تو گویا دریا نے اپنا رُخ بدل دیا اور اس میں آب صافی کے بجائے گندلا اور ناصاف پانی بہنے لگا، اس لیے فساد عقیدہ اور زیغ وضلال کے ساتھ کوئی دعوت وتحریک کسی ملک کا عروج واقبال، کسی معاشرہ کی جزئی اصلاح یا کسی فساد یا خرابی کو دور کرنے کا دعویٰ یا وعدہ قبول نہیں کیا جاسکتا، یہ وہ حقیقت ہے جس میں اس ملّت کی بقا اور دین کی حفاظت کا راز مضمر ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو اپنے اپنے دور کے علماء، خادمین دین اور محافظین شریعت وسنت کو اس دشوار اور بعض اوقات ناخوشگوار فرض کو ادا کرنے پر مجبور کرتی رہی ہے۔'' (از مقدمہ کتاب، صفحہ ۱۵)

اس کے بعد اس موضوع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ''دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں'' کے نام سے اردو میں ایک کتاب تصنیف کی جو ۱۹۸۵ء کے اوائل میں شائع ہوئی، عربی میں اس کا ترجمہ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی نے ''صورتان متضادتان'' کے نام سے کیا اور عالم عربی میں اسے بڑی شہرت اور مقبولیت ملی اور وہ صحیح تصویر سامنے آئی جو لوگوں کی نظروں سے دھندلی تھی، بہت سے دینی اداروں اور تنظیموں نے یہ بڑی خدمت سمجھ کر اس کتاب کو بہت عام کیا اور مختلف دارالاشاعت سے اس کے بڑے ایڈیشن نکلے اور متعدد مغربی زبانوں میں متعدد مقامات سے اس کے ترجمے شائع ہوئے۔ کتاب کے مقدمہ سے ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

''بہت سے حلقوں میں مدح وذم اور تعریف وتنقید کا معیار کتاب وسنت، اسوۂ سلف اور عقائد اور مسلک کی صحت نہیں رہا، بلکہ اسلام کے نام مطلق حکومت کا قیام، طاقت کا حصول، کسی مغربی طاقت کو للکار دینا، اس کے لیے مشکلات پیدا کر دینا، اس کو محبوب و مثالی قائد بنا دینے کے لیے کافی ہے، عقیدہ کی اہمیت ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل میں خطرناک حد تک کم ہوتی جا رہی ہے، اور یہ بڑی تشویش انگیز اور قابل فکر بات ہے، انبیاء اور غیر انبیاء کی دعوتوں میں اور ان کی جدوجہد کے مقاصد اور محرّکات میں سب سے بڑی حد فاصل یہی عقیدہ ہے جس پر وہ کسی سمجھوتہ اور اونے پونے سودا کر لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے، ان کے یہاں رد و قبول، پسندیدگی ناپسندیدگی کا معیار اور وصل وفصل کی شرط ہی عقیدہ ہوتا ہے، یہ دین جو مسلمانوں کی ساری کمزوریوں کے باوجود اپنی اصل شکل پر اس وقت تک موجود ہے، وہ اسی عقیدہ کے معاملہ میں صلابت و استقامت اور حمیت وغیرت کا رہین منت ہے، دین کے شارحین ومحافظین نے اس سلسلہ میں کسی باجبروت طاقت اور کسی وسیع سے وسیع تر بادشاہی کے سامنے سپر نہیں ڈالی، اور اس کے کسی غلط عقیدے اور دعوے پر سکوت جائز نہیں سمجھا''۔

سیرت النبیؐ پر حضرت مولاناؒ کو صدر ضیاء الحق کی طرف سے ایوارڈ کا اعلان

پاکستانی ریڈیو اور اخبارات سے اطلاع ملی کہ گذشتہ مہینہ اسلام آباد (پاکستان)

میں منعقد ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں سیرت النبیؐ پر کام کرنے والے ممتاز اہل قلم ومفکرین کے لئے صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے چند انعامات کا اعلان کیا، اسی سلسلہ میں علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت النبی جلد ہفتم پر مقدمہ نگاری اور اس کی اشاعت سے دلچسپی کی بنا پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے لئے بھی ایک لاکھ روپے کے انعام کا اعلان کیا، سیرت النبی جلد ہفتم سیرت النبی کے سلسلہ کی آخری جلد ہے، جو علامہ سید سلیمان ندی کی تصنیف ہے، اس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مبسوط مقدمہ شامل ہے، اسی جلد میں علامہ سید سلیمان ندوی نے اسلام کے سیاسی نظام کا مفصل مطالعہ وخاکہ پیش کیا ہے، اور پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق اس سے بہت متاثر ہیں، اس سے قبل ایک تقریر میں انہوں نے قومی اسمبلی کے تمام ممبران کو اس کے مطالعہ کا مشورہ دیا تھا، اور یہ کتاب تمام ممبران کے لئے سرکاری طور پر فراہم کی گئی تھی۔

جب سرکاری طور پر مولانا کو اس کی اطلاع مل گئی، اور خود صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کا خط بھی موصول ہوا تو انہوں نے اس کو قبول کیا اور اس کی نصف رقم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی اہلیہ محترمہ کی خدمت میں اور نصف رقم دارالمصنفین اعظم گڈھ کو دیئے جانے کا اعلان کیا، کہ اس کتاب کی تمام جلدوں کا اصل ناشر دارالمصنفین اعظم گڈھ ہے۔

مدینہ طیبہ کی "نادی المدینۃ الأدبی" میں حضرت مولاناؒ کی تقریر

ماہ ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ جنوری ۱۹۸۵ء میں جب مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مکہ معظمہ میں رابطۂ عالم اسلامی کے جلسوں سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تو ہاں مدینہ طیبہ کی انجمن نادی المدینۃ الأدبی کے ذمہ داروں نے مولانا سے اپنی انجمن میں تقریر پر اصرار کیا اور پچھلے وعدہ کا بھی حوالہ دیا، مولانا نے ان کے اصرار پر تقریر منظور کی، انجمن کے نمائندوں نے تقریر کا موضوع "دور إقبال في توجيه الأدب والشعر" تجویز کیا، اور اس کے لئے شب سہ شنبہ ۲۴ ربیع الثانی ۱۶ جنوری کا اعلان کر دیا گیا، مولانا کو یہ معلوم کر کے قدرے تکلیف اور فکر ہوئی کہ تقریر مکتبہ الملک عبدالعزیز کے ہال میں ہوگی جو مسجد نبوی کے جوار میں چند قدم کے فاصلہ پر ہے، اور وقت مغرب عشاء کے درمیان کا رکھا

گیا ہے، جو مختصر اور عام طور پر مسجد کی حاضری اور تلاوت و نوافل کی مشغولیت کا ہوتا ہے، اور متعدد مقامات پر حلقات درس بھی لگتے ہیں، اس لئے اندیشہ تھا کہ اس حالت میں شاید نشست زیادہ کامیاب نہ ہو سکے، لیکن اندازہ اور اندیشہ کے خلاف نماز مغرب ختم ہوتے ہی لائبریری کا وسیع اور شاندار ہال سامعین سے بھر گیا، جن میں بڑے علماء اور اساتذہ، تعلیم یافتہ نوجوان، علوم دینیہ اور شعر و ادب دونوں سے تعلق رکھنے والے اہل ذوق موجود تھے، باہر بھی کھڑے تھے، اور تقریر میں وہ جوش و اثر تھا جس کی اس مقام و وقت کی وجہ سے زیادہ توقع نہ تھی، مسجد نبویؐ میں عشاء کی اذان سے پہلے ہی تقریر ختم ہوگئی اور لوگوں نے اطمینان کے ساتھ مسجد میں جا کر عشاء کی نماز با جماعت ادا کی۔

اس کی اہمیت یوں بھی زیادہ ہوگئی کہ سال گذشتہ متعدد جامعات کے اساتذہ، ادباء و مصنفین نے رابطۂ الادب الاسلامی کے نام سے ادب اسلامی کی ایک عمومی انجمن تشکیل کی تھی، جس کے ارکان مختلف عرب اور اسلامی ممالک کے وہ سب ادیب و اہل قلم ہو سکتے ہیں، جن کو اس مقصد سے اتفاق ہو اور اس کی صدارت کے لئے انجمن کی تشکیل کرنے والوں نے مولانا کا انتخاب کیا تھا، اور اس کا دستور ساز جلسہ دو چار دن میں سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں ہونے والا تھا، تقریر میں اس مجلس کی ترجمانی اور نمائندگی بھی تھی، اور رابطۂ ادب اسلامی کے لئے یہ ایک نیک فال تھا کہ مدینہ طیبہ کی عطر بیز ہواؤں سے ادب اسلامی کی کشتی کی ناخدائی ہوئی، جس کی تاسیس مکہ مکرمہ کی بابرکت اور پرانوار فضا میں ہوئی تھی، فللہ الحمد و الفضل و الشکر۔

شیخ عبدالعزیز الرفاعی کے مکان پر ادب اسلامی کا ایک جلسہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی میٹنگ میں شرکت کے لئے اور بعض دوسری مناسبتوں سے سال میں دو یا تین بار حجاز مقدس کے سفر پر جایا کرتے تھے، اور ریاض کا بھی پروگرام بن جاتا تھا کہ وہ مملکت کا دارالسلطنت ہے، مئی ۱۹۸۴ء میں مکہ مکرمہ میں ایک نشست میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی زیر

صدارت عالمی رابطۂ ادب اسلامی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا، رواں سال جنوری ۱۹۸۵ء میں حضرت مولانا کا پھر سفر ہوا جو رابطۂ عالم اسلامی کی مجلس تاسیسی میں شرکت کا تھا، تو ریاض کے ممتاز ومشہور ادیب ومصنف شیخ عبد العزیز الرفاعی نے اپنے گھر پر جمعرات کو منعقد ہونے والی ادبی مجلس میں مولانا کو مدعو کیا، اور ادب اسلامی پر اظہار خیال کی دعوت دی، شیخ رفاعی ریاض کے معززین میں سے صاحب ذوق ادیب وناقد اور مصنف ہیں، سعودی حکومت کی مرکزی کابینہ کے سکریٹری رہ چکے ہیں، متعدد ادبی وثقافتی کمیٹیوں اور اداروں کے مشیر ہیں، ہر جمعرات کی شام کو ان کے گھر پر منعقد ہونے والی ادبی وعلمی مجلس میں ممتاز ادباء وشعراء اور اہل علم شریک ہوتے ہیں، یہ سلسلہ ۲۵، ۲۶ر سالوں سے جاری ہے، اور پورے عالم عربی میں مشہور ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اس مجلس میں ادب اسلامی کے مقاصد واضح کیے اور اس کی ضرورت واہمیت بتلائی۔

رابطۂ ادب اسلامی عالمی کی ریاض میں اہم اور پہلی تاسیسی میٹنگ

پھر جمعہ ۱۸ر جنوری ۱۹۸۵ء کو رابطۂ ادب اسلامی کی مجلس تاسیسی کی نشست حضرت مولانا کی صدارت میں منعقد ہوئی، جس میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت الباشا صدر شعبۂ عربی ادب امام محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض نائب صدر رابطۂ ادب اسلامی عالمی اور ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح پروفیسر امام محمد بن سعود یونیورسٹی، استاد احمد براء الامیری ریڈر امام محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض، استاد حیدر الغدیر اور دیگر اہم اشخاص شریک ہوئے اور مختلف امور پر غور وخوض کے بعد حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں۔

۱۔ اب فروری ۱۹۸۶ء میں رابطۂ ادب اسلامی کا عام اجلاس منعقد ہو۔

۲۔ رابطۂ ادب اسلامی کے منشور اور اس کے اغراض ومقاصد کی اشاعت کا فیصلہ کیا گیا کہ اس کے صدر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک پریس کانفرنس کو خطاب کریں گے جس میں مقامی اخبارات کے علاوہ عرب اخبارات کے نمائندوں کو دعوت دیں۔

۳۔ رابطۂ ادب اسلامی کے لائحہ عمل پر غور وخوض اور ترمیمات کے بعد آخری

شکل دی گئی۔

۴۔طے پایا کہ تاسیسی ارکان میں سے ادب اسلامی کے سلسلہ میں علمی و تحقیقی مقالات مرتب کرنے کے لئے کہاجائے تاکہ رسائل واخبارات میں شائع کیا جاسکے۔اس سلسلہ میں صدر محترم سے گذارش کی گئی کہ ہندوستان میں اسلامی ادب اور اسلامی ادیبوں سے متعلق مضامین لکھوا کر بھجوائیں جو عربی اخبارات ورسائل میں شائع ہوسکیں۔

۵۔فیصلہ کیا گیا کہ جن ادباء اور نقادوں کے نام ادب اسلامی کی ممبری کے لئے تجویز ہوئے ہیں اور جن میں ادبی، علمی و تحقیقی مقالات کی صلاحیت ہے، ان سے ادب اسلامی سے متعلق مختلف موضوعات پر مقالات تیار کروائے جائیں، خاص طور پر حسب ذیل موضوعات پر:

ا۔اسلامی تنقید کے بنیادی اصول

ب۔ادب اسلامی کے بنیادی نظریات کے تحت کہانیاں اور افسانوں کے خدوخال۔

ج۔ادب اسلامی کے بنیادی نظریات کے تحت ڈراموں کی شکلیں۔

د۔ادب اسلامی کے بنیادی نظریات کے تحت سیرت ادیب کے بنیادی اوصاف۔

یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ادب اسلامی سے متعلق اہم عربی مقالات کے اردو اور دوسری زبانوں میں، اسی طرح اردو مقالات کے عربی میں ترجمہ کرائے جائیں۔

۶۔رابطۂ ادب اسلامی کے ممبران کی فیس ممبری مختلف ممالک کے سکوں میں طے کی گئی۔

۷۔رابطہ کے مجوزہ عام اجلاس سے قبل رابطۂ ادب اسلامی کے خرچ پر کچھ مقالات اور کتابوں کی اشاعت کا فیصلہ کیا گیا، اور طے پایا کہ جو کتابیں رابطہ کی طرف سے شائع ہوں یا جن پر یہ لکھا جائے کہ مؤلف رابطۂ ادب اسلامی کے ممبر ہیں، ان کی کتابوں کی اشاعت سے قبل نشر واشاعت سے متعلق کمیٹی کو پیش کرنا ضروری ہوگا۔

رابطۂ ادب اسلامی کے سکریٹری کی طرف سے ایک اعلان شائع کیا گیا کہ

اس کی مرکزی کمیٹی پوری دنیا کے مسلمان ادیبوں کو جن میں اسلامی غیرت ہے، اور جنھیں مسلمان نسلوں کے ذہن وافکار کی فکر ہے، ہم رابطۂ ادب اسلام کے قیام کی خوشخبری دے رہے ہیں اوراس کی سرگرمیوں میں شرکت، اس خواب کو حقیقت بنانے اور بامقصد ادب کی تخلیق کے ذریعہ اس کے اغراض ومقاصد کو بروئے کار لانے کی دعوت دیتے ہیں، تاکہ ادب اسلامی کے نظریہ کو واضح اور عملی شکل میں پیش کیا جائے، اور انحراف پسند ادب کے مقابلہ میں ایک مؤثر اور طاقتور ادبی تحریک کی شکل دی جاسکے۔

اس ادارہ کا قیام تمام مسلمان ادیبوں کی ذمہ داریاں یاد دلاتا ہے، جنھیں اللہ تعالیٰ نے خدمت حق کی ذمہ داری اور کلمہ کی امانت سپرد کی ہے اور ذہنوں وافکار کی تربیت واصلاح کی صلاحیت بخشی ہے۔

رائے بریلی میں مولانا محمد ثانی حسنی میموریل لائبریری کا افتتاح

۱۵ رفروری ۱۹۸۵ء کو شہر رائے بریلی کے وسط میں کہاروں کے اڈہ جواب مولانا علی میاں چوک کے نام سے معروف ہے، ایک مکان پر مولانا محمد ثانی حسنی میموریل لائبریری کی افتتاحی تقریب ہوئی، اس تقریب کی صدارت کی ذمہ داری راقم السطور کو سپرد کی گئی تھی، اس پروگرام میں اہم شخصیات نے شرکت فرمائی اور خطاب فرمایا، جن میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے علاوہ مولانا عبدالکریم پاریکھ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے ملک میں ایک صحت مند معاشرہ کے لئے معیاری کتابوں کے بہتر انتخاب پر زور دیتے ہوئے اخباروں اور ذرائع ابلاغ پر بھی زور دیا کہ ملک سے سچی محبت کا ماحول بنانے اور دانشور طبقہ کو کرپشن کی لعنت سے بچانے کے لئے ایک ملک گیر طوفانی تحریک چلانے میں لگ جائیں، اور فرمایا کہ جہاں اس مہم کی ضرورت ہے وہیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ معیاری کتب خانے ہوں اور کتابوں کا بہتر انتخاب کیا جائے، کیوں کہ کتابوں کا فیض بہت بڑا فیض ہے، کتابوں سے زندگی بدلنے کی لاکھوں مثالیں ہیں، اور ایسے واقعات لوگوں کے سامنے لانا چاہئے جو

بہترین مثال بن سکیں اور فرد کو متاثر کر سکیں، اور فرمایا کہ لائبریری جس شخص کے نام سے موسوم کی گئی ہے، وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں تھی، وہ مؤرخ بھی تھے، مصنف بھی تھے، سوانح نگار بھی تھے، شاعر اور ادیب، صحافی، مبلغ اور مقرر بھی تھے، اور مجھے وہ بہت عزیز تھے، اس لئے مجھے دوہری خوشی نہیں تہری خوشی ہے، اور یہ انتخاب بہت موزوں ہے۔

جلسہ کی نظامت مولوی سید محمد حمزہ حسنی ندوی نے کی اور مولانا محمد ثانی حسنی سوسائٹی جس کے زیر انتظام یہ لائبریری قائم کی گئی، کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے مولانا امتیاز احمد ندوی نے رپورٹ پیش کی۔

مولانا محمد ثانی حسنی سوسائٹی کا قیام جون ۱۹۸۴ء میں عمل میں آیا تھا، جس کے صدر ڈاکٹر سید احمد الحسنی ندوی علیگ اور جنرل سکریٹری مولانا امتیاز احمد ندوی (مرحوم) کو بنایا گیا اور ارکان پر مشتمل سوسائٹی تشکیل دی گئی، اور راقم السطور کو بطور سرپرست ذمہ داری دی گئی، اس کے قیام کے کچھ ماہ بعد ہی جامعہ ام المؤمنین عائشہ للبنات کا قیام عمل میں آیا، اور چند ماہ بعد لائبریری کا قیام عمل میں آیا، اس کے اور بھی مقاصد ہیں جن کے لئے سوسائٹی کوشاں ہے، اس موقع پر حضرت مولانا کا خطاب ''تعمیر حیات'' ۲۵/مارچ ۱۹۸۵ء میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

انگریزی میگزین کے اجراء کے لیے ایک اپیل

ذرائع ابلاغ کی افادیت واہمیت اور اس کے اثرات خاص طور پر انگریزی میں اس کی زیادہ ضرورت محسوس کرتے ہوئے انگریزی اخبار نکالنے کی کوشش حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور جناب سید حامد سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے نہ صرف کی، بلکہ اس کے لئے بڑی تگ ودو کی، اسی ضرورت کے پیش نظر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ نے بھی ایک انگریزی مجلہ نکالنے کا ارادہ کیا اور اس کے لئے اپیل بھی جاری کی، اگرچہ اس پر عمل اس طور پر نہ ہوسکا کہ مجلس قدم اٹھاتی، ندوۃ العلماء نے یہ ذمہ داری قبول کر لی اور دی فرینگرینس آف دی ایسٹ'' نکلنا شروع ہوا جو الحمدللہ برابر جاری ہے۔

تعمیر حیات ۱۰راپریل ۱۹۸۵ء میں مجلس کے سکریڑی کی طرف سے جو اپیل جاری ہوئی وہ اس طرح تھی:

"مجلس تحقیقات ونشریات اسلام مئی ۱۹۵۹ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی صدارت میں قائم کی گئی تھی اور اس کا مقصد موجودہ زمانہ کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے تحریر کے ذریعہ اسلام کی ترجمانی کرنا ہے، مجلس معمولی حیثیت سے ترقی کر کے اب تک انگریزی، اردو، ہندی میں تقریباً دوسو کتابوں کی اشاعت کرچکی ہے، جن میں سے اکثر کتابوں کے متعدد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں، اوران کا کئی زبانوں میں ترجمہ کیا جاچکا ہے، مجلس کی مطبوعات میں اس کی انگریزی کتابوں نے عالم اسلام میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔

مجلس کافی دنوں سے انگریزی میں ایک مجلّہ شائع کرنے پر غور کررہی تھی اوراب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ فی الحال ایک سہ ماہی رسالہ شائع کیا جائے جسے بعد میں ایک ماہانہ پرچہ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے، اس رسالہ میں عمومی طور پر ایسے علمی مقالے اوراسلام کی صحیح ترجمانی کرنے والے مضامین شائع کیے جائیں گے، جو مسلمانوں اور اسلام سے دلچسپی رکھنے والے غیر مسلموں کے لئے باعث کشش ہوں گے۔

بہرحال اس کی آئندہ شکل اس پر منحصر ہوگی کہ ہمارے معاونین اور صاحب قلم حضرات اس معاملہ میں کتنا تعاون کرتے ہیں، ہم عالم اسلام کے سبھی صاحب قلم حضرات سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس رسالہ کے لئے اپنی تخلیقات ہمیں ارسال کریں تاکہ ہم اس کی ابتداء کرسکیں، اس کے ساتھ ہی اپنے ان معاونین سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ اگر وہ ہم سے متفق ہوں تو اس رسالہ کی خریداری سے متعلق ہمیں اپنی منظوری سے مطلع کریں تاکہ پہلا مجلّہ شائع ہونے کے ساتھ انہیں ارسال کیا جاسکے۔

سکریٹری مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ"

ندوۃ العلماء میں ادب اسلامی پر دوروزہ ملتقی

۱۷،۱۸/رجب المرجب ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۰/۱۱/اپریل ۱۹۸۵ء میں ندوۃ العلماء میں ادب اسلامی پر دوروزہ ملتقی (مجلس) ہوا، جس کا موضوع اسلامی ادب میں تنقید، اسلامی ادب میں قصے، اسلامی ادب میں سوانح نگاری تھا۔

اس ملتقی کی نشستوں میں زور دیا گیا کہ ادب کی تاریخ کو از سر نو ترتیب دیا جائے اور کلام ربانی، حدیث نبویؐ، اسلام کا نظریۂ کائنات اور اسلامی ادباء و ناقدوں کی تحریروں اور کلام سے تنقید کے اصول اخذ کئے جائیں، تنقید کا منہج تعمیری ہو، اور ایسے عناصر و خیالات پر خصوصی نظر رکھی جائے جو غیر اسلامی عقائد و خیالات کی طرف لے جانے والے ہوں اور ان کا ہر وقت تنقید و تبصرہ کر کے تدارک کیا جائے، اور سوانح نگاروں کا مقصد اسلام کے شاندار ماضی کی حال میں بازیابی ہونا چاہئے، اور اسلامی سورماؤں اور سپوتوں کی سوانح عمریاں اس طرح لکھی جائیں کہ ان سے جدید نسل کے افراد بالخصوص نوجوانوں کو اسلامی اقدار سے روشناس کرایا جائے، اس نشست میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ادباء اپنے افسانوں، ڈراموں اور کہانیوں کی اساس اسلامی شخصیات، واقعات اور اقدار پر رکھیں، اور ایسے مواد سے پرہیز کریں، جو غیر اسلامی طرز زندگی اختیار کرنے کی ترغیب دے، اور اخلاقی بحران پیدا کرے۔

ملتقی میں اس بات پر بھی زور گیا کہ اسلامی شخصیات اور قائدین کو قصوں اور ڈراموں میں مرکزی حیثیت اور نمایاں طور پر پیش کیا جائے، اور نیز ادبی کاوشوں کو زبان وادب کے نئے قالب اور جدید فنی خط و خال کے پیرایہ میں پیش کیا جائے۔

ملتقی میں یہ بات پر زور انداز میں کہی گئی کی ہندوستان کے ادب عربی کی تاریخ اس طرح مرتب کی جائے جیسے تاریخ اسلام کے مختلف ادوار کی تاریخ کے دوش بدوش ادب عربی کی تاریخ مرتب کی گئی۔

یہ ملتقی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی زیر صدارت منعقد ہوئی اور

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں قائم مجلس ادبیات اسلامی کے سکریٹریٹ کے زیر اہتمام ہوئی، جس میں ہندوستان کی جامعات علی گڈھ، جامعہ ملیہ، عثمانیہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڈھ، لکھنؤ یونیورسٹی، کاشف العلوم اورنگ آباد، فلاح دارین ترکیسر گجرات کی نمائندگی رہی، ایک پانچ رکنی کمیٹی تجاویز مرتب کرنے کے لئے بنائی گئی جو حسب ذیل افراد پر مشتمل تھی:

۱۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صدر

۲۔ ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقی سکریٹری

۳۔ مولانا واضح رشید ندوی رکن

۴۔ ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خان بھوپالی رکن

۵۔ مولانا عبداللہ کاپودروی رکن۔

بحیثیت سکریٹری مجلس ادبیات اسلامی راقم السطور نے ایک رپورٹ پیش کی جس کے اہم اجزاء یہ تھے۔

مجلس ادبیات اسلامی ندوۃ العلماء جس کے قیام کے چار سال ہونے پر چار سالہ کارکردگی پیش کی گئی کہ اس نے اپنی اس چار سالہ مدت میں کیا کیا کام انجام دیا۔

۱۔ادب اسلامی کے موضوع پر متعدد کتابیں زیر ترتیب واشاعت رہیں، یہ اشاعتی کام زیادہ تر عربی میں رہا۔

۲۔مجلس کے تحت ایک ذیلی شعبہ مجلس صحافت اسلامی قائم کیا، جس میں زیادہ تر اردو میں کام ہوا۔

۳۔مجلس ادب اسلامی سے متعلق اہم شخصیات کو دعوت دے کر ادبی نشستیں منعقد کی گئی۔

رپورٹ میں یہ ذکر کیا گیا کہ اپریل ۱۹۸۱ء میں ادب اسلامی کے موضوع پر ایک بین الاقوامی اجلاس ندوۃ العلماء نے منعقد کیا جس کے دو شعبے ہیں ایک عربی، دوسرا اردو اور دیگر زبانوں کا، ان کی مجالس بہت خوبی کے ساتھ انجام پائیں، اور ادب اسلامی کے موضوع پر یہ دنیا

میں کہیں بھی پہلا بین الاقوامی اجلاس قرار پایا، مقالات کی روشنی میں تجاویز وسفارشات مرتب کی گئی تھیں جن میں ایک ادب اسلامی کے مستقل سکریٹریٹ کے قیام کی تجویز تھی، جس کی بنا پر حضرت مولانا کی صدارت میں ندوۃ العلماء میں ایک سکریٹریٹ قائم ہوا، اور اس کی مجلس تشکیل پائی، الحمدللہ ادب اسلامی کے پیغام کو ایسی مقبولیت ملی کہ دوسرے ہی سال مدینہ اسلامی یونیورسٹی کی طرف سے دوسرا بین الاقوامی سمینار مدینہ منورہ میں منعقد ہوا، اور اس میں ندوۃ العلماء کی سبقت کو تسلیم کیا گیا، اور سراہا گیا اور یہ اعتراف اس کے اعلانیہ کا جزو بھی بنایا گیا۔

اس ملتقی کے انعقاد کی بابت عرض کیا گیا کہ ادب اسلامی کی یہ نشست دراصل ایک محدود سطح کی نشست ہے، لیکن اس سے ہم کو ادب اسلامی کے موضوع پر ایک عالمی مجلس مذاکرہ کے انعقاد سے تقویت حاصل کرنا ہے، یہ عالمی مجلس مذاکرہ ندوۃ العلماء میں ۱۹۸۶ء کے اوائل غالباً ماہ فروری میں منعقد ہوئی، اس کا فیصلہ مجلس ادبیات اسلامی کی انتظامیہ نے کیا جس کی تشکیل جدید چند ماہ قبل مکہ مکرمہ میں کی گئی، پھر اس مجلس انتظامی کی نشست منعقد ریاض میں اس کی توثیق ہوئی، ضرورت تھی کہ اس عالمی مجلس مذاکرہ کے انعقاد سے قبل مجلس کے صدر مقام لکھنؤ میں ایک مختصر اور محدود پیمانہ کا اجتماع کیا جائے، جس کے ذریعہ پروگرام کا تعارف کرایا جاسکے اور بعض ضمنی موضوعات پر مذاکرہ وتبادلۂ خیال ہوسکے، اور مجلس کا عربی نام رابطۂ ادب اسلامی طے پایا۔

رفیق درس وتدریس مولانا عبدالماجد ندوی کی وفات

ہمارے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ملتقی الادب الاسلامی کا دوسرا روز تھا کہ یہ افسوس ناک خبر ملی کہ ہمارے رفیق درس وتدریس اور صاحب قلم وتصنیف، عالم وادیب مولانا عبدالماجد ندوی جدہ سعودی عرب میں ۱۸؍رجب المرجب ۱۴۰۵ھ کو حرکت قلب بند ہوجانے سے وفات پاگئے، ہم دونوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ساتھ فراغت حاصل کی تھی، ہم ۳،۴ ساتھیوں میں وہ ممتاز تھے اور ہم دونوں کا دارالعلوم میں تدریس کے لئے ساتھ تقرر بھی ہوا، اور علمی وادبی واداری سرگرمیوں میں ساتھ رہا، معلم الانشاء کا کام انہیں سپرد کیا

گیا جس کے دو حصے انہوں نے لکھے جو بہت مقبول ہوئے اور تیسرا حصہ راقم الحروف کو سپرد کیا گیا، اس طرح ہم دونوں شریک تصنیف بھی تھے، وہ اپنے بعض حالات کی وجہ سے مستقل دارالعلوم میں نہیں رہ سکے اور جدہ میں ایک اچھی ملازمت ملنے پر وہاں چلے گئے مگر رابطہ و تعلق برابر قائم رہا، غفر اللہ لہ وارفع مراتبہ، آمین۔

ملتقی الادب الاسلامی میں ان کے متعلق جو تعزیتی قرارداد منظور ہوئی، وہ حسب ذیل ہے:

ہم بڑے رنج وافسوس کے ساتھ مولانا عبدالماجد ندوی کی وفات حسرت آیات پر قرارداد تعزیت منظور کرتے ہیں، مولانا عبدالماجد ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک قدیم طالب علم اور ممتاز استاذ تھے، وہ بڑی صلاحیتوں کے حامل، اعلیٰ اخلاق کے مالک اور شفقت ورحمت سے حصہ وافر رکھتے تھے، خاص کر وہ طلبہ کے لئے شفقت وخلوص اور خیر خواہی کے پیکر تھے، ندوہ اور ندوی فکر سے ان کو عشق کی حد تک شیفتگی تھی، اگر چہ بعض حالات کے سبب وہ دارالعلوم کی چاردیواری سے دور چلے گئے تھے لیکن ان کا دل یہیں کے بام ودر میں اٹکا رہا، عربی ادب وزبان پر گہرا عبور رکھتے تھے، اور خاص کر ان کا خصوصی فن تھا، جس کا جیتا جاگتا ثبوت ان کی کتاب ''معلم الانشاء'' ہے، جس نے عربی انشاء میں ایک جدید وصالح روایت کی بنا ڈالی، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، اور ان کو اپنی رحمتوں سے ڈھانک لے، اور ان کے متعلقین وغیرہ کو صبر جمیل کی توفیق عطا کرے۔ آمین۔

امام حرم شیخ عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز السدیس کی ندوۃ العلماء تشریف آوری

۳؍اپریل ۱۹۸۵ء کو حرم مکی کے امام شیخ عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز السدیس حفظہ اللہ اور ان کے ساتھ رابطۂ عالم اسلامی مکہ میں نشر واشاعت وصحافت ورابطہ عامہ کے سربراہ استاذ محمد محمود الحافظ کی ندوۃ العلماء آمد ہوئی اور ان کے اعزاز میں ایک تقریب بھی منعقد ہوئی۔

شیخ عبدالرحمٰن السدیس حیدرآباد کے دارالعلوم کے پروگرام میں شرکت کر کے

یہاں آئے تھے اور یہ اعزاز یہ کتب خانہ ندوۃ العلماء شبلی لائبریری کے وسیع وعریض ہال میں ہوا، اور علامہ اقبال کی نظم جس کا مطلع ہے:

''ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے''

سنائی گئی اور عربی میں اس کی ترجمانی کی گئی، یہ جلسہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی صدارت میں منعقد ہوا اور انہوں نے اپنے استقبالیہ کلمات میں حرم پاک کے لئے ہندوستانی شعراء اور ہندوستانیوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی۔

امام حرم شیخ سدیس حفظہ اللہ نے اپنے خطاب میں مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

''میری تمنا تھی کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی زیارت کروں، اللہ تعالیٰ نے میری یہ آرزو پوری کی، حیدرآباد کی کانفرنس میں شرکت تو ایک بہانہ تھی، ورنہ میرا اصل مقصد ندوہ کی زیارت تھی، انہوں نے خاص طور سے ندوہ کی دینی وعلمی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم ندوۃ العلماء کے شکرگزار ہیں کہ اس نے دین کی دعوت وتبلیغ کا مقدس فریضہ بطریق احسن انجام دیا، اور اس کے فضلاء نے اس دور میں اسلام کی صحیح ترجمانی کی، جبکہ ہر طرف سے اس دین پر طرح طرح کے حملے ہو رہے ہیں، ایسے نازک وقت میں انہوں نے دین کی حفاظت وخدمت کا فریضہ انجام دے کر یہ ثابت کردیا کہ صحیح معنوں میں یہ ایک اسلامی قلعہ ہے، ندوہ کے احسانات سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پورا عالم اسلام گراں بار ہے۔

شیخ عبدالرحمٰن السدیس نے خاص طور پر ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنے شیخ واستاد بلکہ روحانی باپ سماحۃ الشیخ ابوالحسن علی الحسنی الندوی کا خاص طور پر ممنون ومشکور ہوں کہ انہوں نے میرے لیے یہ موقع فراہم کردیا کہ میں ندوہ کی زیارت کرسکوں اور یہاں کے طلبہ واساتذہ سے ملاقات کرسکوں۔

امام حرم نے مغرب کی نماز مسجد دارالعلوم میں ادا کرائی جس کا پہلے سے اعلان کردیا گیا تھا، اور شہر ومضافات شہر سے لوگ خاصی تعداد میں جمع ہوگئے، نماز بعد امام حرم نے اپنے عمومی خطاب میں کہا کہ عقیدہ توحید وہ شئی ہے جس نے رنگ ونسل اور زبان وملک کی حدود کو توڑ دیا، اور

تمام مسلمانوں کو ایک ہی رسی میں جوڑ دیا، مزید فرمایا کہ اسلام محض عبادت کا کام نہیں بلکہ اس کی تعلیمات اخلاقیات، سماجیات، معاشیات، سیاسیات غرض کہ تمام پہلو پر مشتمل ہیں، اس کا دائرہ کار صرف مسجد تک محدود نہیں، ہر میدان میں، بازار میں، دفتروں میں، گھر میں سب جگہ اس کی تعلیمات میں ہمیں اپنے اخلاق وعمل سے اس کی صحیح ترجمانی کرنی چاہئے، آخر میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہاں سے آپ سب لوگ یہ پیغام لے کر جائے کہ اپنی آئندہ نسلوں کی فکر کریں گے، اور یہ اطمینان کرلیں کہ وہ توحید پر قائم رہیں، اور کلمہ پڑھ سکیں اور اسلام کی زبان سیکھ سکیں۔

مہمان معظم کو ایک استقبالیہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام میں بھی دیا گیا، اور مجلس کی مطبوعات کا ایک منتخب مجموعہ ندوۃ العلماء کے تعارفی لڑیچر کے ساتھ پیش کیا گیا۔

استاد محمد محمود الحافظ کو النادی العربی میں الگ سے بھی استقبالیہ دیا گیا کہ وہ اپنے زمانۂ تعلیم میں النادی العربی کے سکریٹری رہ چکے تھے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی وفات

یہ خبر علمی ودینی حلقوں میں بڑے رنج وافسوس کے ساتھ سنی گئی کہ حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی ہمارے درمیان نہیں رہے، کراچی پاکستان کے ایک سفر میں تھے کہ وہاں بیمار ہوئے اور اسی میں ان کی وفات ہوگئی، جہاں دارالعلوم کورنگی کراچی کے قبرستان میں ان کے استاد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ کے پہلو میں ان کی تدفین عمل میں آئی، غفر اللہ لہ ورحمہ اللہ رحمۃ واسعہ۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے تعزیتی خطاب میں ان کی علمی ودینی خصوصیات وامتیازات پر تفصیلی روشنی ڈالی اور کہا کہ مولانا ایک صحیح الفکر، صحیح العقیدہ بلکہ راسخ العقیدہ اور صحیح علمی ذوق رکھنے والے عالم تھے، وہ ایک طرح مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ، علوم دینیہ میں ملکہ اور پختہ صلاحیت رکھتے تھے تو دوسری طرف مولانا نے دہلی کے مشہور تعلیمی ادارے سینٹ اسٹیفن کالج سے جدید علوم کی تکمیل کی

تھی، اس طرح وہ قدیم وجدید علوم سے باخبر اور دونوں کے جامع تھے، وہ ندوۃ العلماء بھی تشریف لاتے تھے، اس کی انتظامیہ کے رکن تھے اور اس کے طلبہ سے خطاب بھی فرماتے، ان کی کتابوں میں ''صدیق اکبرؓ'' اور ''عثمان ذوالنورینؓ'' سوانحی ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں، یہ حادثۂ وفات ۳؍رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ مطابق ۲۴؍مئی ۱۹۸۵ء کو کراچی میں ہوا۔

محدث جلیل مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کی کراچی سے تشریف آوری

مشہور محدث ومحقق اور نامور فاضل مولانا محمد عبدالرشید نعمانی جے پوری جو علامہ حیدر حسین خاں ٹونکی محدث دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ممتاز شاگرد اور فیض یافتہ ہیں اور ان کے ساتھ ندوہ میں تعلیم واستفادہ کا وقت بھی گذار چکے ہیں، ندوۃ المصنفین دہلی سے بھی ان کی علمی وتحقیقی وابستگی رہی اور ادھر طویل عرصہ سے ان کا کراچی میں قیام ہے، اور اپنی کتاب ''ابن ماجہ اور علم حدیث'' سے انہیں علمی ودینی حلقوں میں بڑی پزیرائی ملی ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے تعلق ومحبت میں رمضان کے ایام گزارنے ان کی قیام گاہ رائے بریلی تشریف لائے اور اعتکاف بھی کیا، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نئے تعلیمی سال میں طلبہ کو بھی مستفید کیا، انہیں حضرت مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی اور پھر حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے اجازت وخلافت بھی حاصل ہے، ان کے قیام سے ہم سب کو علمی مذاکرہ وتبادلۂ خیال کا موقع ملا اور فائدہ ہوا۔

دارالعلوم تاج المساجد بھوپال میں علامہ سید سلیمان ندویؒ پر سمینار

دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کے زیر اہتمام ۴تا۷؍ستمبر ۱۹۸۵ء علامہ سید سلیمان ندوی پر سمینار بزم سلیمانی منعقد ہوا، جو نہایت حسن انتظام اور کامیابی کے ساتھ تین دن تک جاری رہا، مولانا محمد عمران خاں ندوی امیر تاج المساجد اس کے داعی ومنتظم تھے، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے صدارت فرمائی، راقم السطور کو بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی اور سید صاحبؒ کی ادبی خصوصیات کو موضوع بنا کر مقالہ بھی پیش کیا جو عربی میں تھا، جن اہم لوگوں نے اس سمینار میں شرکت کی اور اپنے مقالات پیش کئے ان میں چند نام یہ ہیں۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی، مولانا ابوالعرفان خاں ندوی، مولانا یوسف کوکن عمری، ڈاکٹر عبداللطیف اعظمی، ڈاکٹر مشیر الحق ندوی، پروفیسر محمد اقبال انصاری، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقی، مولانا حبیب ریحان خاں ندوی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، ڈاکٹر محمد راشد ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دارالمصنفین اعظم گڈھ۔

اس کے علاوہ دوسرے پروگرام بھی ہوئے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے ایک تبلیغی اجتماع کو خطاب بھی فرمایا، سیفیہ کالج میں بھی خطاب فرمایا، پیام انسانیت کے ایک جلسہ میں بھی خطاب کیا۔

مختلف تجاویز و سفارشات پیش کی گئیں جن میں سیرۃ النبی کے سلسلہ میں اہم مشورے اور گذارشیں تھیں، کہ اس کا ایک ملخص بھی آنا چاہئے، اور سید صاحب کی علمی و تحقیقی خدمات پر توسیع خطبات کا بھی سلسلہ ہو اور ان کی تصنیفات کا انگریزی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ کا بھی اہتمام ہو، اور سفارش یہ بھی تھی کہ:

علامہ سید سلیمان ندوی کے خیال میں مسلم اقلیتی ممالک کے لئے بالعموم اور ملت اسلامیہ ہند کے لئے بالخصوص ایک ملک گیر امارت شرعیہ کا قیام ضروری تھا، لہٰذا یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ کل ہند پیمانہ پر امارت شرعیہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، مولانا سید منت اللہ رحمانی اور مولانا محمد عمران خاں ندوی کے مشورہ سے قائم کی جائے، اور امارت شرعیہ بہار اڑیسہ سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس اہم ملی معاملہ میں اقدام و پیش رفت کرے۔

یورپ میں حضرت مولاناؒ کے ساتھ چند دن

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ۸/ اکتوبر سے ۱۵/ اکتوبر ۱۹۸۵ء تک کا زمانہ یورپ میں گذارا، اس دوران ان کو آکسفورڈ میں اسلامی سنٹر کا افتتاح کرنا تھا اور پھر لندن اور لکسمبرگ کے بعض پروگراموں میں شریک ہونا تھا، مجھ کو ان کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا، یہاں میں افادۂ عام کے لئے اسی سفر کی اہم معلومات قلمبند کر رہا ہوں امید کہ قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

آکسفورڈ سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز کا قیام

جہاں تک آکسفورڈ کے اسلامی سنٹر کا تعلق ہے تو تقریباً دو تین سال سے سینٹ کراس کالج آکسفورڈ کے ایک مسلمان ریسرچ اسکالر اور ایک غیر مسلم استاد یونیورسٹی حدود میں اس کو قائم کرنے کی ضرورت کو محسوس کر رہے تھے ان کا احساس یہ تھا کہ آکسفورڈ یونیورسٹی سلطنت برطانیہ کی ایک اہم ترین اور موقر ترین یونیورسٹی ہے اس میں پڑھنے پڑھانے والے ایشیا میں وقیع نگاہوں سے دیکھے جاتے رہے ہیں، لیکن یہ یونیورسٹی اپنے شعبوں کے تنوع کے باوجود کسی اسلامی شعبہ سے خالی ہے جب کہ دنیا کی چند در چند یونیورسٹیوں میں مختلف ناموں سے اسلامی شعبے قائم ہیں، یہ ایک ایسی کمی ہے جس پر کسی معمولی یونیورسٹی کو تو معاف کیا جا سکتا ہے لیکن ایسی یونیورسٹی کو جس کو اپنے معیار و اہمیت کا غرور بھی ہو معاف نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ سینٹ کراس کالج آکسفورڈ کے اسکالر اور حال استاد ڈاکٹر فرحان نظامی جو مشہور محقق و مصنف پروفیسر خلیق احمد نظامی کے صاحبزادے ہیں، اور سینٹ کراس کالج ہی کے ایک استاد اور وائس پرنسپل ڈاکٹر ڈیوڈ براؤننگ نے آپس میں غور و خوض کے بعد پروفیسر خلیق احمد نظامی اور ان کے توسط سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور برصغیر و ممالک عربیہ کے کئی اہل دانش کو اس سلسلہ میں غور و خوض و تعاون کی دعوت دی اور اس سلسلہ کی ایک نشست سال گذشتہ آکسفورڈ میں منعقد کی جس میں مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کیا گیا اور یہ طے ہوا کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے ہی علاقے میں یونیورسٹی کے اتفاق و تائید سے ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جو یونیورسٹی کے اندر واقع ہونے کے باوجود یونیورسٹی کے تابع نہ ہو صرف علمی و اخلاقی ربط و تعلق رکھتا ہو اور یونیورسٹی کا تسلیم کردہ ہو، اس تعلق کی علامت کے طور پر طے ہوا کہ سنٹر ہیئت حاکمہ میں دو ایک نمائندے یونیورسٹی کے بھی رکھے جا سکتے ہیں، لیکن دس بارہ ارکان عالم اسلام سے منتخب کئے جائیں، چنانچہ ان خطوط پر یونیورسٹی کے ذمہ داروں، انگلینڈ کے قانونی ماہرین اور خود سینٹر کے مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والوں سے سال بھر مشورہ ہوتا رہا، اس سلسلہ میں ڈاکٹر فرحان نظامی

اور ڈاکٹر براؤننگ نے ہندوستان اور ممالک عربیہ کا سفر بھی کیا۔

انہوں نے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے بھی ربط رکھا اور مشورہ وتعاون حاصل کرتے رہے، سینٹر کے اصول وطریقۂ کار کا خاکہ بن جانے اور یونیورسٹی سے تائید و اتفاق حاصل ہو جانے کے بعد اس کی تاسیس کی قانونی کارروائی انجام دینے کے لئے ۹ رتا ۱۱ راکتوبر کی تاریخیں طے پائیں، جس کے لئے مولاناؒ کو مدعو کیا گیا، چنانچہ اسی کے ضمن میں مولاناؒ نے ۸ راکتوبر کو آکسفورڈ کا یہ سفر کیا، سینٹر کا خاکہ یہ طے کیا گیا تھا کہ اس کو ایک وقف کی شکل میں تشکیل دیا جائے جو مجلس متولیان پر مشتمل ہو اور اس کے ماتحت سینٹر ہو، جس کو اس کا سکریٹریٹ چلائے، وقف کے لئے ٹرسٹیوں کی تعداد ۱۴ رطے ہوئی، جس میں ایک ٹرسٹی مکہ یونیورسٹی اور دوسرا سینٹ کراس کالج کا نمائندہ اور ۱۲ رعالم اسلام کے صحیح الفکر اور مسلمان حضرات میں سے نامزد کئے جائیں اور یہ طے ہوا کہ ۱۴ رٹرسٹیوں میں سے کم از کم ۱۱ رٹرسٹی مسلمان ہوں۔

مجلس متولیان کے صدر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور سکریٹری اور سینٹر کے ڈائرکٹر ڈاکٹر فرحان نظامی طے ہوئے، ان کے شریک کار اور رجسٹرار کی حیثیت سے ڈاکٹر براؤننگ مقرر کئے گئے، یہ اور اس طرح کے دیگر بنیادی امور پر مشتمل ایک مسودہ قانون ''DEED'' انگلستان کی عدالت کے بموجب رجسٹرڈ کرانے کے لئے تیار کرایا گیا، اس کے قانونی طور پر منظور ہونے کے لئے مسودۂ قانون پر کم از کم ۶ رٹرسٹیوں کے دستخط ضروری تھے، چنانچہ ۹ راکتوبر کو وکیل کی موجودگی میں ۶ رافراد نے بحیثیت پہلے ۶ رٹرسٹیوں کے دستخط کئے، ان میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف (سکریٹری رابطہ عالم اسلامی) شیخ سلطان محمد قاسمی (امیر شارقہ) پروفیسر خلیق احمد نظامی اور مسٹر احسن شفیق (عراق) کے نام قابل ذکر ہیں اور اس طرح وقف قانونی طور پر وجود میں آیا، اس کے فوراً بعد ٹرسٹیوں کا پہلا جلسہ بنایا، اور دوسرے بلیک ول بکڈپو کے ڈائریکٹر کالکس بلیک ول تھے، جن کو سینٹ کراس کالج نے اپنا نمائندہ بنایا، پھر ٹرسٹیوں کی باقی جگہوں کے لئے حسب ذیل افراد کا انتخاب ہوا۔

۱۔ ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن ترکی وائس چانسلر اسلامی یونیورسٹی، ریاض۔
۲۔ ڈاکٹر محمد ناصر سابق وزیر اعظم، انڈونیشیا۔
۳۔ شیخ عبدالعزیز علی المطوع، کویت۔
۴۔ ڈاکٹر کامل الباقر، سابق وائس چانسلر ام درمان اسلامی یونیورسٹی، سوڈان۔
۵۔ ڈاکٹر یوسف القرضاوی، صدر شعبۂ اسلامیات قطر یونیورسٹی۔
۶۔ حکیم محمد سعید صاحب، صدر ہمدرد فاؤنڈیشن، پاکستان۔

جلسہ میں سنٹر کے معاملات پر بھی غور و فیصلہ ہوا اور پہلے سال کے اخراجات کا بجٹ ایک لاکھ پاؤنڈ، اور سینٹر کی تعمیر کے لئے، زمین و عمارت کے مصارف کے لئے کئی لاکھ پونڈ کا بجٹ پیش ہوا، حاکم شارجہ شیخ سلطان نے پہلے سال کی دونوں مدات کے ایک خاصے بڑے حصہ کی ذمہ داری لی، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے بھی ادارہ کے لئے ذاتی طور پر ایک رقم کے عطیہ کا اعلان کیا، اور اس طرح ''آکسفورڈ سینٹر آف اسلامک اسٹڈیز'' نام کا یہ ادارہ دو سال کے غور و فکر و انتظام کے بعد قانونی طور پر وجود میں آ گیا، پھر ۱۱ر اکتوبر کو یونیورسٹی کے ذمہ داروں اور دیگر اہم شخصیتوں کے ایک جلسہ میں باقاعدہ اس کا اعلان بھی کر دیا گیا، یونیورسٹی کے حدود کے اندر سینٹ کراس کالج روڈ پر ایک قطعہ زمین سینٹر کی عمارت کے لائق دیکھا گیا، وہ جگہ کی موزونیت کے لحاظ سے اس لائق محسوس کیا گیا کہ سینٹر کی عمارت اسی جگہ تعمیر ہو، ٹرسٹیوں نے اس جگہ کا مشاہدہ کیا، ان میں خاص طور سے حاکم شارجہ، شیخ سلطان بن محمد قاسمی پیش پیش تھے، جنہوں نے اس کے اکوائر منٹ کے اخراجات برداشت کرنے کا اعلان ٹرسٹیوں کی پہلی نشست میں کیا تھا۔

یورپ میں اسلامی سنٹر کا قیام عمومی نقطۂ نظر سے شاید بہت اہم بات نہ ہو لیکن آکسفورڈ یونیورسٹی کے حدود میں اور یونیورسٹی کی ہمدردی کے ساتھ آزاد طریقہ سے سینٹر کا قائم ہونا اہمیت و مسرت کی حامل بات ہے، وجہ یہ ہے کہ یورپ کا پڑھا لکھا طبقہ خاص طور پر علمی و تعلیمی زندگی سے وابستہ اسلام کے متعلق نہ صرف یہ کہ غلط فہمی میں رہا ہے بلکہ اسلام کو ایک غیر حقیقت پسندانہ اور غیر عملی مذہب سمجھتا ہے، جس میں درحقیقت اس کی ناواقفیت کو

بڑا دخل ہے، یورپ میں اسلام کا تعارف علمی انداز میں بہت کم کرایا جا سکا، کیوں کہ جو لوگ یورپ کی زبان و مزاج علمی سے واقفیت حاصل کرتے رہے وہ عام طور پر یورپ سے مرعوبیت اور احساس کمتری کا شکار ہوتے رہے، ایسے میں وہ یورپ کو اپنے فکر و مذہب سے کیا متاثر کر سکتے تھے، ان میں سے اکثر نہ صرف یہ کہ احساس کمتری کا شکار ہوئے بلکہ وہ خود اپنے اپنے ملکوں میں یورپ کی فکر و تہذیب کے نقیب ہو گئے، جس کی وجہ سے یورپ کو متاثر کرنے کے بجائے وہ خود اپنی قوم کو اسی فکر و تہذیب میں رنگنے لگے، ہمارے مشرقی ممالک کی یونیورسٹی کے اساتذہ نے عموماً یہی کردار انجام دیا۔

لیکن اب جب کہ مغربی تہذیب اپنی بے راہ روی کی اس منزل تک پہنچ گئی ہے، جو اس کے لیے خودکشی کے منزل کے مرادف ہے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں اور مشرقی قوموں کو اس کی ضرورت ہے کہ یورپ ان کے عظیم فکر و مذہب سے واقف ہو اور زندگی میں اس کو اس کا جائز مقام دے بلکہ خود یورپ کی یہ ضرورت ہے کہ اس کو اسلام کی رہنمائی حاصل ہو اور وہ اپنی فکر و حیات میں اس کے ذریعہ ایسی تبدیلی لا سکے جس سے وہ اس تباہی سے بچ سکے، جس کے دہانے پر وہ پہنچ چکا ہے۔

اسی وجہ سے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے آکسفورڈ میں اسلامک سینٹر کے قیام کی کوششوں کو سراہا اور جو مشورہ و تعاون ممکن ہوا پیش کیا، آکسفورڈ یونیورسٹی کے اتفاق و رضامندی کے بغیر اس کے حدود میں اور اس کی ہمدردی کے ساتھ یہ سینٹر قائم نہیں ہو سکتا تھا، اور یونیورسٹی کی ہمدردی اور ربط کے بغیر قائم کرنے سے سینٹر کی افادیت کم ہو جاتی، یونیورسٹی سے اس کا اتفاق و ہمدردی حاصل کرنا آسان کام نہ تھا، لیکن سینٹر کے مؤسسین کی مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں یہ بات ممکن ہو سکی، یونیورسٹی کے انتظامیہ کو شکوک و شبہات تھے جو اس نے سینٹر کے نمائندوں کے سامنے رکھے، ان میں ان کا وہ تاثر بھی تھا جو اسلام کے متعلق ایرانی فکر و تحریک سے بنا تھا، انھوں نے صاف صاف دریافت کیا کہ اسلام کا مطلب وہی تو نہیں ہے، نیز انہوں نے سینٹر کے کام اور مالی و علمی امکانات کے متعلق بھی اطمینان چاہا، ان کو بتایا گیا کہ عالم اسلام ایسے متعدد اہل علم اور اصحاب خیر مسلمانوں سے خالی نہیں جو کسی

معیاری اسلامی سینٹر کو بخوبی سنبھال سکتے ہیں اور چلا سکتے ہیں، اس سلسلہ میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی وقیع علمی تصنیفات جن میں متعدد انگریزی کے تراجم ان کے سامنے آئے اور مولانا کا عالم اسلام میں تعارف اور کام ومقام ان کے سامنے آیا اور سینٹر سے مولاناؒ کی دلچسپی انہوں نے دیکھی ان کے اطمینان کا بڑی حد تک باعث بنا۔

بہرحال یونیورسٹی کی انتظامیہ نے غور وخوص کے بعد سینٹر کے قیام سے اپنے اتفاق اور تعاون کا اظہار کیا اور اپنی کونسل سے تائید ورضامندی کا فیصلہ صادر کیا۔

یہاں پر یہ بات باعث دلچسپی ہوگی کہ یونیورسٹی کونسل کی جس نشست میں سینٹر کے متعلق فیصلہ زیر غور آنے والا تھا، اس سے قبل کی نشست میں ایک اہم مسئلہ یہ آیا تھا کہ وزیر اعظم برطانیہ مارگریٹ تھیچر کو جو اسی یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ ہیں، یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری پیش کی جائے، کیونکہ یونیورسٹی کی روایات میں یہ بات رہی ہے کہ اس کا تعلیم یافتہ فرد اگر وزیر اعظم بن جائے تو وہ اس کو اعزازی ڈگری دیتی ہے، لیکن کونسل کے ارکان نے یہ تجویز منظور نہیں کی اور کہا کہ مارگریٹ تھیچر کی پالیسیاں پسندیدہ نہیں ہیں، سینٹر کے لئے کوشش کرنے والے خائف تھے کہ کونسل نے اگر اپنے سخت رویہ کا اس مسئلہ میں بھی ثبوت دیا تو سینٹر کو منظوری نہ مل سکے گی، لیکن سینٹر کے معاملہ میں کونسل نے اتفاق کا رویہ اختیار کیا۔

سینٹر کی تشکیل کے اعلان کی نشست جو ۱۱/ اکتوبر کو سینٹ کراس کالج کے ہال میں منعقد کی گئی، ایک اچھی حوصلہ افزا نشست ثابت ہوئی، سینٹر کے چیرمین کی طرف سے تقریباً ایک سو منتخب ترین آدمیوں کو ڈنر پر مدعو کیا گیا تھا، جس میں یونیورسٹیوں کے پروفیسران اور عہدیداران اور برطانیہ میں مقیم دانشور طبقہ کے منتخب افراد تھے، یہ سب افراد آئے اور دلچسپی سے شریک رہے، کھانے کے اختتام پر تقریروں کا پروگرام رہا، جس کو حاضرین نے بہت سکون سے سنا، اور باوجود نشست کے طویل ہو جانے کے اکتاہٹ اور بے دلی کا اظہار نہیں کیا، تقریروں میں پہلے ڈاکٹر براوننگ نے سینٹر کے قیام کے محرکات اور تاریخ بیان کی اور اہم مؤسسین کو سراہا، جن میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا نام، شیخ سلطان

بن محمد قاسمی کا نام، ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کا نام، پھر کئی لوگوں کے نام انہوں نے لئے، پھر ڈاکٹر فرحان نے مزید امور پر روشنی ڈالی، پھر نشست کے داعی اور صدر حضرت مولاناؒ کی تقریر ہوئی جو تعارفی اور دعوتی دونوں مقصد لئے ہوئے تھی، تقریر عربی میں تھی، جس کا پہلے سے تیار کردہ ترجمہ ڈاکٹر فرحان نے سنایا، پھر وائس چانسلر کے نمائندے اور یونیورسٹی کی طرف سے سینٹر کے لئے نئے منتخب رکن ڈاکٹر کے بی گری فن پرسیڈنٹ میگوالن کالج نے تقریر کی، پھر سینٹ کراس کالج کے (پرنسپل) ہر کرا کراجی ایچ اسٹیفورڈ نے تقریر کی، پھر رابطہ عالم اسلام کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف نے تقریر کی اور جلسہ پسندیدگی کے احساسات کے ساتھ ختم ہوا، مولاناؒ نے اپنی تقریر میں اسلامی سینٹر کے قیام کے سلسلہ میں یونیورسٹی کے رویہ کو سراہا اور وحی الٰہی نے علم کو جس طرح سراہا ہے اور دنیا میں علمی وتمدنی ترقیات میں اسلام کا جو حصہ ہے اس پر روشنی ڈالی، مولانا نے فرمایا:

"نبی اکرم ﷺ کا ایک دائمی اور ابدی کارنامہ اور آپ کی بعثت و دعوت کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے مذہب وعلم کے درمیان پاکیزہ اور پائیدار تعلق قائم کیا اور ان دونوں کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کیا۔ آپ ﷺ نے علم کی اہمیت وشان میں اضافہ کیا اور اس کی طرف لوگوں کو اس قدر رغبت دلائی کہ اس سے زیادہ کا تصور ممکن نہیں ہے اس کے فطری نتیجہ کے طور پر ایک ایسی علمی اور تصنیفی تحریک وجود میں آئی کہ مذہب اور آسمانی مذاہب کی بنیاد پر قائم شدہ تہذیبوں، تمدنوں، عہدوں کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی، اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر نازل شدہ سب سے پہلی وحی میں کائنات کے خالق نے نوع انسانی پر اپنے اس احسان کا ذکر کیا ہے کہ اس نے انسان کو علم کا امتیاز بخشا اور اسی وحی میں اللہ تعالیٰ نے علم کے اس اہم ذریعہ کا تذکرہ کیا جس سے علم کی تاریخ اور اس کا ارتقاء وابستہ ہے، جس سے تعلیم وتعلم اور تصنیف وتالیف کی تحریک وجود میں آئی، علوم وفنون ایک فرد سے دوسرے فرد تک، ایک قوم سے دوسری قوم تک، ایک عصر سے دوسرے عصر تک اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے رہے، مذہب

کے اندر وسیع ترین پیمانہ پر علوم کی نشر واشاعت کا سہرا اسی کے سر ہے اور اسی کی بنیاد پر مدرسوں، اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور لائبریریوں کی بنیاد قائم ہوئی، یہ پہلی وحی غار حراء میں ایک ان پڑھ نبیؐ پر نازل ہوئی، چھ سو سال گذر جانے کے بعد یہ پہلی مرتبہ زمین کا آسمان سے بلکہ آسمان کا زمین سے تعلق قائم ہوا، اس وحی کی ابتداء عبادت معرفت الٰہی، اطاعت خداوندی، دعوت جیسے مثبت امور یا بتوں کی پرستش سے بیزاری اور جاہلیت اور جاہلی رسم و رواج کے خاتمہ کے احکام سے نہیں ہوئی، بلکہ وحی کا آغاز ''اقرا'' (پڑھو) کے لفظ سے ہوتا ہے، پڑھو اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھو اور تمہارا پروردگار وہ عزت والا ہے جس نے قلم کے ذریعہ سکھایا، اس نے انسان کو وہ (چیز) سکھائی جس کو وہ نہیں جانتا تھا'' ایک اہم تاریخی واقعہ تھا جس نے انسانی تفکیر اور مورخین و مفکرین کے غور و فکر کے لئے نئے گوشے وا کر دیئے یہ اس بات کی طرف کھلا ہوا اور بلیغ اشارہ ہے کہ یہ ان پڑھ نبی انسانیت، مذاہب اور آسمانی پیغاموں کی تاریخ میں ایک ایسے نئے دور کا آغاز کرے گا جو ''علم'' کی سلطنت کے قیام، علم کے روشن دور کے آغاز، علم و مذہب کے اتصال کی خصوصیتوں سے مالا مال ہوگا۔''

حاکم شارقہ شیخ سلطان بن قاسمی سے ایک ملاقات

حضرت مولاناؒ کے پہنچنے کے دوسرے روز صبح حضرت مولاناؒ سے ملنے آئے، شیخ سلطان عرصہ سے مولاناؒ سے تعلق رکھتے ہیں وراس تعلق کا مظاہرہ وہ اپنے عمل سے بھی کئی بار کر چکے ہیں، ایک سال قبل اپنی ہندوستان آمد کے موقع پر انہوں نے لکھنؤ کا پروگرام باقاعدہ رکھوایا اور ندوہ آئے اور اس کا اظہار کیا کہ انھوں نے خاص طور پر یہ سفر کیا، مولاناؒ نے ان کے استقبال میں یہ فرمایا تھا کہ:

''نعم الأمير على باب الفقير وبئس الفقير على باب الأمير''

کہ عربی میں مثل ہے کہ وہ حاکم بہت اچھا ہے جو غریب کے دروازہ پر جائے اور وہ غریب برا ہے جو حاکم کے دروازہ پر جائے۔

مولانا نے فرمایا کہ یہ مثل آج حاکم شارقہ پر منطبق ہو رہی ہے، شیخ سلطان قاسمی مولانا کے ساتھ کچھ دیر رہے اور پھر وہیں سے اسلامک سینٹر کے جلسہ میں گئے، اور جلسہ سے واپسی میں ڈاکٹر فرحان احمد نظامی کی طرف سے لنچ ان کی قیام گاہ پر تھا، اس میں شیخ سلطان نے شرکت کی اور دیر تک نشست رہی، یہ نشست معلومات افزا بھی تھی، انہوں نے شارقہ میں اپنی دینی اصلاحات کی تفصیلات بتائیں۔

انہوں نے اپنے ایک جامع فلاحی منصوبہ پر روشنی ڈالی جو انہوں نے اپنی ریاست میں شروع کیا ہے جس کی رو سے ہر گاؤں اور بستی میں آبادی کی اقتصادی، معاشرتی اور مذہبی ضرورت کے مطابق مناسب انتظامات کئے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص بھی پریشان حال نہ رہے اور اخلاق وحسن سیرت قوموں کی زندگی میں پیدا ہو اس کے لئے ہر بستی میں اچھا شہری ثابت ہونے پر انعام دینے کا بھی نظام رکھا ہے۔

شراب کے سلسلے میں انہوں نے بتایا کہ شراب پینے کی لت لوگ ہوٹلوں کے ذریعہ پوری کیا کرتے تھے اور ہوٹلوں میں عام طور پر غیر ملکیوں کی آمد کی وجہ سے چھوٹ تھی، اس کو روکنے کے لئے انہوں نے مرحلہ وار طریقہ اختیار کیا، پہلے تو ریاست کے تمام ہوٹلوں میں صرف چند ہوٹلوں تک پرمٹ کو محدود کر دیا، شہر کے اندر نگرانی و دیکھ بھال کا انتظام کیا، پھر کچھ وقفہ کے بعد مزید پابندی لگائی، بالآخر شراب پر مکمل پابندی عائد کر دی اور اس طرح اس لعنت سے ریاست آزاد ہوگئی اور ریاست میں اس طرح پابندی لگنے سے پڑوس کی ریاستوں پر بھی اثر پڑا اور وہاں بھی اچھے اثرات مرتب ہوئے۔

شیخ سلطان عرب امارات فیڈریشن کے امراء میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ شخص سمجھتے جاتے ہیں، انہوں نے حال ہی میں برطانیہ کی ایک یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بھی مکمل کر لی ہے، انھوں نے خلیج کے ساحل پر بسنے والے عربوں کے متعلق تھیس تیار کی ہے جس میں انھوں نے ثابت کیا کہ مغرب کے استعماری ذہن نے یہ مفروضہ بنا کر تاریخ

میں داخل کر دیا حالانکہ اس بات کا کوئی علمی ثبوت نہیں، مغرب کے اس نظریہ کے برعکس اس علاقہ میں علمی واخلاقی اعتبار سے صورت حال اچھی رہی ہے، یہ خوشی کی بات ہے کہ ان کی تھیسس کامیاب قرار پائی اور وہ اس پر پی. ایچ. ڈی. کی ڈگری کے مستحق ہوئے۔

شیخ سلطان بن محمد القاسمی کے ہمراہ ان کے عزیز اور شارقہ کے بین الاقوامی اسلامک سینٹر کے سربراہ شیخ سالم بن محمد قاسمی بھی تھے یہ ایک بہت صالح اور سمجھدار نوجوان ہیں اور ایک عرصہ سے ہندوستان کے تبلیغی کام سے بہت مانوس ہیں اور اس میں حصہ بھی لیتے رہتے ہیں، یہ مذہبی معاملات میں شیخ سلطان کو مشورے بھی دیتے ہیں اور مدد بھی کرتے ہیں، ان سے بھی شیخ سلطان کو اپنے اصلاحی اور مذہبی کاموں میں تقویت ملتی ہے۔

شیخ سلطان نے یہ جاننے کے بعد کہ آکسفورڈ کے اسلامک سینٹر کے متعلق مولاناؒ کا اچھا خیال ہے اور وہ اس کی تقویت چاہتے ہیں تعاون اور مدد کی، چنانچہ اس کے قیام کے ابتدائی مصارف بھی انھوں نے ادا کئے اور اپنی تقریر میں اشارہ بھی کیا کہ شیخ ندوی کی دلچسپی نے مجھ کو اس پر آمادہ کیا، شیخ نے مولاناؒ کو واپسی میں شارقہ چلنے کی دعوت دی لیکن مولانا نے ہندوستان جلد واپسی کی ضرورت بتائی اور شکریہ کے ساتھ معذرت پیش کی۔

آکسفورڈ اسلامک سنٹر کی تأسیس کے موقع سے آنے والی اہم شخصیتوں میں دوسری اہم شخصیت رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کی تھی، ان کے پاس وقت بہت محدود تھا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے دو اہم جلسوں میں شرکت کے لئے وقت نکالا ایک تو تأسیس کی عمومی نشست میں، انھوں نے اسلامک سینٹر کے قیام کو اچھے الفاظ میں سراہا، اور اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کو ایک بہت مفید اور ضروری اقدام قرار دیا۔

۱۱؍اکتوبر کے عمومی جلسہ سے جو کہ سینٹ کراس کالج کے ہال میں منعقد ہوا تھا، سینٹر کے تعارف میں بڑی مدد ملی، اور یونیورسٹی کے نیز ان اطراف کے اہل علم طبقہ کے چیدہ لوگوں کے سامنے سینٹر کی ضرورت اور اسلام کے ساتھ علم کے گہرے تعلق کو موثر انداز میں پیش کیا جاسکا، جس سے اس بات کا اظہار بھی ہوا کہ یہ کوشش کوئی سیاسی یا اقتصادی کوشش نہیں ہے جس کی طرف آج کل ہر شخص کا ذہن جایا کرتا ہے یہ اسلام کے کام و مقام سے علمی انداز میں متعارف

کرانے کی کوشش ہے جس کے متعلق مختلف سیاسی وقومی مقاصد کی بناء پر غلط فہمیاں پیدا کی جاتی رہی ہیں، اس جلسہ میں مولاناؒ کی تقریر کا وہ حصہ بہت فکر انگیز اور موثر تھا انھوں نے فرمایا کہ:

''آکسفورڈ یونیورسٹی میں اس سینٹر کا قیام ایک فال نیک ہے اس سے دوستی اور مفاہمت کے نئے دروازے کھلیں گے اور علمی تحقیق کی نئی شاہراہیں سامنے آئیں گی، اسلام نے انسانیت کا جو درس دیا ہے اور جس طرح انسانیت کو اعلیٰ مقام پر پہونچایا ہے ضروری ہے کہ اس کا صحیح احساس پیدا ہو، بعثت نبویؐ کے وقت انسانیت سکرات موت کی ہچکیاں لے رہی تھی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مردہ رگوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑائی، آنے والی صدیوں میں جو ترقی ممکن ہوئی وہ بقائے انسانیت کے لئے اسی عظیم کوشش کا نتیجہ تھی جو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے شروع ہوئی تھی، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہ کوشش بقاء انسانیت کے لئے نہ فرماتے تو نہ یہ یونیورسٹیاں ہوتیں نہ یہ ادارے، ان کے اثرات آج تک انسانیت پر رحمت کی امید بنے ہوئے ہیں، اسی بناء پر اسلامی مرکز کا قیام یونیورسٹی کا احسان نہیں شکر و اعتراف کا اظہار ہے اور خراج محبت و شرافت ہے جو برضا ورغبت اسلام کو پیش کیا جارہا ہے۔''

مولاناؒ کا آکسفورڈ کا سفر ایسے حالات میں ہوا تھا کہ اگر ضرورت کا شدید احساس نہ ہوتا تو یہ سفر مشکل تھا آکسفورڈ وقف اور مرکز کی قانونی تشکیل کے لئے کم از کم چھ بنیادی ارکان کے موجود ہونے اور دستخط کرنے کی ضرورت تھی، ابتداءً آٹھ یا نو ارکان کے پہونچنے کی امید تھی لیکن ان میں سے کئی کو ناگزیر دشواریاں پیش آگئیں، چنانچہ یہ اندیشہ ہوگیا کہ تاسیس کا کام کہیں ملتوی نہ ہوجائے اسی لئے منتظمین نے مولاناؒ سے آمد پر اصرار کیا ان کے اصرار کی بناء پر مقامی موانع کے باوجود سفر ہوا، وہاں پہونچ کر اندازہ ہوا کہ واقعی سفر ضروری تھا کیوں کہ وقت پر کم ہی ارکان پہونچ پائے، تین عرب حضرات جن میں شیخ سلطان بن محمد قاسمی، ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف اور جناب احسان شفیق تھے اور تین ہندوستانی جن میں پروفیسر خلیق احمد نظامی حضرت مولاناؒ اور راقم الحروف تھے، چنانچہ وقف و مرکز کا قیام ان چھ افراد کی دستخطوں سے اپنی اعلان شدہ تاریخ اور پروگرام کے مطابق انجام پایا۔

آکسفورڈ یونیورسٹی:

برطانیہ میں آکسفورڈ یونیورسٹی اور وہاں سے تقریباً دو سو میل دور کیمبرج یونیورسٹی دونوں قدیم روایات کی اور مذہبی آغاز رکھنے والی یونیورسٹیاں ہیں جس کا اظہار ان کے کالج کی عمارتوں کے طرز سے اور ان کی مختلف روایات سے ہوتا ہے۔

چنانچہ تمام کالجوں کی کچھ اپنی مخصوص روایات ہیں، ہر کالج میں ایک چیپلین یعنی مذہبی سرپرست ونگراں بھی ہوتا ہے اور حسب ضرورت گرجوں اور ان سے فائدہ اٹھانے کے انتظامات ہیں۔

آکسفورڈ یونیورسٹی تقریباً ۴۰ درس گاہوں پر مشتمل ہے جن میں ۳۵/ کالج ہیں اور ۵/ ہال ہیں، یہ درس گاہیں یونیورسٹی انتظامیہ کے ماتحت ہیں لیکن اپنے بہت سے معاملات میں آزاد ہیں، یونیورسٹی دراصل شہر میں واقع کالجوں کا گویا ایک فیڈریشن ہے جس کی مرکزی مشترک انتظامیہ یونیورسٹی کہلاتی ہے، یونیورسٹی انتظامیہ میں وائس چانسلر رجسٹرار اور مختلف مضامین کے پروفیسروں اور ریڈروں کی ایک تعداد ہے، یونیورسٹی کے تحت اس کی عمومی بڑی لائبریری جو بوڈلین لائبریری کہلاتی ہے، لیبریٹری اور تصویری مرکز وغیرہ ہیں، بوڈلین لائبریری میں ۴۷ لاکھ جلدوں پر مشتمل کتابیں ہیں، اس لائبریری میں متعدد فرعی لائبریریاں بھی شامل ہیں، یونیورسٹی میں اس وقت طلباء کی تعداد ۱۲-۱۳ ہزار ہے۔

یونیورسٹی کے کالج اپنے اندرونی معاملات میں تقریباً خودمختار ہیں، ہر کالج اپنا اسٹاف خود مقرر کرتا ہے، پرنسپل کا خود انتخاب کرتا ہے، اور کالج کے اندر کے ضابطے طے کرتا اور نافذ کرتا ہے، کالجوں کے مابین بعض اصول و روایات میں بھی فرق ہے، یہ فرق بعض اصطلاحات میں بھی ملتا ہے، مثلاً کسی کالج کا سربراہ پرنسپل، کسی کا پرسیڈنٹ، کسی کا ماسٹر، کسی کا وارڈن اور کسی کا ڈین کہلاتا ہے۔

یونیورسٹی انتظامیہ اور کالج انتظامیہ کا تعاون وتعلق اس طور پر ہے کہ کالج انتظامیہ اپنے فیلو اور لکچرر مقرر کرنے میں ٹیٹوریل نظام کا بندوبست کرنے میں اور طلباء کی اقامتی

زندگی سے متعلق امور کا نظم کرنے کے معاملات کو دیکھنے میں آزاد و خود مختار ہیں۔

یونیورسٹی انتظامیہ مضامین کے اعتبار سے فیکلٹیاں مقرر کرنے، پروفیسروں اور ریڈروں کا تقرر کرنے، ان کے نظام کو چلانے نیز کالجوں کو ممکن حد تک ہم آہنگ و مربوط بنانے اور امتحانات کا نظم کرنے کی ذمہ داریاں انجام دیتا ہے۔

تعلیم کے دائرہ میں ٹیٹوریل نظام کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لکچروں میں طالب علم کی شرکت اتنی اہم نہیں سمجھی جاتی جتنی کہ اپنے ٹیوٹر سے متعلق رہنے اور اس کی ہدایات اور نگرانی میں کام کرنے کی سمجھی جاتی ہے، چنانچہ داخلہ ملتے ہی کالج انتظامیہ پہلا کام یہ کرتا ہے کہ طالب علم کا ٹیوٹر طے کر دیتا ہے، اس ٹیوٹر کی حسب ہدایات و نگرانی طالب علم کو علمی کام کرنا ہوتا ہے، جو عموماً ہفتہ میں دو یا دو ہفتوں میں تین یا ہفتہ میں ایک تحقیقی مقالہ تیار کرنے اور اپنے موضوع پر استاد سے مذاکرہ کرنے پر مشتمل ہوتا ہے، طلبہ کے اس نظام کو باقاعدہ چک کیا جاتا ہے اور اس پر ترقی اور تعلیمی فرائض کی ادائیگی کا بڑی حد تک انحصار سمجھا جاتا ہے، تمام تعلیمی اسٹاف کو یونیورسٹی حاضری کے وقت ایک گون (جو کالے لیکن قدرے چھوٹے سائز کے عباء کی طرح ہوتا ہے) پہننا پڑتا ہے۔

یونیورسٹی میں اساتذہ اور طلباء کی ذمہ داریوں نیز ان کے مابین تعلقات اور روایات میں بعض امور مخصوص اور دلچسپ قسم کے ہیں مثلاً بورڈنگ کے ذمہ دار کو عموماً بورڈنگ میں مقیم طلباء کے ساتھ کھانا کھانا ہوتا ہے اور اس کی میز طلباء کی میز سے بلند رکھی جاتی ہے، یونیورسٹی کے لان پر یوں طلباء و اساتذہ کا چلنا ممنوع ہے لیکن بعض لان ایسے بھی ہیں کہ طلباء تو ان پر نہیں چل سکتے البتہ اساتذہ کے لئے ممانعت نہیں ہاں طالب علم اگر استاد کے ساتھ ساتھ ہو تو وہ بھی چل سکتا ہے۔

یونیورسٹی میں کھانے کی محفلوں کو علمی افادہ کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، چنانچہ یہ بات ملحوظ ہوتی ہے کہ کون اسکالر ایسی کتنی محفلوں کو علمی میں شریک ہوا۔

ایک دلچسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ وائس چانسلر کا ٹرم جب ختم ہوتا ہے اور دوسرا وائس چانسلر مقرر ہوتا ہے تو سابق وائس چانسلر پرو وائس چانسلر کے طور پر کام کرنے لگتا ہے

تاکہ نئے عہد کی سابق عہد سے ہم آہنگی میں مدد ملے، اتفاق سے یہ بات خود دیکھنے کا موقع ملا، سال گزشتہ جس وائس چانسلر کا دور تھا وہ سال رواں بدل کر پرووائس چانسلر کے عہدے پر آچکا تھا اور یہ وہی صاحب تھے جن کی وائس چانسلری میں اسلامک سینٹر کے معاملات طے ہوئے تھے، چنانچہ انھوں نے پرووائس چانسلر کی حیثیت سے سینٹر کی عملی تاسیس سے دلچسپی لی، اور اعلان کے جلسہ میں وائس چانسلر کی نمائندگی انھوں نے ہی کی۔

آکسفورڈ کی بلیک ویل بک شاپ بہت بڑی بک شاپ ہے وہ دوکان کیا ایک بڑی لائبریری معلوم ہوتی ہے، ایک عظیم عمارت کے کئی طبقے میں مختلف موضوعات کے لحاظ سے کتابوں کے کارنر ہیں اور بہت بڑا عملہ کام کرتا ہے کتابوں کی ایک دنیا ہے اس کے موجودہ منیجنگ ڈائرکٹر ڈاکٹر مائل بلیک ویل ہیں، جو سینٹ کراس کالج کے فیلو یعنی استاد بھی ہیں، سینٹ کراس کالج نے اسلامک سینٹر کے قیام میں ہمدردی کا رویہ رکھا، غالباً اس کی وجہ سے بلیک ویل نے لحاظ اور موانست کا مظاہرہ کیا، اور بک ڈپو کی سیر کرائی، اتفاق سے اسلامک سینٹر کے ٹرسٹی بورڈ میں سینٹ کراس کی طرف سے نمائندہ کے طور پر بلیک ویل ہی منتخب ہوئے ہیں۔

یونیورسٹی کی عظیم لائبریری کو سال گزشتہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اور سال رواں اس کے شعبہ مشرقیات دیکھنے کا موقع ملا۔

ذمہ داروں کی طرف سے اس کے دیکھنے کی دعوت اسلامک سینٹر کے ارکان کو دی گئی تھی، چنانچہ اس میں جانا ہوا، ۱۱ رتاریخ جمعہ کا دن تھا، گزشتہ سال بھی اتفاق سے ایک جمعہ آکسفورڈ میں پڑا تھا۔

آکسفورڈ سنٹر

آکسفورڈ شہر ایک چھوٹا شہر ہے مثال کے طور پر جیسے علی گڑھ، البتہ آبادی کے لحاظ سے علی گڑھ سے چھوٹا ہے، شہر میں بازار وغیرہ بھی ہیں، لیکن یونیورسٹی خاصے علاقہ میں پھیلی ہوئی ہے، اس کی عمارتیں شہر میں نمایاں ہیں، شہر میں اس کے مقیم مسلمانوں نے ایک مسجد تعمیر کر رکھی ہے، یہ مسجد اچھی اور کشادہ مسجد ہے، اور نماز پڑھنے والوں کی تعداد خاصی ہو جاتی

ہے، ان میں زیادہ تر شہر آکسفورڈ میں بسے ہوئے مشرقی ممالک کے مسلمان ہوتے ہیں، سال گزشتہ اس مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کا موقع ملا، لیکن تجربہ زیادہ اچھا نہیں رہا تھا، امام صاحب نے ایک طویل خطبہ دیا اور اس میں ایسی فروعی باتوں کو شدت کے ساتھ زور دیا گیا، جن کی ایک ایسے ماحول میں جہاں فروعی نزاعات کو سمجھنا اور ہضم کرنا آسان نہ ہو، ضرورت نہ تھی، چنانچہ اس سال ایک دوسری مسجد میں جانا ہوا جو ایک مکان میں قائم کی گئی ہے اور مسجد کی صورت میں تبدیل کی جارہی ہے وہاں پہونچنے پر ذمہ داروں نے خود حضرت مولاناؒ سے خطبہ دلوایا۔

عقیدہ کا مسئلہ چند برسوں سے برطانیہ میں بڑا نزاعی شکل اختیار کر گیا ہے اس سے کئی مسلح جھگڑے بھی ہو چکے ہیں افسوس کی بات ہے کہ یہ لوگ مذہب کے نام پر خودساختہ طریقوں کو رواج دینے کے لئے اس کا بھی خیال نہیں کرتے کہ ایک غیر مسلم ملک میں ان باتوں سے غیر مسلموں کو اسلام سے قریب لانے میں کیا کیا رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں،

۱۱ر اکتوبر کی شام کو اسلامک سنٹر کا کام ختم ہو رہا تھا، لہٰذا یہ دن گزار کر آکسفورڈ سے لندن واپسی کا پروگرام تھا، لندن میں مولاناؒ کا قیام اپنے ایک تعلق والے مسرور احمد صاحب کے مکان پر ہوا کرتا ہے، ان کو مولاناؒ کی آمد برطانیہ کی اطلاع ہوگئی تھی اور انھوں نے سنیچر ۱۲ر اکتوبر کی صبح کو لینے کے لئے آنے کو کہہ دیا تھا، چنانچہ وہ ۱۲ر کی صبح کو اپنی کار لے کر پہونچ گئے جس کے ذریعہ مولاناؒ اور میں ۱۲:۰۰ ربجے تک لندن پہونچ گئے۔

لکسمبرگ کا سفر

لندن پہونچ کر اسی روز لکسمبرگ کا سفر کرنا تھا، جہاں بین الاقوامی مجلس برائے تحقیقات اسلامی کی عاملہ کا جلسہ تھا مولاناؒ اس ادارہ کے صدر ہیں اور یہ ان کی صدارت کا پہلا جلسہ تھا، اس کی شرکت کے لئے کئی ماہ سے خط و کتابت چل رہی تھی، مولاناؒ نے اپنی مصروفیات اور صحت کی دشواری کی بناپر شرکت سے تقریباً معذرت کردی تھی، لیکن جب آکسفورڈ کا سفر ممکن ہو گیا تو لکسمبرگ کے اس جلسہ کی شرکت کا بھی ارادہ فرمالیا، کیوں کہ لکسمبرگ لندن سے صرف

ایک گھنٹہ کی فضائی مسافت پر ہے۔

آکسفورڈ پہونچنے کے بعد ٹیلیفون پر ڈاکٹر جمال الدین عطیہ کو جو اس کونسل کے جنرل سکریٹری ہیں مولاناؒ کے آکسفورڈ آنے کی اطلاع دی انہوں نے لکسمبرگ پہونچنے کا وقت وغیرہ طے کرایا، چنانچہ اسی کے مطابق سنیچر ۱۲/اکتوبر کی شام کو بلجیم ایرلائن سے بروسلز اور وہاں سے بذریعہ کار لکسمبرگ جانا طے ہوا کیوں کہ اس روز براہِ راست لکسمبرگ کی فلائٹ نہ تھی۔

عین روانگی سے چند گھنٹے قبل پتہ چلا کہ ہندوستان سے لکسمبرگ جانے سے معذرت کی جانے کی بناء پر ویزا کے حصول کی کارروائی نہیں کی گئی تھی، اب اچانک اور غیر دفتری اوقات میں ویزا حاصل کرنا ممکن نہیں، اس بات سے ڈاکٹر عطیہ کو مطلع کیا اور کہا کہ کوئی ذمہ دار آدمی بروسلز پہلے سے پہونچ جائے اور اس کا انتظام کردے کہ ملک میں انٹری ہوسکے تو شاید سفر وشرکت جلسہ ممکن ہوسکے وہ بروسلز سے اپنے ساتھ لے لے کیوں کہ لکسمبرگ بروسلز سے تقریباً ۲۰۰ میل ہے، اور یہ فاصلہ کار سے طے کیا جاتا تھا اور چونکہ بلجیم اور لکسمبرگ الگ الگ ملک ہیں، اس لئے مسئلہ اور بھی دشوار تھا، بہرحال سفر کیا گیا اور احتیاطاً مولاناؒ کے میزبان مسرور احمد صاحب بھی ساتھ ہوگئے تاکہ دشواری کے حل میں معاون بنیں، جہاز ایک گھنٹہ سے کچھ کم میں بروسلز پہونچ گیا، لیکن انٹری میں خاصی دشواری ہوئی، ڈاکٹر عطیہ کے نمائندے پہلے سے آگئے تھے، لہٰذا ویزا کی کارروائی ایرپورٹ ہی پر انجام پائی اور انٹری ہوئی، لیکن رات کے دس بج گئے تھے، اور وہاں سے لکسمبرگ پہونچنے میں کئی گھنٹے صرف ہوئے اس لئے قیام گاہ پہونچنے میں رات کے تقریباً ۱ بج گئے اس طرح رات کا بیشتر حصہ بیداری میں گزرا، جس کا تکان مولاناؒ کو بہت ہوا، لیکن کچھ تلافی صبح نماز فجر آرام کرکے ہوگئی۔

بلجیم بروسلز اور لکسمبرگ دونوں شہر بہت ستھرے اور معیاری اور ترقی یافتہ ہیں ایک وجہ تو یہ ہے کہ پورا یورپ تمدن کے ایک اعلیٰ معیار پر ہے دوسرے یہ کہ یہ دونوں شہر یورپین مشترک مارکیٹ کے صدر مقام بھی چنے گئے ہیں، اس لئے ایک طرح سے یہ پورے

یورپ کے بھی صدر مقام سمجھے جاتے ہیں۔

یورپین کامن مارکیٹ یورپین ممالک کی ایک اقتصادی انجمن ہے جو درآمد برآمد اور اقتصادی معاملات کے اصول طے کرتی اور ان کی نگرانی کرتی ہے اس کے ذریعہ یورپ کا اقتصادی نظام ایک مشترک ڈھانچے کے اندر چلتا ہے، اور چونکہ یورپین قوموں کی زندگی کے دواہم محور ہیں ایک اقتصادیات دوسرے سیاسیات، اقتصادیات کے دائرہ میں ان ملکوں کے نفع ونقصان کی نگرانی کے لئے یہی انجمن ہے، رہا سیاسیات کا معاملہ تو اس میں ناٹو نامی کونسل کام کرتی ہے، جس کا ایک مثالی اور غالب ممبر امریکہ ہے، ان دونوں انجمنوں کا دائرہ کار مغربی یورپ کے ممالک ہیں جو غیر کمیونسٹ ہیں، اس کے مقابلہ میں کمیونسٹ ممالک یورپ کی انجمن وارسا پیکٹ کے ممالک ہیں جن کا غالب اور متصرف ممبر روس ہے۔

یورپ کی مشترک مارکیٹ میں عرصہ تک برطانیہ کو داخل نہیں کیا تھا، لیکن برطانیہ بہت کوشاں تھا، کئی سال اسی کشمکش میں گزرے سب سے زیادہ رکاوٹ فرانس کی طرف سے تھی، مخالفت کرنے والے کہتے تھے کہ یہ تو یورپ کے براعظم سے جدا جزیروں میں ہے، لہٰذا یورپین برادری سے باہر ہے، بہر حال بڑی کوششوں کے بعد برطانیہ کو داخلہ مل گیا، اس کونسل کے تحت جتنے ممالک ہیں ان کے مابین زندگی کے دیگر متعدد گوشوں میں بھی تعاون ہے اور آپس میں ویزا نہیں ہے، بروسلز دراصل تو بلجیم کا دارالسلطنت ہے اور بلجیم شمالی یورپ کا ایک نسبتاً چھوٹا ملک ہے جس کی آبادی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے، بروسلز بڑا شہر ہے اور اس کی آبادی دس لاکھ ہے، بروسلز شہر میں یورپین مشترک مارکیٹ انجمن کے ہونے کے باعث یورپین برادری انجمن کے دفاتر کی عمارتیں بھی ہیں، جن میں انجمن کا کام اور مشورے انجام پاتے ہیں، اس لئے بروسلز کو ساری دنیا میں ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔

لکسمبرگ ایک ترقی یافتہ لیکن نسبتاً چھوٹا شہر اور اپنے قرب و جوار کے علاقوں کو ملا کر ایک مستقل ملک کی حیثیت رکھتا ہے بلجیم سے متصل ہونے کے باعث بلجیم سے اس کے تعلقات بہت قریبی ہیں، ان میں سے کسی ایک کا ویزا حاصل ہوجانے پر دوسرے کا بھی ویزا مل جاتا ہے، پورے ملک کی آبادی صرف تین لاکھ ۶۰ ہزار ہے اور شہر کی آبادی کل اسی ۸۰

ہزار ہے، اور چونکہ یورپین کامن مارکیٹ کے بعض دفاتر یہاں بھی ہیں اس لئے اس کو بھی بین الاقوامی اہمیت حاصل ہے۔

بین الاقوامی مجلس تحقیقات اسلامی (اسلامک ریسرچ ورلڈ کونسل) کا صدر مقام اس شہر میں تجویز ہوا تاکہ اس شہر کی مرکزی اہمیت اور بعض دیگر بین الاقوامی سہولتوں کی بناء پر کام بہتر طریقہ سے انجام پائے یہ اسلامک ریسرچ کونسل دراصل کئی سال قبل منعقد کئے جانے والے ایک سیمینار کے نتیجہ میں وجود میں آئی اور اس کو اسلامی بنکوں کے ایک بین الاقوامی ادارہ (اسلامک بنکنگ سسٹم انٹرنیشنل ہولڈنگ) نے جس کا صدر دفتر بھی لکسمبرگ میں ہے قائم کیا ہے۔

اسلامی بنکوں کا یہ بین الاقوامی ادارہ (آئی. بی. بی. انٹرنیشنل ہولڈنگ) غیر سودی بنک کاری کے نظام کو عام کرنے اور چلانے اور اسلامی نقطۂ نظر سے جو مشکلات سامنے آئی ہیں ان کو حل کرنے کا کام انجام دیتا ہے اس کے تحت ایک بین الاقوامی اسلامک بنک ہے جو کہ ڈنمارک کے دارالسلطنت کوپن ہیگن (Copenhagen) میں قائم ہے اس میں رقمیں جمع کرنے والوں کو اچھی شرح سے منافع ملتا ہے، یہ منافع کاروباری شرکت کے اسلامی اصول سے دیا جاتا ہے، بنک کا سرمایہ دنیا کے مختلف فرموں میں لگایا جاتا ہے، اس غرض سے خود اسلامک بنکنگ سسٹم اور کمپنیاں دنیا کے مختلف حصوں میں قائم ہوچکی ہیں، جن میں عام طور پر صنعتی کاروبار مثلاً الکٹرانک سامان کمپیوٹر اور دیگر سامان کی تیاری اور برآمد ہوتی ہے۔

اسلامک بنکنگ سسٹم کے بنیادی ممبروں میں خلیج عرب کے ملکوں کے بڑے بڑے تاجر شامل ہیں، وہ عام طور پر کوپن ہیگن کے اسلامی بنک کے حصہ دار ہیں اور ان میں سے بعض حصہ دار بعض مذکورہ بالا فرموں کے بڑے ذمہ دار بھی ہیں، اسلامی بنکوں کے متعلق معلوم ہوا کہ اس وقت دنیا میں دس بارہ کی تعداد تک پہنچ چکے ہیں جو خلیج عربی کے ملکوں اور دنیا کے دیگر کئی ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں اس بین الاقوامی بنک ادارہ نے اپنے انتظامیہ میں فقہ اسلامی کے ایک بڑے عالم و ماہر اقتصادیات کو بھی رکھا ہے جو کونسل اور اس کے بنک کے معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے جانچتا رہتا ہے اور اس پہلو کی نگرانی رکھتا ہے۔

ادارہ کے صدر مقام میں اس کے تعاون سے ایک رفاہی ادارہ اسلامک ریسرچ کونسل قائم ہے جس کے صدر مولاناؒ ہیں اور ایک دوسرا ادارہ سائنسی ریسرچ کونسل قائم ہے، جو اول الذکر کی طرح اسلامی تاریخی تحقیقات پر کام کرتا ہے، اسلامی بنکنگ سسٹم کے تعاون سے قائم ہونے والے ان تینوں اداروں کے جنرل سکریٹری جمال الدین عطیہ ہی ہیں، ڈاکٹر جمال الدین ایک مصری فاضل ہیں، جن کے پاس اقتصادیات کی اعلیٰ ڈگری ہے، اور ان کو اقتصادی مسائل و معاملات کا بڑا اچھا تجربہ ہے، ان کے ایک دوسرے بھائی ڈاکٹر محی الدین عطیہ کویت میں ہیں اور وہ بھی بڑے فاضل ہیں اور وہاں ایک بلند پایہ عربی علمی ماہنامہ" المسلم المعاصر" نکالتے ہیں۔

ان دو اداروں کے علاوہ ایک امدادی ادارہ چیرٹی انسٹی ٹیوٹ بھی قائم ہے جو اپنی متعینہ اغراض کے لئے کام کرتا ہے۔

عالمی انجمن برائے تحقیقات اسلامی کے جلسہ کی کارروائی

لکسمبرگ میں صبح دس بجے ادارہ تحقیقات اسلامی کا مقررہ جلسہ ادارہ کے مستقر میں شروع ہوا، اس میں ڈاکٹر جمال الدین عطیہ کے علاوہ سوڈان کے بڑے عالم اور اخوان المسلمین کے سربراہ ڈاکٹر حسن ترابی اور عالم عربی کے ممتاز صاحبِ علم اور فلا دلفیا امریکہ کی ٹمپل یونیورسٹی کے شعبۂ ادیان میں اسلامی مطالعات کے صدر ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی اور اخیر میں مولاناؒ شرکت کے لئے پہونچے، میٹنگ ایک روز قبل سے ہو رہی تھی، مولاناؒ کے پہونچنے پر کارروائی اور فیصلے ان کی تصویب کے لئے پیش کئے گئے، اور ایجنڈے کے بقیہ امور زیر بحث آئے، جلسہ نے جو اہم فیصلے کئے اور تجویزیں پاس کیں ان میں انتظامیہ کمیٹی کے عہدہ داروں کے عہدوں کی تصویب کے ساتھ دو ایک مزید عہدوں کے لئے نامزدگی کی گئی تھی انتظامیہ کمیٹی کے عہدہ داروں میں مولاناؒ کو صدر ڈاکٹر محمود ابوالسعود کو نائب صدر و ڈاکٹر جمال الدین عطیہ کو جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا تھا اب ان کی تصویب کے ساتھ ایک تجویز کے ذریعہ ایک مزید نائب صدر اسماعیل راجی فاروقی کو بنایا گیا اور ڈاکٹر عطیہ کو جنرل سکریٹری کے ساتھ ساتھ

خازن بھی مقرر کیا گیا، ایک دوسری تجویز کے ذریعہ ڈاکٹر عبدہ یمانی اور ڈاکٹر عبدالستار ابوغدہ کو بطور رکن کمیٹی منتخب کیا گیا۔

تحقیقی کاموں کا جائزہ

دیگر تجاویز میں تمام اسلامی تحقیقی وعلمی کاموں نیز علمی وتحقیقی کام کرنے کا ایک وسیع جائزہ تیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا، تجویز میں یہ بتایا گیا کہ اس کام کو ادارہ نے ایک حد تک انجام بھی دیا ہے، جس کو مختصراً کویت کے دارالاشاعت دارالبحوث الاسلامیہ نے شائع بھی کیا ہے لیکن مزید وسیع اور جامع جائزہ تیار کرنے کی ضرورت ہے، کام کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ طے ہوا کہ یہ کام فی الحال صرف عربی زبان میں موجود حوالہ جات کے جمع کرنے تک محدود رکھا جائے اور انگریزی کے کام کے سلسلے میں اسلامک فاؤنڈیشن واقع لیسٹر انگلینڈ سے درخواست کی جائے کہ اس سلسلہ میں وہ جو کام انجام دے رہا ہے وہ اس کو مزید تفصیلی جامع بنائے۔

تحقیقی اداروں نیز تحقیقی کام کرنے والوں کا جائزہ تیار کرنے کے سلسلہ میں یہ بھی طے کیا گیا کہ کام کے اس حصہ کو جو ہندو پاک سے تعلق رکھتا ہے انجام دینے کی ذمہ داری ندوۃ العلماء کے سپرد کی جائے اور مصر کے لئے اس کام کو انجام دینے کی ذمہ داری کویت کے دارالبحوث الاسلامیہ کویت پر ڈالی جائے پھر ایک تجویز کے ذریعہ تمام مروج علوم کو اسلامی روح کے مطابق ڈھالنے کے کام کو انجام دینے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے لئے علوم و فنون کے حسب ذیل ابواب طے کئے گئے۔

علم تعلیم، علم سیاست و بین الاقوامی تعلقات اقتصادی علوم، سماجی علوم، علم نفسیات، فلسفہ و مذہب، صحت، اخلاق، آرٹ، تاریخ، طبعیاتی علوم، تعلقات عامہ وابلاغ، قانونی علوم، اخلاقیات۔

طے کیا گیا کہ کام کی وسعت اور بڑائی کو دیکھتے ہوئے اس کی انجام دہی میں ترتیب کا لحاظ رکھا جائے اور اس کے ماہرین کی فہرست پر نظر ڈال کر ناموں کا انتخاب کیا جائے، کام کا

طرز و اسلوب وہ ہو جو واشنگٹن میں قائم "ورلڈ اسلامک انسٹی ٹیوٹ" (عالمی ادارہ اسلامی) نے اختیار کیا ہے، اسی نہج اور طرز پر کام کو پھیلانے اور بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مذکورہ بالا امور پر غور کرتے وقت یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ علوم کی تشکیل جدید کا کام اس طرح انجام دینا چاہئے کہ وہ اپنے پورے اور صحیح معیار پر ہو اور صحیح اسلامی روح پر مشتمل ہو اور اسی کے ساتھ ساتھ زمانہ کی ضرورت بھی پورا کرتا ہو، اس طرح کا کام اگرچہ خاصا مشکل امر ہے کیوں کہ جو حضرات اسلامی علوم کے ماہرین ہیں، وہ زمانہ کی ضرورت کو پورا کرنے والا کام انجام دینے میں کامیاب نہیں ہو رہے ہیں اور عصری علوم کے ماہرین جو کام انجام دیتے ہیں اس میں اسلام کا صحیح مزاج نہیں پیدا ہوتا، لہٰذا کمیٹی نے اپنے ادارہ کے مقاصد میں اس پہلو کو بھی شامل کیا ہے کہ اس شکل کا علاج تلاش کرنے کی کوشش کی جائے جس کی صحیح صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں ثقافتوں کے درمیان بُعد دور کیا جائے اور دونوں کے ماہرین کے درمیان روابط مضبوط کئے جائیں اور ایک کے ذریعہ دوسرے کے علوم و ثقافت کو قوت بہم پہونچائی جائے اور اس طرح اہل علم کے کام کو موجودہ امت اسلامیہ کی ضرورت کے پورا کر سکنے کے قابل بنایا جائے۔

اس مسئلہ میں مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی اور ماضی، حال اور مستقبل کے حالات اور توقعات پر بھی غور کیا گیا چنانچہ یہ خیال سامنے آیا کہ اس دشواری کا علاج صرف یہ نہیں کہ دونوں ثقافتوں کو آپس میں قریب لایا جائے، یا ایک شخص میں دونوں ثقافتوں کو جمع کیا جائے، بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں ثقافتوں سے ایک جامع ثقافت تشکیل دی جائے جو وحدانی ڈھانچہ رکھتی ہو پھر ایک قابل توجہ پہلو یہ محسوس ہوا کہ مختلف علوم و ثقافت کا ایک وحدانی ڈھانچہ میں آپس کا کیا تناسب ہو اور نصاب میں ہر علم کو کتنی جگہ دی جائے۔

بہر حال اس سلسلہ میں ضروری غور و خوض ہوا اور مختلف عالمی مسلم اداروں نے اس سمت میں جو کوشش کی ہیں ان کا بھی جائزہ لیا گیا اس بارے میں کویت کے رسالہ "المسلم المعاصر" اور واشنگٹن کے فکر اسلامی کے عالمی ادارہ کا بھی تذکرہ آیا اور مکہ مکرمہ اسلام آباد، ڈھاکہ اور جکارتا میں جو تعلیمی کانفرنسیں منعقد ہوئیں، ان میں پڑھے جانے

والے مقالات کا حوالہ بھی آیا اور اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس بارے میں اہلِ علم کی کانفرنسوں اور ملاقاتوں سے مدد مل سکتی ہے۔

مزید غور وفکر کے بعد یہ خیال سامنے آیا کہ ایک ایسی جامع درسگاہ جو علم کے مطلوبہ پہلوؤں کو سمیٹ سکتی ہو اور اسلام کے صحیح مزاج اور اصولوں کے مطابق قائم ہو اس مسئلہ کو زیادہ بہتر حل کر سکتی ہے، لیکن کوئی درسگاہ بغیر اس ضرورت ومزاج کے حامل اساتذہ اور نصاب کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی، بہرحال یہ طے ہوا کہ ان لائنوں پر غور وعمل کی جو صورتیں ہوں اختیار کی جائیں۔

مذکورہ بالا دو مسئلوں یعنی علوم وفنون کی ترتیب وتبویب اور دو ثقافتوں میں وحدانیت پیدا کرنے کے موضوع کے علاوہ دو دیگر موضوعات کو بھی لائق توجہ قرار دیا گیا، ایک تو قانون اسلامی کے نظام کی ترتیب اور اس کے نفاذ کی صورتوں پر غور نیز بنکنگ اور اقتصادیات کے اسلامی طریقوں کی ترقی واجراء کی فکر، ان دو مسئلوں کے مختلف پہلوؤں پر بھی تفصیلی غور ہو اور بعض تجاویز طے کی گئی، اور نشست دوپہر ایک بجے کے قریب برخواست ہوگئی۔

ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی اور ڈاکٹر حسن ترابی

جلسہ کے شرکاء میں پروفیسر اسماعیل راجی فاروقی سے بالمشافہ ملاقات کرنے کا ہم لوگوں کو یہ پہلا موقع ملا، وہ ایک خوش طبع صحیح الفکر اور اچھے وسیع مطالعہ وعلم کے آدمی معلوم ہوئے، چونکہ ایک اہم امریکن یونیورسٹی میں عرصہ سے تعلیم دیتے رہے ہیں اور یورپ و امریکہ کی یونیورسٹیوں میں چلنے والے رجحانات سے قریبی واقفیت رکھتے ہیں اس لئے ان کو اسلامی اور مغربی افکار کے مابین جو فرق واختلاف ہے اور قریب لانے کے جو امکانات ہو سکتے ہیں، ان کا اچھا اندازہ ہے وہ فلسطینی مسلمان ہیں اور اسلامی اقدار کی ترویج سے پوری دلچسپی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر حسن ترابی سوڈان کی تحریک اسلامی کے ایک ممتاز قائد ہیں گذشتہ دنوں جب سوڈان میں نظام حکومت کو اسلامیانے کا بڑا اقدام کیا گیا تھا اس میں ان کا کلیدی حصہ

تھا اور وہ صدر نمیری کے معتمد علیہ بھی بن گئے تھے، ان کی متعدد تصنیفات اسلامی معاملات و مسائل پر ہیں، ان کی بعض اختیاری رایوں سے علماء نے اختلاف بھی کیا ہے، ادھیڑ عمر کے قریب ہوں گے، البتہ اسماعیل راجی فاروقی ان سے بڑے ہیں۔

اس ادارہ تحقیقات اسلامی کے مستقر پر بنکنگ سسٹم انٹرنیشنل ہولڈنگ کے انتظامی شعبے کے جنرل سکریٹری برصغیر ہی کے ایک فاضل ہمایوں صادق ہیں، جو لاہور کے رہنے والے اور با اخلاق آدمی ہیں۔

ڈاکٹر عطیہ نے انہی کو بروسلز سے مولاناؒ کو لانے کے لئے دعوت دی تھی اور انھوں نے رات کا بڑا حصہ اس خدمت کو انجام دینے میں صرف کیا اور اخلاق برتا۔

دوپہر کو ادارہ تحقیقات اسلامی کی طرف سے حاضرین جلسہ کی دعوت تھی جس کا ہندوستانی ہوٹل میں انتظام کیا گیا تھا، لکسمبرگ میں مجلس کے دفتر سے قریب ہی یہ ہوٹل واقع ہے وہاں عملہ اور کھانے کے اقسام دونوں ہندوستانی ہیں، دونوں جنوبی ہند حیدرآباد کے تھے، سبھی نے پسندیدگی کا اظہار کیا اور چونکہ اس روز مولاناؒ کو لندن واپس ہونا تھا اس لئے کھانے کے بعد ہی رفقاء سے رخصت ہوئے اور کچھ دیر آرام کے لئے اپنے ہوٹل کی قیام گاہ میں آگئے جہاں سے مغرب کے قریب لکسمبرگ ایرپورٹ کو روانہ ہوئے۔

لندن واپسی

ایک گھنٹے کی پرواز سے لندن عشاء کے قریب پہونچنا ہوا وہاں مولوی انس اللہ آبادی ندوی اپنی موٹر لئے ہوئے موجود تھے، اسی پر مسرور احمد صاحب کی قیام گاہ پر واپسی ہوئی، لندن ایرپورٹ سے شہر کے اندر آنے میں تقریباً دو گھنٹے کا وقت صرف ہو جاتا ہے، فاصلہ بھی ہے اور شہر کے ٹرافک کا رش بہت ہوتا ہے۔

مولوی انس ندوی دارالافتاء ریاض کی طرف سے لندن میں داعی کی حیثیت سے مبعوث ہیں، انھوں نے دارالعلوم دیوبند پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی اور یہاں سے ریاض کی اسلامی یونیورسٹی گئے وہاں تعلیم کے بعد اب لندن میں کام پر مامور

ہیں، لندن کے ایک بڑے اسلامی عربی ادارہ ''دار الرعایۃ الاسلامیہ'' کے اسٹاف کے رکن ہیں، آکسفورڈ سے لندن پہونچتے ہی ان سے ملاقات ہوگئی تھی انھوں نے اپنے ادارہ میں آنے کی دعوت بھی دی اور بروسلز کے سفر کے لئے لندن ایرپورٹ بھی انھوں نے پہنچایا۔

لندن میں مولاناؒ کے پاس اب ایک دن اور دوراتیں تھیں کیوں کہ ۱۵؍کی صبح کو ہندوستان واپسی کے لئے سیٹیں طے ہوگئی تھیں اس ایک دن کے قیام میں متعدد لوگوں سے ملاقاتیں اور کئی اسلامی اداروں میں جانا تھا، چنانچہ ۱۴؍اکتوبر کو دوپہر سے قبل چند اہل تعلق ملنے آئے، ان میں مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے بڑے صاحبزادہ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی لندن ہی سے اور دوندوی فاضل مولوی سید نعیم اختر اور مولوی مظفر الحق تھے۔

ڈاکٹر فتحی عثمان

دیگر حضرات میں سے انگریزی مجلّہ کے ایڈیٹر ڈاکٹر فتحی عثمان ملنے آئے ڈاکٹر فتحی عثمان بڑے فاضل شخص ہیں، انگریزی عربی میں بڑی قدرت ہے ندوہ کے ادب اسلامی کے سیمینار میں ریاض کی امام محمد بن سعود یونیورسٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے اور ایک بڑا فاضلانہ خطبہ دیا تھا جس میں علمی وادبی میدان میں ہندوستانی علماء کا جو حصہ ہے اس کا بڑا اچھا تذکرہ کیا تھا، اور سراہا تھا، ان کی تقریر سے ان کی خطابت اور ان کی وسیع معلومات کا پتہ چلتا تھا، وہ امام محمد بن سعود یونیورسٹی کے سماجی علوم کے شعبہ میں پروفیسر تھے، پھر لندن کے ایک وقیع انگریزی اسلامی مجلّہ عربیہ نے ان کی خدمات حاصل کرلیں اور اب اسی منصب پر مامور ہیں، پروفیسر فتحی عثمان مولاناؒ سے ملنے آئے اور تھوڑی دیر بڑی اچھی نشست رہی۔

اسلامک ویلفیئر ہاؤس

اس نشست سے قبل مولاناؒ ''دار الرعایۃ الاسلامیہ'' (اسلامک ویلفیئر ہاؤس) جس میں مولوی انس ندوی کام کرتے ہیں دیکھنے گئے، یہ ادارہ لندن میں عربوں کا ایک بڑا اسلامی ادارہ ہے اس کو اسلامی الفکر عربوں نے قائم کیا ہے، اس میں اسلامی کتب کا ایک اچھا مرکز ہے اور تربیت ودعوت کے مختلف شعبے کام کررہے ہیں، اس کے ناظم ڈاکٹر محمود

الخانی سے بھی ملاقات ہوئی، وہ مولاناؒ سے ملنے کے بہت مشتاق تھے، بہت مسرت کا اظہار کیا اور مختلف اسلامی موضوعات پر گفتگو رہی، انھوں نے مولاناؒ سے تذکرہ کیا کہ وہ آج کل ایک ایسی تصنیف تیار کر رہے ہیں، جس میں مولاناؒ کے خاص مکتب فکر پر روشنی ڈلیں گے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کا علیحدہ ایک مکتب فکر ہے جس کو متعین حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش ابھی تک نہیں کی گئی، اس پر میں کام کر رہا ہوں اور شاید اس کے لئے مجھے آپ سے بعض پہلوؤں کے متعلق وضاحت حاصل کرنے کے لئے آپ کے پاس آنے کی بھی ضرورت پڑے، انھوں نے مولاناؒ سے اپنے عربی آرگن کے لئے انٹرویو بھی چاہا، مولانا نے فرصت کی کمی کے باعث سوالات لے کر رکھ لئے کہ جوابات عنقریب بھجوادیں گے۔ عربوں کا اسلامی الفکر طبقہ اس اسلامی مرکز سے برابر تعلق رکھتا ہے اس کے نگراں ایک شامی فاضل عادل صلاحی ہیں جن کا قیام ایک عرصہ سے لندن میں ہے۔

عربی روزنامہ ''الشرق الاوسط''

جناب عادل صلاحی صاحب عربوں کے ایک بین الاقوامی اشاعت ومقبولیت رکھنے والے عربی روزنامہ ''الشرق الاوسط'' کے ایک ذمہ دار سب اڈیٹر بھی ہیں اور روزانہ ان کے قلم سے چند کالم ہوتے ہیں، وہ اس اخبار کے انگریزی ایڈیشن عرب نیوز کے بھی جو جدہ سے نکلتا ہے سب ایڈیٹر ہیں، اس میں بھی ان کے قلم سے برابر چیزیں آتی رہتی ہیں۔ ''الشرق الاوسط'' اخبار کا متن لندن میں تیار ہوتا ہے اور اس کے لئے ادارت وتحریر کے ترقی یافتہ اور وسیع ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں، آٹھ دس صفحے کا اخبار ہوتا ہے اور مصنوعی سیارہ کے ذریعہ اس کا نقش روزانہ جدہ، پیرس اور رباط جاتا ہے، اور لندنی نسخہ کا اخبار ہی چاروں بڑے شہروں سے صبح سویرے شائع ہو کر بازار میں آجاتا ہے، خبروں اور وقیع تبصروں کے لحاظ سے یہ اخبار عالم عربی میں اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

عادل صلاحی نے مولاناؒ سے اس اخبار کے لئے آکسفورڈ کے دوران قیام ایک انٹرویو لیا تھا جس میں مسلمانوں کی موجودہ مشکلات، دعوتی وسماجی مسائل، اداروں اور تحریکوں کے سلسلہ میں مولاناؒ کے نقطۂ نظر آکسفورڈ کے نوتاسیس اسلامی سنٹر کے بارے میں سوالات

تھے، یہ انٹرویو ''الشرق الاوسط'' کے عربی اور عرب نیوز کے انگریزی پرچوں میں شائع ہوا، جو مولاناؒ کے خیالات اور آراء کا ایک مختصر مقالہ بن گیا ہے، ممکن ہے کہ وہ ایک رسالہ کی شکل میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی طرف سے شائع کیا جائے۔

اسلامک سنٹر اور مسلم ویلفیئر سنٹر

دن کے دوسرے وقت کے پروگراموں میں اپنے میزبان مسرور احمد صاحب کے مسلم ویلفیئر سنٹر کو دیکھنے جانا تھا اور بعد مغرب لندن کے سب سے بڑے اسلامی سنٹر، بیکر اسٹریٹ جانا تھا، جہاں مولاناؒ کے خطاب کا اعلان تھا، بیکر اسٹریٹ کا یہ اسلامک سنٹر بہت معروف سنٹر ہے، اس کو مسلمانوں کے مختلف ملکوں کی اجتماعی سرپرستی حاصل ہے، ان کے سفارت خانے دلچسپی لیتے ہیں، اس کے ڈائرکٹر کے انتخاب میں مختلف خصوصیات کا خیال کیا جاتا ہے، عام طور پر کسی مصری فاضل کا انتخاب ہوتا ہے، وہاں جانے سے قبل راستہ میں مولاناؒ نے اور ان کی ہم رکابی میں ہم نے مسلم ویلفیئر سنٹر میں عصر کی نماز ادا کی۔

حضرت مولاناؒ کی ایک مختصر نشست ہوئی، یہ ایک جدید اور قدرے چھوٹا سنٹر ہے جس کو ہندو پاک وافریقہ کے چند اسلامی الفکر حضرات نے قائم کیا ہے اور اس کے ناظر مسرور احمد صاحب ہیں اور اس کے معاملات میں ان کی دلچسپیوں کو زیادہ دخل ہے، انھوں نے صرف چند سالوں کی کوشش سے اس کو خاصی ترقی دی ہے اور ایک مختلف الفروغ مرکز کی حیثیت دے دی ہے، اس کے تحت ایک اسکول بھی قائم ہے جس کو حکومت برطانیہ اقلیتی شعبہ کی مد سے مدد بھی دیتی ہے اس اسکول کے علاوہ ایک چھوٹی لائبریری، مسجد اور بعض دیگر شعبے ہیں جن کے مصارف مسلمانوں کے چندوں سے پورے کئے جاتے ہیں، اب اس کے لئے ایک جگہ خریدی گئی ہے جس میں ایک وسیع البنیاد عمارت تعمیر کی جانے والی ہے، جس کے لئے وہ عالم اسلامی کے مخیّر حضرات سے تعاون بھی طلب کر رہے ہیں۔

کچھ دنوں اس مرکز سے مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کا بھی تعلق رہا ہے اور ان کے بعد ندوہ کے نوجوان فاضل مولوی نعیم اختر کا بھی تعلق رہا ہے۔

اسلامک سنٹر میں

مسلم ویلفیئر سنٹر سے نکل کر بیکر اسٹریٹ کے اسلامک سنٹر جانا ہوا اور مغرب کی نماز اس کی وسیع مسجد میں ادا کی گئی، ڈائرکٹر صاحب نے نماز کے لئے مولاناؒ ہی سے فرمائش کی چنانچہ مولانا نے نماز پڑھائی اس کے بعد تقریر کی، تقریر عربی میں تھی اس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا، مولانا نے چند منٹ اردو میں بھی کچھ فرمایا۔

ڈاکٹر سعید رمضان سے ملاقات

آکسفورڈ میں قیام کے دوران جنیوا سے ڈاکٹر سعید رمضان نے جن کی سرپرستی میں جنیوا میں ایک قدیم اسلامی سنٹر کام کر رہا ہے اور جو ایک قدیم اخوانی قائد رہ چکے ہیں اور مولاناؒ سے بہت محبت رکھتے ہیں اخوان المسلمین کے بانی مرحوم شیخ حسن البنا کے داماد بھی ہیں، ٹیلیفون پر مولانا کو جنیوا آنے کی دعوت دی، مولانا نے جب وقت کی کمی کے باعث معذرت کی تو انھوں نے خود لندن آنے کا ارادہ ظاہر کیا، چنانچہ اسلامک سینٹر کے جلسہ کے اختتام پر وہ اچانک پہنچے، بہت گرم جوشی اور تاثر کے ساتھ ملے، اور مولانا کے ساتھ ہی قیام گاہ تک آئے اور کچھ دیر تک بیٹھے پھر اپنے لندن کے میزبان کے یہاں رات گذارنے کے لئے واپس گئے، ڈاکٹر سعید رمضان اسلامی قانون کے ایک ماہر ایک اعلیٰ وموثر خطیب اور ایک عظیم داعی کی حیثیت سے اسلامی الفکر حلقوں میں معروف رہے ہیں مصر کے قائد انقلاب جمال عبدالناصر کے طرز سے بیزار ہونے کی وجہ سے مصر چھوڑ کر پردیس میں انھوں نے اپنا مستقر بنایا اور جنیوا میں اسلامی مرکز قائم کر کے تقریباً ربع صدی سے اسلامی فکر و دعوت کی خدمت انجام دے رہے ہیں، مولانا نے یورپ میں شروع کے کئی سفر انہی کی دعوت پر کئے تھے، اسلامک سنٹر میں مولانا کی تقریر کا پروگرام ختم ہونے پر ایک بے تکلف نشست میں لندن وانگلینڈ میں مقیم مختلف متعارف لوگوں سے ملاقات کا موقع ملا۔

شیخ سعید باذ سنجی

اس موقع سے ایک شامی فاضل شیخ سعید باذ سنجی (ندوی) سے ملاقات ہوئی،

آج کل دارالافتاء ریاض کی طرف سے برمنگھم میں ایک داعی اور مربی کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں ان کی نگرانی میں ایک اسلامی ادارہ بھی وہاں چل رہا ہے، بہت تعلق خاطر سے ملے، انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں کی آمد کی ہم کو اطلاع بالکل اخیر میں ملی میں فوراً بھاگا ہوا آیا کہ ملاقات نہ رہ جائے دیر تک ندوہ کے بارے میں دریافت کرتے رہے، اور تعلق کا اظہار کرتے رہے انھوں نے ندوۃ العلماء میں بھی تعلیم حاصل کی ہے۔

صالح نومسلم انگریز

انھوں نے انگلینڈ کے ایک نومسلم سے ملایا، جن کو ہم صوبہ سرحد کا کوئی دیندار مسلمان سمجھ رہے تھے کیوں کہ ان کا لباس اور وضع قطع ایسی ہی تھی انھوں نے بتایا کہ یہ برطانیہ کے مشہور ومقبول انگریز مغنی تھے اوران کے فن کی وجہ سے ان کی ملک میں بڑی قدر و منزلت تھی اسلام کا مطالعہ کیا اور سب چھوڑ چھاڑ ایک محتاط پرہیز گاراور داعی مسلمان کا رنگ اختیار کرلیا ہے اور کئی مسلمان مدرسے قائم کر لئے ہیں، جن میں طلباء کی اسلامی تعلیم وتربیت کی فکرونگرانی کرتے ہیں ان سے ہماری بھی بات چیت ہوئی، ہندوستان کا ایک سفر کرنے کا ایماء ظاہر کرر ہے تھے، بڑے جذبہ کے صالح مسلمان معلوم ہوئے۔

ہندوستان واپسی

۱۵ر اکتوبر کی صبح کو ۱۰ا۱ بجے لندن کے وقت ۳ بجے دوپہر ہندوستان کے وقت سے دہلی کی پرواز تھی، رات گذار کر صبح دس بجے روانگی ہوئی۔ جہاز کویت اور دبئ رکتا ہوا دہلی رات کے تقریباً ۳ بجے پہونچا اوراس طرح یہ ۸-۹ روز کا سفر مکمل ہوا۔

مولانا محمود الحسن عثمانی کی وفات

مولانا محمود الحسن عثمانی ہماری دینی تعلیمی کونسل کے رکن اولین اوراس کے دفتر کے ناظم تھے اور پوری طرح اسی کے لئے وقف تھے وہ اس کے بانی قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کے خالہ زاد بھائی اور بہنوئی بھی تھے، افسوس کہ ۵ر نومبر ۱۹۸۵ء کو وفات پائی، ان کے

صاحبزادہ ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی بھی دینی تعلیمی کونسل کے کام میں پوری دلچسپی اور تعلق رکھتے ہیں، اور ذی علم و باصلاحیت ہیں، غفر اللہ لہ و رحمہ رحمۃً واسعۃً۔

جامعۃ الہدایۃ جے پور کا افتتاح

۲۴، ۲۵ ربیع الاول ۱۴۰۶ھ، ۸۔۹ دسمبر ۱۹۸۵ء کو جامعۃ الہدایۃ جے پور کا جشن افتتاح منعقد ہوا، یہ ادارہ اور اس کی شاندار عمارت اور عالی شان منصوبہ حضرت شاہ عبدالرحیم مجددی جے پوری نبیرہ وخلیفہ حضرت شاہ ہدایت علی نقشبندی (م ۱۹۵۱ء) کے عزم راسخ، سعی پیہم، مقبول و مؤثر شخصیت کا نقش جمیل ہے، جس نے اس دشت کوہسار میں جامعہ ہدایت کی شاندار عمارت کھڑی کردی، یہ دوروزہ اجتماع شہر جے پور سے تقریباً ۸ کیلومیٹر کے فاصلہ پر رام گڈھ روڈ کے وسیع وعریض میدان میں منعقد ہوا، اسٹیج پر مؤقر علماء، معززین شہر، مختلف ریاستوں کے مندوبین، متعدد جج صاحبان، ماہرین تعلیم و قائدین موجود تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے ۱۷؍اکتوبر ۱۹۷۶ء کو اس کا سنگ بنیاد رکھا تھا، جس کا ان کے ہاتھوں اب افتتاح عمل میں آیا، حضرت مولانا نے صدارتی خطاب بھی فرمایا، اور راجستھان کی مناسبت سے یہاں آنے والے سب سے پہلے داعی و شیخ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا تذکرہ کیا اور کہا:

عزم راسخ ہے نشانِ قیس وشان کوہکس
عشق نے آباد کرڈالے ہیں دشت وکوہسار

لیکن جب میں عزم راسخ کا ذکر کرتا ہوں تو بے اختیارانہ و مضطربانہ میرا ذہن اس جلیل القدر صاحب عزم انسان کی طرف جاتا ہے جس پر نہ صرف راجپوتانہ کی سرزمین بلکہ سارے ہندوستان کو فخر حاصل ہے، اور جس سے عزم راسخ، خلوص اور خدا کی محبت، اور انسانیت کی خدمت کے جذبہ کی تاریخ کو روشنی ملتی ہے، میرا اشارہ حضرت خواجۂ خواجگان خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی طرف ہے جنھوں نے اپنے عزم راسخ، اپنی ایمانی قوت، سچی روحانیت، خداترسی اور انسان دوستی اور اپنے یگانہ خلوص محبت سے زمین فتح نہیں کی،

ملک فتح نہیں کیا، دل فتح کیے، انہوں نے دل توڑنے کا کام نہیں کیا، دل جوڑنے کا کام کیا، ان کی روشن کی ہوئی شمع اس وقت روشن ہے، تاریخ کی روشنی میں عرض کررہا ہوں کہ ہندوستان کے سارے مدارس جن میں ایک نمایاں مقام ان شاء اللہ جامعہ ہدایت کا بھی ہوگا اور اس وقت علم ودانش کے سارے مراکز مرہون منت ہیں حضرت خواجہ اجمیری کے اس عزم صادق کے جوان کو ایران سے لایا اور اجمیر میں بٹھایا، اور یہاں ان کے دم سے شمعیں فروزاں ہوئیں، علم کے اور عقل ودانش کے چراغ روشن ہوئے، اور سچی روحانیت اور خدمت انسانیت کا جذبہ از سرنو بیدار ہوا۔ (تعمیر حیات، شمارہ ۲۵/دسمبر ۱۹۸۵ء)۔

شاہ بانو کا مسئلہ اور حکومت کا فیصلہ

شاہ بانو کیس کے سلسلہ میں حکومت کی طرف سے مسلمانوں کے مذہبی موقف کو سختی سے نظرانداز کیا گیا اور اس کے لئے باوجود رابطہ کی کوششوں کے حکومت نے اپنی مرضی کے مطابق حل طے کیا جو مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول تھا، اس لیے بھی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تلخی پیدا کی اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے جو کوششیں ہوسکتی تھیں وہ کیں اور ملک بھر میں بڑے اجلاس منعقد کیے، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی نے وزیر اعظم راجیو گاندھی سے اس سلسلہ میں متعدد ملاقاتیں کیں اور ملت کا اجتماعی موقف اور اس میں دین وشریعت کا مسئلہ عقلی ونقلی طور پر اس طرح پیش کیا کہ وزیر اعظم کو اطمینان ہوگیا اور ان کی ایوان بالا میں دو تہائی اکثریت تھی، انہوں نے وہپ جاری کیا کہ اس کی تائید حکمراں پارٹی کے سبھی ارکان پارلیمنٹ کو کرنی ہے، ان میں جن دو تین ارکان نے تائید نہیں کی انہیں پارٹی سے باہر بھی کردیا گیا، لیکن یہ ایک تاریخی کامیابی تھی مگر بعض مقامات پر صحیح تشریح حکومت کی طرف سے سامنے نہ آنے پر بل میں کمزوری رہ گئی جس کی وجہ سے آج بھی عدالت کو فیصلہ لینے میں ان مسائل میں جو مسلم پرسنل لاء نکاح، طلاق، نفقہ، وراثت وغیرہ سے متعلق ہیں مسلمانوں کے دین وشریعت کا پاس نہیں رہتا اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کو آئین ہند کی دفعات کی روشنی میں اپنی لڑائی جاری

رکھنی پڑتی ہے، پھر بھی آزادی ہند کے بعد سے مسلم قیادت کی بڑی کامیابی مانی گئی جو آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کر رہا تھا، جس میں ملک وملت کی جماعتی وانفرادی بھرپور نمائندگی تھی، اوراس کا دنیا میں ایک اچھا پیغام گیا کہ ہندوستانی علماء ایک غیر مسلم اقتدار میں رہ کر اپنے مسائل کو حکمت وہوش مندی سے حل کرنے میں سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔

ملت کا بے نظیر اتحاد اوراس کے نتائج

ادھر چند ماہ کے اندر ہندوستانی مسلمانوں نے جس اتحاد اور یکجہتی کا مظاہرہ کیا اور ملت کے مسائل کے سلسلہ میں ایک زبان ہوکر اور متحدہ جذبہ سے جو کام کیا وہ ہندوستان کی جدید تاریخ کا بڑا شاندار اور تقریباً بے نظیر واقعہ شمار کیا جائے گا، اس اتحاد کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ملت کی ایک اہم ضرورت یعنی اس کے مذہبی تشخص کے سلسلہ میں کیا گیا اوراس کی رہنمائی وسرپرستی عام رائج الوقت قیادت نہیں بلکہ ایک سنجیدہ اور اجتماعی قیادت نے کی جس کی سرکردگی علماءدین نے کی عرصہ کے بعد اس برصغیر کی تاریخ میں یہ بات پیش آئی کہ پوری ملت اسلامی ہند علماء کی قیادت کے تحت جمع ہوگئی اور اسی کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آج ایسے نازک اور مشکل مسئلہ میں کامیابی عطا فرمائی، جس میں کامیابی ایک ناممکن بات معلوم ہوتی تھی۔

عورت کو طلاق کے بعد نان ونفقہ ملنے یا نہ ملنے کی بات درحقیقت ایک ایسی کسوٹی بن گئی تھی جس میں رہنمائے دین جو کہ یورپ کے علمی تسلط کے اس دور میں دقیانوسی اور فرسودہ معاملات کے نمائندہ قرار دیئے جاتے رہے ہیں، اور جدید تعلیم یافتہ حضرات اور مخالفین دین جو کہ روشن خیال اور زمانہ کے تقاضوں کو سمجھنے اور پورا کرنے والے سمجھے جاتے رہے ہیں ایک دوسرے کے بالمقابل آگئے تھے اور ایک ایسی لڑائی بن گئی تھی جس میں اس ملک کے اندر اسلام کے مذہبی وقار کا فیصلہ ہونا تھا۔

صدیوں سے یورپ کے مستشرق علماء نے یہ جھوٹا پروپیگنڈہ کر رکھا تھا کہ اسلام میں عورت پر ظلم ہوتا ہے کیوں کہ اس میں ایک مسلمان کو چار تک بیویاں رکھ سکنے کی اجازت ہے، اور طلاق دینے کا حق شوہر کو دیا گیا ہے، اور مرد کو عورت پر انتظامی برتری دی گئی ہے،

ان باتوں کو ہولناک اور ظالمانہ عمل ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی، ہمارے علمائے دین جو شریعت اسلامی کی باریکیوں کو زیادہ سمجھنے والے اور دین اسلام کے اصل نمائندہ ہیں، یورپ کی پروپیگنڈہ تیکنک نیز بات کو مؤثر بنانے کا رائج الوقت اسلوب نہ جاننے کی وجہ سے برابر نقصان اٹھاتے رہے۔

ندوۃ العلماء نے آج سے سو سال قبل ہی سے اس پہلو کی طرف توجہ دلائی تھی اور اس کے بانیوں نے نئی مسلم نسلوں کی تعلیم وتربیت میں ان امور کا لحاظ رکھنے پر زور دیا تھا، اگر ندوۃ العلماء کی یہ دعوت اسی وقت سے قبول کی جاسکتی تو آج ان متعدد خساروں سے بچا جا سکتا تھا جو پیش آئے۔

افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں یورپ کی مفسدانہ کوشش بڑی حد تک کامیاب ہوئی، اور نئے تعلیم یافتہ ذہنوں نے مستشرقین کے اثر سے ان الزامات کو ایک حد تک تسلیم کر لیا اور خود مسلمان جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے۔ جو انہی خیالات کے حامل بن گئے، اسی کا نتیجہ تھا کہ عارف محمد خاں جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معروف اولڈ بوائے رہے ہیں کے فیصلہ کے بعد مسئلہ ہندوستانی پارلیمنٹ جائے بغیر حل نہیں ہو سکتا تھا، اور وہاں مسلمانوں کا تناسب ایک اور دس کا ہے اور اس میں بھی عارف محمد خاں جیسے کئی افراد شامل ہیں لہٰذا یہ بات محال معلوم ہوتی تھی کہ اس سلسلہ میں کامیابی حاصل ہوگی۔

لیکن ہمارے علماء وقائدین نے جن میں پیش پیش مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا منت اللہ رحمانی اور متعدد مسلم جماعتوں اور فرقوں کے قائدین تھے، ذمہ داران حکومت اور ارکان پارلیمنٹ کو توجہ دلانے کے لئے علمی اور جمہوری کوششوں کا سہارا لیا۔ اور ان کے ہمراہ ملت کے اکثر شعبوں کے نمائندہ قائدین نے شرکت کی حتی کہ وہ ذمہ داروں کو سمجھانے میں کامیاب ہوئے کہ شریعت اسلامی نے جو حل اس سلسلہ میں پیش کیا وہی صحیح اور منصفانہ حل ہے اور شریعت اسلامی کی حفاظت جو کہ مسلمانوں کے لئے جان سے زیادہ عزیز ہے اسی میں ہے، چنانچہ شریعت اسلامی کی روشنی میں ایک بل تیار کیا گیا، جس کی تصدیق علماء سے حاصل کی گئی، اور وہ مخالفین شریعت اور نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے ایک بے

مہار گروہ کی مخالفتوں کے درمیان پارلیمنٹ میں پیش کر دیا گیا، لیکن پیش کرنے والے افراد کی مضبوط تعداد ہونے کے باعث پارلیمنٹ سے اس کے منظور و پاس ہو جانے کی قوی امید ہے، مسلمانوں کا عائلی قانون برطانوی حکومت کے زمانے سے جتنا تسلیم شدہ چلا آ رہا تھا، وہ آزادئ ہند کے بعد بھی باقی رکھا گیا تھا، اور اسی پر برابر عمل ہو رہا تھا، لیکن چند ماہ قبل سپریم کورٹ کے چیف جسٹس چندر چوڑ نے جواب ریٹائر بھی ہو چکے ہیں، اپنے ایک فیصلہ سے اس کو بدل دیا تھا اور اپنے فیصلہ میں بے محل طریقہ سے اسلام پر بھی تنقید کی تھی اور اس طرح مسلمانوں کو سخت بے چین اور ناراض کر دیا تھا، کسی طے شدہ قانون کو اگرچہ ملک کا کوئی بڑے سے بڑا جج بدل نہیں سکتا، لیکن تشریح ضرور ایسی کر سکتا ہے کہ قانون کا مقصد ہی فوت ہو جائے یا اس کا فائدہ ختم ہو جائے، دوسری طرف ملک کی عدالت علیا کے فیصلہ کے بعد نظر ثانی کی بات بھی نہیں کی جا سکتی کیوں کہ عدالت کا احترام عدالت پر تنقید کو ممنوع قرار دیتا ہے، اس لئے ایسے سنگین واقعہ پر صرف یہی ممکن تھا کہ پارلیمنٹ سے رجوع کیا جائے اور اس سے مطلقہ قانون کی تشکیل جدید کرائی جائے اور یہ کام ایک ایسے ملک میں جس میں اکثریت اقلیت سے بدگمان رہتی ہو اور اس کو ناخواندہ مہمان کی طرح سمجھتی ہو، تقریباً ناممکن کے درجہ کی بات تھی، لیکن علماء کرام اور ع قائدین ملت نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا، اور اپنی صفوں کو متحد کیا، مسلم عوام کو متوجہ کیا اور ایک بے نظیر اتحاد کا مظاہرہ کر کے حکومت وقت کو توجہ دلانے میں کامیاب ہوئے ملک کے نوجوان وزیر اعظم نے مسئلہ کو نہ صرف یہ کہ سمجھا بلکہ خصوصی دلچسپی لی، اور طویل مشوروں کے بعد اس زیر بحث قانون کو ایک نئی تجویز کے ذریعہ محفوظ اور مضبوط کر دینے کا بل تیار کیا، جس کو شریعت اسلامی کے ماہرین نے دیکھا اور پسند کیا، خدا کا شکر ہے کہ یہی بل منظوری کے لئے پارلیمنٹ میں آ گیا ہے، عائلی قانون کی شق میں جس میں کسی مسلمان مطلقہ کو اپنے شوہر سے طلاق کے بعد کیا ملنا چاہئے اور کیا فیصلہ دینا چاہئے کا تذکرہ کیا گیا ہے، عدالت علیا نے شوہر پر اپنی مطلقہ کو بیوی کی طرح نان نفقہ ملنے کی پابندی عائد کی، دراصل عدالت کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان شوہر کو اپنی بیوی کو کسی حالت میں بھی طلاق دینے کی

چھوٹ نہ دی جائے اور اگر اس سے طلاق دینے کی غلطی سرزد ہو جائے تو بھی وہ عملاً اپنی مطلقہ کو بیوی سمجھنے پر مجبور رہے۔

ہندوؤں کے لئے چونکہ اس سلسلہ میں پابندی ہے اس لئے دراصل قومی دھارے میں لینے کے لئے مسلمانوں کے واسطہ بھی اس طرح کی پابندی لگانے کی کوشش کی گئی ہے، حالانکہ اس طرح کی پابندی کا اس ملک میں یہ حشر ہو رہا ہے کہ شوہر اپنی بیوی کے ناقابل قبول ہونے کی صورت میں چونکہ ہندو قانون کے تحت طلاق کے ذریعہ گلوخلاصی نہیں کرسکتا، لہٰذا متعدد شوہر اپنی بیویوں کو قتل کر کے اس قتل کو خودکشی ثابت کرنے کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں جس کے نتیجہ میں دہلی میں کئی سو بیویاں چند سال کے اندر جلائی جا چکی ہیں، اس لئے عقل کا بھی تقاضہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے قانون طلاق وحقوق مطلقہ کی اسلامی تشریح کو نہ صرف یہ کہ باقی رکھا جاتا بلکہ دیگر قوموں میں بھی اس کا اطلاق کر دیا جاتا خیر اب یہ خوش آئند بات ہے کہ پارلیمنٹ اس خطرناک اقدام کی تلافی کر رہی ہے جو سپریم کورٹ نے کر کے ملت اسلامیہ بلکہ پورے ملک کو پریشانی میں ڈال دیا تھا۔

ندوۃ العلماء میں رابطہ ادب اسلامی کا بین الاقوامی اجلاس

۱۹۸۴ء میں حجاز مقدس مدینہ یونیورسٹی اور ریاض یونیورسٹی کے اساتذہ ادب اور سعودیہ کے ادباء کا وفد رابطۂ ادب اسلامی کی تجویز لے کر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے ملا اور صدارت کی درخواست کی مولانا نے ان کے اصرار پر صدارت قبول فرمائی، اسی ملاقات میں ندوۃ العلماء کو اس کا مرکز قرار دیا گیا، اسی کے بعد اس بین الاقوامی تنظیم کے اصول وضوابط کی ترتیب کا کام شروع ہوا، انہیں کو آخری شکل دینے کے لیے ۷/۸/۹/ جنوری ۱۹۸۶ء کو یہ کانفرنس منعقد ہوئی۔

۷/ جنوری کو لکھنؤ میں گہرا کہرا چھایا ہوا تھا جس کی وجہ سے کوئی عام اجتماع نہیں ہو سکا لیکن تمام نمائندگان دستور اساسی کو آخری شکل دینے میں مشغول رہے، ان نمائندوں کے اجتماعات تینوں دن جاری رہے جن میں دستور اور دیگر تنظیمی امور پر گفتگو جاری رہی۔

۸؍جنوری کو دس بجے تلاوت کلام پاک سے عام اجتماع کا آغاز ہوا، مرکزی دفتر کے سکریٹری راقم الحروف نے رپورٹ پیش کی پھر رابطۂ ادب اسلامی کے سکریٹری ڈاکٹر عبدالباسط بدر نے رپورٹ پیش کی، پھر صدر رابطۂ ادب اسلامی مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ہندوستان کے ''اسلامی ادبی اسکول'' کا مختصر تعارف اور اس کے امتیازات سے متعلق مقالہ پیش کیا، جناب شمس تبریز صاحب نے اس کا اردو خلاصہ سنایا پھر عمر بہاء الدین امیری نے تقریر کی انھوں نے اسلامی ادب کی اہمیت وضرورت پر گفتگو کی اس کانفرنس کی دعوت پر ندوہ اور اس کے ناظم کا شکریہ ادا کیا اور حکومت ہند کا بھی شکریہ ادا کیا، پاکستان میں ایک عرصہ تک سفیر رہنے کی وجہ سے عمر بہاء الدین صاحب اردو بھی سمجھتے اور بولتے ہیں، انھوں نے تھوڑی دیر اردو میں تقریر کی پھر عربی میں، قطر کے شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری نے اپنی تقریر میں ادباء وشعراء کو اسلامی تعلیمات اور اس کے متعین کردہ اخلاقی حدود کا خیال رکھنے پر زور دیا، مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی نے ان کی تقریر کا ترجمہ کیا، اس طرح ایک بجے ظہر کے اذان کے ساتھ یہ نشست ختم ہوئی۔

۸؍جنوری کو بعد نماز مغرب مشاعرہ ہوا، صدارت جناب عمر بہاء الدین نے کی اور نظامت کے فرائض شیخ محمد حسن بریغش نے انجام دیئے، اس میں معہد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں زیر تعلیم ایک طالب علم محمد اسماعیل نے اقبال کی نظم طارق کی دعا سنائی اور عرب حاضرین اردو نہ سمجھنے کے باوجود متاثر ہوئے، پھر ''روائع اقبال'' سے اس کا عربی ترجمہ پیش کیا گیا اس مشاعرہ میں عرب شعراء نے اپنے قصیدے سنائے۔

۹؍جنوری کو مقالات کی نشست تھی اس روز سمینار کے دو حصے کر دیئے گئے تھے ایک حصہ میں عربی زبان میں مقالات پیش کئے گئے اور ان پر مباحثہ ہوا، اس میں مندرجہ ذیل مقالے پیش ہوئے۔

۱۔ محمد اقبال اور محمد الزبیری، فکر وادب کی دو عظیم شخصیتیں۔

۲۔ مصر کا موجودہ عربی ادب اسلامی تنقید کی روشنی میں۔

۳۔ نقد ادبی کے اسلامی اقدار

۴۔ عرب قومیت اور اسلامی اتحاد: جدید عربی ادب کی روشنی میں۔
۵۔ نوجوانوں کی تربیت میں کہانیوں اور افسانوں کا کردار۔
۶۔ ادبی موضوعات
۷۔ ادب میں اسلامیت: حقیقت اور عزائم
۸۔ ادبی تنقید کا اسلامی معیار
۹۔ عربی زبان میں غیر عربی تعبیرات

سمینار کا دوسرا حصہ جس میں اردو اور انگریزی میں مقالے پیش کئے گئے جس کی صدارت سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دارالمصنفین اور سید حامد سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے کی نظامت کے فرائض سید ضیاء الحسن ندوی اور نذر الحفیظ ندوی نے انجام دیئے، اس میں پیش کئے گئے مقالوں کے عناوین یہ ہیں:

۱۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، لمحہ فکریہ
۲۔ سید محی الدین، اسلامی تاریخ میں ادبی علامتوں کی تلاش۔
۳۔ عبیداللہ کوٹی ندوی نقد ادب کے اسلامی اقدار
۴۔ محمد عارف عمری ادب اور عقیدہ
۵۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی، قرآن میں عملی اور نظری تنقید
۶۔ ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی، جمہرۃ البلاغۃ کا تنقیدی مطالعہ
۷۔ ڈاکٹر ظفر احمد ندوی، علامہ شبلی اسلام اور ادب کا بہترین امتزاج
۸۔ ہندوستان میں عربی شاعری (انگریزی) ڈاکٹر اعجاز احمد ندوی
۹۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے عربی حروف ہجا کی اہمیت (انگریزی) سرفراز احمد۔

وقت کی کمی اور مقالات کی کثرت کی وجہ سے بعض اہم مقالات پڑھے نہیں جاسکے، ان میں دو اہم ترین مقالے سید حامد صاحب اور سید صباح الدین صاحب کے تھے، ان کے علاوہ شمس تبریز، عتیق احمد قاسمی، عمیر الصدیق ندوی کے مقالے بھی نہیں پڑھے جاسکے۔

مقالات و مضامین کا سلسلہ ایک بجے تک جاری رہا، اخیر میں صدر رابطۂ ادب

اسلامی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی اختتامی تقریر پر کانفرنس ختم ہوئی، مولانا نے مندوبین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''آپ حضرات نے رابطۂ ادب اسلامی قائم کرکے پوری دنیا کے مسلمانوں اور اسلام کی عظیم خدمت انجام دی ہے، آپ کے اس کارنامہ کا مسلمانوں پر گہرا اور خوشگوار اثر پڑے گا، اور آپ کی یہ کانفرنس اس صدی کی تاریخ میں اور اسلامی بیداری کی تاریخ میں اہم مقام حاصل کرے گی۔''

بابری مسجد کا مسئلہ

بابری مسجد کے سلسلہ میں شروع سے آخر تک جو حالات پیش آئے اس نے پوری امت کو ہلا کر رکھ دیا، ہندو مسلم منافرت (دشمنی) میں اضافہ کیا، حالانکہ مسئلہ ناقابل حل نہ تھا ،اس کا بہتر حل یہی تھا کہ مسلمانوں کے آثار قدیمہ مسجدیں اور تاریخی مقامات کے سلسلہ میں جو ضابطہ مقرر شدہ تھا کہ آزادی کے وقت جس کی جو پوزیشن ہے وہ برقرار رہے گی، اس طرح دوسری قدیم مسجدوں کے مسائل پر یہ مسجد بھی باقی رکھی جائے، اور اس میں ردوبدل کی بات نہ سوچی جائے، لیکن ایسا نہیں ہوا، بلکہ برسراقتدار لوگوں کو اپنی سیاسی ترقی اور کامیابی کے لئے اس کو ذریعہ بنایا گیا، اور تحریکی انداز میں اس مسجد کو جھگڑے کا ذریعہ بنادیا گیا، بالکل شروع میں برسراقتدار لوگوں کے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ دیگر آثار قدیمہ کی طرح اس مسجد کو بھی آثار قدیمہ میں سمجھا جائے جس کو بعض لوگوں نے ظاہر بھی کیا تھا، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اس وقت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی سے ایک ملاقات میں اس کی طرف توجہ دلائی تھی کہ اس عمل کو اختیار کیا جائے اور اس جگہ کو آثار قدیمہ کے اصول کے مطابق کردیا جائے، بات حل ہوجائے گی، ورنہ یہ بتدریج سیاسی لوگوں کے ہاتھ میں مسئلہ چلا جائے گا، انہوں نے ہاں نہیں کا اظہار نہیں کیا، پھر ایک روز دیکھا کہ ندوہ کے سامنے پشتہ (باندھ) پر سیکورٹی کی ایک ٹیم کھڑی ہے، ہمیں تعجب ہوا کہ یہاں کیا خطرہ محسوس کیا گیا، لیکن کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا کہ مسجد کا تالا کھول دیا گیا ہے، میں نے اپنے

تعلق کے لوگوں کے ذریعہ ایک چھوٹی نشست منعقد کرائی کہ قانونی طور پر اس کے وقف ہونے کے جو کاغذات ہیں، وہ حاصل کر کے جو قانونی ذریعہ بنتا ہو وہ اختیار کیا جائے، اس کو قبول کیا گیا، لیکن کچھ عرصہ تک کچھ عمل نہیں ہوا، پھر اچانک یہ مسئلہ تحریکی طور پر اختیار کیا گیا اور مسئلہ سڑک پر آ گیا ہے، اور ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوگئی، جیسا کہ معلوم ہے کہ باقاعدہ طور پر فوج اور پولس لگانے کے باوجود ۶ ردسمبر ۱۹۹۲ء کو مسجد گرادی گئی، اس سے جو تکلیف مسلمانوں کو پہونچی اور کھلی زیادتی نظر آئی، اس کی بنیاد پر مسلمانوں نے قانونی راہ سے جو کر سکتے تھے، وہ کرنا شروع کیا، اس سے قبل ملت کے کئی سربراہ جن میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی بھی تھے، ہندو مذہبی ذمہ داروں سے ملے، جن میں مدراس کے شنکر اچاریہ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، حضرت مولانا کے ساتھ مولانا عبدالکریم پاریکھ، اور جناب یونس سلیم مرحوم گورنر بہار اور کرشن کانت گورنر آندھرا پردیش جو بعد میں نائب صدر جمہوریہ ہوئے، پیش پیش تھے، اور ایسی تجویز پر اتفاق رائے ہو رہا تھا کہ مسجد پوری طرح محفوظ رہے، اور مندر الگ تعمیر ہو جائے، خود اس وقت ہندوؤں کا بڑا طبقہ مسجد گرانے کے حق میں نہ تھا، مگر شدت پسند لوگوں نے اس کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا، پہلے رتھ یاترا نکال کر فضا کو خراب کی گئی اور پھر وی پی سنگھ حکومت سے ہاتھ کھینچ کر صورت حال خراب کی اور اس مسئلہ سے سیاسی فائدہ اٹھانے کا عمل گرم کیا، مسجد گرانے کے بعد جمعیۃ علماء ہند اور مسلم پرسنل لاء بورڈ نے پوری کوشش کی کہ عدالت اس سلسلہ میں فیصلہ کرے کہ کون فریق حق پر ہے، ظاہری آثار و مقدمات کی روداد سے ایسا لگ رہا تھا کہ مسلمانوں کے حق میں فیصلہ ہوگا کہ مسجد مندر کی جگہ یا متنازعہ مقام پر نہیں بنائی گئی، اور اس پر مسلم اور ہندو اسکالرز کی اہم کتابیں بھی سامنے آ چکی تھیں، جن میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب اور ہمارے مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سکریٹری جناب عبدالرحیم قریشی مرحوم کی کتاب بڑی اہمیت کی حامل دستاویزی کتاب ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے راجیو گاندھی سے یہ بات کہی تھی جب وہ وزیر اعظم تھے اور بابری مسجد کا مسئلہ نیا نیا سامنے آیا تھا کہ یہ اعلان کر دیجئے کہ

۱۹۴۷ء میں جو پوزیشن تھی وہی پوزیشن بابری مسجد کی اور دوسری مساجد کی رہے گی ورنہ یہ مسئلہ سیاسی بن کر الجھ جائے گا اور بابری مسجد گر جانے کے بعد ان کی سربراہی میں ایک مؤقر مسلم قائدین کا وفد وزیر اعظم نرسمہا راؤ سے ملا تو وہاں بھی انہوں نے صاف اور واضح موقف رکھا، مگر وہ خاموش اور بے بس نظر آئے۔

بعض تجزیہ نگار حضرات نے لکھا کہ شاہ بانو مطلقہ نان ونفقہ کیس میں کانگریس حکومت کا مسلم قائدین کی بات تسلیم کر لینے اور اس سلسلہ میں شریعت بل پارلیمنٹ میں پاس کرانے پر ہندوؤں کی ناراضگی دور کرنے کے لئے اجودھیا کا پرانا مسئلہ زندہ کیا، جو ۱۹۴۹ء میں بابری مسجد میں مورتی رکھے جانے پر کورٹ سے حکم امتناعی کے نتیجہ میں مسجد کو بند کر دیا گیا تھا، یکم فروری ۱۹۸۶ء کو ڈسٹرکٹ جج کے ایم / پانڈے نے ایک دن پہلے ۳۱/ جنوری ۱۹۸۶ء کو دائر اپیل کی سماعت کے دوران تقریباً ۳۷ برس سے بند بابری مسجد کا دروازہ کھلوایا تھا، یوپی میں ویر بہادر سنگھ کی حکومت تھی، ان کی طرف سے کوئی ردعمل نہ آنے پر اس بات کو تقویت ملی۔

بعد میں یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ یہ ایک فرضی بات تھی، میڈیا اور فرقہ پرست تنظیموں نے چلائی اور حکومت ہند اپنا کوئی واضح موقف نہ پیش کر سکی اس لئے کہ وہ دونوں طبقوں کو خوش رکھنا چاہتی تھی کہ جس مقام پر بابری مسجد تعمیر کرائی گئی تھی وہ مندر کو توڑ کر یا مندر کی جگہ نہیں بنائی گئی لیکن ہندوؤں کے جذبات اور آستھا کو ٹھیس نہ پہونچے اس لئے پہلے ہائی کورٹ نے اور پھر سپریم کورٹ نے اس کے حق میں فیصلہ دے دیا حالانکہ فیصلہ سے بہت پہلے ہی کانگریس نے شیلانیاس کی تقریب بھی متنازعہ آراضی میں منعقد کروائی تھی اور اس میں خود وزیر اعظم نے شرکت کی تھی اور جب مسجد کے انہدام کا واقعہ پیش آیا، تب بھی مرکز میں حکمراں پارٹی کانگریس ہی تھی یاللعجب۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کا بیان

اس موقع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بابری مسجد کے قضیہ کے تعلق

سے ایک بیان جاری فرمایا، جو حسب ذیل ہے:

''اجودھیا کی بابری مسجد کے سلسلہ میں یک طرفہ فیصلہ سے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو غیر معمولی صدمہ ہوا ہے، ایسے حالات میں جبکہ مسلمانوں کے جذبات پرسنل لاء کے مسئلہ پر مجروح ہیں اور ان کی تمام تر جدوجہد اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھنے اور دینی شعائر کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے ہورہی ہے، بابری مسجد پر پڑے ہوئے تالہ کو کھول کر اسے دوسرے فرقہ کو پوجا اور درشن کی کھلی اجازت دینا، اور اس مسجد پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنے کا حکم دینا، کسی طرح دانشمندانہ اقدام سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ اس اقدام سے خطرہ ہے کہ مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو جائیں اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں کہ اس ملک پر صرف ایک فرقہ کی حکومت ہے، اور طاقت کے بل بوتے پر یک طرفہ فیصلے کر کے دوسرے کے حقوق کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

بابری مسجد کے بارے میں یہ تاریخی حقیقت ہے کہ وہ مسلمانوں کی ملکیت اور ان کی مسجد ہے، جس میں ساڑھے چار سو سال سے زائد عرصہ سے نمازیں ادا کرتے رہے ہیں، مسلمانوں میں اس اقدام سے اشتعال کا ہونا فطری بات ہے، اور یہ ان کی دینی غیرت وحمیت کی دلیل ہے، البتہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ فرقہ پرست عناصر کے اشتعال انگیز نعروں سے متاثر نہ ہوں، اس سے حالات مزید بگڑ جائیں گے، انہیں چاہئے کہ اپنی صفوں کو متحد رکھیں، اور جس طرح انہوں نے مسلم پرسنل لاء کے سلسلہ میں اپنے بے مثال اتحاد کا مظاہرہ کیا ہے، اسی طرح انھیں ان جیسے نازک مسائل کے بارے میں اپنے اتحاد کے مظاہرے کے ساتھ دانش مندانہ اور ٹھوس قدم اٹھانا چاہئے اور حکومت وانتظامیہ کو وہ یہ باور کرائیں کہ اقلیتوں پر ظلم وزیادتی اور خاص طور سے ان کی عبادت گاہوں پر قبضہ برداشت نہیں کیا جائے گا، یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اگر حکومت نے مسلمانوں کے جذبات کا احترام نہ کیا، اور بابری مسجد کے سلسلہ میں کئے گئے حالیہ اقدامات واپس نہ لئے تو اس کے نتائج بڑے سنگین اور خطرناک ہو سکتے ہیں۔

اس مسئلہ پر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے اپنے حالیہ اجلاس دہلی میں ایک

تجویز منظور کر کے اخبارات کو اشاعت کے لیے ارسال کیا ہے۔ (تعمیر حیات ۲۵؍فروری ۱۹۸۶ء)

ترکی میں رابطہ ادب اسلامی کی اہم کانفرنس

رابطۂ ادب اسلامی کی مجلس امناء کا دوسرا اجلاس ۱۴، ۱۵، ۱۶؍شوال ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۱، ۲۲، ۲۳؍جون ۱۹۸۶ء کو ترکی کے سب سے بڑے شہر استنبول میں ہوا، جس میں سعودی عرب، شام، اردن، فلسطین اور مراکش سے مجلس امناء کے ارکان شریک ہوئے، ہندوستان سے رابطۂ ادب اسلامی عالمی کے سربراہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور رابطہ کی مقامی شاخ کے ذمہ دار کی حیثیت سے کاتب تحریر شریک اجلاس ہوئے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی صدارت میں نشست کی کاروائی ہوئی، مولانا نے افتتاحی خطاب میں حمد وصلوٰۃ کے بعد فرمایا:

''یہ نشست صحیح وقت پر اور صحیح جگہ پر ہورہی ہے، کیونکہ استنبول آخری اسلامی خلافت، خلافت عثمانیہ کا مرکز رہا ہے، جہاں سے ایک طویل عرصہ تک مسلمانوں کو اپنے عقیدہ پر مستحکم رہنے اور اسلام کو زندگی کے تمام میدانوں میں جاری وساری کرنے کی دعوت دی جاتی رہی ہے۔''

سکریٹری مجلس امناء ڈاکٹر عبدالباسط بدر (استاذ ادب عربی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ) نے نشست کا ایجنڈا پیش کیا، اور دیگر ممبران کی تائید کے بعد اسی کے مطابق کاروائی ہوئی۔

سب سے پہلے ہندوستانی دفتر کی طرف سے رابطہ کے قیام سے اب تک کی کارگزاری رپورٹ ہندوستانی شاخ کے سربراہ کاتب تحریر نے پیش کی، دفتر کی کارگزاری کے ساتھ ۱۳۱؍افراد پر مشتمل ہندوستان کے ادباء واہل قلم کی فہرست پیش کی، جن کو رابطہ کی مجلس امناء نے رابطہ کے ممبر کی حیثیت سے منظور کیا، اس کے بعد استاذ محمد حسن بریغش نے ممالک عربیہ سے متعلق دفتر کی کارگزاری رپورٹ پیش کی، اس پر بحث ومباحثہ ہوا، رابطہ کی مجلس امناء نے ایک قرارداد میں اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ عالم اسلام اور اسی طرح دوسرے

اسلامی ممالک کے اسلام پسند ادیبوں کو رابطہ کے اغراض و مقاصد سے روشناس کرانے اور ان کو تنظیم میں شامل کرنے کی جدوجہد کی جائے گی، ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ رابطہ کے دستور اساسی میں ممبری کے لئے جن بنیادوں اور شرائط کا تذکرہ ہے ان کا لحاظ رکھا جائے گا، اور جس ملک میں رابطہ کے ممبران کی تعداد تیس (۳۰) سے اوپر ہو جائے، وہاں شاخ قائم کی جاسکتی ہے، اسی طرح کسی شہر میں ممبران کی تعداد ۱۵؍ تک پہونچ جائے تو وہاں رابطہ کا شعبہ قائم کیا جاسکتا ہے، مجلس امناء نے ہندوستان اور عرب میں اپنے دفتروں پر زور دیا ہے کہ اسلامی رجحانات رکھنے والی خاتون ادیبات کو رابطہ کا ممبر بنانے کی کوشش کریں۔

رابطہ کے پہلے اجلاس میں صدر رابطہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت وخدمات سے متعلق ایک کتاب مرتب کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا، حالیہ اجلاس نے اس کام کو مکمل کرنے کا فیصلہ کیا، اسی طرح رابطہ کا نشرہ (بلیٹن) عربی اور دوسری زبانوں میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا، ادب اسلامی سے متعلق منتخب مقالات پر مشتمل ایک کتاب شائع کرنے کا بھی فیصلہ ہوا، اور آخر میں صدر رابطہ کی دعا پر نشست کی کاروائی اختتام کو پہونچی۔

مجلس امناء کی نشست کے علاوہ ترک ادیبوں و اہل قلم کے ایک بڑے اجتماع کے سامنے رابطۂ ادب اسلامی کا تعارف کرایا گیا اور ترک ادباء نے اس سے دلچسپی لی، اسی طرح مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے کئی اجتماعات سے خطاب بھی کیا، عمومی طور پر اسلام پسند ادیبوں کا یہ اجتماع ادبی اعتبار سے بھی اور دعوتی اعتبار سے بھی بہت مفید رہا۔

کاتب تحریر نے اپنے اس سفر ترکی کے حالات وتأثرات مرتب کیے جو ''ترکی میں ایک ہفتہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ہمراہ'' کے عنوان سے ''تعمیر حیات'' میں شائع ہوئے، اور پھر کتابی صورت میں بھی مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے طبع ہوئے، اس سے رابطۂ ادب اسلامی کی کارگزاری بھی سامنے آجاتی ہے جو پچھلے دنوں کی ہے، اس کی ایک خاص بات یہ بھی رہی کہ ۱۷؍ شوال ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۴؍ جون ۱۹۸۶ء کو مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے ابنائے باسفورس کے ایشیائی ساحل پر ایک بلند مقام پر جہاں سے استنبول (قسطنطنیہ) کا عظیم تاریخی شہر نظر آتا تھا، ایک چیدہ مجمع کے سامنے تقریر کی، جس میں ترک

ادباء واساتذہ، ایک سابق وزیر اور مشرق وسطی کے مشہور عرب ادیب ومصنف محمد قطب (برادر سید قطب شہید) بھی موجود تھے، مولانا نے وہ دن ترکی کی عثمانی خلافت کے اسلامی آثار اور عظیم الشان مساجد کی زیارت اور ترکی کی مغربیت سے دوری کے مناظر دیکھنے کے سلسلہ میں گذارا، ان متضاد تأثرات ومشاہدات نے ان کے دل ودماغ میں جو خیالات وتفکرات پیدا کئے، پھر ان پر قرآن وایمان نے جو جلا بخشی، اس کے نتیجہ میں یہ تقریر دل پذیر ہوئی جس کا آخر کا اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ایک طرح کی ترکی والوں کو ان کے صبر واستقامت کی بشارت ہے، فرمایا:

"موت وحیات جس کا چکر انسانی زندگی اور بشری تاریخ میں چلتا رہتا ہے، وہ کسی فرد وجماعت کے لئے ابدی ودائمی نہیں، بلکہ ان کی حیثیت عارضی وعبوری ہوتی ہے، اور وہ زندگی کے بہت سے بدلتے رہنے والے مرحلوں میں سے ایک مرحلہ ہوتی ہیں، اس لئے جب کبھی غنودگی یا وقتی موت طاری ہوگی تو اللہ کی عنایت سے اس کے بعد بیداری اور زندگی بھی پیدا ہوگی۔

میرا یہ پختہ خیال ہے کہ مسلم اقوام وممالک اس وقت نازک اور بحرانی دور سے گذر رہے ہیں، وہ دراصل ایک وقتی وعبوری زمانے سے گذر رہے ہیں اور ان شاء اللہ وہ مستقبل قریب میں اسلام کے سایہ تلے ہوں گے، خصوصاً عالم اسلامی کا یہ ملک، اسلام کا جو علم وفہم اور اسلام سے جو شیفتگی وفریفتگی اور اس کے لئے فداکاری وجاں نثاری کا جو ناقابل تسخیر جذبہ رکھتا تھا، اور انسانی قیادت کے جس بلند مقام پر تھا، اسی پر ان شاء اللہ پہنچ کر رہے گا۔" (تعمیر حیات، ۱۰ر اگست ۱۹۸۶ء ص ۱۱)

ڈاکٹر عبد الرحمٰن رافت پاشا کا انتقال (۱۸ر جولائی ۱۹۸۶ء)

عربی کے مشہور اور اسلامی فکر کے ادیب، مصنف واستاذ ادب ڈاکٹر عبد الرحمٰن پاشا کے انتقال کی خبر یہاں ندوۃ العلماء میں بڑے رنج وغم کے ساتھ سنی گئی، اور ان کے انتقال کو صرف عربی ہی نہیں بلکہ اسلامی ادب کے لئے زبردست خسارہ قرار دیا گیا۔

۲۹ر جولائی ۱۹۸۶ء کو بعد نماز مغرب ندوۃ العلماء کی مسجد میں تعزیتی جلسہ ہوا جس

میں حاضرین نے اس حادثہ پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا، مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی گئی اور ایصال ثواب کا بھی انتظام کیا گیا، ڈاکٹر عبدالرحمٰن باشا کا انتقال استنبول (ترکی) میں ہوا جہاں وہ اس وقت علاج کے لئے گئے ہوئے تھے اور انہیں استنبول کے رابطہ ادب اسلامی کی عاملہ کے پہلے مشاورتی اجلاس میں شرکت بھی کرنی تھی جو وہاں ۲۱،۲۲،۲۳ رجون ۱۹۸۶ء کو منعقد ہوا تھا مگر وہ اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے لیکن قضا انہیں چند ہی دنوں میں استنبول لائی جہاں ۱۸ رجولائی ۱۹۸۶ء کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

ندوۃ العلماء کے تعزیتی جلسہ میں تمہیدی بات راقم کی ہوئی اور اس نے ان کی خدمات وکمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ندوۃ العلماء سے بڑا تعلق رکھتے تھے، انہوں نے مولانا کی اسلامی ادب پر دعوت کو لبیک کہا اور اس کو اپنا لیا، چنانچہ انہوں نے خود مسلم نوجوانوں کے لئے صور من حیاۃ الصحابۃ کتابوں کا ایک سلسلہ تیار کرایا اور اسی کے ساتھ انہوں نے تحقیق وریسرچ کرنے والے اپنے طلبہ کے لئے "شعر الدعوۃ الإسلامیۃ" کے عنوان سے چھ جلدیں تیار کرائیں، علمی خدمات کے ساتھ وہ نہایت خلیق اور وسیع القلب تھے۔ (تعمیر حیات ۱۰ ر اگست ۱۹۸۶ء)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے جو اہم بات رابطۂ ادب اسلامی کے قیام وتاسیس اور اس کی فکر کی اشاعت کے متعلق فرمائی وہ درج کی جاتی ہے۔

انہوں نے فرمایا:

"ہمارا تعارف ان کی زندگی کے آخری برسوں میں ہوا جس کی مدت بہت طویل نہیں ہے، لیکن بہت جلد ہمارے ان کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم ہو گیا جو صرف ادبی اور علمی رشتہ نہیں تھا، بلکہ دوستانہ اور برادرانہ رشتہ بھی تھا، میں ان کی شرافت سے بہت زیادہ متاثر ہوا، ادب اسلامی میں ندوۃ العلماء کا اور ندوۃ العلماء کے کارکنوں کا جو حصہ ہے، اس کا انہوں نے بڑی فراخ دلی بلکہ جرأت اور شرافت کے ساتھ اعتراف کیا اور حقیقت میں اس وقت رابطۂ ادب اسلامی کی جو تحریک ہے، وہ ان کی ہی رہین منت ہے۔

انہوں نے اس کی طرف توجہ دلائی اور خود بھی وہ کوشش کرتے رہے اور اس کو ایک

ادارے کی حیثیت سے اور تحریک کی حیثیت سے لینے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے، جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی اسی موضوع پر گفتگو ہوتی تھی، وہ یہاں رابطہ ادب اسلامی کے جلسہ میں آئے اور انہوں نے جلسہ کی رہنمائی کی، اور بڑی اچھی قیادت کی، اس کو صحیح رخ پر رکھا، اور وہ اس کے بعد بھی برابر اس تحریک سے وابستہ رہے، اور ہمارے ساتھیوں اور عزیزوں اور ان کے درمیان برابر رابطہ رہا، اور ہم بڑی امیدیں رکھتے تھے کہ ان کا کام اور وسیع ہوگا اور زیادہ ہوگا،، کیوں کہ ان کا شب وروز کا مشغلہ اور گویا ان کا وظیفہ یہی تھا، اور ہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے وقت کا ایک جہاد اور دعوت کا کام سمجھ کر اس کو انجام دیا اور یہ بھی ایک نیک فال اور بشارت ہے۔" (تعمیر حیات (۲۵ / اگست ۱۹۸۶ء)

مولانا محمد عمران خاں ندوی کا سانحۂ وفات

مولانا محمد عمران خاں ندوی بھوپالی سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء امیر دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کا سانحۂ وفات دینی حلقوں کے لئے اور خاص طور پر ندوۃ العلماء اور اس کے متعلق لوگوں کے لئے بہت محسوس کیا جانے والا سانحۂ وفات تھا، جو ۱۸/ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو طویل علالت کے بعد بھوپال میں پیش آیا، وہ اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں اور ممتاز دینی خصوصیات وصفات کے حامل بزرگ تھے اور حضرت شاہ محمد یعقوب مجددیؒ سے انہیں اجازت وخلافت بھی حاصل تھی، تاج المساجد بھوپال کی تعمیر نو کا عمل ان کا کارنامہ اور یادگار ہے جس کو انہوں نے اپنے شیخ حضرت شاہ یعقوب صاحب مجددی (م ۱۹۷۰ء) کے کہنے پر پوری ہمت اور قوت وحوصلہ سے شروع کیا اور وہ کام کیا جو امراء وسلاطین کرتے ہیں، پھر دارالعلوم وہاں قائم کر کے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب کو وہاں جاری کیا اور سہ روزہ سالانہ عالمی تبلیغی اجتماع کے انعقاد کی بنا ڈالی جس میں مرکز نظام الدین دہلی کے اکابر کی شرکت کو یقینی بنانے کے ساتھ ملک کی اہم دینی شخصیات کو مدعو کرنے اور خطاب کرنے کا بھی موقع دیتے تھے، پھر یہ اجتماع نظام الدین مرکز کے اصولوں اور انتظام کے تحت مکمل طور پر انجام پانے لگا، اور اس اجتماع کی ہی ایک الگ کمیٹی بنائی گئی، دارالعلوم ندوۃ

العلماء کے پچاسی ۸۵ سالہ جشن تعلیمی کے انعقاد کا فیصلہ کیا تو ناظم اجلاس مولانا مرحوم کو بتایا گیا جو ان کے نظم ونسق کی اعلیٰ مثال کہا جائے گا۔

ہمارا ان سے تعلق زمانۂ طالبعلمی سے تھا کہ وہ مہتمم تھے اور ناظم میرے بڑے ماموں مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنی صاحب تھے، جن کے پاس کاغذات وغیرہ پر دستخط کے لئے گھر تشریف لاتے تھے، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نائب ناظم ونائب معتمد اور پھر علامہ سید سلیمان ندوی کے پاکستان ہجرت کر جانے پر معتمد تعلیم ہوئے تھے جو ان کے معاصر وہم درس ورفیق تھے، پھر باقاعدہ دارالعلوم میں میری ملازمت وخدمات تدریسی اور اس میں ترقی کا ذریعہ بھی مولانا محمد عمران خاں صاحب بنے، اور آخر تک ان کی مجھے بڑی شفقت حاصل رہی ان کی وفات سے ایسا لگا کہ میرے سرپرست نہیں رہے، رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ ومغفرۃ۔

ان کی احسان شناسی وجذبۂ شکر واحسانمندی کی یہ واضح مثال یہ بھی سامنے آئی کہ انہیں اپنے محبوب استاد اور دارالعلوم ندوۃ العلماء سے انتظامی وابستگی کے دوران اس کے معتمد تعلیم مولانا سید سلیمان ندوی کی شخصیت اور علمی ادبی کمالات، ملی ودعوتی خصوصیات اور شخصی صفات وامتیازات پر ایک بڑا اجلاس بھوپال دارالعلوم تاج المساجد کے زیر اہتمام منعقد بھی کرایا، جو ان کی وفات کے پچاس سال کے عرصہ کے گذرنے پر ہوا تھا، جس میں پیش کئے گئے مقالات کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

انہیں حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی بھی شفقت حاصل ہوئی تھی، اور اس کا انہیں ہمیشہ خیال بھی رہا اور تبلیغی جماعت سے ان کی ہمیشہ دینی وعلمی وابستگی بھی رہی۔

اس کا ان کی وفات پر بھوپال میں کھل کر اعتراف کیا گیا، ان کا پورا خاندان علمی خانوادہ ہے، جس کے اکثر افراد حافظ قرآن بھی ہیں، اور اکثر ندوۃ العلماء کے فاضل وتعلیم یافتہ ہیں، اور علم ودین وادب ودعوت سے جڑے ہوئے ہیں۔

ندوۃ العلماء میں امام حرم اور رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے وفد کی آمد

یکم نومبر ۱۹۸۶ء کو دن میں رابطۂ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر

نصیف اور امور حرمین شریفین کے نائب مدیر امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السبیل اور ہندوستان میں متعین سعودی عرب کے سفیر جناب صادق فواد مفتی اور ان کے ہمراہ آنے والے وفد کے اعزاز میں ایک جلسہ ہوا جس کی نظامت کی ذمہ داری راقم اور مولانا عبداللہ عباس ندوی پر ڈالی گئی، اس جلسہ کے لیے دار العلوم کے عقب میں میدان میں ایک وسیع شامیانہ لگایا گیا تھا، جس میں گورنر اتر پردیش جناب عثمان عارف اسپیکر یوپی اسمبلی جناب نیاز احمد خاں، مرکزی وزراء، صوبائی وزراء، سرکاری ذمہ داروں کے علاوہ علماء، عمائدین شہر، سماجی کارکن، دعوت و تعلیم سے جڑے حضرات، دانشور اور اساتذہ مدارس بڑی تعداد میں موجود تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے استقبالیہ کلمات میں جو کہا جو ہم سب کے احساسات تھے، انہوں نے فرمایا کہ:

''میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ جب تک مسلمانوں کا تعلق حرمین شریفین سے ہے اور قرآن کریم سے ہے، عربی زبان سے ہے تو ان کو نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ خوف، ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ عربی زبان، نحو، صرف اور اس کے قواعد سے واقف ہوں اور حرمین شریفین سے اپنا تعلق برقرار رکھیں، اس سے قوت ونشاط اور غیرت ایمانی حاصل کریں، یہ ہمارے لئے، اہل ندوہ کے لئے اور اہل لکھنؤ کے لئے اور اہل ہندوستان کے لئے سعادت وشرف کی بات ہے کہ یہاں امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السبیل اور عالم اسلامی کی سب سے بڑی تنظیم رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف تشریف لائے، یہ ہم سب کے لئے عزت وافتخار کا مقام ہے کہ یہاں پر دین ودنیا دونوں کی قیادت جمع ہوگئی ہے اور اس مملکت کے سفیر جو خادم الحرمین الشریفین کے نمائندہ ہیں تشریف لائے ہیں''۔

اور آیت پاک ''جعل اللہ البیت الحرام قیاماً للناس '' سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ اللہ نے کعبہ کو قیام للناس بنایا ہے، یعنی اللہ نے کعبہ کو لوگوں کی زندگی کا دارو مدار بنایا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ نظام عالم حقیقتاً بیت اللہ شریف سے وابستہ ہے، نہ حکومتوں سے مربوط ہے، نہ تنظیمات سے، نہ فوجی طاقت سے، اور نہ اخلاقی فلسفوں سے، اور نہ تہذیبوں وعلمی درسگاہوں اور مرکزوں سے نظام عالم جہاں تک ہماری نگاہیں نہیں پہونچ سکتیں، مربوط ہے اس دعوت سے جس کے

لئے بیت اللہ قائم ہوا، وہ دعوت ہے دعوت توحید اور صحیح اسلامی معاشرہ، اس کا قرآن مجید میں اشارہ اس طرح ملتا ہے: "واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا البلد آمنا واجنبنی وبنیَّ ان نعبد الاصنام" (اور جب ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ پروردگار! اس شہر یعنی مکہ کو امن کا شہر بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا)۔

اور حاضرین محفل سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے ان حضرات کو صرف زیارت کرنے اور دارالعلوم دکھانے کے لئے نہیں بلایا ہے، اس کی دور دور الحمد للہ شہرت ہے، ہم نے اس لیے بلایا کہ ہم آپ کی وہ خدمت نہیں پا رہے ہیں جو آپ چاہتے ہیں کہ ہم میں نہ وہ روحانیت ہے، نہ وہ برکت ہے جو ہمارے بزرگوں میں تھی، اس لئے ہم ایسی بابرکت ہستیوں کو بلاتے ہیں، تو اب آپ کے سامنے حرم شریف کے مہمان ہیں، آپ اس کا یہ پیغام لے کر جائیں کہ ہماری پوری زندگی اسلامی شریعت کے مطابق ہوگی، جہاں بھی آپ ہوں ملی تشخص کو قائم رکھیں، اور پھر آگے بڑھ کر اس ملک کی اخلاقی قیادت کے لئے کھڑے ہو جائیں، اور یہ بات کریں کہ آپ کے ہوتے ہوئے یہاں کسی قوم کو کسی خطرہ کا سامنا نہ ہو۔"

امام حرمین شریفین شیخ محمد بن عبد اللہ السبیل نے اس کے جواب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خدمات کا تذکرہ کیا، اور خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد بن عبد العزیز کا سلام پہونچایا، اور توحید، تقویٰ، اور والدین کے حقوق کی ادائیگی اور دینی تعلیم کی قدر کی طرف توجہ دلائی، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور ان کے حرمین شریفین سے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:

"میں خوش قسمت ترین انسان ہوں کہ آپ کے درمیان بیٹھا ہوں میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے یہ قیمتی موقع عنایت فرمایا کہ آپ سے گفتگو کروں، ان کو حرمین شریفین سے، وہاں کے رہنے والوں سے، وہاں کے ذرہ ذرہ سے، وہاں کی خاک سے جو غیر معمولی محبت و تعلق ہے، یہ خالص ان کے دینی عقیدہ کی برکت ہے، اور اسی عقیدہ کی برکت کی وجہ سے انہوں نے جو الفاظ کہے ہیں اور جس طرح جزیرۃ العرب اور حرمین شریفین کی تعریف کی، یہ ان کی محبت اور دینی غیرت کی علامت ہے

کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین کو ہمارے سامنے پیش کیا تھا اور جس پر صحابہ کرام چلتے تھے، اور جس کا نمونہ پیش کیا تھا، آپ اسی دین کے داعی ہیں اور اسی دین کے حامل ہیں، اور اسی دین کو لے کر ساری دنیا میں چل رہے ہیں"۔

آخر میں امام حرم نے یہ وصیت فرمائی، اسی پر اپنی بات ختم کی کہ:

"حضرات! آپ ایسے ملک میں رہتے ہیں، جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہے، آپ کو اپنے معاملات، اخلاق، اقوال و وفا شعاری اپنی سچائی سے، اپنے حسن سلوک اور اپنے حسن اطوار سے اچھا نمونہ پیش کریں، تاکہ اپنے برادران وطن پر اس کا اچھا اثر پڑے اور آپ کے نمونوں سے ان کی زندگی متاثر ہو، اور اپنے صبر و تحمل کا ایسا مظاہر کریں کہ اہل ملک اس سے اثر لئے بغیر نہ رہ سکیں۔"

ڈاکٹر عبداللہ نصیف جنرل سکریٹری رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے اپنے خطاب میں کہا کہ:

"بہت دنوں سے میری یہ تمنا تھی کہ میں اس ادارہ "ندوۃ العلماء" کی زیارت کا شرف حاصل کروں لیکن اللہ کے یہاں یہی مقدر تھا کہ میں اس وقت حاضر ہوں، میں اس ادارہ سے بہت پہلے سے واقف ہوں جب میں برطانیہ میں زیر تعلیم تھا، میرے پاس یہاں کے مجلات وجرائد "البعث الاسلامی، والرائد" پہونچتے تھے، اور ان سے اسلامی فکر وثقافت حاصل کرتا تھا، اور فائدہ اٹھاتا تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی کوشش تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔"

ٹیلہ شاہ پیر محمد میں اہالیان لکھنؤ کی جانب سے اس مؤقر وفد اور عظیم مہمان حرم کو سپاس نامہ بھی پیش کیا گیا جو شہر کی اہم اور سر کردہ شخصیت صدر مجلس استقبالیہ ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کی جانب سے تھا، سکریٹری استقبالیہ مولوی سید محمد حمزہ حسنی ندوی نے شکریہ کے کلمات کہے۔

اس سے قبل جمعہ کے روز اور امام حرم نے لاکھوں کے مجمع کو جو قرب وجوار اور دور دراز جگہوں سے جمع ہو گیا تھا، نماز پڑھائی اور خطبہ دیا جس کا فصیح اردو ترجمہ بھی ہوا، اور بعد نماز مغرب مسجد دارالعلوم میں طلبہ واساتذہ کو درس قرآن دیا جو سورہ فرقان کے آخری رکوع کا درس تھا، اخبارات نے بھرپور رپوٹنگ کی، جمعہ سے قبل خیر مقدمی پروگرام بھی ہوا تھا جو

جمعہ سے پہلے مسجد دارالعلوم کے بالائی حصہ کے کنارے ہوا تا کہ لاکھوں کا مجمع جوان کے استقبال کے لئے آیا ہوا تھا، ان کا نظارہ بھی کر سکے، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے امام حرم کا تعارف کرایا، اور امام حرم نے خطاب کیا اور پھر جمعہ کا خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام میں ایک استقبالیہ

عالم اسلام اور خاص طور پر بلاد عربیہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا تعارف ان کی دعوتی خدمات اور علمی فکری لٹریچر اور تحقیقی کتابوں وتصنیفات سے ہے جس کا اہم مرکز مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ہے، اس لئے خاص طور پر عرب مہمانوں کو ان کی آمد پر یہاں بھی مدعو کیا جاتا ہے، ۱۹۷۵ء کے عالمی تعلیمی اجلاس کے موقع پر اور پھر مذاکرہ ادبیات اسلامی کے بین الاقوامی سیمینار منعقدہ ندوۃ العلماء کے موقع پر بھی اس کا اہتمام کیا گیا، اس بار اس کی نئی عمارت گاہ کا اس کے ذریعہ ایک طرح سے افتتاح عمل میں آیا۔

جمعہ بعد عصر ۳۱/اکتوبر کو یہ تقریب عمل میں آئی جس میں عصرانہ کا اہتمام تھا، مہمانان حرم کے سامنے مجلس کی کارکردگی اور اس کے قیام کا پس منظر اور اس کے اغراض ومقاصد بتائے گئے تھے، اس موقع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے امام حرم اور اس مؤقر وفد میں شامل حرم شریف کے دینی امور کے ڈائرکٹر جناب شیخ سلیمان منیع کو مجلس کی اہم مطبوعات پیش کیں، اس عصرانہ میں امام حرم کے صاحبزادے احمد بن السبیل جو فیصل یونیورسٹی میں لکچرار تھے، ہمراہ تھے۔

یکم نومبر کو ظہرانہ کے بعد مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے خوبصورت استقبالیہ ہال میں ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف سکریٹری جنرل رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ مدعو تھے، ان سے ملاقات کے لئے وہاں وزیر اعلیٰ اتر پردیش وی پی سنگھ اور وزیر پارلیمانی امور جناب عمار رضوی بھی آئے، اور مختلف امور پر تبادلۂ خیال کیا اور گفتگو کی۔

معہد تحفیظ القرآن الکریم کا افتتاح

یکم نومبر کی شام کو رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا وفد اور امام حرم حفظہ اللہ معہد تحفیظ

القرآن کی نوتعمیر عمارت کے معائنہ کے لئے بھی گئے، اس موقع پر جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ مولانا شاہ سید منت اللہ رحمانی بھی موجود تھے جو بانی ندوۃ العلماء حضرت سید محمد علی مونگیریؒ کے صاحبزادے ہیں، امام حرم نے دعا بھی کرائی، اس کی پہلی منزل پر رہائش شروع ہوگئی، اب اس کے بعد دوسری منزل اور تیسری منزل بھی استعمال میں آنے لگی۔

اخبارات کا تاثر

اخبارات نے بڑی فراخدلی سے خبریں شائع کیں، اور اس کو ہندوستان کا سب سے بڑا اجتماع قرار دیا، ۵/لاکھ کی تعداد بتائی جنھوں نے امام حرم کی اقتداء میں نماز جمعہ پڑھی اور پچاس ہزار کی تعداد ایئرپورٹ میں استقبال کرنے والوں کی بتائی کہ اس میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی بڑی تعداد میں تھے اور ندوہ تک راستہ میں استقبالیہ گیٹ تھے اور جہاں سے قافلہ گذرتا تھا، لوگ خیر مقدم کرتے جا رہے تھے۔

ولکن اللہ سَلَّمَ (۲۸/نومبر ۱۹۸۶ء)

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عظیم دینی، روحانی ودعوتی اجلاس اور عظیم مہمانان حرم اور مکۂ معظمہ کے موقر وفد کے استقبال وخیر مقدم اور امام حرم وصدر امور حرمین شریفین شیخ محمد بن عبداللہ السبیل کی اقتداء میں لاکھوں افراد کی نماز جمعہ ادائیگی، اور مسجد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں جمعہ کے خطاب میں شرکت اور مسجد میں ہی بعد فجر درس قرآن مجید کے اہم پروگراموں کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دینے کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وطن تکیہ حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلی بھی شریف لے گئے جہاں ان کا اپنی مشغولیات اور پروگراموں کے بعد یکسوئی سے کچھ وقت تصنیف وتالیف میں گذارنے اور خاص افراد خاندان کے درمیان رہنے کا معمول چلا آرہا ہے کہ وہ ہفتہ دو ہفتے قیام فرماتے ہیں، واپسی میں جب وہ رائے بریلی سے اپنے چند عزیز بھائیوں اور خدام ورفقاء کے ساتھ لکھنؤ واپس ہورہے تو ان کی گاڑی ایک حادثہ کا شکار ہوگئی، اور یہ واقعہ پچھلے ٹائر کے پھٹنے سے پیش آیا، گاڑی فی کیلومیٹر ۸۵ کی رفتار سے تھی، سید

محمد نصیر صاحب ڈرائیور تھے، اوران کے ساتھ آگے حضرت مولانا تشریف رکھتے تھے، بہت ہلکی خراش کے ساتھ یہ لوگ پوری طرح محفوظ رہے؛ البتہ بعض خدام واعزہ کو کچھ تکلیفیں ہوئیں اور چوٹ آئی، سید حسن مجتبیٰ صاحب، سید محمد مسلم حسنی صاحب، چودھری عبدالمنان صاحب، مولانا ثناز الحق ندوی، حاجی عبدالرزاق، مولوی عبدالرحمٰن بٹ ندوی تھے، اوراس طرح سے انہیں بھی اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا، اس موقع پر بے ساختہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کوسورۂ انفال کی آیت "وَلٰکِنَّ اللّٰہَ سَلَّمَ" زبان پر آئی، اسی طرح کا ایک واقعہ ۱۹۶۷ء میں طائف میں حضرت مولانا کو پیش آیا تھا، ان کے ساتھ ان کے برادر عزیز مولانا سید محمد الحسنی مرحوم تھے، اس وقت بھی یہی آیت ان کی زبان پر تھی جب عرب ڈرائیور نے پوچھا کہ "یا سیدی ھل انت حیٌّ"؟ ندوۃ العلماء پہونچ کر ہم سب خدام اللہ کی حمد وثناء میں رطب اللسان ہوئے، حضرت مولانا نے جب یہ آیت دھرائی تو مولانا عبداللہ عباس ندویؒ نے متنبی کے شعر میں تصرف کر کے عرض کیا۔

المجد سُلِّم ـ اذ سُلمتَ ـ والکرم
والنبل عوفی ـ اذ عوفیت ـ والشھم

یہ واقعہ ۲۵؍ربیع الاول ۱۴۰۷ھ - ۲۸؍نومبر ۱۹۸۶ء کو پیش آیا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حضرت مولانا محمد احمد پرتا بگڈھیؒ کی تشریف آوری

ماہ ربیع الاول ۱۴۰۷ھ ماہ نومبر ۱۹۸۶ء میں یادگار سلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتابگڈھی رحمۃ اللہ کی لکھنؤ تشریف آوری ہوئی اور ندوہ العلماء میں قیام ہوا، حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتابگڈھی، حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ حضرت سید بدرعلی شاہ صاحب رائے پوری کے خلیفہ اوراپنے عہد کے بڑے بلند پایہ شیخ ہیں، ندوہ کے ۸۵ سالہ جشن میں ندوہ کی مسجد میں اعتکاف کیا تھا اوراس ادارہ کی حفاظت وترقی کے لئے اجلاس کی کامیابی اوراس کے دوررس اثرات کے لئے مشغول دعا ہی رہے تھے۔

ان سے ندوۃ العلماء میں ہفتہ در ہفتہ قیام کی درخواست کی بھی کی گئی تھی جو قبول فرمائی اورنومبر ۱۹۸۶ء میں دس پندرہ روز قیام فرمایا، ان کی مغرب بعد عمومی مجالس بھی ہوئی

تھیں، جس میں ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی بھی تشریف لائے اور اساتذہ وطلبہ کی بھی ایک تعداد شریک مجلس ہوئی، یہ مجالس تعمیر حیات نومبر، دسمبر ۱۹۸۶ء اور جنوری ۱۹۸۷ء کی اشاعتوں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں جو مولوی شیر افگن ندوی نے ٹیپ ریکارڈ سے سپرد قلم کی ہیں۔

اور ۲۵ نمبر ۱۹۸۶ء کے شمارہ میں مولانا شمس الحق ندوی مدیر تعمیر حیات نے تفصیلی مضمون حضرت کے ندوہ میں قیام اوران کی روحانی مجالس پر تحریر کیا ہے، جو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، حضرت کا دیوان ''عرفان محبت'' بھی ندوہ کے متعلق لوگوں نے مرتب کیا اور شائع کرنے کا اہتمام کیا جس میں مولانا سید محمد الحسنی و مولانا سعید الرحمٰن اعظمی مدیران البعث الاسلامی پیش پیش رہے تھے، اس طرح حضرت کو ندوۃ العلماء سے مختلف نسبتوں اور مناسبتوں سے اچھا تعلق رہا ہے، اس سے قبل دس سال قبل لکھنؤ شہر میں حضرت کے قیام اور ان کی مجالس بھی ندوہ کے بعض متعلقین نے مرتب کیں جو تعمیر حیات میں شائع ہوئی تھیں۔

رائے بریلی کا سفر

حضرت ایک روز ہمارے وطن دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی بھی تشریف لائے، اور وہاں بھی وعظ فرمایا وہ بھی تعمیر حیات میں شائع ہو چکا ہے، یہ سفر میری چھوٹی بیٹی (والدہ عزیزان خلیل، امین، عبدالحی سلمہم) کے عقد کی مناسبت سے ہوا تھا۔ جو برادر زادہ عزیز مولوی جعفر مسعود حسنی ندوی حال رئیس تحریر ''الرائد'' لکھنؤ سے تھا اور نکاح کی مجلس میں جو تکیہ کی مسجد شاہ علم اللہ میں ہوئی تھی شرکت فرمائی تھی۔

حضرت نے لکھنؤ کے قیام کے دوران باوجود ضعف و پیرانہ سالی کے ایک جمعہ میں نماز بھی پڑھائی اور وعظ بھی فرمایا۔

ایک روز حضرت مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر ''شبستان سعادت'' کھدرا بھی تشریف لائے اور ان کے جواں سال نواسہ کے حادثۂ وفات پر جو چند روز قبل پیش آیا تعزیت فرمائی اور اہل خانہ کی تسکین کے لیے وعظ بھی فرمایا۔

سعودی عرب کے وزیر تعلیم شیخ حسن عبداللہ آل الشیخ کی وفات

فروری ۱۹۸۷ء ندوۃ العلماء اور اس کے حلقہ و متعلقین کے لئے یہ خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ شیخ حسن بن عبداللہ آل الشیخ نہیں رہے، شیخ حسن مملکت کے وزیر تعلیم عالی تھے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بڑا تعلق رکھتے تھے جو عقیدت و محبت کا تعلق تھا اور مملکت کے سفروں میں ملاقات بھی کرتے، افسوس کہ وہ ندوہ نہیں آسکے البتہ ان کے بھائی شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل الشیخ ۱۹۷۸ء کے اوائل میں بحیثیت امام حرم و خطیب تشریف لائے اور ان کے اقتداء میں لاکھوں افراء نے نماز جمعہ ادا کی تھی اور ان کا خطبہ و خطاب سنا تھا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کا خیر مقدم کیا تھا، شیخ کے عم مکرم شیخ عمر بن الحسن سعودی عرب کے سر برآوردہ شخصیت تھے ان کا بھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے سفر حجاز ۱۹۴۷ء سے بڑا گہرا تعلق ہو گیا تھا اور حضرت مولانا کو اپنے خاندانی بزرگوں سے قدیم روابط اور ان کے بلند دینی و علمی مقام کی وجہ سے مثل والد سمجھتے اور تکریم فرماتے تھے، میری بھی ان سے ملاقات ہوئی اور ان کی بڑی قدر آئی، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

رابطۂ ادب اسلامی کا اجلاس جے پور (فروری ۱۹۸۷ء)

۲۲،۲۳؍جون ۱۹۸۶ء میں رابطۂ ادب اسلامی عالمی کی مجلس امناء (بورڈ آف ٹرسٹیز) کی استنبول ترکی میں میٹنگ ہوئی، جس میں ہندوستان سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور راقم السطور نے شرکت کی، وہاں ہندوستانی شاخ نے ۱۹۸۷ء میں ایک سمینار کا فیصلہ کیا جس کا موضوع ''اسلامی ادب اور مغربی تحریکات'' منتخب کیا گیا، مختلف مقامات ذہن میں تھے لیکن بزرگ شخصیت حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم جے پوری نے اپنے قائم کردہ وزیر تولیت ادارے جامعۃ الہدایہ کی پیشکش کی، ان کے خلوص و محبت اور جذبہ کی قدر کرتے ہوئے اس کو اختیار کیا گیا، اس کی خصوصیت بھی تھی کہ اس سمینار کا ہندوستان کے لئے خاص ہونے کے بعد اس کے عرب ممالک کے دفتر ریاض سے اس کے نائب صدر ڈاکٹر عبدالقدوس ابو صالح بھی تشریف لائے، اور اس کی کاروائیوں میں بنفس نفیس شریک رہے اور پوری دلچسپی لیتے

رہے، مولانا شاہ عبدالرحیم مجددی نے صدر مجلس استقبالیہ کی حیثیت سے خطبہ استقبالیہ پیش کیا، جس میں اجتماع کے موضوع اور مقصد کو واضح کیا اور مہمانوں کو خوش آمدید کہا، اور عملی طور پر بھی انہوں نے اور ان کے معاونین نے اس کا پورا حق ادا کیا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے صدارتی تقریر فرمائی، راقم السطور نے اپنی رپورٹ میں حمد وثنا اور اظہار تشکر کے بعد مغرب میں پیدا ہونے والے ادبی رجحانات وتحریکات کا جائزہ لیا، اور ان کے تاریخی ونفسیاتی پس منظر پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ وہاں کے ذہنی اضطراب اور فکری انتشار، زندگی کے صالح اور فطری قدروں سے محروی اور زندگی سے مایوسی کے اثرات وہاں پیدا ہونے والے ادبی افکار ونظریات میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔

ان باتوں کے باوجود یورپ میں گذشتہ صدیوں میں بننے والے نظریات اور قدریں مطلقاً نظرانداز کرنے کی بھی نہیں، کیوں کہ یہ سب انسانی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور نفسیاتی کیفیات ہیں، جو دنیا کی کسی قوم میں اور کسی ماحول میں پیدا ہوسکتی ہیں، نیز یہ کہ یورپ کی نشأۃ جدید کا دور تھا، جس میں اس کے باشندوں میں عملیت اور ترقی کی کوشش کا ایک عمل مسلسل اور فکر وعمل کے میدان میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھنے کی جدوجہد تھی جس کے بہت سے پہلوؤں سے ہماری مشرقی قومیں جو کئی صدیوں سے یورپ کے برعکس بے ہمتی اور عزلت گزینی کا شکار ہیں، کچھ سیکھ سکتی ہیں۔

دنیا کا نظام انسانی تجربات اور مفید تجربات کے تبادلہ پر قائم ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب نظریات جن کے پس منظر میں یورپ کا کچھ مشرکانہ، کچھ مسیحی، کچھ ملحدانہ پہلو اور اس کے ساتھ نفسیاتی اضطراب، مایوسی اور شکست وریخت ہے، ہم اپنے اوپر کہاں تک منطبق کرسکتے ہیں، اور کہاں کرنا چاہئے۔

اگر ہم احساس کمتری سے اور مرعوبیت سے علاحدہ ہوکر غور کرسکیں اور غیر جانبدارانہ تنقیدی عمل کرسکیں تو شاید زیادہ بہتر فیصلہ کرسکیں گے۔

نائب صدر عالمی رابطۂ ادب اسلامی دفتر ریاض سعودی واستاد جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ ریاض ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح جو بڑی دشواریوں مگر ثبات شوق سے جے

پور پہونچے تھے، فرمایا کہ: ''یہ بڑی حوصلہ افزا بات ہے کہ انشاء پردازوں، ادیبوں اور شعراء کی بہت بڑی تعداد رابطۂ ادب اسلامی سے منسلک ہوتی جارہی ہے، وجہ یہ ہے کہ مسلمان ادیبوں کو رابطہ کی شکل میں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آگئی ہے، ان کے دل کی گہرائیوں میں کروٹیں لیتی ہوئی آرزوئیں عملی شکل اختیار کرتی جارہی ہیں اور کہا کہ:

''رابطۂ ادب اسلامی کے اہم ترین مقاصد میں سے یہ ہے کہ وہ ادب اسلامی کا صحیح مفہوم متعین کرے، ادب وتنقید کے اسلامی نظریہ کے خدوخال واضح کرے، تاکہ ہمارا اسلامی ادب مغرب کے درآمد شدہ ادبی وتنقیدی افکار ونظریات کا نہ صرف مقابلہ کرے بلکہ ان کا صحیح اور بہترین بدل فراہم کرسکے، اور آج کے اجتماع کا موضوع ومقصد رابطہ کے مقاصد سے حرف بحرف ہم آہنگ ہے''۔

تقریر کے آخر میں ڈاکٹر عبد القدوس ابو صالح نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اپنی عقیدت وتعلقات کا اظہار عربی اشعار میں کیا، تقریر کا ترجمہ ڈاکٹر سید ضیاء الحسن ندوی دہلی نے کیا، اور پھر شاعر الاسلام کے عنوان سے اپنا قصیدہ سنایا جس کا مفہوم ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی نے اردو زبان میں کیا، ڈاکٹر سید طفیل احمد مدنی الہ آبادی استاد الہ آباد یونیورسٹی نے اسلامی ادب اور مغربی ادبی تحریکات کے موضوع پر اردو میں اپنا قصیدہ پیش کیا، اور سامعین سے خراج تحسین حاصل کیا، جس کا ایک شعر یہ تھا۔

ادب تقلید مغرب سے سنور جائے کہاں ممکن؟
شعور آدمیت کا ہے اسلامی ادب ضامن

ٹونک میں عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر صاحبزادہ شوکت علی خاں اپنے تحقیقی ادارے کے ساتھ اس اجلاس میں شریک ہوئے، ان کے ادارے کی جانب سے مخطوطات اور کتابت کے خوبصورت نمونوں کی نمائش بھی پیش کی گئی تھی اور انہوں نے خطاب بھی کیا۔

افتتاحی اجلاس کی آخری وصدارتی تقریر صدر رابطہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی

ندوی کی ہوئی، انہوں نے کہا قرآن مجید نے اپنے معجزانہ انداز میں فاسد وسقیم اور تخریبی ادب کو زخرف القول غروراً، وطبع کاری اور فریب کے بلبلے اور معنی خیز الفاظ سے تعبیر کیا ہے، ہمارا سابقہ زیادہ تر سطحی ادب سے ہے مگر ہماری اور عصر حاضر کی اور خاص طور سے عالم عربی کی بڑی ضرورت صالح اور مقصدی ادب ہے جو قوت وزندگی سے بھر پور ہو اور عالم گیر اسلامی وانسانی پیغام کا حامل وعلم بردار ہو"۔

اور آخر میں مشہور شاعر شمیم جے پوری نے قافلۂ ادب اسلامی وحاضرین کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا، پھر مقالات کی نشستیں ہوئیں جو مرکزی عنوان کے ذیلی عناوین وموضوعات کے متعلق ہیں اور بہت کامیابی کے ساتھ یہ سمینار اختتام کو پہونچا، بانی امیر میزبان ادارہ جامعہ الہدایہ نے اپنی بزرگانہ شفقت اور کریمانہ اخلاق سے سبھی مندوبین کے دلوں کو موہ لیا، فالحمدللہ علی ذلک۔ (مقالات کی نشستوں کی تفصیلات تعمیر حیات شمارہ ۱۰ر اپریل ۱۹۸۷ء میں ملاحظہ ہو)۔

حضرت مولانا کی افتتاحی جلسہ کی تقریر "مسلمانون کا منصب دنیا کی علمی، فکری اور ادبی قیادت" کے عنوان سے تعمیر حیات شمارہ ۲۵ر اپریل ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔

ملیشیا کا سفر

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ملیشیا کی اسلامی انجمن کی دعوت پر ۲ر اپریل ۱۹۸۷ء کو ملیشیا کا سفر فرمایا، اور وہاں سات روز کا مشغول وقت گزارا، وقت کا بڑا حصہ دارالسطنت کوالالمپور میں گذرا، جس میں وہاں کے اداروں اور انجمنوں میں تشریف لے گئے اور خطاب بھی فرمایا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ہم رکاب مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ایک محبّ ومخلص جناب سید غلام محمد صاحب جیلانی حیدر آبادی اور راقم الحروف تھا، سید غلام محمد صاحب نے یہ سفر خود اپنے مصارف پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو راحت ومدد پہنچانے کے لئے اختیار کیا، ملیشیا میں پہلی منزل کوالالمپور بنا، کوالالمپور ملیشیا کا دارالسلطنت ہے، وہ سنگاپور کے ملایا سے علیحدہ ہونے کے بعد ملک کا دارالسلطنت بنا، ورنہ ملک کا اصل دارالسلطنت سنگاپور ہی تھا، ملیشیا کا اصل علاقہ ملایا ہے جو خلیج بنگال کے مشرق میں ایک

جزیرہ نما کی صورت میں واقع ہے، ملیشیا کے قرب وجوار میں متعدد ممالک اور خطے واقع ہیں جو عموماً جزیروں پر مشتمل ہیں اور شرق اقصیٰ کے جزء سمجھے جاتے ہیں، ملیشیا اس خطے کے مغربی پہلو میں واقع ہے اس کے پڑوس میں اہم ملک انڈونیشیا، فلپائن، بورنیو، برما، تھائی لینڈ وغیرہ واقع ہیں، ملیشیا ملایا کے جزیرہ نما تھائی لینڈ سے متصل جنوب میں اور انڈونیشیا کے جزیرہ سماترا کے بہت قریب بجانب شمال واقع ہے۔

جزیرہ نما ملایا کا جنوبی سرا سنگاپور جزیرہ سے جڑا ہوا ہے، سنگاپور آخر آخر تک ملایا کا جزء رہا، لیکن بعد میں ملکوں کی سیاسی تقسیم میں سنگاپور کو علیحدہ ایک الگ ملک قرار دے دیا گیا اور اس کے عوض میں جزیرہ نمائے ملایا کے مشرقی جانب واقع جزیرہ بورنیو کا شمالی حصہ ملایا کے ساتھ جوڑا گیا، سنگاپور کو مستثنیٰ کر کے اور ایک مشرقی علاقے کو شامل کر کے ملایا ملیشیا کہلایا، اور اس کا دارالسلطنت جزیرہ نما کے جنوبی خطہ کا ایک بڑا شہر کوالالمپور قرار دیا گیا۔

ملیشیا حکومتی سطح پر ایک اتحاد (فیڈریشن) ہے جس میں تیرہ ریاستیں شامل ہیں، تمام ریاستوں کے اتحاد کا سربراہ اعلیٰ بادشاہ ہوتا ہے جو ملک کے نو بادشاہوں میں سے کسی ایک کو پانچ سال کے لئے انتخاب سے مقرر کیا جاتا ہے، اس کا نام وخطاب ملیشین زبان میں یانگ وی پرتوان اگانگ ہوتا ہے اس کے تحت علمی وانتظامی سربراہ اور وزیر اعظم ہوتا ہے جو پارلیمنٹ کی اکثریتی جماعت سے منتخب ہوتا ہے۔

ملیشیا کی تیرہ ریاستوں میں ۹ ریاستیں دراصل بادشاہتیں ہیں جو ملک کے صوبوں کے طور پر اتحاد میں شامل ہیں، ان کے نام حسب ذیل ہیں، جوہور، کیلاتین، نگری سمبلان، پہانگ، پیرک، پرلیس، سیلنگو، ترنگانو اور قداح، ان میں سے ہر ریاست کا سربراہ اعلیٰ جو پہلے اس کا بادشاہ تھا، اب اتحاد کے اندر نیم بادشاہ اور نیم گورنر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔

مذکورہ نو بادشاہی صوبوں کے علاوہ چار ریاستیں جمہوری طرز کی ہیں، ان کا سربراہ جمہوری نظام کے اعتبار سے گورنر ہوتا ہے، اور مرکز سے مقرر ہوتا ہے، یہ ریاستیں حسب ذیل ہیں، پنانگ جو ایک چھوٹے جزیرہ کے طور پر جزیرہ نما ملایا کے مغربی ساحل پر واقع ہے اور دوسری تیسری ریاست سرواک اور صباح ہے اور چوتھی ریاست ملاکا ہے۔

ملیشیا کے اتحاد کی تاسیس ۱۹۶۱ء میں اس کے پہلے وزیر اعظم تنکو عبد الرحمٰن کے ذریعہ ہوئی وہ اس اتحاد کے پہلے وزیر اعظم بنے، سنگا پور بھی اس اتحاد میں شامل تھا، سنگا پور میں مسلمانوں کی اقلیت اور چینیوں کی اکثریت ہے اس کی وجہ سے ملیشیا میں مسلمان چند فیصدی سے اقلیت میں تھے لیکن ۱۹۶۵ء میں سنگا پور اس اتحاد سے علیحدہ ہوگیا، اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا کہ اتحاد میں ان کی اکثریت ہوگئی، یوں ملیشیا میں پہلے سے مسلمانوں کا تہذیبی غلبہ تھا، کیونکہ اس کے صوبوں کے بادشاہ سب مسلمان ہیں ان کا اثر تھا پھر ملک کے مختلف طبقات میں مسلمانوں کی اکثریت رہی ہے جو سنگا پور کی علیحدگی کے بعد ملک کی آبادی میں فیصدی اکثریت بن گئی۔

یہاں کے مسلمان عموماً ملائی نسل سے ہیں البتہ ان کا تناسب کم اکثریت کا ہے ملک کی اقلیتوں میں سب سے بڑی اقلیت چینیوں کی ہے جو عموماً بدھ اور کنفیوشش مذہب کے ہیں وہ ملک کی آبادی کا ۳۵ فیصد ہیں، پھر ۱۰ فیصد میں عیسائی اور بیرونی نسلوں کے لوگ جو عموماً برصغیر ہندو پاک کے لوگ ہیں جن میں ایک تعدد ہندوؤں اور سکھوں کی ہے، اس طرح پر یہ ملک ایک رنگا رنگ نسلوں اور مذہبوں کا علاقہ ہے، اس طرح پر اس کی سیاسی صورت حال ہندوستان کی صورت حال سے ملتی جلتی ہے، فرق یہ ہے کہ ہندوستان ایک دیو قامت ملک ہے جس کی آبادی ستر کروڑ کے لگ بھگ ہے اور ملیشیا صرف ڈیڑھ کروڑ آبادی کا ملک ہے، ملیشیا کی آبادی کی اکثریت مسلمان ہے جب کہ ہندوستان کی اکثریت ہندو مذہب کی پیرو ہے، دونوں ملک انگریزوں کی غلامی میں رہے ہیں، اور انگریزوں کی حکومت نظام و تعلیم کے اثر سے علم وتمدن میں دونوں انگریزوں کے خوشہ چیں ہیں، اس لئے دونوں ملکوں کے مسائل میں ایک طرح کی مماثلت ہے، ملیشیا ہندوستان کے پڑوس میں بھی ہے، اس لیے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اس ملک کو دیکھنے سے دلچسپی ایک عرصہ سے تھی اور دعوت نامے بھی کئی سال سے مل رہے تھے لیکن ان پر عمل کے لیے اللہ تعالی کو یہ موقع منظور تھا، چنانچہ سفر ہوا۔

کوالالمپور ایر پورٹ پر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی واقع کوالالمپور کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبد الرؤف مصری اور داعیوں کے نمائندے اور متعدد ندوی فضلاء موجود تھے

جن میں خاص طور پر قدح کے تعلیمی ادارہ جمعیۃ التربیۃ الاسلامیۃ کے مدیر شیخ نعمت یوسف ملیبسی اور ندوی فضلاء شیخ احمد فہمی زمزم انڈونیشی ندوی اور شیخ محمد علی رجب انڈونیشی ندوی قابل ذکر ہیں۔

داعیوں کے اثر ورسوخ کی بنا پر کارروائی میں وقت صرف نہیں ہوا اور ایر پورٹ سے قیام گاہ جلدی ہی روانگی ہوگئی جہاں دن کے ڈھائی بجے پہنچنا ہوا، ملیشیا ہندوستان سے وقت کے اعتبار سے ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلہ پر ہے جو گرمائی وقت کے لحاظ سے ایک گھنٹہ مزید بڑھا کر ڈھائی گھنٹے کا رکھا گیا ہے، لہذا دہلی سے کوالالمپور تک سفر میں اصلاً تو پانچ گھنٹے صرف ہوئے لیکن مقامی وقت کے فرق سے وہ ساڑھے سات گھنٹے شمار ہوئے، ہم لوگ صبح کے چلے ہوئے بعد ظہر پہونچے۔

کوالالمپور تقریباً دس لاکھ آبادی کا اور ملیشیا کا سب سے بڑا شہر ہے اپنی صفائی نظم و ضبط اور تمدنی معیار کے لحاظ سے وہ یورپ کے کسی متوسط شہر سے کم نہیں ہے اس کا ایر پورٹ بھی بالکل یورپ کے ایر پورٹوں کے معیار اور حال کے مطابق ہے، بڑا شاندار اور بڑا ایر پورٹ ہے، عمارتوں، سڑکوں، بازاروں اور مواصلات کے لحاظ سے بھی شہر کا یورپ جیسا معیار ہے، البتہ چونکہ آبادی کی اکثریت مسلمان ہے اس لئے مسلمانوں کے انداز و اخلاق کا مظاہرہ ملا اور جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہے تو ان کو وہاں زبان کے فرق کو مستثنیٰ کر کے وہاں کوئی اجنبیت نہیں معلوم ہوتی اور زبان کا فرق بھی تعلیم یافتہ طبقہ میں انگریزی کی مشترک واقفیت کی بنا پر معلوم نہیں ہوتا۔

ملیشیا میں ان دنوں اسلام سے دلچسپی اور اسلامی اخوت کا احساس بہت بڑھا ہوا ہے ان کا یہ جذبہ ان کے کاموں اور ان کے معاملہ میں صاف نمایاں ملتا ہے، یہ حال وہاں کے مردوں اور عورتوں دونوں میں ملتا ہے، اسلامی حجاب کا لحاظ اور اس کی کوشش مسلمان عورتوں میں ہر طرف نظر آتی ہے، وفاتر میں یونیورسٹیوں میں اور تمدنی وانتظامی اداروں میں بھی اس کے نمونے ملتے ہیں لیکن برقع کی شکل میں نہیں؛ بلکہ ساتر لباس کی صورت میں ملتے ہیں، مسلمان وغیر مسلمان عورتوں کا فرق بڑی حد تک اسی سے واضح ہوتا ہے، مسلمان

عورتیں ضروری حدتک حجاب کے ساتھ اور غیر مسلم عورتیں پوری بے حجابی میں نظر آتی ہیں، تمدنی زندگی چونکہ یورپ وجاپان کے تمدنی معیار کے لحاظ سے ہے اس لیے وہاں کی بے حجابی بھی اسی بے حجابی کی طرح ہے جو یورپ وچین وجاپان میں پائی جاتی ہے۔

ملیشیا کی زندگی میں مسلمانوں کا اثر ان کی اکثریت وحکومت کی وجہ سے اور چینی تمدن وثقافت کا اثر ملک میں چینیوں کے بڑی اقلیت میں ہونے نیز قریب ترین پڑوسی اور متمدن ملک ہونے کی بنا پر ملتا ہے، ہندوستان وملیشیا کے درمیان ایک بڑا فرق یہ نظر آیا کہ وہاں اکثریت واقلیت کے مابین مذہبی، نسلی اور ثقافتی اختلاف کے باوجود کوئی آویزش نہیں دونوں اپنی اپنی پسند کے مطابق زندگی کے انداز اپنانے نیز اجتماعی وانفرادی حقوق سے فائدہ اٹھانے پر برابر ہیں اور ان کے مابین وہ کشیدگی نہیں جس سے افسوس ہے کہ ہمارا ملک ہندوستان ان دنوں دوچار ہے، ہندوستان میں مذہبی عصبیت صرف مذہبی دائرے ہی کو نہیں بلکہ علمی وادبی دائروں کو بھی متاثر کر رکھا ہے۔

ملیشیا میں قومی زبان ملیشین ہے لیکن اس کے باوجود چینی نژاد لوگ خاصی تعداد میں اپنی دوکانوں کے بورڈ چینی الفاظ وحروف میں لکھتے ہیں اور اپنی تعلیم گاہوں میں چینی زبان کو رابطہ کی زبان بناتے ہیں اور اپنی ثقافت کے مطابق تعلیمی نظام بھی چلاتے ہیں وہ اپنی کمیونٹی کے لئے بھی چینی زبان میں شاندار روزنامے بھی نکالتے ہیں اور اس میں وہاں کی حکومت واکثریت کوئی قابل اعتراض یا کوئی قابل شکایت بات محسوس نہیں کرتی۔

دفاتر وعدالتوں میں صرف ملیشی نسل کے لوگوں کو ہی نہیں بلکہ اقلیتوں کے افراد کو بھی فراخ دلی سے جگہیں ملتی ہیں جن میں چینیوں کے علاوہ ہندوستانی نژاد اور ہندوستانی مذاہب کے ماننے والوں یعنی ہندوؤں وسکھوں کو بھی جگہیں خاصی حاصل ہیں اور سوسائٹی میں ان کا بھی اچھا لحاظ ہے، ہم لوگ وہاں کے اکثریتی طبقوں میں رہے، اور انہیں سے ملنے کا موقع رہا، لیکن ان افراد کو نسلی یا ثقافتی تعصب کے عناد کا اظہار کرتے ہوئے نہیں پایا، تمدنی ترقی ونظم وضبط کو دیکھ کر یہ احساس بہت ہوا کہ اگر یہ لوگ انگریزی سیاست ونظام تعلیم کے تربیت یافتہ ہیں تو ہمارا ملک بھی ایسے وسائل وانتظام میں ان سے کم نہیں رہا، پھر کیا بات

ہے کہ دونوں میں نظم وضبط وفرض شناسی کے لحاظ سے فرق ہے؟ غور کرنے پر دو سبب سمجھ میں آئے ایک تو یہ کہ یہ ملک چھوٹا ہے اس کے لوگوں کو اپنے ملک کو معیاری بنانے اور ترقی دینے میں نسبتاً آسانی ہے دوسرے یہ کہ تمدنی وجمہوری کوتاہیوں کو یہاں نظر انداز نہیں کیا جاتا بلکہ گرفت وسزا کا صحیح انتظام ہے، شہری زندگی کی پابندیوں پر عمل کرایا جاتا ہے، کوتاہی پر سزا ہوتی ہے لیکن ہمارے ملک میں اس کی پوری افراتفری ہے سڑکوں، راستوں کو خراب کرنے، ٹریفک کی پابندیوں کو نظر انداز کرنے، شہری ذمہ داریوں پر عمل نہ کرنے کی پوری آزادی ہے اور گرفت وسزا کا کوئی انتظام نہیں، بدنظمی میں سب اپنی اپنی گنجائش کے اعتبار سے حصہ لیتے ہیں، تعصب کی منفی شکلیں عام ہیں، رشوت، طاقت اور اکثریت کے بل بوتے پر سب کام ہوتا ہے اکثریتی لوگ دیگر فرقوں کے لوگوں کو شہری اور وطنی بنیاد پر بھی پوری سہولتوں کا حقدار نہیں سمجھتے یا حق حاصل کرنے نہیں دیتے، ذمہ داران حکومت چشم پوشی سے کام لیتے ہیں، بددیانتی اور کوتاہی فرض پر بالکل روک نہیں لگاتے، اس لئے بگاڑ پیدا کرنے والوں کو کھلی چھوٹ ہے۔

ٹریفک اصولوں کی پابندی، سڑکوں اور پبلک مقامات کی صفائی وانتظام اور اسی طرح کے دیگر امور دیکھ کر وہاں بڑی چوکسی اور نگرانی ہے اور ہمارے یہاں اس کی کھلی چھوٹ ہے، ہمارے یہاں رشوت کا تو یہ معاملہ ہے کہ اپنے ایک ہم وطن دوست کے بقول اگر یہاں رشوت کا ذریعہ نہ ہوتا تو شاید یہ لوگوں کو دفاتر سے کوئی بھی حق لینے میں کامیابی نہ ہوتی، یہ ذریعہ خواہ برا ہو لیکن بہرحال کام نکالنے کا ایک ذریعہ تو باقی ہے۔

بات موضوع سے ہٹ گئی لیکن صرف کوالالمپور ہی بلکہ پورے ملیشیا کو تمدنی وشہری لحاظ سے منظم اور صاف ستھرا دیکھنے پر یہ احساس پیدا ہوا جس کا اظہار ضروری محسوس ہوا، ملیشیا کا ملک تیرہ صوبوں پر مشتمل ہے اور یہ صوبے دراصل یہاں کی بادشاہتوں سے عبارت ہیں، ان بادشاہتوں کا ایک اتحاد قائم کر کے ملک کی تشکیل دے دی گئی ان کے بادشاہوں میں سے ایک کا انتخاب کر کے پورے ملک کا سربراہ بنایا جاتا ہے اور وہ بادشاہ برطانیہ کے بادشاہ کی طرح صرف تاج کا بادشاہ اور وہ بھی پانچ سال کے لئے انتخاب سے طے ہوتا ہے یہ سب

بادشاہ مسلمان ہیں، ان مسلمان سربراہوں کا اثر بھی ملک کے اسلامی رجحان پر پڑتا ہے، باوجود اس کے کہ دستوری لحاظ سے ملک کے مختلف اجزاء کے بادشاہ اپنے اپنے جزء میں گورنر جیسے محدود اختیار رکھتے ہیں لیکن ان کی سربراہی سے ملک میں اسلامی وقار کو مدد ملتی ہے۔

کوالالمپور میں متعدد یونیورسٹیاں ہیں ایک ملیشین یونیورسٹی جو عام یونیورسٹی ہے دوسری یونیورسٹی یہاں کی قومی یونیورسٹی ہے جس کی رابطہ کی زبان صرف ملیشین ہے، تیسری یونیورسٹی، یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی ہے، چوتھی یونیورسٹی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ہے جو اسلامی ممالک کی مدد سے چند سال ہوئے قائم ہوئی ہے ان سب میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے خطاب کا پروگرام پہلے سے بن چکا تھا، انکے علاوہ وہاں کے مسلمانوں کی انجمنوں اور بعض عام ملکی سطح کے اداروں میں بھی عمومی خطاب کا بندوبست کیا گیا تھا۔

شمال کے یہ دو صوبے مشرقی صوبہ ترنگانو اور شمال مغربی صوبہ قدح ہیں، اور تھائی لینڈ کی جنوبی سرحد سے ملے ہوئے ہیں، تھائی لینڈ کے جنوبی حصہ کا ایک عظیم علاقہ فطانی نام کا علاقہ ہے وہ دراصل ملیشیا کے شمالی علاقہ کا تہذیبی و مذہبی تسلسل ہے لیکن سیاسی تقسیمات میں وہ تھائی لینڈ کے حصہ میں چلا گیا اور وہاں تھائی لینڈ کی اکثریتی آبادی کے مقابلہ میں اقلیتی علاقہ بنا جو مذہبی و نسلی اقلیت و اکثریت کے نزاع میں بڑی آزمائش کے حالات سے گذر رہا ہے وہ اپنے ہم مذہب و ہم نسل علاقہ شمالی علاقہ سے قریب بھی ہے۔

بہرحال منتظمین نے ملیشیا کے اس دورہ میں وہاں پہنچنے کے دوسرے روز ترنگانو کے صدر مقام کوالاترنگانو جانے اور وہاں متعدد جلسوں کو خطاب کرنے اور چوتھے دن قدح جاکر وہاں کے متعدد پروگراموں میں شرکت کرنے کا نظم کیا باقی، دنوں میں صرف دارالسلطنت کوالالمپور اور اس کے مضافات کے پروگرام رکھے۔

کوالاترنگانو میں دعوتی و تربیتی کام میں سب سے ممتاز شخصیت اس وقت شیخ عبد الہادی الحاج اوانج کی ہے، یہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے فارغ ہیں اور ممتاز عالم و خطیب ہیں، یہ جمعہ کے روز اپنی جامع مسجد میں جو ایک بڑی مسجد ہے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہیں جس میں صوبہ کے دور دراز سے لوگ آکر شریک ہوتے ہیں، آنے والوں سے مسجد بھر جاتی

ہے اور مسجد سے باہر موٹروں اور سواریوں کی لائن لگ جاتی ہے ابھی جوان ہیں، عمر غالبا پچاس کے اندر ہوگی وہ اپنے علاقہ میں بڑی مؤثر شخصیت بن چکے ہیں ان کا تعلق جماعتی بنیاد پر ملیشیا کی الحزب الاسلامی سے ہے، جس کے صدر ملک کے ایک معمر عالم شیخ یوسف بن عبداللہ الراوی ہیں جنھوں نے ملیشیا کے علاوہ مکہ مکرمہ میں آج سے پچاس سال قبل وہاں کی مشہور درسگاہ مدرسۃ الفلاح میں تعلیم حاصل کی ہے۔

الحزب الاسلامی دراصل علماء اور ان سے متعلق اہل ملک کی ایک مذہبی نیم سیاسی جماعت ہے اس کو آج کل حکومت وقت کی پالیسیوں سے اختلاف ہے یہ الیکشن میں بھی شرکت کرتی ہے چنانچہ اس کے ایک رکن اس وقت ملک کی پارلیمنٹ میں پہنچ گئے ہیں جو حکومت سے زیادہ اس حزب اختلاف سے جوڑ رکھتے ہیں، الحزب الاسلامی کے تحت اس جماعت کے علماء کا شعبہ علیحدہ سے کام کرتا ہے جس کو جمعیۃ علماء مالیشیا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، الحزب الاسلامی کے دو نائب صدر ہیں، ایک شیخ فاضل محمد نور جو قدح میں رہتے ہیں اور دوسرے یہ شیخ عبدالہادی الحاج اوانج جو کوالاترنگانو میں رہتے ہیں، علماء کے شعبہ کے صدر شیخ عبدالعزیز نیک مت ہیں یہ ایک اچھے عالم دین ہیں اور قدرے معمر بھی ہیں۔

الحزب الاسلامی کا طریقہ کار باوجود سیاسی رجحان کے غالب ہونے کے قدیمی انداز کا ہے، جدید خطوط وذہن کے اسلامی تخیل کی جو جماعت اس ملک میں زیادہ بااثر ہے وہ .A.B.I.M ہے اسی کی دعوت پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس وقت یہاں تشریف لائے ہیں، یہ جماعت زیادہ کھلے ذہن کی اور حالات وخطرات کو زیادہ سمجھنے والی اور انہی کے مطابق اپنی پالیسی مرتب کرنے والی ہے وہ اس وقت حکومت وقت سے تعاون کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہے کیونکہ حکومت کے موجودہ سربراہ وزیر اعظم ڈاکٹر محاضر محمد مذہبی رجحانات کے ساتھ رواداری کا رویہ رکھتے ہیں کابینہ میں بھی انہوں نے بعض اسلامی خیال کے لوگ شامل کیے ہیں، ابیم (.A.B.M.I) کے سابق صدر انور ابراہیم کو وزیر تعلیم بنایا ہے باوجود اس کے کہ ملیشیا کا ملک مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی آبادی پر مشتمل ہے اور ان سب کے ساتھ رواداری برتی جاتی ہے مسلمانوں کے معاملہ میں اسلامیت کی پابندی کا

رجحان پیدا کرنے میں حکومت دلچسپی لیتی رہتی ہے اس کی وجہ سے ابھی گزشتہ مہینوں کے دوران برسر اقتدار پارٹی میں جس کے سربراہ وزیراعظم ہیں سخت اختلاف رائے کی نوبت آگئی تھی حتی کہ پارٹی کے نائب صدر سے پارٹی کے صدر کی کشمکش ہوئی اور پارٹی میں استصواب رائے کی نوبت آگئی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی میں یہ مسئلہ بہت گرم تھا اور جلد ہی پارٹی کے جدید انتخاب کئے جانے والے تھے جو اس ماہ کے اختتام پر انجام پائے لیکن وزیراعظم دوبارہ پارٹی کے صدر منتخب کئے گئے اس طرح وہ ایک سخت آزمائش سے نکل گئے لیکن ان کے مؤیدین کے تناسب میں فرق آگیا۔

ملیشیا میں حزب اسلامی اور ابیم کے علاوہ اسلامی رجحانات کی اور کئی جماعتیں ہیں لیکن بااثر اور اہم جماعتوں میں مذکورہ بالا دو جماعتوں کے علاوہ تبلیغی جماعت کو خاصا فروغ حاصل ہے، ملیشیا کے عام اور پڑھے لکھے مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد اس کام سے دلچسپی رکھتی ہے اور ان کا مرکز تبلیغ اس کے کام کرنے والوں سے خوب آباد رہتا ہے اور بڑی تعداد میں لوگ باہر نکلتے ہیں یہ لوگ دہلی بھی خاصی تعداد میں آتے ہیں۔

جماعت اسلامی پاکستان و ہند کے نقطۂ نظر سے اتفاق رکھنے والوں کی بھی ایک خاصی تعداد ہے لیکن وہ زیادہ تر ابیم کے لوگ ہیں لیکن وہ لوگ اسلامی الفکر جماعتوں کے تنوع کو تسلیم کرنے اور سب کے ساتھ نیک گمان رکھنے کا طریقہ کار رکھتے ہیں وہ جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت دونوں کو ایک نظر سے دیکھتے اور معاملہ رکھتے ہیں، انہوں نے اس سلسلہ میں اخوان المسلمین کے شروع دور کے طرز عمل کو اپنایا ہے جس میں اخوان المسلمین مسلمانوں کی تمام جماعتوں سے خوش گمانی اور رواداری کا طریقہ اپناتی تھی۔

ملیشیا کے مذہبی علم کے حاملین نے عموماً باہر کے ملکوں میں بھی جا کر تعلیم مکمل کی ہے ان میں زیادہ تر حضرات جامعہ ازہر قاہرہ میں پھر مدرسۃ الفلاح مکہ مکرمہ میں پھر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم حاصل کی ہے اور ایک مختصر تعداد ہندوستان بھی آتی رہی ہے، ان میں ایک نمایاں حصہ ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کرنے والوں کا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ ندویوں کے متعلق ملیشیا میں اچھا تصور ہے، ندوہ کے نصاب تعلیم نیز مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی سربراہی کے

تعلق سے ان کا تصور ندوۃ العلماء کے بارے میں بلند ہے جو طلباء ندوۃ العلماء سے پڑھ کر گیے ہیں ان کو اچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ان کو وہاں نیک نامی بھی حاصل ہے۔

چنانچہ قدح میں ایک وقیع تعلیمی ادارہ نے ندوۃ العلماء کے طرز کو اپنالیا ہے، اس ادارہ کے سربراہ ازہر کے پڑھے ہوئے ایک فاضل اور باا ثر شخص شیخ نعمت یوسف ہیں انھوں نے اپنے علاقہ کے دو ندویوں کو ادارہ کے بڑے اساتذہ و نگراں کی حیثیت سے مقرر کیا ہے ایک شیخ احمد فہمی زمزم انڈونیشی اور دوسرے شیخ محمد علی رجب ہیں تعلیم گاہ کا نام ''معھد التربیۃ الاسلامیۃ'' ہے۔

ملیشین زبان انگریزوں کے شروع زمانہ تک عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی بعد میں قومی وطنی تحریک کے اثر سے اس کا رسم الخط رومن کر دیا گیا، اب قومی سطح پر اسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اگر چہ بعض مواقع پر عربی رسم الخط بھی استعمال کیا جاتا ہے، لیکن وہ قلیل ہے، ملیشیا کے لوگوں کو اپنی زبان سے گہرا ربط ہے اور بولنے میں اس کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کی ترقی کے لئے کوشاں ہیں، یہ زبان اردو کی طرح مختلف زبانوں کے الفاظ کا مرکب ہے جن میں سنسکرت اور قدیم مقامی الفاظ کے علاوہ، عربی، انگریزی، اردو کے الفاظ شامل ہیں اس میں اور انڈونیشیا کی زبان میں بڑی یکسانیت ہے، الفاظ کا صرف معمولی اختلاف ہے۔

کوالالمپور میں میزبان حضرات نے ٹیکنالوجی یونیورسٹی کے قریب ایک بنگلہ میں قیام کا نظم کیا تھا، یہ بنگلہ ان حضرات کے ایک دوست کا تھا جو کسی پروگرام میں کچھ مدت کے لئے امریکہ گئے ہوئے ہیں ان کا بنگلہ خالی تھا اور انہوں نے اس کو انہی حضرات کے سپرد کر رکھا تھا، ملیشیا میں لکڑی کی سہولت و کثرت کی وجہ سے مضافاتی اور قصباتی علاقوں کے مکانات کی تعمیر میں لکڑی کا خاصا استعمال کیا جاتا ہے اور یہ پورے ملیشیا کا عمومی طرز ہے، سوائے کثیر منزلہ عمارتوں کے جو عموماً شہروں کے وسط میں ہوتی ہیں، مضافاتی رہائش گاہیں اور بنگلے بعض وقت تو پورے مکمل طور پر لکڑی ہی کے ہوتے ہیں اس میں یہاں لکڑی کی کثرت نیز بعض دیگر مصلحتیں پیش نظر ہوتی ہیں۔

کوالالمپور پہنچنے کے دن کوئی پروگرام باقاعدہ نہیں رکھا گیا تھا، لیکن بعد مغرب

میزبان حضرات جو ابیم کے عموماً ذمہ دار حضرات تھے ملنے آگئے اور ان کے ساتھ ایک دوستانہ نسشت رہی، انہوں نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے نصیحت کے طور پر کچھ مختصر طور پر فرمانے کو کہا، چنانچہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین کے داعیانہ مقام و کام کے لحاظ سے مختصر الفاظ میں کچھ فرمایا جس میں مسلمان داعی کے اخلاق وصفات اور داعیانہ فہم کے سلسلہ میں اسلام کی دعوتی تاریخ کی بعض روشن مثالوں کے حوالہ سے کچھ رہبر اور مفید باتیں فرمائیں، اس گفتگو اور حاضرین کے فرداً فرداً تعارف پر مجلس برخواست ہوئی۔

قیام گاہ پر مدد اور دیکھ بھال کے لئے شیخ احمد فہمی زمزم انڈونیشی اور ان کے بعض مقامی رفقاء نے بھی قیام اختیار کیا، شیخ احمد فہمی زمزم نے ندوہ میں کئی سال رہ کر عالمیت اور فضیلت دونوں کے نصاب کی تکمیل کی اور سند حاصل کی، سمجھ دار متوازن اور ذی استعداد عالم ہیں، تحریر وتقریر کی اچھی صلاحیت پیدا کرلی ہے، انہیں کی طرح شیخ محمد علی رجب انڈونیشی بھی ہیں انہوں نے صرف عالمیت کی تکمیل کی ہے، شیخ محمد علی رجب نے تو ملیشیا کی باقاعدہ سکونت اختیار کرلی ہے، اور وہ ''معہد التربیۃ الاسلامیۃ قدح'' کے نائب مدیر بھی ہو گئے ہیں اور وہ مدیر معہد شیخ نعمت یوسف کے داماد بھی ہیں، مولوی احمد فہمی زمزم کو بھی اسی معہد میں جگہ مل گئی ہے، اس طور پر اس معہد میں دونوں نوجوان اپنی صلاحیتوں سے فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

اگلے روز کا پروگرام ملیشیا کے شمال مشرقی صوبہ ترنگانو جانے کا رکھا گیا تھا جہاں صبح طیارہ سے جا کر شام کو کوالالمپور واپس آنا تھا، فاصلہ تقریباً ڈھائی سو میل کا ہے، چنانچہ صبح سویرے ترنگانو کے صدر مقام کوالا ترنگانو کا سفر ہوا وہاں اس وقت ایک اہم داعی شخصیت شیخ عبدالہادی اونگ کی ہے، جنہوں نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم کی تکمیل کی، انہوں نے یہاں اپنے وطن میں اپنے دعوتی وتربیتی کام کے ذریعہ اچھا رسوخ حاصل کرلیا ہے، ہر جمعہ کو ان کی بڑی مسجد میں ان کا خطاب ہوتا ہے جس میں قرب وجوار سے اچھی تعداد آکر اکٹھا ہوتی ہے، شیخ عبدالہادی نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا قدر ومسرت کے ساتھ استقبال کیا، انہوں نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اس آمد کا پہلے سے اعلان کر رکھا تھا، چنانچہ مجمع اکٹھا ہو چکا تھا جس کو مولانا نے وہاں پہنچنے پر خطاب کیا ترجمانی خود شیخ عبدالہادی نے کی۔

خطاب کے بعد جمعہ کے وقت میں تھوڑا وقفہ تھا وہ شیخ عبدالہادی کے مہمان خانہ میں گذرا، پھر جمعہ کی نماز انہی کی مسجد میں ادا کی، جمعہ کا خطبہ شیخ عبدالہادی نے دیا اور نماز پڑھائی، عصر کے قریب تک وہیں قیام رہا، عصر اول وقت ادا کر کے شہر سے باہر واقع زین العابدین ہال میں ایک جلسہ کو خطاب کرنے کا پروگرام پہلے سے طے تھا، چنانچہ وہاں پہنچ کر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے تقریر کی جس کی نظامت کے فرائض ابیم کے مقامی صدر الحاج اوانج اور نائب صدر الاستاذ زاوادی علی نے انجام دیئے، یہ دونوں حضرات مخلص اور سمجھ دار شخص ہیں، ایک سال قبل ندوہ کے دو استاذ مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی، مولانا شمس الحق صاحب ندوی آچکے تھے، انہوں نے جن شخصیتوں کا تعارف کرایا تھا اور ان کی اہمیت اور خصوصیت کی تعریف کی تھی، ان میں شیخ عبدالہادی کے علاوہ ان دو حضرات کا بھی ذکر کیا تھا، ملاقات سے بھی اس کا اندازہ ہوا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے اوپر سوالات وجوابات بھی ہوئے اور پروگرام مغرب کے قریب ختم ہوا۔

یہاں سے کوالاترنگانو کے تبلیغی مرکز جانا ہوا یہ ایک وسیع مسجد میں واقع ہے جس کی تعمیر ایک ملیشی مخیرّ اور تبلیغی شخص حاجی نودا مرحوم نے کی ہے، یہاں تبلیغ کے بڑے اجتماعات ہوتے ہیں، اس میں حفظ قرآن کا ایک مکتب بھی قائم ہے جس کے موجودہ ذمہ دار ایک ملیشی ندوی فاضل مولوی عبدالقادر ملیشی ہیں وہ اس موقع سے بہت مسرور ہوئے اور خیر مقدم کیا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں طلبہ واساتذہ کو ایک مختصر خطاب کیا جس میں علم دین کے حصول اور دعوت دین کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور ان کے لئے دعائے خیر کیا، مغرب کی نماز ادا کر کے ایرپورٹ جاتے ہوئے ایک محبّ کے مکان پر بھی جانا تھا جس کی وجہ سے وقت میں تنگی تھی لیکن پرواز میں کچھ تاخیر کی اطلاع ملنے سے سہولت ہوئی اور عشاء کے وقت پرواز سے کوالالمپور واپسی ہوئی۔

دوسرے روز یعنی یوم شنبہ کے پروگرام میں دن کے اوقات میں قومی یونیورسٹی کی شریعت اسلامی فیکلٹی میں جانے اور اساتذہ سے ملنے اور خطاب کرنے اور شام کے وقت قیام گاہ سے قریب واقع ٹیکنالوجی یونیورسٹی کی مسجد میں طلبہ واساتذہ کو خطاب کرنے کا

پروگرام بھی شامل تھا، چنانچہ دن میں ۱۱ بجے قومی یونیورسٹی جانا ہوا، یہ ایک شاندار اور بڑے اچھے جائے وقوع کی عمارت ہے اور شہر سے باہر ایک مضافاتی مقام پر واقع ہے، شریعہ فیکلٹی (کلیۃ الشریعۃ) کا اسٹاف استقبال کے لئے موجود تھا جس میں انچارج ڈین العمید بالنیابۃ اور صدر و شعبہائے تفسیر وحدیث وثقافت اسلامی وغیرہ تھے، یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں وہ لے گئے، حاضرین میں صرف اساتذہ اور بعض ریسرچ اسکالر طلبہ تھے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے تعلیمی موضوع پر خطاب کیا اور عہد جدید میں تعلیم کا طریقہ اور عالم اسلام میں اس سے پیدا ہونے والے مسائل کا جائزہ پیش کیا، تقریر کے بعد اساتذہ اور طلبہ نے سوالات کئے جس کے جوابات مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے عنایت فرمائے۔

شام کو بعد مغرب ٹیکنالوجی یونیورسٹی کی مسجد میں خطاب تھا لیکن بروقت معلوم ہوا کہ اس کے وقت کا اعلان بعد عشاء کا ہے، قیام گاہ قریب تھی، اس لئے قیام گاہ واپس آ کے پھر عشاء کی نماز میں پہنچنا ہوا، اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر ہوئی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے قرآنی آیت ''وانزلنا الحدید فیہ باس شدید ومنافع للناس'' کو موضوع بنا کر جدید صنعتی وسائنسی ترقی کی اہمیت، مسلمانوں اور اسلامی دنیا کے لئے اس کی ضرورت پر زور دیا، انہوں نے فرمایا کہ ''انزلنا'' کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی مشیت سے اور ارادہ سے انسانوں کے بڑے نفع اور فائدے کے لئے فولاد غیر معمولی مقدار میں پیدا فرمایا، اس سے یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ جس طرح صحف آسمانی کو ہم نے نازل کیا، اور وہ انسانوں کے لیے عظیم نعمت شمار کی جاتی ہیں، اسی طرح فولاد کا وجود بھی خاص مشیت الٰہی کی رہین منت ہے، مولانا نے آگے چل کر فرمایا کہ ''باس شدید'' اور ''منافع للناس'' کی تعبیرات خود مستقل معجزے کی حیثیت رکھتی ہیں، باس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ اس میں بہت قوت پائی جاتی ہے، بلکہ یہ ایک ایسا وسیع اور جامع لفظ ہے جس میں جنگ، دفاعی ساز وسامان، اسلحہ قوت وشوکت اور دبدبہ سب شامل ہیں، اسی طرح فولاد کی قوت اور نفع کو کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہیں کیا اور نہ ہی اس کے منافع کو محدود فرمایا، مولانا نے یورپ کی جدید وسائنسی وصنعتی ترقی میں مسلمانوں کے اثرات کا تذکرہ کرتے

ہوئے فرمایا کہ یورپ نے استقراء کا نظریہ مسلمانوں سے لے کر اسی پر اپنی ترقی کی بنیاد رکھی اس وقت مسلمانوں کا یہ فرض تھا کہ وہ یورپ کی صنعتی وسائنسی ترقی سے سبق حاصل کرتے اور اس کو اسلامی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتے اور ایٹمی اور سائنسی ٹیکنالوجی کے ذریعہ انسانیت کی خدمت کرتے، مولانا نے ٹیکنالوجی یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ پر زور دیا کہ آپ ان علوم میں ایسی مہارت حاصل کریں کہ آپ کو بڑے سے بڑے عالمی ایوارڈ کا مستحق سمجھا جائے، مولانا نے فرمایا کہ آپ اس علم کے حصول میں یہ نیت رکھیں کہ اس کو حاصل کر کے ہم انسانیت کی خدمت کریں گے اور مسلمانوں کو اور اسلامی دنیا کی ترقی کے لئے کام کریں گے تو آپ کے جدوجہد اجر وثواب کی مستحق ہوگی، مولانا نے فرمایا کہ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ٹیکنالوجی یونیورسٹی کی مسجد میں نماز پڑھنے والے بیشتر طلبہ ہی تھے، اس طرح دین ودنیا کو اس یونیورسٹی میں یکجا کر دیا ہے جس سے بہتر اور کوئی بات نہیں ہوسکتی۔

اگلے روز دن کا پروگرام اہم پروگرام تھا وہ شہر کے اہم اور وسیع ہال میں جو ملک کے پہلے وزیر اعظم ٹنکو عبد الرحمٰن کے نام سے موسوم ہے رکھا گیا تھا اور اندازہ تھا کہ ملک کے دارالسلطنت کے ایک وقیع ہال میں ہونے نیز اتوار کا دن ہونے کے باعث دانشور طبقہ میں سے اچھے افراد کے اکٹھا ہونے کی امید ہے، چنانچہ مولانا نے بھی اس کا اہتمام فرمایا، ۱۱ ربجے دن میں یہ خطاب تھا جو تقریباً ایک گھنٹہ رہا اور مؤثر خطاب رہا، ترجمانی ابیم کے نائب صدر شیخ عبد الغنی شمس الدین نے کی، وہ ایک اچھے فاضل اور عربی وملیشین کے ماہر بھی ہیں۔

اگلے روز کا پروگرام قدح میں رکھا گیا تھا، قدح بھی ملک کے شمالی حصہ کا اسی طرح ایک صوبہ ہے جس طرح ترنگانو جہاں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا پروگرام جمعہ کے روز رہا، یہ دونوں صوبے ملک کے منتہائے شمال میں مشرقی ومغربی پہلو میں واقع ہیں، قدح مغرب میں ہے اور ملک کا اہم حصہ سمجھا جاتا ہے، اس کی بڑی زراعتی اہمیت ہے، یہاں پیدا ہونے والا چاول پورے ملک کی ضرورت کو پورا کرتا ہے، یہاں کی آبادی بھاری اکثریت کے ساتھ مسلمانوں کی ہے اور ان مسلمانوں میں عصر جدید کی خرابیاں بھی بہت کم پہنچی ہیں، دین سے تعلق اور اسلامی تشخص کے یہ زیادہ پابند ہیں، چنانچہ عرب لباس اور عمامے عام طریقہ سے نظر آتے ہیں، اور

اسلامی اخوت کا مظاہرہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے، یہاں سے تھائی لینڈ کی جنوبی سرحد بھی خاصی قریب ہے، سرحد کے اس پار کی آبادی سے یہاں کے لوگوں کا تعلق نسلی اور مذہبی دونوں طرح کا ہے، وہ علاقہ فطانی کے نام سے موسوم ہے وہاں کی اکثریت بھی مسلمان ہے اور اس کو ملک کی غیر مسلم اکثریتی حکومت سے بڑی حق تلفیوں اور مظالم کی شکایت بھی ہے اور جو واقعات پریس میں آرہے ہیں ان سے اس بات کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔

مغرب کے وقت قدح کے لیے پرواز تھی فاصلہ دو ڈھائی سو میل کا ہوگا، چنانچہ پون گھنٹے میں قدح پہنچنا ہوا، ایرپورٹ پر استقبال کرنے والوں کا ایک مجمع اکٹھا تھا، جس نے محبت واخوت کے جذبہ سے استقبال کیا اور قیام گاہ جو شہر سے فاصلہ پر ایک قصبہ میں تھی دور یہ لوگ جاتے ہوئے ملتے گئے، قصبہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ دور دور سے آئے ہوئے افراد ایک بڑے جلسہ عام کی صورت میں موجود ہیں، معہد التربیۃ الاسلامیۃ اسی قصبہ میں واقع ہے اسی کے دفتر کی عمارت کے سامنے کے وسیع لان میں جلسہ تھا جس کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے خطاب فرمایا، خطاب کی تمہید میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں دن بھر کی مشغولیت اور پھر سفر کا تھکا ہوا بہت ہوں، لیکن اس مجمع کو اور اس کی محبت کے مظاہرہ کو دیکھ کر تکان بھول گیا ہوں اور مسرت کے ساتھ خطاب کر رہا ہوں۔

تقریر سے قبل مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے تعارف واستقبال میں یہاں کے ایک عالم اور الحزب الاسلامی کے نائب صدر شیخ فاضل محمد نور نے ایک مختصر تقریر کی تھی اور مولانا کو تقریر کی دعوت دی اور تقریر کے بعد شیخ نعمت یوسف کی طرف سے جو کہ ''معہد التربیۃ الاسلامیۃ'' کے مدیر ہیں، ایک استاذ نے شکریہ ادا کیا، ترجمانی بھی انہوں نے کیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تقریر میں پہلے اس دینی اجتماع پر اپنی بے پایاں مسرت کا اظہار فرمایا کہ محض اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی کے حصول کی نیت سے یہاں جمع ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے مجمع سے خوش ہوتا اور فرشتوں کے سامنے اپنی رضا کا اظہار فرمایا ہے، اس کے بعد مولانا نے ملیشیا کے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کا وجود حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی جدو جہد کا نتیجہ ہے، اس کے لئے انہوں نے

اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کو داؤں پر لگایا تھا، مقصد صرف یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد سے اس کائنات کی تخلیق فرمائی ہے، اس کی تکمیل آپ جیسے مسلمانوں سے ہو، آپ کے وجود سے یہ مقصد پورا ہوتا ہے، کائنات اور آسمان و زمین کی تمام اشیاء الفاظ اور آپ ان کے معانی ہیں، مولانا نے اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے فرمایاہ کہ ہر چیز کی قدر و قیمت اس کے نفع رسائی اور کارکردگی کی صلاحیت سے لگائی جاتی ہے، ٹارچ کا مقصد تاریک راستہ کو روشن کرنا، اور گھڑی کا فائدہ صحیح وقت بتانا ہے، لیکن اگر یہ اشیاء اپنی قدر و قیمت کھودیں تو اس سے وہ لاٹھی بہتر ہے جس سے آدمی بہت سے کام نکال لیتا ہے، اگر مسلمان اس دنیا میں دولتمند، دانشور ہوں، صنعت و تجارت کے میدان میں کامیاب، اور وہ سائنس و صنعتی ترقی میں سب سے آگے ہوں لیکن وہ صحیح معنوں میں مسلمان نہ ہوں، انسانیت کے لیے ان کے پاس کوئی پیغام نہ ہو، ان کی اور غیر مسلموں کی زندگی کے درمیان کوئی امتیازی چیز نہ ہو تو ان سے بہتر وہ عصا ہے جس سے آدمی اپنے دفاع کا کام لیتا ہے۔

مولانا نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پوری دنیا کا نگراں محتسب اور امام و قائد بنایا ہے، آپ کا فرض یہ ہے کہ آپ دنیا کی اخلاقی قیادت کریں اور یہ دیکھیں کہ اس وقت انسانیت کس منزل کی طرف گامزن ہے، آپ صرف اپنے ذمہ دار نہیں بلکہ پوری دنیا اور تمام قوموں کی ذمہ داری آپ پر ہے، مولانا نے مزید فرمایا کہ جس طرح نبی ﷺ کی بعثت ہوئی ہے اس طرح آپ کو ایسی امت بنا کر بھیجا گیا ہے جس کا کام ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، مولانا نے مسلمانوں کی امتیازی زندگی اور ان کے خاص اخلاق و سیرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلمانوں کا جو عقیدہ ہے اس کی جھلک ان کے چہرے، بشرے، حرکات و سکنات، اعضاء و جوارح، بول چال اور تجارت و معاملات سے ظاہر ہوتی ہے اور یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان دوسری قوموں سے ممتاز ہیں، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی وقفہ میں بڑی تعداد میں کفار مکہ اسلام سے مشرف ہوئے، اس کی وجہ مؤرخین اور سیرت نگار یہ بیان کرتے ہیں کہ کفار مکہ نے مدینہ جا کر مسلمانوں کو قریب سے دیکھا اور انہیں برتا تو ان پر یہ انکشاف ہوا کہ نبی کی

صحبت وتربیت نے ان کے اندر غیر معمولی انقلاب برپا کردیا ہے، ورنہ زبان اور لباس ایک ہی ہے، مولانا نے آخر میں فرمایا کہ قرآن کا عطر اس وقت بھی تھا جس کی خوشبو سے لوگ متاثر ہوتے تھے، آج بھی وہ عطر موجود ہے، لیکن کیا بات ہے کہ اس کی خوشبو ہمارے وجود سے اٹھ نہیں رہی ہے، اس لئے کہ ہم نے اپنی بہت سی خصوصیات سے اپنے کو محروم کرلیا ہے، ہمارے اخلاق ومعاملات اور ہماری امانت داری لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی لیکن اب یہ بات نہیں، مولانا نے آخر میں اس بات پر روز دیا کہ آپ اپنے اخلاق وصفات اور ایمان ویقین کی حرارت سے لوگوں میں انقلاب برپا کریں۔

رات کو شیخ یوسف کے مہمان خانہ میں قیام رہا اور ان کی تعلیم گاہ کی مجلس انتظامی کے ایک رکن نے جو اس علاقہ کی ایک سربرآوردہ شخصیت ہیں ضیافت کی۔

دوسرے روز ۱۰ ربجے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے معہد التربیۃ الاسلامیۃ کے اساتذہ وطلبہ سے خطاب فرمایا، پھر نئے قائم کیے جانے والے ذیلی ادارہ ''المعہد العالی للدعوۃ'' کا سنگ بنیاد رکھا اور دعا فرمائی، شام کے پروگرام میں قدح کے مرکزی ادارہ امور زراعت ''مدا'' میں جو پورے ملک کا ایک اہم قومی سطح کا ادارہ ہے خطاب رکھا گیا تھا، جن کے لیے مولانا رحمۃ اللہ علیہ بعد مغرب تشریف لے گئے وہ جائے قیام سے دس بارہ کلومیٹر پر واقع تھا، وہاں خطاب فرمایا۔

اس زراعتی ادارہ کے سربراہ ملک کی ایک مقتدر شخصیت السید محمد المہدنی ہیں اور اچھا اسلامی جذبہ رکھتے ہیں، انہوں نے محبت وقدر کے ساتھ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا استقبال کیا اور خطاب کے بعد عشائیہ دیا، وہاں سے واپسی پر عشا ہوئی اور قریب میں واقع ایک محبؓ اور داعی شخص کے مکان پر قیام ہوا اور رات وہیں رہے، اور وہیں سے دوسرے روز صبح ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے یہ سہ شنبہ کا دن تھا، اس روز قبل ظہر ملیشین یونیورسٹی میں پروگرام طے تھا، اسی لیے کوالا لمپور پہنچ کر ایرپورٹ سے سیدھے وہیں جانا ہوا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو گذشتہ روز کے مشغول پروگرام، پھر صبح سویرے سفر کے اثر سے خاصا تکان تھا، لیکن پھر بھی اس پروگرام کو انجام دیا اور حاضرین کو خطاب فرمایا۔

خطاب کے بعد قیام گاہ تشریف لائے، وہاں سے بعد عصر دو جگہوں پر جانا تھا ایک تو تبلیغی مرکز، دوسرے ابیم کے مرکز، اول الذکر مرکز تو شہر میں ہی ہے اور ہندوستانی مسجد کے نام سے موسوم ہے، عصر کے بعد روانہ ہو کر ٹریفک کی رکاوٹوں کی وجہ سے مغرب کے قریب پہنچنا ہوا، نماز مغرب ادا فرما کر تقریر فرمائی، حاضرین عموماً مقامی حضرات تھے اسی لیے عربی میں تقریر ہوئی جس کی ترجمانی ملیشین زبان میں ایک تبلیغی صاحب نے کی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے جماعت کے کام کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اور اس کی اہمیت بتاتے ہوئے مزید اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی کہ ملک کے حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے ملیشیا کے مقامی مزاج کی رعایت رکھیں اور کوشش کریں کہ ملک کے بااثر طبقہ کے دلوں میں کام سے کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

مولانا نے یہ بات اس لئے بھی فرمائی کہ ملیشیا پہنچتے ہی کئی جلسوں میں سوالات کچھ جدید تعلیم یافتہ لوگ تبلیغی کام کے بارے میں دریافت کرتے تھے ایک صاحب نے کہا کہ یہ تو رہبانیت و ترک دنیا کی تعلیم ہے جس کو اسلام صحیح نہیں سمجھتا، ایک صاحب نے کہا کہ جماعت کے لوگ ملک و قوم کی خدمت کرتے کرتے اور تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی اچانک طویل طویل مدت کے لیے جماعت میں چلے جاتے ہیں اس سے کام کو نقصان پہنچتا ہے اور ضرورت مند لوگوں کے کام رک جاتے ہیں جس سے وہ پریشان ہوتے ہیں، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے خصوصی طور پر تبلیغی کام پر اتنے استفسار ہونے کی اصل وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ ایک تو یہ کام ملک میں خاصا پھیلا ہوا ہے، اور کام کرنے والوں کے رویہ سے کچھ منفی اثرات بھی سامنے آنے لگے ہیں، دوسرے یہ کہ ابھی حال میں جامع ازہر قاہرہ کے ایک بڑے فاضل اور عہدہ دار ڈاکٹر عبدالرؤف شبلی نے اس سلسلہ میں سخت مضمون لکھا ہے کہ طلباء اپنی تعلیم کو اور ملازمین اپنے فرائض منصبی کو اس طرح چھوڑ چھوڑ کر طویل مدت کے لیے چلے جاتے ہیں کہ مسلمانوں کی ضرورت اور مفادات کو نقصان پہنچتا ہے اور خدمت خلق کا واجبی حق ادا کرنے میں ان لوگوں سے کوتاہی ہوتی ہے جو کہ ایک طرح کی رہبانیت ہے جو بدھ مذہب کے نظریہ میں ملتی ہے، اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ غلط راہ ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت کے ساتھ اس کام کے آغاز اور اس کے موسس

مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ سے اپنی ذاتی واقفیت اوران کے اخلاص اور دین کی سمجھ کے بارے میں اپنے اعلیٰ تاثر کا ذکر کیا اور فرمایا کہ کام کرنے والوں کے عام افراد میں اگر کہیں کوئی بے اعتدالی ملتی ہے تو یہ ان مخصوص افراد کی اپنی کوتاہی ہے ورنہ جماعت کے قائدین کی طرف سے کوئی ایسی ہدایت یا تاکید نہیں کی جاتی اور جماعت کے موجودہ قائدین سے بھی اپنے قریبی روابط کا ذکر کیا اوران کے بارے میں اپنے اچھے تاثر کا ذکر کیا۔

تبلیغی کام کے بارے میں سوالات کے علاوہ ملیشیا کے پروگرام میں ایک دوسرے امر کی طرف بھی خصوصی توجہ مبذول کرائی گئی، وہ یہ بات تھی کہ چند دنوں سے بعض شر پسندوں نے یہ خیال پھیلانا شروع کر دیا ہے کہ قیامت کا زمانہ آ گیا ہے اور قرآن مجید منسوخ ہو رہا ہے، یہ بات یہاں کے متعدد اہل علم نے بہت تشویش کی نگاہ سے دیکھی کہ اس سے قرآن مجید کے بقاء کے بارے میں ایک مایوسی کا تصور بنتا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے یہ بات لائی گئی کہ اسرائیل نے قرآن مجید کے ایسے نسخے طبع کرا کے جن میں آیات کی تحریف ہے دنیا میں پھیلانے کی کوشش کی ہے اس کو دیکھ کر بعض لوگوں کے ذہن میں یہ تصور آیا کہ قرآن مجید کو تو اللہ تعالیٰ نے تا قیامت محفوظ فرمادیا ہے اگر اس میں تحریف ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قیامت بالکل سر پر آ گئی ہے جس کے آنے پر قرآن مجید بھی اٹھا لیا جائے گا، لہٰذا یہ بات اب پیش آ گئی ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت کی کہ یہ بالکل لغو بات ہے اسرائیل نے یہ کیا ضرور ہے لیکن اس کو ناکامی ہوئی ہے، اور ناکامی ہی ہوگی، کیونکہ جس صحیفہ کی حفاظت خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے اس کو اسرائیل کیا کوئی بھی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی، البتہ ایسی سازشی کوششوں سے ہوشیار ضرور رہنا چاہئے اور ہوشیار کرتے رہنا چاہئے۔

شیخ علی طنطاوی کا ندوۃ العلماء کے بارے میں اظہار خیال

علامہ علی طنطاوی کا ندوۃ العلماء اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے تعلق قدیم اور بہت محبانہ اور قدردانہ ہے، ۱۹۵۴ء میں جب پہلی بار لکھنؤ آئے تھے اور ان کے ساتھ مشہور عراقی عالم شیخ امجد الزھاوی بھی تھے، تو واپس جا کر المسلمون دمشق میں اپنے والہانہ

تاثرات شائع کیے تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ''کاروان زندگی'' کا عربی ترجمہ منظر عام پر آیا تو انہوں نے عربی ایڈیشن "في مسيرة الحياة" کا مقدمہ لکھا جو تین قسطوں میں بین الاقوامی روزنامہ " الشرق الاوسط" ۱۱، ۱۸، ۲۵ر دسمبر میں شائع ہوا، جس کا ایک اہم اقتباس کا ترجمہ جو خاص ندوہ کے منہج کے متعلق ہے، نقل کیا جاتا ہے۔

''ندوہ کی مثال اس نوجوان کی سی ہے، جس کی پرورش طاعت الٰہی کی نورانی فضا میں ہوئی ہو، وہ ازہر جیسا قدیم ادارہ نہیں ہے اس لیے اس کے کارنامے بھی اتنے نہیں ہیں اور نہ ہی ہوسکتے ہیں لیکن روز اول سے ہی اس کی اساس تقوی الٰہی پر رکھی گئی، اور ابتداء سے ہی وہ جادۂ اعتدال پر گامزن ہے، کبھی وہ اپنے مقصد اور طریقۂ کار سے ہٹا نہیں جبکہ ازہر اپنی طویل عمر کو پہونچنے کے بعد اپنے قافلہ سے کسی قدر پیچھے ہٹ گیا، اور دارالعلوم دیوبند جسے ہندوستان میں ازہر کے طرز پر قائم کیا گیا، اور جس نے اس کے نقش قدم کی پیروی کی اور علی گڈھ یونیورسٹی جسے سرسید نے اس لئے قائم کیا کہ وہ زمانہ کا ساتھ دے سکے، ندوہ نے ان تینوں سے ہٹ کر ایک راہ اعتدال اختیار کی، وہ نہ تو دیوبند اور قدیم ازہر کی طرح قدامت پرست اور جمود پسند رہا، اور نہ علی گڈھ کی طرح جدت پسند اور ہر حال میں زمانے کے ساتھ چلنے والا، بلکہ دونوں کے حسنات سے اس نے استفادہ کیا، اور ایک متوازن ومعتدل موقف اختیار کیا، ندوہ ایک نیا تجربہ تھا، جسے اللہ تعالیٰ نے کامیابی سے ہمکنار کیا'' (تعمیر حیات۔۱۰رمئی ۱۹۸۷ء)

دعوت اور اس کے اس طریقۂ کار کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''دعوت میں جس کا طریقۂ کار، افکار ونظریات کی اشاعت اور لوگوں کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنا ہو اور جو اخبار ورسائل کو بھی اپنی دعوت اور فکر کی اشاعت کا ذریعہ بنائے، اس کا اعلیٰ نمونہ ہمیں سید ابوالحسن علی ندوی اور دیگر فضلاء کے یہاں ملتا ہے، وہ لوگ تعلیم کو جو سب سے مؤثر ذریعہ ہے، اس مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں، اگرچہ اس کا نتیجہ کبھی کبھی دیر سے برآمد ہوتا ہے، لیکن ہر حال میں نتیجہ نکلتا ہے، قوموں کی زندگی میں دس سال کی کیا اہمیت ہے، جبکہ ان کی زندگی صدیوں پر محیط ہوتی ہے''۔ (بحوالۂ سابق)

دار العلوم حیدرآباد کی کانفرنس، امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السبیل کی شرکت، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا کلیدی خطبہ

جامعہ اسلامیہ دار العلوم حیدرآباد جنوب ہند کا مرکزی اور اہم تعلیمی ادارہ ہے، جس کا بلاد عربیہ سے بھی اچھا رابطہ ہے، اور ہمارے بعض ندوی فضلاء بھی یہاں اچھی خدمت انجام دے رہے تھے جن میں مولوی نعمان الدین ندوی فرزند مولانا محمد برہان الدین سنبھلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اور وہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے فراغت کر کے تازہ تازہ جامعہ آئے اور اس کے عربی ترجمان الصحوۃ الاسلامیۃ کے ایڈیٹر بھی ہوئے، دار العلوم حیدرآباد کے بانی اور ناظم مولانا شاہ حمید الدین عاقل حسامی تھے جو ایک مؤقر وباوقار شخصیت تھے اور ہمارے ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے بھی رکن رہے، انہوں نے ضرورت سمجھی کہ ایک عالمی، دینی، تعلیمی ودعوتی کانفرنس کا حیدرآباد میں انعقاد کریں کہ حیدرآباد علم ودین وثقافت کا قدیم مرکز اور نظام کی ریاست کا پایہ تخت رہا ہے، اور آج بھی اس کا بلاد عربیہ وممالک اسلامیہ میں اچھا تعارف ہے اور اس کے لوگ امریکہ ویورپ میں بھی اچھی تعداد میں اپنی خدمات سے معروف ہیں، اس کے لئے ۱۶/۱۷ رجب ۱۴۰۷ھ/۱۷/۱۸ مارچ ۱۹۸۷ء کی تاریخیں طے ہوئیں اور یہ اجلاس بڑی کامیابی کے ساتھ منعقد ہوا، اس کے پہلے اجلاس ۱۶ ررجب مطابق ۱۷ رمارچ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کا کلیدی مقالہ تھا جو ''مسلمانان ہند کے لئے صحیح راہ عمل ان کے منصب ومقام، اسلامی تعلیمات اور واقعات وحقائق کی روشنی میں'' کے عنوان سے تعمیر حیات کے شمارہ ۱۰ رجون ۱۹۸۷ء میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دینے کے موقع پر اس کے بانی وداعی اور روح رواں مولانا حمید الدین عاقل حسامی (امیر ملت اسلامیہ آندھرا پردیش) کی فرمائش پر یہ کلیدی خطبہ تیار کیا گیا تھا، تا کہ اس کے ذریعہ کانفرنس کا افتتاح ہو کہ وہ ایک رہنما مقالہ کی حیثیت سے غور وفکر اور منزل سفر متعین کرنے کی خدمت انجام دے، اجلاس میں جو گاندھی

بھون کے ہال میں ہوا، بڑی تعداد میں علماء وفضلاء دانشور، تعلیمی اداروں کے ذمہ دار وکارکن، صحافی، عمائد شہر اور عرب اہل علم کی ایک تعداد تھی جن میں سب سے قابل ذکر شخصیت اور عظیم القدر مہمان علامہ شیخ محمد بن عبداللہ السبیل امام وخطیب مسجد حرام مکہ مکرمہ کی تھی، اس مقالہ پر گہرے تأثرات کا اظہار کیا گیا لہٰذا اسے ایک راہ عمل کی حیثیت سے سنا گیا، جو ایک طرح سے ایک ملی منشور کی حیثیت رکھتا ہے، اور دعوت فکر وعمل دیتا ہے۔

مقالہ کا آخری اقتباس ملاحظہ ہو:

''حضرات! آپ کے اس اجلاس میں بڑے بڑے علماء، فضلائے علوم دینیہ، زعماء وقائدین، اہل قلم ومفکرین موجود ہیں، میں اپنی اس گزارش کو اسلام کے عہد اول کے ایک عبرت انگیز اور سبق آموز واقعہ کو یاد دلانے پر ختم کرتا ہوں جو ہمارے لیے ایک پیام رکھتا ہے۔

جس وقت جزیرۃ العرب میں ارتداد کی آگ پھیل گئی تو یہ سب کی ذمہ داری تھی، لیکن ذمہ داری کے احساس میں فرق ہوتا ہے، یہی فرق آدمی کو زندہ جاوید بناتا ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس وقت خلیفۂ وقت تھے، انہوں نے کہا: "أینقص الدین وأنا حی" کیا میرے جیتے جی دین میں کوئی کتر بیونت ہوسکتی ہے؟ یا کوئی قطع برید ہوسکتی ہے؟ حیف ہے میری زندگی پر اگر میرے سامنے شریعت اسلامی میں ترمیم، اور اس کے فرائض واحکام میں انتخاب کیا جانے لگے، کہ نماز تو ٹھیک، حج بھی ٹھیک، روزہ بھی ٹھیک لیکن زکوۃ نہیں، یا یہ کہ زکوۃ بھی ٹھیک روزہ نہیں، میں زندہ ہوں اور میرے سامنے یہ تحریف ہو؟ ہو نہیں سکتا۔

پس یہ حمیت تھی جو اُبل کر ان کی زبان پر آئی، اور یہ لفظ ان کی زبان سے نکلے، اور اس نے زمانہ کی کلائی موڑ دی، اور تاریخ کا دھارا بدل دیا، ایک انسان کی حمیت اسلامی، ایک انسان کے احساس ذمہ داری نے تہہ بہ تہہ مشکلات کو کائی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا، تاریخ لمبی ہے، اور واقعۂ ارتداد اور اس کی تفصیلات تاریخ میں محفوظ ہیں، لیکن حقیقت میں جو فیصلہ کن بات تھی، وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ بات تھی، کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ میں زندہ ہوں اور دین پر حرف آئے، میں نے جو دین اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پایا تھا، وہ دین بے کم وکاست ۱۰۰ فیصد رہے گا، ایک نقطہ کو بھی میں اپنی جگہ سے ہٹنے نہیں

دوں گا، اور انہوں نے کر کے دکھایا، اور آج اسلام اپنی پوری شریعت، اپنے ارکان وفرائض ور اپنے مکمل ڈھانچے کے ساتھ موجود ہے۔

عہد حاضر بھی اس وقت کے علماء وقائدین اور سچے اور وفادار حاملین دین سے، اسی دینی غیرت وحمیت اور اسی ہمت وعزیمت کا متوقع ومنتظر ہے، اور مستقبل کا مؤرخ ہی نہیں، عہد حاضر کا حقیقت نگار اور وقائع نویس بھی گوش برآواز ہے کہ وہ ہماری زبان (صرف زبان قال نہیں زبان حال) سے یہ اعلان سنے کہ

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم (۱)

تخریب کاری کا ایک واقعہ اور حادثۂ حرم مکی

حج ۱۴۰۷ھ کے موقع پر حادثۂ حرم کی جو بات سامنے آئی تو یہ حقیقت مخفی نہیں کہ یہ سب کچھ ایرانی جارحیت وشرارت کا حصہ تھا، لیکن اللہ کا یہ فضل ہوا کہ اس جارحیت وشرارت کو سعودی حکومت نے ناکام بنا دیا اور اس کا پورا لحاظ رہا کہ ایک بھی ناحق خون نہ بہے جو رپورٹیں سامنے آئیں، ان میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"سیکورٹی افواج کی رپورٹ اور ٹیپ رکارڈ اور تصاویر سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ تشدد کے باوجود سیکورٹی افواج اور سعودی باشندوں نے ایک گولی بھی ایرانی حجاج پر نہیں چلائی، بلکہ جو چیز پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے، وہ یہ کہ سیکورٹی افواج اور سعودی باشندے اور دوسرے حجاج ایرانیوں کی ان چھری اور چاقوؤں سے زخمی ہوئے، جسے وہ اپنے کپڑوں میں چھپا کر لائے تھے، مسجد حرام کے میدان میں تشدد وہنگامہ کی وجہ سے ۴۱۲ افراد ہلاک ہوئے، اور ۶۴۹ افراد زخمی ہوئے"۔ (تعمیر حیات، ۲۵/اگست ۱۹۸۷ء)

حرم مکی کی عظیم توسیع کی تکمیل اور مسجد نبوی ﷺ کی توسیع کا آغاز

آل سعود کے کارناموں میں پیام توحید کی حفاظت واشاعت سرفہرست کارنامہ ہے، کہ عقیدۂ توحید کے خلاف کوئی بھی خبر انہوں نے گوارہ نہ کیا اور اس سلسلہ میں آل الشیخ

کے مشائخ کی کسی بات کو نظر انداز نہیں کیا، شیخ عمر بن الحسن، شیخ عبد اللہ بن حسن، شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ، شیخ حسن بن عبد اللہ اور مفتی اعظم شیخ محمد بن ابراہیم ان سب کو بڑی عزت وتوقیر دی، اور ان کی سفارشات کو قبول کیا۔ اس کے ساتھ حرمین شریفین کی تولیت کو بہت بڑا اپنے لئے شرف وسعادت کی بات سمجھ کر اس کی بڑی خدمت کی، حرم مکی کی تازہ توسیع بڑا اور اہم کارنامہ ہے کہ جس کے بعد اس کے اندر ۵/لاکھ افراد نماز ادا کرسکیں گے، اور اوپر کی چھت پر اسی ہزار افراد نماز ادا کر سکتے ہیں، شاہ فہد بن عبد العزیز کی ذاتی ہدایات پر حرم شریف کی تین منزلہ عمارت کی چھتوں کو وسیع کر دیا گیا ہے، اور تین منزلہ عمارت کے ایک لاکھ چوالیس ہزار مربع میٹر رقبہ کو وسیع کر دیا گیا ہے، تا کہ نمازیوں کی زیادہ تعداد کو عبادت کے لئے جگہ ملے، اور حرم شریف کی بالائی چھتوں پر جانے کے لئے، چار کونوں میں بجلی سے چلنے والی لفٹوں نے سال گذشتہ سے کام شروع کر دیا ہے، اور ہر یونٹ کی صلاحیت فی گھنٹہ ۳۰ ہزار آدمیوں کو لے جانے کی ہے، اور بالائی چھتوں کے فرش میں مطاف جیسی خاص قسم کی ٹائلس لگائے گئے ہیں، جو حرارت کو جذب کر لیتے ہیں، اور ٹھنڈے محسوس ہوتے ہیں، حرم شریف سے باہر ملحق پانچ میدانوں کی توسیع کر دی گئی ہے، جہاں نمازی اپنی گاڑیاں کھڑی کرتے ہیں، اس کے علاوہ اور بہت سی تفصیلات وجزئیات ہیں، زمزم شریف کی طرف بھی خاص توجہ دی گئی ہے، اور اس کے نظام کو بھی بہتر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

شاہ فہد کا یہ جذبہ بھی قابل قدر ہے کہ وہ مسجد نبوی کی بھی خصوصی فکر رکھتے ہیں، اور اس کے توسیعی منصوبہ کا بھی آغاز کر چکے ہیں، تا کہ عہد نبوی کا مدینہ مسجد نبوی کی وسعت میں آجائے، ہر طرح کی بہتر سے بہتر سہولت کی فراہمی ان کے پیش نظر ہے، اس کے علاوہ منیٰ، مزدلفہ، جمرات کے نظام کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کے لئے وہ اور ان کے معاونین کوشاں ہیں۔(۱)

انگلستان کا سفر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ مرکز اسلامی آکسفورڈ کی دعوت پر ۲۴/اگست ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ سے، ۲۵/اگست کو دہلی سے لندن کے لئے روانہ ہوئے، کاتب

(۱) تعمیر حیات، ۱۰/جون ۱۹۸۷ء۔

تحریر بھی ساتھ تھا، پروگرام یہ تھا کہ لندن سے مرکز البحوث الاسلامیہ لکسمبرگ جس کا اجلاس اس سال قاہرہ میں ہو رہا ہے، کی دعوت پر قاہرہ تشریف لے جائیں گے، اور وہاں تقریباً ایک ہفتہ قیام کر کے ۶ رستمبر کو حجاز مقدس اور وہاں سے وسط ستمبر تک ہندوستان تشریف لائیں گے، مولانا کو ملتقی الفکر الاسلامی الجزائر کی بھی دعوت ملی ہوئی ہے، یہ بھی پروگرام میں تھا لیکن پھر وقت کی تنگی اور واپسی کے تقاضہ کی وجہ سے سفر کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا یورپ کا پہلا سفر اسپین (اندلس) کا تھا، اور اس سفر کے محرک ڈاکٹر سعید رمضان تھے، اس میں ان کے مرافق سفر ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی مرحوم تھے، جن سے حضرت مولانا کو بڑی مدد ملتی تھی اور وہ اردو انگریزی پر یکساں قدرت رکھتے تھے، اور اسلامی وعصری ثقافت کا ایک نمونہ تھے، بعد کے سفروں میں مجھے حضرت مولانا کے ساتھ رہنے کی سعادت ملی، اور یورپ کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا، افسوس ہوا کہ اس کو دنیا کی قیادت کا موقع ملا مگر اس سے دنیائے انسانیت کو فائدہ پہونچانے کے بجائے انسانی اقدار کی پامالی، اور حیا سوز چیزوں کے فروغ اور خود غرضی سامنے آئی، اور اس نے انسانیت کو جو نقصان پہونچایا اس کی تلافی ممکن نہیں، اہل یورپ کے عروج وغلبہ واقتدار سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مسلمانوں کے انحطاط وزوال سے دنیائے انسانیت کو کیسا عظیم نقصان پہونچا، انگلستان، جرمن، سوئزرلینڈ وغیرہ کے سفر ہوئے، ان میں انگلستان کے کئی سفر ہوئے اور آکسفورڈ میں اسلامک سنٹر قائم ہونے کے بعد حضرت مولانا کے اس کے صدر منتخب ہونے اور مجھے بھی رکنیت ملنے پر اس کے سالانہ جلسوں میں شرکت کے مواقع ملنے لگے۔

''جمعیۃ الاصلاح'' ندوہ کے جلسہ میں تاثرات کا اظہار

لندن سے واپسی پر جمعیۃ الاصلاح دار العلوم ندوۃ العلماء نے سفر کے تعلق سے کچھ کہنے کی بات کہی ہے اور ۱۶ رستمبر ۱۹۸۷ء کو یہ پروگرام ہوا، جس میں میں نے طلبہ سے کہا کہ:

''کئی بار مجھے حضرت مولانا کے ساتھ آکسفورڈ جانے کا موقع ملا ہے، لیکن یہ سفر اس نوعیت سے خوش آئند تھا کہ دو سال قبل آکسفورڈ جیسی دنیا کی معروف یونیورسٹی میں

اسلامک سنٹر کا قیام عمل میں آیا ہے، اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس کے صدر ہیں، اس کو صرف ایک تائید غیبی کہنا چاہئے، اس مرکز کے قیام کے بعد اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ یونیورسٹی کے مسلمان اور دیگر طلبہ کو اسلامیات پر مطالعہ کرنے کا اچھا موقع مل سکے گا، اس طرح وہ اسلام کے خدوخال سے صحیح طور پر واقف ہوسکتے ہیں۔

اس سفر سے اندازہ ہوا کہ یورپ کی قومیں روبہ زوال ہیں، کچھ دنوں کے بعد ان کی قیادت دوسروں کے ہاتھوں میں آجائے گی، لیکن ان کے بعد کون قیادت کرے گا؟ معلوم نہیں کہ۔

خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

مگر ان قوموں کو تیار رہنا چاہئے، جن کے آباء واجداد قیادت کر چکے ہیں، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ صدی اسلام کی صدی ہے، اس وقت آپ کی ذمہ داری دوگنی ہوجاتی ہے، اس لئے آپ کو بڑی جدوجہد، بڑی محنت، کاوش وریاضت کرنی پڑے گی، آپ اس کے لئے ندوۃ العلماء کی مہیا کی ہوئی تمام سرگرمیوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیے، اور اسلام کا صحیح اور سچا نمائندہ بنئے۔

رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے پچیس ۲۵ سال ہونے پر عالمی کانفرنس

راقم چونکہ اس کانفرنس میں شریک تھا، اس لیے تاثرات ''تعمیر حیات'' میں شائع ہوئے وہ پیش ہیں۔

''رابطۂ عالم اسلامی آج سے ۲۵ رسال قبل مکہ مکرمہ میں قائم کیا گیا تھا، عالم اسلام کے مسائل ومشکلات میں اپنے وسائل وذرائع کے دائرہ میں سعودی حکومت جو کرسکتی ہے، یا جو رہنمائی دے سکتی ہے، اس کے لئے یہ اس کا ایک نیم آزاد شعبہ تھا جس کے سکریٹری جنرل سعودی حکومت کے ایک قابل اعتماد اور باصلاحیت شخص جو ایک اہم سعودی وزارت پر فائز رہ چکے تھے، مقرر کئے گئے تھے، انہی کی سرگردگی میں اس ادارہ نے اپنا کام شروع کیا، یہ تھے معروف عرب دانشور اور ادیب شیخ محمد سرور الصبان، اس ادارہ کے سربراہ مقرر کئے

گئے جانے سے قبل ملک کے اندر اچھی شہرت رکھتے تھے، اور اہل ادب وفکر میں اعتماد کا مقام رکھتے تھے، چنانچہ ادارہ کو بھی اعتماد کا مقام حاصل ہوا، ان کے معاون خاص شیخ محمد صالح القزاز مقرر کیے گئے، جو مسجد نبویؐ شریف کی توسیع کے کام کی ذمہ داری بڑی خوبی کے ساتھ انجام دے چکے تھے، اور حرم مکی کے عظیم توسیع کے کام کو بڑی خوبی و ہنر مندی کے ساتھ انجام دے رہے تھے، دونوں حرم کی توسیع کا کام مذہبی اور انتظامی دونوں لحاظ سے ایک عظیم کام تھا، جس سے ان کو مسلمانوں کے دلوں میں ایک اچھا مقام حاصل ہو رہا تھا، بعد میں شیخ محمد سرور الصبّان کے انتقال پر رابطہ کے وہی جنرل سکریڑی بھی مقرر ہوئے اور انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے رابطہ کو بڑی ترقی دی۔

رابطۂ عالم اسلامی کا مکہ مکرمہ میں آغاز دراصل ایک اسلامی کانفرنس سے کیا گیا، جو مکہ مکرمہ کے ایک ہوٹل میں منعقد کی گئی تھی، کانفرنس سابق سعودی بادشاہ شاہ سعود بن عبدالعزیز آل سعود کی ہدایت وسرپرستی میں منعقد ہوئی، اس کے انعقاد کے موقع پر جو حضرات پیش پیش اور نمایاں تھے، ان میں مرحوم مفتی فلسطین سید امین الحسینی، مشہور اخوانی رہنما ڈاکٹر سعید رمضان، مشہور عراقی داعی و عالم شیخ محمد محمود الصواف، سابق مفتی اعظم مصر شیخ حسنین محمد مخلوف اور دیگر عرب قائدین ورہنما تھے، اس اجتماع میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ بھی شریک تھے، اور دیگر اہم شرکاء میں ان کا شمار تھا، یہ تمام حضرات اور عالم اسلام کی دیگر متعدد شخصیات کا انتخاب رابطہ کے قیام کے ساتھ اس کے اساسی ممبران کی حیثیت سے کرلیا گیا۔

رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے گذشتہ ۲۵ رسال میں متنوع اور وسیع محاذوں پر اپنی خدمات پیش کیں، اور اس کام کو انجام دیا، دعوت اسلامی کے بے شمار تقاضوں کو پورا کیا، اور مسلمانان عالم کے اداروں اور کاموں میں اپنے وسائل کے دائرہ میں پورا تعاون کیا، اس وقت دنیا کے بیشتر ملکوں میں خواہ وہ اسلامی ہوں، یا غیر اسلامی، رابطہ کے تعاون سے بہت سے ادارے مستفید ہو چکے ہیں، اور دنیا کے بہت سے ملکوں میں اس کے ذیلی دفاتر قائم ہیں جو وہاں کی اسلامی ضرورتوں کا جائزہ لے کر قابل عمل تعاون کی سفارش کرتے ہیں، رابطہ کا یہ سارا کام ثقافتی، علمی، دعوتی میدانوں میں محدود رہا ہے، سیاسی اور حزبی اختلاف

سے اس نے عموماً گریز رکھا ہے۔

رابطۂ عالم اسلامی نے اپنے کاموں کی وسعت کی بنا پر اس مدت میں کئی ذیلی ادارے قائم کئے، تاکہ کام تقسیم کیا جاسکے، ان میں ایک اسلامی مساجد کونسل اور دوسری اسلامک فقہ کونسل ہے، جس کے علیحدہ علیحدہ ذمہ داران ہیں اور بنیادی طور پر رابطۂ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ان کے بھی سربراہ اعلیٰ ہوتے ہیں۔

ان کے علاوہ انتظامی طور پر رابطہ کے صدر دفتر میں متعدد شعبے ہیں جن کے ذمہ عالم اسلامی کی متنوع ضرورتوں کے لحاظ سے ذمہ داریاں تقسیم ہیں، اس طرح رابطۂ عالم اسلامی کا کام ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے، رابطۂ عالم اسلامی کو متحدہ اقوام نے مشاہد کی حیثیت سے اپنے یہاں تسلیم کیا ہے، اور عرب لیگ اور مؤتمر ممالک اسلامی میں بھی اس کو مدعو خصوصی کا درجہ حاصل ہے، رابطۂ عالم اسلامی کے بجٹ کا بڑا حصہ سعودی حکومت کی امداد سے پورا ہوتا ہے، اواس کا بقیہ حصہ دیگر مسلم ممالک اور اصحاب ثروت کی مدد سے پورا ہوتا ہے۔

رابطۂ عالم اسلامی یوں تو شاہ سعود بن عبد العزیز کے زمانہ میں قائم ہوا تھا لیکن پھر اس کو شاہ فیصل بن عبد العزیز کی سرپرستی حاصل ہوئی اور ان کے عہد میں اس کو بہت ترقی اور وسعت حاصل ہوئی، شاہ فیصل کے بعد ان کے بھائی شاہ خالد اور اب ان کے بھائی شاہ فہد بن عبد العزیز کی سرپرستی حاصل ہے اور انہی کی سرپرستی میں اس کی عمر کے ۲۵ سال پورے ہوئے، اور یہ طے ہوا کہ اس کی سلور جوبلی منعقد کی جائے، جو دعوت اسلامی کی ایک وسیع کانفرنس کی صورت میں منعقد ہو، چنانچہ یہ کانفرنس ۱۱ر تا ۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۷ء رکھی گئی، اور اس میں دنیا کے مختلف ملکوں اور خطوں سے چار سو سے زائد مسلمان مفکرین وعلماء اور داعی مدعو کئے گئے، جن کی تعداد کانفرنس شروع ہونے تک چھ سو ۶۰۰ سے اوپر پہونچ گئی اور وہاں کی دنیا کی چیدہ مسلم شخصیتیں اکٹھا ہوگئیں، جن میں ایک تعداد دعوت اسلامی اور مسائل عالم اسلام کے مختلف النوع موضوعات پر مقالے کر آئی تھی، اور دیگر حضرات نے سامعین کی حیثیت سے شرکت کی، اور ان میں سے متعدد نے بحث ومباحثہ میں حصہ لیا، یہ ۶۰۰ سو سے زائد نمائندے دنیا کے تقریباً ۱۸ار ملکوں سے آئے تھے، کانفرنس میں جو اہم موضوعات زیر بحث آئے، ان میں

فلسطین کا قضیہ، لبنان میں یہودی جارحیت کا مسئلہ، لبنان میں فلسطینی وغیر فلسطینی عناصر کی مسلح کشمکش، خلیج کی جنگ کے مہلک اثرات، اور اس کے بند کرانے کی ضرورت، آیت اللہ خمینی کے عقائد و رجحانات اور ان کے اثرات ونتائج، سوڈان اور انڈونیشا میں عیسائی مشنریوں کی اسلام دشمنی اور سامراجی روش، افغانستان میں مجاہدین کی جدوجہد اور قربانی اور ان کی آزادی وخودمختاری کا مسئلہ، جنوبی فلپائن میں مسلمانوں کی جدوجہد وقربانی، اور ان کے مسائل، مسلمانوں کی دینی وذہنی تربیت کی صورتیں، نیز دعوت اسلامی کے مختلف النوع تقاضے اور ان کی تدابیر اور دیگر موضوعات زیر بحث آئے، اور مناسب قراردادوں پر کانفرنس ختم ہوئی۔

کانفرنس کا افتتاح شاہ فہد بن عبدالعزیز کے خطاب سے ہوا، ان کے بعد صدر رابطہ سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز نے جو سعودی عرب کے سب سے بڑے دینی وشرعی ادارہ دارالافتاء والبحوث العلمیۃ والدعوۃ والارشاد کے صدر بھی ہیں، خطاب کیا۔

رابطۂ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف نے تمہیدی تقریر کی پھر مندوبین کی نمائندگی کے لئے جامع الازہر کے صدر فضیلۃ الشیخ جادالحق علی جادالحق نے تقریر کی۔

افتتاحی اجلاس صدر رابطہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز اور سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کی تقریروں پر مشتمل تھا، اور اس میں مندوبین کے نمائندہ کی حیثیت سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے تقریر فرمائی۔

آخر میں امام محمد بن سعود الاسلامیہ یونیورسٹی ریاض کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی نے قراردادیں پڑھ کر سنائیں جن کی منظوری پر اجلاس ختم ہوا، کانفرنس کے درمیانی اجلاس عالم اسلامی کی مختلف شخصیتوں کی صدارت میں ہوتے رہے، جن میں مقالات پیش کئے جاتے رہے، اور تقریریں ومباحثے ہوتے رہے۔

کانفرنس کے اہم بیرونی شرکاء میں جامع ازہر مصر کے سربراہ شیخ جادالحق علی جاد الحق، سوڈان کی سابق انقلابی کونسل کے صدر فیلڈ مارشل عبدالرحمٰن سوار الذہب، پاکستانی کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم خاں، لبنان کے مفتی اعظم شیخ حسن خالد، عراق کے وزیر

اوقاف ڈاکٹر عباس، قطر کے بڑے عالم شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری، اور مشہور اسلامی مفکر وداعی علامہ یوسف القرضاوی، عرب امارات سے ڈاکٹر عزالدین ابراہیم، اور شیخ صالح الرئیس، کویت سے مؤسسۃ البر والزکوۃ کے صدر شیخ یوسف الحجی، اور وہاں کی بااثر ومشہور شخصیت شیخ عبداللہ علی المطوع، شیخ مستشار عبداللہ العقیل، استاذ انورالجندی اور عالم اسلام کے مختلف ممالک کے بڑے اہل علم وفکر نیز امریکہ، افریقہ، یورپ اور مشرق اقصی کے ممالک کے بہت نامور اہل علم ودانشور تھے، ہندوستان سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے علاوہ مختلف اداروں اور جماعتوں کے نمائندے شریک تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے کانفرنس میں تین خطاب فرمائے، ایک مندوبین کے نمائندے کی حیثیت سے، دوسرا مکہ مکرمہ ومدینہ منورہ کے تقدس وحرمت پر، اور تیسرا دعوت اسلامی۔اصول وطریقۂ کار پر، یہ آخر الذکر خطاب دراصل ان کا ایک ٹھوس اور علمی مقالہ تھا جوانہوں نے کانفرنس کے لئے خاص طور پر پہلے سے تیار فرمایا تھا، اس مقالہ کو حاضرین نے بہت سراہا، اور تجویز رکھی کہ اس کو کانفرنس کی قرارداد میں شامل کرلیا جائے۔

کانفرنس کے اجلاس مکہ انٹرکونٹینٹل ہوٹل کے التضامن الاسلامی ہال میں منعقد ہوئے، اور اس کے مہمان اسی ہوٹل میں اور اجیاد ہوٹل میں ٹھہرائے گئے، اول الذکر ہوٹل مکہ مکرمہ کی آبادی سے باہر کئی میل کے فاصلہ پر جدہ مکہ روڈ پر واقع ہے، اور وہاں پانچ ستاروں والا ہوٹل ہے۔اور آخر الذکر آبادی کے اندر حرم شریف کے جنوبی رخ پر محلّہ اجیاد میں واقع ہے اور اول الذکر کی سطح کا ہوٹل ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اپنے مقررہ طریقۂ کار کے مطابق اپنے محبّ ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی کے مکان پر قیام کو ترجیح دی اور اپنے رفقاء کے ساتھ انہیں کے یہاں رہے، کانفرنس کے دوران جن اہم شخصیتوں یا اداروں کی طرف سے ظہرانہ یا عشائیہ دیئے گئے ان میں صدر رابطہ سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز اور وزیر حج واوقاف شیخ عبدالوہاب عبدالواسع، منطقہ مکہ کے گورنر امیر ماجد بن عبدالعزیز آل سعود، اسلامک دیولپمنٹ بینک کے ڈائرکٹر ڈاکٹر احمد محمد علی ودیگر شخصیتیں تھیں۔

رابطہ کی طرف سے مہمانوں کو مدینہ منورہ کی زیارت کے لئے خصوصی پروازوں سے بھیجا گیا اور ایک روز بیت اللہ شریف کے اندر داخلہ کی سعادت بھی حاصل کرائی گئی۔

کانفرنس سے اس کے مقررہ موضوع کو تقویت وفائدہ پہونچنے کے ساتھ ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ایک وقت میں ایک جگہ پر اتنی دور دور کی شخصیتوں کو دیکھنے اور ملنے کا موقع فراہم ہوا، عرصہ سے بچھڑے ہوئے ساتھی اور دوست بھی ملے، اور مختلف علاقوں اور منطقوں کے اعزہ ایک جگہ جمع ہوئے، اور ایک کو دوسرے کی بات سننے اور سمجھنے کا موقع ملا، اور ملت اسلامیہ کی عالمی برادری کے مختلف النوع حالات، مسائل اور تقاضوں کو جاننے کی صورت پیدا ہوئی، یہ کانفرنس اس لحاظ سے بھی بڑی کامیاب اور مفید کانفرنس تھی۔ (ملاحظہ ہو تعمیر حیات، کا شمارہ ۱۱ تا ۱۵ نومبر ۱۹۸۷ء)

مکہ مکرمہ میں یہ اجتماع ۱۸؍ تا ۲۳؍ صفر المظفر ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۱ تا ۱۵؍ اکتوبر ۱۹۸۷ء منعقد ہوا جس میں ۱۲۲؍ ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے، حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا کلیدی مقالہ جسے قرارداد میں جگہ دی گئی، شیخ محمد بن ناصر العبودی کی زیر صدارت نشست میں پڑھا گیا تھا، مقالہ کا اردو ترجمہ ماہنامہ ''ذکر وفکر'' نئی دہلی شمارہ دسمبر اور ''تعمیر حیات'' کے شمارہ ۱۰؍ دسمبر ۱۹۸۷ء میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، جو ''موجودہ عالم اسلام کے لئے فیصلہ کن محاذ اور مرکزی میدان عمل'' کے عنوان سے ہے، اور الگ رسالہ کی صورت میں شائع ہو چکا ہے، جس کے اہم نکات حسب ذیل ہیں:

۱۔ مسلم عوام اور ان کے تمام گروہوں میں ایمان کی قوت کو پیدا کرنا اور جلا دینا۔

۲۔ مذہبی حقائق اور دینی تصورات کو تحریف اور عصر حاضر کے مغربی تصور سے محفوظ رکھنا۔

۳۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی، جذباتی اور قلبی تعلق کی پختگی اور گہری محبت جو اپنی ذات، اہل وعیال، آل واولاد، ماں باپ اور ساری متاع سے زیادہ ہو۔

۴۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام پر اعتماد کی بحالی جن کے ہاتھوں میں تعلیم وتربیت اور وسائل ابلاغ کی باگ ڈور ہے۔

۵۔ ضرورت ہے کہ مغرب سے درآمد کیا ہوا نظام تعلیم جو پورے عالم اسلام میں رائج ہے، ایک بار نئے سرے سے اس کا جائزہ لیا جائے، اور پوری طرح کھنگالا جائے، اور اس کو ایسے قالب میں ڈھالا جائے جو مسلم اقوام کے قدو قامت پر راست آئے، اور اس کے عقیدہ و پیغام سے ہم آہنگ ہو اور جس سے مسلم قوم کی معنوی خصوصیت نمایاں اور اس کی انفرادیت آشکارا ہو، مادی والحادی عناصر سے پاک ہو تا کہ کائنات کا صرف مادی تصور اس کے سامنے نہ ہو۔

۶۔ ایک بین الاقوامی پیمانہ پر مضبوط تحریک ہو کہ دنیا کے پڑھے لکھے سمجھدار طبقہ میں اسلام کے علمی خزانوں کا تعارف کرایا جائے۔

۷۔ انسانی نفوس اور قومی وجدان میں تمدنی نظام کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں، اس لئے اسلامی حکومتوں اور مسلم سوسائٹیوں کا فرض ہے کہ وہ ایک مستقل بالذات تمدن کی باریک بینی کے ساتھ تشکیل کریں، جو مغرب کی کورانہ تقلید کے سرسری اقدام اور احساس کمتری کے آثار سے پاک ہو اور یہ کہ اسلامی ممالک اسلامی زندگی کا ایک نمونہ پیش کریں جس سے اسلام کی ایک خاموش تبلیغ ہو گی۔

۸۔ مغربی تمدن بشمول مغربی علوم و نظریات کو ایجادات و امکانات کے ایک خام مال کی حیثیت سے قبول کیا جائے، جس سے عالم اسلام کے فکری رہنما اور سربراہ ایک ایسا پائیدار مناسب وقت تمدن تیار کریں جس کی بنیاد اخلاق، پرہیزگاری اور رحم و انصاف پر ہو، دوسری طرف اس میں نمو و افزائش کی گنجائش ہو۔

۹۔ جہاں تک ان ممالک کا تعلق ہے جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے، اور حکمراں اسلام سے صلح کل کا معاملہ کرتے ہیں، ان ممالک میں کوشش ہونی چاہئے کہ ایک مرکزی قیادت ہو، جس کی بنیاد اسلام کے نظام شوریٰ پر ہو اور خیر و نفع کے کاموں میں باہمی تعاون جس کی اساس ہو اور کم از کم اپنی کوتاہی کا احساس ضرور ہو کہ مسلمان ''امامت عامہ'' کے وجود سے محروم ہیں، امامت عامہ یا خلافت اسلامیہ جس کو قائم کرنا مسلمانوں کا فرض تھا اور جس کے نہ قائم کرنے کی ان سے پرشش ہو گی۔

۱۰۔ وہ ممالک جو غیر اسلامی ہیں وہاں اسلام کی دعوت اور اس کا تعارف حکمت وبصیرت کے ساتھ جاری رکھنا چاہئے اور وہ نہج اختیار کرنا چاہئے جس میں اسلامی تعلیمات کی روح جلوہ گر ہو، زمانہ کے مزاج کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہو۔

۱۱۔ وہ ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں اس بات کی فکر رکھنی ہے کہ اسلام کی صحیح نمائندگی ہو، اسلامی زندگی ایسی ہو جو دوسروں کو متوجہ کرے اور جس کی طرف لوگوں کے دل مائل ہوں اور اخلاقی وروحانی قدروں کی قیادت مسلمانوں کو سنبھالنا چاہئے، اور ملک کو حوادث اور تباہی سے بچانے کی ذمہ داری قبول کرنا چاہئے، کہ اسلام صرف اس صورت میں اپنی ضرورت اور اہلیت ثابت کرسکتا ہے اور مسلمان اپنی دعوتی مہم اور قائدانہ کردار ان ملکوں میں ادا کرسکتے ہیں۔

۱۲۔ ایک دعوتی وایمانی حرکت مسلمانوں میں ضرور قائم رہے، جو ایجابی انداز کی ہو اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہو، ان کے حاملین اسلام کی برتری کا عقیدہ ہو اور اس پر یقین ہو، انسانیت اس دین کی محتاج اور ضرورت مند ہے۔

ایک اپوزیشن قائد کا اعتراف حقیقت

جنتا پارٹی کے صدر جو بعد میں سماج وادی پارٹی و جنتا پارٹی کے صدر اور ہندوستان کے وزیر اعظم کے منصب پر بھی فائز ہوئے، جناب چندر شیکھر کا یہ بیان سامنے آیا جو تاریخی حقائق اور انصاف پر مبنی بیان تھا کہ:

"بابری مسجد ساڑھے چار سو سال سے مسجد ہے، اس لئے اسے مسجد ہی رہنا چاہئے، اور اس سلسلہ میں دو فرقوں کے درمیان جو تنازعہ پیدا ہو گیا ہے، اسے باہر بات چیت کے ذریعہ دور کیا جانا چاہئے، جنتا پارٹی کے قائد چندر شیکھر نے یہ بات بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہی جو اس کی اردو سروس سے ۱۹/اکتوبر ۱۹۸۷ء کی رات کو نشر کیا گیا، چندر شیکھر نے کہا کہ اس عمارت کی قدیم تاریخ کی بحث میں نہیں پڑنا چاہئے، کیونکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں، اگر تاریخ کو اسی طرح کریدا جائے، تو اس کی زد ہندوستان کے ۱۳ کروڑ مسلمانوں پر پڑ سکتی ہے، جن کی

بڑی تعداد پہلے ہندو ہی تھی، کیا یہ مطالبہ درست ہوگا کہ انہیں ہندو ہو جانا چاہئے، بابری مسجد کو مندر میں تبدیل کر لینے کے عمل سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہونچی ہے۔"(۱)

ایک خوش کن خبر اور مبارک اقدام

ذرائع ابلاغ سے یہ خوش کن خبر اور مبارک اقدام کی اطلاع ملی کی سعودی عرب میں جس کے حکمراں کے عقیدہ توحید کے معاملہ میں بڑے حساس ہیں، ایک شاہی فرمان کے ذریعہ شاہ فہد بن عبدالعزیز آل سعود نے اپنے ولی عہد سلطنت امیر عبداللہ بن عبدالعزیز کو ہدایت جاری کی کہ ان کو جلالۃ الملک کے بجائے خادم الحرمین الشریفین لکھا جائے اور تعظیم وتکریم کے الفاظ مولائی اور المعظم کے استعمال سے بھی احتراز کیا جائے۔

خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد نے یہ شاہی فرمان ۲۹/۲/۱۴۰۷ھ یکم نومبر ۱۹۸۷ء کو جاری کیا، اس سے پہلے شاہ فیصل بن عبدالعزیز بھی اس کی تاکید کر چکے تھے، اور شاہ خالد کی بھی تاکید تھی مگر ذرائع ابلاغ اس سے رک نہیں رہے تھے تو شاہ فہد نے سختی سے یہ ہدایت ولی عہد سلطنت کے ذریعہ سب کو جاری کی، اور ہدایت کی کہ تمام سرکاری کاغذات وغیر سرکاری مراسلات میں اسے ترک کر دیا جائے، اور اس کی جگہ خادم الحرمین الشریفین کا لقب استعمال کیا جائے، شاہی فرمان میں یہ وضاحت بھی کی گئی کہ ان کو یہ بالکل پسند نہیں کہ ان کے نام کے ساتھ جلالۃ اور مولائی اور المعظم وغیرہ الفاظ کا استعمال ہو، یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ مملکت کے دینی حلقے ان الفاظ کے استعمال میں پہلے سے حساس رہے ہیں کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت وبزرگی کے لئے استعمال ہوتا ہے، خلفائے راشدین اور بعد کے ملوک نے بھی اس سے احتراز کیا تھا اور خلیفہ وامیر المومنین کے لقب اختیار کئے۔

شاہ فہد بن عبدالعزیز نے خادم الحرمین الشریفین کے لقب کو اختیار کر کے حرمین شریفین کی خدمت کو اپنے لئے سب سے اول ترجیح اور مقدم کام کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، اور اپنے عمل سے دونوں حرموں کی خدمت وتوسیع میں بھی بڑی فراخدلی کا اظہار کیا ہے۔

---

(۱) بہ شکریہ سہ روزہ دعوت، نئی دہلی۔ ۲۵/ اکتوبر ۱۹۸۷ء

ندوۃ العلماء میں رابطہ ادب اسلامی کا دوسرا سیمینار اور سکریٹری رپورٹ

۱۱رنومبر ۱۹۸۷ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں رابطہ ادب اسلامی کا دوسرا سیمینار جو جے پور سیمینار کے بعد ہوا، اردو ادب پر حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا اثر کے عنوان سے تھا جس کے مختلف موضوعات پر فاضل مقالہ نگاروں نے اور ممتاز علمی وادبی شخصیات نے روشنی ڈالی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے صدارت فرمائی اور کاتب تحریر نے سکریٹری رپورٹ پیش کی جو حسب ذیل ہے۔

الحمدللہ والصلوۃ والسلام علی سیدنا رسول اللّٰہ محمد وآلہ وصحبی اجمعین!

حضرات! ہمارا یہ اجتماع ان علمی اجتماعات کی ایک کڑی ہے جو رابطہ ادب اسلامی کے تحت کئی سال سے منعقد کئے جاتے رہے ہیں اس اجتماع سے قبل چار پانچ علمی اجتماع منعقد کئے گئے، جن میں ادب اسلامی کے تصور کو سامنے رکھتے ہوئے مضامین پیش کئے گئے اور مذاکرے ہوئے، ادب اسلامی یوں تو کوئی نیا عنوان نہیں ہے لیکن ذہنوں میں اس کو اس طرح جگہ نہیں ملی جس طرح جگہ ملنی چاہئے، بعض ذہن ادب کے ساتھ اسلامی کا لفظ لگنے سے کچھ تعجب محسوس کرتے ہیں اور ان کو اس میں ایک محدود اور تنگ تصور کا احساس ہوتا ہے، رابطہ ادب اسلامی نے اسلامی ادب پر بحث و مذاکرے اور مضامین سے ان شکوک وشبہات کو کم کرنے کی کوشش کی اور الحمد للہ خاصی حد تک کامیابی ہوئی، اس سے قبل رابطہ نے دو سال کی مدت میں جن موضوعات پر مذاکرہ علمی منعقد کئے، ان میں (۱) ادب اسلامی کا تصور (۲) اسلامی ادب میں سوانح نگاری، افسانہ نگاری اور تنقید (۳) اسلامی ادب میں طنز ومزاح (۴) اسلامی ادب اور مغربی ادبی تحریکات کے موضوعات رہے ہیں، ان موضوعات کے مذاکرہ میں ادب کے اچھے فضلاء نے حصہ لیا اور بیش قیمت مضامین پڑھے۔

اب ہمارا یہ مذاکرۂ علمی ''اردو زبان وادب پر حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا اثر'' کے موضوع پر منعقد ہونے جا رہا ہے، ہم کو مسرت ہے کہ ہندوستان کی متعدد دانش گاہوں

کے مؤقر اساتذہ اور ملک کے متعدد سر برآوردہ اصحاب علم وذوق ہمارے اس اجتماع کو اپنی شرکت سے قیمتی بنا رہے ہیں، ہم کو اس موضوع پر ان کے علم ومطالعہ سے فائدہ اٹھانے کا اچھا موقع مل رہا ہے، ہم ان سب کے شکر گزار ہیں کہ سفر کی زحمت وصعوبت اٹھا کر انہوں نے ہماری اس محفل کو زینت بخشی۔

حضرات! ہمارے اس اجتماع کا موضوع کسی قدر ایک نیا موضوع ہے، اس پر باقاعدہ علمی مجلس ابھی تک منعقد نہیں کی گئی اور نہ اس پر اہل علم وذوق نے زیادہ کاوشیں صرف کیں لیکن یہ موضوع ایک اہم موضوع ہے کیونکہ برصغیر کے مسلمانوں پر بلکہ ان کے علاوہ دیگر اہل مذاہب کی عمومی زندگی اور ان کی مشترکہ زبان اردو پر حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اصلاح وجہاد نے خاصا اثر ڈالا ہے، زبان زندگی کو متاثر کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے اور زندگی کی ترجمانی کا وسیلہ بھی اور یہ بات گذشتہ دو صدی کی مدت میں اس پورے برصغیر میں سب سے زیادہ اردو کو حاصل رہی ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جس کے شروع عہد میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اصلاح وجہاد سے سرشار لوگ برصغیر کے طول وعرض اور اس کے اطراف واکناف میں پھیل گئے تھے اور انہوں نے اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق یہاں کے لوگوں میں کام کیا، تقریر ووعظ، تصنیف وتالیف اور تربیت کے مختلف ذرائع اختیار کیے، ان کے پیش نظر چونکہ اپنی بات لوگوں کے دلوں میں اتارنی تھی لہٰذا اسی کے لئے انہوں نے اپنی علمی وادبی صلاحیتوں کو استعمال کیا، انہوں نے سامعین وقارئین کی علمی وادبی سطح کا خیال کیا اور ان کی زندگی کی عملی صورتحال کو پیش نظر رکھا اور بات اس طرح کہنے کی کوشش کی کہ ان کے دل میں اتر جائے اور کوشش کی یہی وہ نوعیت ہوتی ہے جو ایک ادیب میں اچھا ادب اور ایک صاحب علم میں اچھا علم پیش کرنے کی صلاحیت ابھارتی ہے اور علم وادب کے سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ ہو جاتا ہے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے قبل اردو مرصع ومسجع اسلوب سے بوجھل تھی، اس بوجھ کے ساتھ مخاطبین میں مؤثر وزوراثر کام انجام نہیں دیا جا سکتا تھا، لہٰذا فطری بات تھی کہ اس عظیم اصلاحی تحریک کے اہل قلم وزبان آسان اور زیادہ سمجھا جانے والا اسلوب اختیار کریں اور

چونکہ یہ حضرات ملک کے طول وعرض میں پھیلے اور عامۃ الناس کی بڑی تعداد پر اثر انداز ہوئے اس لئے ان کے اثر سے اردو زبان وادب کے اسلوب میں ایک موڑ کا آنا بالکل فطری تھا اور وہ آیا بھی پھر اس کے اثرات عرصہ تک جاری رہے، متعدد اہل علم کی تحریریں اور تصنیفات اس کی گواہ ہیں، سید صاحبؒ کی تحریک سے اولین اور گہرا تعلق رکھنے والے اسی طرح کے حضرات میں جو نام زیادہ نمایاں ہیں ان میں مولانا اسماعیل شہیدؒ جن کی ''تقویۃ الایمان'' کے بیسوں ایڈیشن شائع ہوئے اور ملک کے طول وعرض میں پھیلے، مولانا خرم علی بلہوری جن کی ''نصیحۃ المسلمین'' اور ''رسالہ جہادیہ'' ہے، ان کے علاوہ مولانا کرامت علی جونپوری جو چند در چند کتابوں کے مصنف ہیں، مولانا عبد الرزاق کلامی جن کی ''فتوح الشام'' کے منظوم ترجمہ ''صمصام الاسلام'' نے عرصہ تک اسلامی جذبات میں گرمی اور جوش پیدا کیا اور وہ اردو میں ایک عظیم شاہنامہ جہاد بنی، ان کے علاوہ عظیم اردو شاعر مومن خان مومن جن کی ''مثنوی جہادیہ'' بھی ہے اور مولانا فخر الدین خیالی جن کی ''مسدس خیالی'' ہے ارو دیگر حضرات کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

اس اولین عہد کے بعد کے دور میں تحریک خلافت اور تحریک آزادی نیز برصغیر کی اصلاحی کوششوں میں جو ادب کارفرما رہا، اس میں حضرت شہیدؒ کی تحریک سے بڑی رہنمائی اور اس کے ادب سے طاقت ملی، یہ مذاکرہ علمی ان ہی امور کے سلسلہ میں بحث و مذاکرہ کرنے کے لئے رابطہ ادب اسلامی کے زیر سرکردگی منعقد کیا جارہا ہے۔

حضرات! ادب اسلامی کا یہ ادارہ رابطہ ادب اسلامی ایک نوخیز ادارہ ہے، اس کے قیام کا فیصلہ آج سے ڈھائی سال قبل مکہ مکرمہ کے ایک ایسے اجتماع میں کیا گیا جس میں مختلف اسلامی ملکوں کے فضلاء و اساتذہ ادب شریک ہوئے تھے، اور پھر باقاعدہ ایک بڑے اجتماع میں جو ہمارے اس ندوۃ العلماء میں تقریباً دو سال قبل منعقد ہوا تھا اس ادارہ کا قیام عمل میں آیا، اس ادارہ نے اپنی ایک مجلس علمی قائم کی اور اس کی رکنیت کے لئے پورے عالم اسلام کی ان ادبی شخصیتوں پر نظر ڈالی جو نہ صرف ادب کے اسلامی تصور کے حامل ہیں بلکہ ادب پر ان کا کچھ نہ کچھ ٹھوس اور مطبوعہ کام بھی ہے، رابطہ ادب اسلامی کی مجلس علمی کی

رکنیت کے لئے ایسے ہی ناموں کو قبول کیا گیا، اس رکنیت کے لئے کچھ شرائط رکھے گئے جن کے مطابق رابطہ ادب اسلامی عملدرآمد کرتا ہے۔

ہم کو خوشی ہے کہ رابطہ ادب اسلامی کی مجلس علمی میں اس وقت تک ڈیڑھ سو سے زائد ادیب رکن بن چکے ہیں، جن میں ہندوستان کے علاوہ بلادعربیہ کے ادیبوں کی خاصی تعداد ہے۔

رابطہ ادب اسلامی کا صدر دفتر فی الحال ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہے، اس کی مجلس علمی کی شاخیں دیگر خطوں اور علاقوں میں ہیں، ادب اسلامی کے مقاصد کے لئے لکھنؤ مرکز کے علاوہ دیگر خطوں میں بھی متعدد اساتذہ ادب کوشاں ہیں جن میں خاص طور پر مصر وشام وحجاز ونجد ومراکش کے اہل ادب وعلم نمایاں ہیں۔

رابطۂ ادب اسلامی کا کام جیسا کہ آپ کے علم میں ہے، صرف علمی وادبی دائروں تک محدود ہے، وہ سیاسی وجماعتی دائروں سے بالکل علیحدہ ہے کیونکہ اس کے مقاصد صرف اسلامی وادبی ہیں جو ادب کے اسلامی تصور کے سب حاملین کے لئے مشترک ہیں، سیاسی وجماعتی وابستگیوں سے ہٹ کر ایسے جو حضرات ہمارے ساتھ تعاون کرتے ہیں، ہم کو ان کے تعاون سے نہ صرف مسرت ہے بلکہ ہم ان کے مشکور ہیں۔

ہم اللہ رب العزت سے دعا کرتے ہیں کہ ہم کو اخلاص کے ساتھ صحیح راہوں پر کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور قبولیت سے نوازے۔

ربنا وفقنا لما تحب وترضى واجعل آخرتنا خيراً من الأولىٰ ولا حول ولا قوة الا بالله وصلى الله على نبيه ورسوله محمد وعلى آله وصحبه أجمعين (۱)۔

اس دوروزہ سمینار کی افتتاحی نشست ۱۱رنومبر ۱۹۸۷ء کو صبح دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شبلی لائبریری میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زیر صدارت ہوئی، جس میں راقم السطور نے یہ رپورٹ پیش کی جو ذکر کی گئی، اردو زبان وادب پر حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے اثرات ایک بڑا ہی اہم دلچسپ موضوع تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی جماعت کے لوگوں نے اپنے گفتار وکردار سے اردو کے فروغ اور ارتقاء میں بڑا حصہ لیا، جس کا امتداد دینی مدارس کے قیام وفروغ

(۱) تعمیر حیات، ۲۵رنومبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳)

سے اور ہوا، عصری دانش گاہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے موسس سر سید احمد خاں کا خاندان بھی سید صاحب کی جماعت سے جڑا ہوا ہے، اور عظیم شاعر مومن خاں مومن نے جہاد کی تائید اور حضرت سید صاحب کی مدح میں اشعار کہے، اس کے علاوہ مولانا خرم علی ملہوری کا قصیدہ جہادیہ، مولانا ابوالحسن کاندھلوی کی مثنوی اور قصیدہ سب اس کے سایہ ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ ''حضرت سید احمد شہید نے دینی جذبہ کو عام کرنے اور انقلاب لانے کے لئے زبان اور بیان کو نظر انداز نہیں کیا، یہاں تک کہ عین میدان جنگ میں بھی شاعری کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا۔''

مزید سمینار کے موضوع کی مناسبت سے کہا کہ ''سید احمد شہید کی تحریک سے اردو زبان وادب کو بڑا فائدہ پہونچا، شاہ عبدالقادر دہلوی کے اردو ترجمہ قرآن مجید کو بھی اس سے بڑا فائدہ پہونچا، جو سید صاحب کے مربیوں میں تھے، اور اس ترجمہ نے عوام میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا، زبان کو اس سے بڑا فائدہ ہوتا ہے کہ وہ تحریک کی زبان بن جائے''۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی، ڈاکٹر مشیر الحق ندوی وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی نے تجویز پیش کی کہ ندوۃ العلماء ایک ایسا شعبہ قائم کرے جو سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے ساتھ خاص ہو، اور اس میں ان الزامات کا جائزہ لیا جائے جو اس تحریک پر عائد کئے گئے ہیں، ڈاکٹر نیاز احمد فاروقی نے کہا کہ ہندوستان میں آزادی کی جو لہر چلی اور اس میں تیزی آئی وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی انقلابی تحریک کی دین ہے، اس تحریک کے بعد اردو زبان میں بہت زیادہ کام ہوا، مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے یہ تجویز رکھی کہ حضرت سید احمد شہید کے بارے میں بین الاقوامی سطح پر ایک مذاکرہ ہونا چاہئے، ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقی ندوی نے سید صاحب کی اردو تفسیر ''سورۃ الفاتحہ'' کو موضوع بنایا اور اس کا دوسری تفسیر سے موازنہ کیا، حضرت شاہ اسماعیل شہید کی ''تقویۃ الایمان'' کو موضوع بنایا گیا، آخر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اختتامی تقریر میں فرمایا کہ اس سمینار میں جو روحانیت اور خیر و برکت کی بات محسوس ہوئی وہ دوسرے سمیناروں میں نہیں ہوئی، اس کا جب یہ حال ہے تو اس جماعت نے زبان وادب پر جو اثر ڈالا، اس کی کیا تاثیر ہوگی۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دارالمصنفین اعظم گڈھ کی وفات

حضرت سید احمد شہید کی تحریک کا اثر اردو زبان وادب پر بہت کامیاب سمینار ندوۃ العلماء میں منعقد ہوا جو رابطہ ادب اسلامی کی ہندوستانی شاخ کا دوسرا سمینار تھا، جو جے پور کے سمینار کے بعد ہوا اور بڑی اہم علمی و تحقیقی شخصیتوں اور اہل علم وادب نے اس میں اپنے مقالات کے ساتھ شرکت کی جن میں خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر احمد فاروقی، ڈاکٹر مشیر الحق ندوی اور مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کے علاوہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی اہم شخصیت بھی شریک تھی، افسوس کہ سمینار کے دو چار دن بعد لکھنؤ میں ہی ایک مقام سے دوسرے مقام پر رکشہ سے جاتے ہوئے ۱۸ر نومبر ۱۹۸۷ء کو وہ گر پڑے اور وہ گرنا ان کی وفات کا سبب بن گیا، جنازہ دارالمصنفین اعظم گڈھ لے جایا گیا اور وہاں تدفین عمل میں آئی جہاں علامہ شبلی نعمانی، مولانا مسعود علی ندوی اور دارالمصنفین کی اہم شخصیتیں آسودۂ خاک ہیں۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

ایک ملی ضرورت کا احساس

ملک کے نیشنل پریس کا جانبدارانہ رویہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی ہے، یہ مسلمانوں کے بارے میں صحافتی دیانتداری کے تقاضوں سے بھی عاری ہے، اس نے مسلمانوں کے مسائل اور ان کی سرگرمیوں کی تمام خبروں سے بلیک آؤٹ اور تقریباً بائیکاٹ کی روش اپنا رکھی ہے، اگر کچھ شائع بھی ہوتا ہے تو وہ معکوس اور مخالفانہ رخ لئے ہوئے ہوتا ہے، مسلمانوں کے بڑے جلسے جن میں لاکھوں کی تعداد ہوتی ہے، ان اخبارات میں ایک لائن کی خبر کی جگہ بھی نہیں نکل پاتی، ایک عرصہ سے اس کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ مسلمانوں کا بھی ایک انگلش زبان میں ترجمان ہو، جو باشندگان ملک اور حکومت کے سامنے مسلم مسائل کو رکھ سکے، اور کوئی آواز بلند کر سکے، اس مقصد کے لئے سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور دوسرے ملی جذبہ رکھنے والے لوگوں نے تائید وحمایت کی جن میں ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی لکھنؤ کا کام بھی اہمیت کا حامل

ہے اور اس کے لئے ایک ٹرسٹ ''قومی وقف برائے اطلاع ورفاہ عام'' کے نام سے بنایا گیا جس کے صدر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور سکریٹری سید حامد صاحب اور کچھ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی، اور بہت سنجیدہ کوشش کی گئی کہ اس سلسلہ میں اچھی پیش رفت ہوجائے مگر جس کامیابی کی امید تھی وہ باوجود کوشش کے سامنے نہ آسکی، اور اس ضرورت کا احساس آج بھی باقی ہے، ۱۰؍دسمبر ۱۹۸۷ء کے ''تعمیر حیات'' میں اس سلسلہ کی ایک اپیل بھی جاری کی گئی تھی، تا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ ادھر متوجہ ہوں۔

آج جبکہ میڈیا بہت آگے نکل چکا ہے، اور الکٹرانک میڈیا کے سامنے پرنٹ میڈیا پیچھے رہ گیا ہے، اس میں انفرادی واجتماعی طور پر تمام مؤثر طریقوں سے کام لینے کی ضرورت ہے، تا کہ اس کے ذریعہ معاشرہ کی خرابیوں کا سدباب کیا جاسکے، علاقائی ومقامی طور پر مقامی وعلاقائی زبانوں میں ایسے اخبارات اور چینل سامنے آئے ہیں جن سے اس ضرورت کو پورا کرنے کا کام کسی حد تک کیا جارہا ہے، لیکن دوسرا طبقہ بھی اپنے مقاصد واغراض کے ساتھ اس پر پورا حاوی ہے، اور سنجیدہ وغیر سنجیدہ طبقہ کے درمیان اس میں ایک کشمکش کا سامنا ہے جو مغربیت ومشرقیت کی کشمکش کا ہی ایک حصہ ہے۔

جنرل ضیاء الحق کی شہادت

صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق مرحوم اپنی بہت سی صفات وخصوصیات میں یاد رکھے جائیں گے اسلام اور اپنے ملک پاکستان کی خدمت کے ساتھ پڑوسی ممالک خاص طور پر ہندوستان سے اچھے تعلقات قائم رکھنے میں انہوں نے جس فکرمندی اور سمجھداری سے کام لیا، یہ انہی کا حصہ تھا۔ علماء اور بزرگوں کی خدمت میں نیازمندانہ حاضری بھی ان کا خاص وصف تھا، اس کے ساتھ نفاذ شریعت کے لئے فکرمندی وکوشش اور امت کے مختلف طبقات کے اہل علم وفکر کو جمع کرکے کسی ایک موقف کو واضح کرنے کی کوشش بھی ان کا کارنامہ ہے جو اسلامی نظریاتی کونسل کے قیام کے ذریعہ انجام دیا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے پاکستان کے سفروں میں ان کی تکریم کی اور خود ملاقات کے لئے

آئے۔توقع تھی کہ ان سے اسلامی ممالک کے اتحاد کا عمل مؤثر طریقہ سے انجام پائے گا کہ بلاد عربیہ اور ممالک اسلامیہ کے حکمراں وذمہ داران ان سے متاثر تھے، اور افغانستان کو کمیونزم کے غلبہ واقتدار سے بچانے میں بھی انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔

صدر صاحب مرحوم کی پیدائش ۱۲/اگست ۱۹۲۴ء کی ہے۔فوج میں اعلیٰ عہدوں پر ترقی کرنے کے بعد ۵/جولائی ۱۹۷۷ء میں اقتدار حاصل کیا اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہوئے پھر ۱۶/ستمبر ۱۹۷۸ء کو چھٹے صدر کی حیثیت سے حلف لیا اور ۱۷/اگست ۱۹۸۸ء کو ۲۹/ساتھیوں کے ساتھ ان کا جہاز حادثہ کا شکار ہوا جو ایک سازش کا حصہ قرار پایا، ۲۰/اگست ۱۹۸۸ء کو شاہ فیصل مسجد اسلام آباد کے احاطہ میں لاکھوں افراد نے نماز جنازہ پڑھی اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون، غفراللہ لہ، ورحمہ رحمۃً واسعۃً

پورے عالم اسلام نے اس حادثہ پر بڑے رنج وغم کا اظہار کیا، اور انسانی بنیاد پر بلاتفریق مذہب وملت اس کو بہت محسوس کیا گیا۔

رابطہ ادب اسلامی کا ''نعت نبویؐ شریف'' سیمینار منعقدہ اورنگ آباد

رابطہ ادب اسلامی کے تین بڑے اجتماعات کے بعد یہ چوتھا اجتماع نعت نبویؐ کے موضوع پر جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم اورنگ آباد کی میزبانی میں اورنگ آباد میں ۸-۹/اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ہوا، موضوع کی اہمیت وقیمت اور کشش کی وجہ سے برصغیر کی اچھی نمائندگی رہی، پشاور (پاکستان) سے معروف مصنف وادیب اور بزرگ مولانا محمد اشرف سلیمانی ایک وفد کے ساتھ شریک ہوئے اور بلاد عربیہ سے بھی اہم لوگ آئے، صدر رابطہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے افتتاحی واختتامی جلسوں کی صدارت فرمائی، راقم نے اپنی سکریٹری رپورٹ میں باور کرایا کہ:

''رابطۂ ادب اسلامی کو باقاعدہ قائم ہوئے تین سال کی مدت ہورہی ہے، اس مدت میں اس نے ادب کے صالح نقطۂ نظر اور اس کے اسلامی تصور کو واضح کرنے اور اس

کے بارے میں موجودہ شکوک اوراس کے سلسلہ میں منفی خیالات کو دور کرنے کی کوشش قائم رکھی، اس سلسلہ میں کئی کل ہند پیمانہ پر مذاکرہ علمی منعقد کیے، ادب اسلامی پر دو بین الاقوامی کانفرنسوں کے علاوہ ہندوستان و بیرون ہند میں متعدد مجالس منعقد کی گئیں، جن میں ترکی کا مذاکرہ علمی بھی قابل ذکر ہے، ہندوستان میں منعقد کیے جانے والے مذاکرات علمی میں دو بڑے مذاکرۂ علمی ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اور ایک جے پور میں منعقد کیا گیا، جن میں ہندوستان کی مختلف جامعات اور اداروں کے نمائندے شریک رہے، جس کے موضوعات حسب ذیل ہیں:

ا۔ادب اسلامی میں تنقید اور سیرت نگاری۔

۲۔مغربی نظریات ادب اور ادب اسلامی۔

۳۔حضرت سید احمد شہید کی تحریک کے اردو زبان و ادب پر اثرات۔

یہ چوتھا مذاکرۂ علمی نعتیہ کلام پر منعقد کیا جا رہا ہے۔

نعتیہ شاعری کے متعلق یہ بات سکریٹری رپورٹ میں کہی گئی جو راقم نے پیش کی تھی کہ:

''نعتیہ شاعری کو مذہبی جذبہ کی تسکین کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے، اہل ادب نے اس کے اس پہلو سے کم ہی دلچسپی لی کہ وہ ایک صنف کی حیثیت سے بھی قابل مطالعہ و مذاکرہ ہے، اوراس کے وہ پہلو جو شاعرانہ خوبیوں اور تخیل کی جدتوں کے حامل ہیں، ان پر نظر ڈالی جانی چاہئے، ان کو سامنے لانا چاہئے، اس صنف شاعری میں مذہبی جذبہ کی تسکین کا سامان یقیناً ہے لیکن نظر کو اس میں محدود کر کے اس کی خوبیوں اور وسعتوں کو نظر انداز کرنا صحیح نہیں۔ اس صنف شاعری کو آج چودہ سو سال کی مدت ہو رہی ہے، یہ شاعری مختلف زمانوں، مختلف ملکوں میں اور مختلف زبانوں میں کی گئی، اور مختلف شعراء نے اپنی صلاحیتوں کو اس میں آزمایا ہے، ایسی صورت میں کیسے اس کو روا روی کا اور محدود موضوع سمجھا جا سکتا ہے، ضرورت تھی کہ اس کی نزاکتوں اور رعنائیوں کو تلاش کرنے کی طرف توجہ دی جائے، رابطہ ادب اسلامی نے اس کی طرف توجہ کی، تو اس کا اچھا استقبال ہوا اور آج ہمارے اس سیمینار میں اندرون ملک مندوبین میں اس وقت تک جواہر لال نہرو یونی ورسٹی دہلی، جامعہ

ملیہ اسلامیہ دہلی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، الہ آباد یونی ورسٹی، بنارس ہندو یونی ورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، کالی کٹ یونیورسٹی کیرالا، کشمیر یونیورسٹی سری نگر، پھر ندوۃ العلماء لکھنؤ، تاج المساجد بھوپال، جامعہ اسلامیہ بھٹکل، دارالمصنفین اعظم گڑھ اور دیگر متعدد اہم اداروں کے نمائندے شریک ہیں۔

بیرون ملک سے پشاور یونی ورسٹی کے عربی شعبہ کے صدر پروفیسر مولانا محمد اشرف سلیمانی جو حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خلیفہ بھی ہیں، اور اسلامیات وادبیات کے ماہر بھی، اپنے رفقاء کے ساتھ جن میں بعض پروفیسر حضرات بھی ہیں، شریک بزم ہیں، بنگلہ دیش کے نمائندوں کی آمد کی بھی اطلاع ہے، بلاد عربیہ سے ڈاکٹر عدنان علی رضا نحوی اور استاد محمد حسن بریغش رابطہ کی بلاد عربیہ کی شاخ کی نمائندگی کررہے ہیں، اول الذکر اس کے نائب صدر اور ثانی الذکر انتظامی امور کے ناظم ہیں۔

اور آخر میں عرض کیا گیا کہ ہماری یہ بزم اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک کہکشاں ہے تو دوسری طرف ہمارے مندوبین کے لحاظ سے علم وادب کے ستاروں کا جھرمٹ ہے۔

رپورٹ میں یہ بھی عرض کیا گیا کہ یہ اجتماع ایک مبارک اجتماع ہے، جو رحمۃ للعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کی گئی شاعری یا ادبی نذرانۂ عقیدت کے سلسلہ میں جو ان کے غلاموں نے اپنے دور میں پیش کئے ہیں، علمی مذاکرہ و تحقیقی کاوشوں کے پیش کرنے کے لئے منعقد کیا جارہا ہے۔

جامعہ کے ناظم مولانا ریاض الدین فاروقی ندوی اور اورنگ آباد کی اہم شخصیت الحاج غلام محمد بھائی پٹنی مالک آندھرا بمبئی ٹرانسپورٹ کا خاص طور پر شکریہ بھی ادا کیا گیا کہ ان کی کوششوں کو اس کے کامیاب بنانے میں زیادہ دخل رہا۔

نعت نبویؐ جیسے مبارک اور اہم موضوع پر یہ کانفرنس ۲۵، ۲۶، ۲۷؍صفر المظفر ۱۴۰۹ھ مطابق ۷، ۸، ۹؍اکتوبر ۱۹۸۸ء کو منعقد ہوئی، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے خطبۂ صدارت میں ایک اہم بات کی طرف اشارہ کیا، یہ سرزمین ہند جہاں ہم لوگ جمع ہیں اس کو "أكالة الأمم" کہا گیا، مذاہب، کلچر، تہذیب جو یہاں آئے، یہاں کی تہذیب

میں ڈھل گئے لیکن اسلام ہی وہ واحد دین ومذہب ہے جو اپنی خصوصیات کے ساتھ یہاں آج بھی قائم ودائم ہے، اوراس نے یہاں کے لوگوں کو اپنے آغوش میں لیا، یہ ذات نبویؐ سے وابستگی کی برکات ہیں، اس کا یہ اثر پڑا کہ صرف یہاں کے مسلم ادباء وشعراء نے فارسی واردوزبانوں میں ذات نبویؐ کی خدمت میں خراج عقیدت پیش نہیں کیا، ہندو، سکھ شعراء نے بھی اپنے جذبات پیش کئے اور جومقالات وبحوث پیش کئے گئے ان میں پروفیسر انیس چشتی کا مقالہ اس اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل تھا کہ انہوں نے ہندوشعراء کی نعتوں کوموضوع بنایا تھا، اور یہ بات بھی سامنے آئی کہ صرف فارسی اوراردوزبانوں میں ہی نہیں، انگریزی اور مختلف صوبائی ومقامی زبانوں میں بھی اس کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

اورنگ آباد شہر کی جامع مسجد جوملک عنبر کی بنائی ہوئی ہے اور جہاں فتاویٰ عالمگیریہ کی ترتیب وتدوین کا کام ہوا، کوخاص شہرت واہمیت حاصل ہے، پھر یہ کہ سلطان محمد تغلق نے دہلی سے دارالحکومت کو یہاں منتقل کیا تھا اور دولت آباد کو جواس کا ایک حصہ ہے، دارالحکومت بنادیا تھا، اوراسی کو سلطان محی الدین اورنگ زیب نے مرکز بنایا اوراسی کے دامن خلد آباد میں وہ آرام فرما بھی ہیں جہاں مشہور چشتی بزرگ شیخ برہان الدین غریب کی خانقاہ ومدرسہ اورمرقد ہے، جن کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے ارشاد وتربیت وہدایت خلق کے کام کے لئے بھیجا اور پھر وہ یہیں کے ہو کے رہ گئے، اس کے علاوہ خلد آباد اور دولت آباد کے علماء، مشائخ، اولیاء، مصنفین اوراہل علم وفضل کی بڑی شہرت ہوئی جن کے احوال کتب تاریخ وسیرت میں ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں، اور بھی بہت سے تاریخی مقامات اوراس کے مضافات میں ایسے غار ہیں جو قدیم تاریخ کی یاد دلاتے ہیں، جن میں ایلورا اوراجنتا کو خاص اہمیت اورشہرت حاصل ہے، مہمانوں کے لئے ان کے کھانے کا بھی نظم کیا گیا اورایک روز حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنے رفقاء کے ساتھ سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر (۱۱۱۸ھ) کے مرقد پر خلد آباد بھی گئے، جو اپنی سادگی کا حکمرانوں میں نمونہ تھے اوران کا مرقد ویسا ہی سادہ، ان کا مرقد ان کے احیاء دین واتباع سنت کے عمل کی خوشبو دیتا ہے، شیخ برہان الدین غریب سے تعلق مع اللہ، عشق ومعرفت، دردوسوز کی دولت قائم ہوئی تھی، وہ سامنے ہی

ایک دوسری طرف آرام فرما ہیں، یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ یہ خطہ غرناطۂ ہند ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ''المرتضیٰ'' کا رسم اجرا

''المرتضیٰ''، یعنی سیرت سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ترتیب وتدوین کی ضرورت بہت محسوس کی جارہی تھی کہ ان کے عہد کو صرف انتشار وخلفشار کا زمانہ کہہ کر مؤرخین نے نظر انداز کیا ہے جب کہ ان کا یہ عظیم کارنامہ اور امتیازی خصوصیت تھی کہ انہوں نے ان سخت حالات میں جب اغراض والوں کا جگہ جگہ غلبہ ہوگیا، اور اسلامی روح ومزاج کے حامل لوگ بہت کم تعداد میں رہ گئے تھے، اور تمدن ومادیت تیزی سے رواج پارہی تھی تو اس وقت انہوں نے اس کو اپنے زاہدانہ کردار اور اعلیٰ روحانیت سے شکست دی، اور اسلامی تہذیب وثقافت کو مخلوط نہیں ہونے دیا، اس بات کو زیادہ قوت ودلائل وشواہد اور اس کے گہرے اثرات ونتائج کے ساتھ ثابت کرنے کی ضرورت تھی، پھر یہ بتانے کی بھی کہ انہوں نے اپنے پیش رو خلفاء کے ساتھ کس ہمدردی، تعاون، خیر خواہی کا معاملہ کیا اور ان حضرات نے ان پر کیسا اعتماد کیا، اور ان کی خدمات، تقدم فی الاسلام، قرابت رسول، اور ان کی بعض امتیازی خصوصیات کی کیسی قدر کی اور اس سے فائدہ اٹھایا کہ یہ محاورہ بن گیا، ''قضية ولا أبا حسن لها'' پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ خاندان نبوت کا سلسلہ دراز کیا، اور دنیا کے مختلف ملکوں اور خطوں میں ایسے مصلحین، مربین نفوس، معلمین اخلاق، ارباب فضل وکمال پیدا کئے جنہوں نے اسلام کی نشر واشاعت اور ہدایت وتبلیغ کے کام میں بڑا حصہ لیا، اور سب سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے جو تعلق اور ان پر جو اعتماد رہا اس کا بھی حق تھا کہ ایسی جامع اور مبسوط کتاب سامنے لائی جائے، جو علمی، تحقیقی لحاظ سے اور اسلوب کے لحاظ سے بھی معیاری ہو، عربی میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے یہ کام انجام دیا، پھر اس کے ترجمہ کی ذمہ داری اپنے ایک معتمد مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کو سپرد کی جن کو دونوں زبانوں پر اچھی قدرت حاصل تھی، اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ نے شائع کیا، فاضل گرامی ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی لکچرار شعبۂ عربی

لکھنؤ یونی ورسٹی نے مسلم انٹلیکچول فورم کی طرف سے اس کی افادیت کو عام کرنے کے لئے ایک پروقار تقریب کی اجازت چاہی جو ۶ رنومبر ۱۹۸۸ء بروز اتوار گنگا پرشاد میموریل ہال امین آباد میں منعقد ہوئی اور یہ تقریب آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا سید منت اللہ رحمانی کے ذریعہ انجام پائی، جس میں ملک کے ممتاز اہل قلم، مصنف، محقق، اور فاضل وقادرالکلام شعراء اور شائقین علم ودین نے شرکت کی جن میں پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر ضیاءالحسن فاروقی، خواجہ احمد فاروقی، مولانا عبدالکریم پاریکھ، مولانا ضیاءالدین اصلاحی نے اپنے بحوث ومقالات کے ساتھ اظہار خیال کیا، ڈاکٹر کلیم احمد عاجز (پٹنہ) اور ڈاکٹر سید عقیل احمد مدنی (الہ آباد) نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ ملک کے مختلف علمی اداروں، جامعات اور مدارس کی بھی اچھی نمائندگی رہی۔

حجاز مقدس کا سفر اور امارات کے راستہ سے وطن واپسی •

۱۲رنومبر ۱۹۸۸ء میں حجاز مقدس کا ایک اہم سفر خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ ہوا، جو رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے اجلاس میں شرکت کا تھا، ۱۱رنومبر کو یہ سفر ہوا اور مکہ مکرمہ میں ایک ہفتہ قیام رہا، ۱۵ یا ۱۶رنومبر کو سابق سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ معالی الشیخ محمد صالح قزاز کی عیادت وملاقات کے لئے بھی جانا ہوا جس کے لئے وہ سراپا انتظار تھے۔ مولانا عبداللہ عباس ندوی جن کے مکان پر مکہ مکرمہ میں قیام ہوتا تھا، وہ بھی ساتھ تھے، شیخ صالح قزاز نے بڑے تعلق کا اظہار فرمایا اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے متعلق اپنا ایک خواب بھی سنایا، جو یہ تھا کہ میں نے خواب میں آپ کو مدینہ منورہ جاتے ہوئے دیکھا کہ آپ بہت اونچے گھوڑے پر سوار ہیں، اور سر پر ایک بہت اونچی ٹوپی ہے، افسوس کہ شیخ صالح قزاز سے یہ آخری ملاقات رہی جن کا دو ماہ بعد مکہ مکرمہ میں انتقال ہوا، ان سے راقم کے تعلقات ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء کے سفر حجاز سے قائم تھے اور بڑی شفقت فرماتے تھے، جو خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی نسبت سے تھی۔

مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ حاضری ہوئی، اور پھر متحدہ عرب امارات بھی جانا ہوا،

اور لکھنؤ ۲؍دسمبر ۱۹۸۸ء/ ۲۱؍ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ کو واپسی ہوئی۔

حجاز مقدس کے اس سفر میں ندوۃ العلماء سے مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی اور مولانا واضح رشید حسنی ندوی بھی گئے تھے جنہیں مدینہ منورہ رابطۂ ادب اسلامی کی مجلس امناء میں شرکت کرنی تھی جس میں وہ دونوں ہی ممبر ہیں، مدینہ منورہ کا قیام بہت مشغولیت کا رہا کہ رابطہ ادب اسلامی عالمی کے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صدر ہیں اور اس کے سکریٹری ہونے کی وجہ سے مجھے بھی اپنی ذمہ داریاں ادا کرنی پڑیں۔

حضرت مولانا مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور وہاں سے جدہ آئے جہاں ۲۷؍نومبر ۱۹۸۸ء کو ایک اہم تقریر ہندوستانیوں وپاکستانیوں کے سامنے فرمائی جو وہاں برسر روزگار ہیں۔ یہ تقریر تعمیر حیات ۱۰؍فروری ۱۹۸۹ء، صفحہ ۵، ۶، ۷، ۸ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، جس کا ایک اہم اقتباس پیش ہے، انہوں نے فرمایا کہ:

''آپ مجھے معاف کریں میں تو ایک اڑتی چڑیا ہوں، آیا اور اس کے شجرۂ طور پر بیٹھ گیا، اور اڑ گیا، کل ہی یہاں سے خدا کو منظور ہوا تو اڑ جاؤں گا، آپ مجھے یہ نہ سمجھئے کہ میں جاسوسی کرتا ہوں یا میں یہاں آکر عیب ڈھونڈھتا ہوں، میں یہاں کے حالات سے واقف ہوں اور زندگی کا جو دھارا بہہ رہا ہے، میں اس سے کچھ دور نہیں ہوں، اس لئے میں دیکھتا ہوں کہ عقائد درست ہیں، نمازوں کی پابندی ہے، لیکن معاشرہ بالکل بگڑا ہوا ہے، گھر کی زندگی بالکل اسلام سے بدلی ہوئی ہے، وہاں تعیّشات کی باتیں ہیں، وہاں اسراف ہے، حقوق کی پامالی ہے، وہاں بے محل خرچ کرنا ہے، اس میں تفریحات کا سامان ہے، وہاں ریڈیو ہے، جو دن رات کا مشغلہ ہے، مسجد میں ہم مسلمان، وہاں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

لیکن مسلمان صرف مسجد میں نہیں ہوتا، مسلمان تو روئے زمین کے کسی چپہ پر ہو، برو بحر میں ہو، اور اگر کبھی خدا چاند پر پہونچا دے اور اس نے پہونچایا ہے انسانوں کو اپنے دیئے ہوئے علم وطاقت کے ذریعہ، یہاں بھی وہ عبد (بندہ) ہے، اللہ کا بندہ ہے، یہاں تک کہ تمام علمائے امت کا اتفاق ہے اس پر کہ تکلیف ساقط نہیں ہوتی، پیغمبروں سے بھی تکلیف ساقط نہیں ہوئی، اور تکلیف کا مطلب شرعی پابندیاں ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے 'اعبد ربك حتی یاتیك

الیقین" اس کی تفسیر تمام مفسرین نے یہی لکھی ہے کہ اپنے رب کی بندگی کرتے رہو، جب تک کہ وفات کا وقت نہ آجائے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات کے وقت تک نمازوں کی ایسی ہی پابندی کرتے رہے، پوچھتے رہے کہ کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی، کہا گیا کہ نہیں یارسول اللہ! آپ کا انتظار ہے، فرمایا پانی لاؤ، غسل فرمایا مگر چلنے کی طاقت نہیں تھی، دو دو تین تین مرتبہ آپؐ نے غسل فرمایا اور تیاری کی نہیں ہوسکا تو فرمایا "مروا ابابکر فیصل الناس" (ابوبکر سے کہو کہ نماز پڑھائیں)، پھر آپؐ نے بھی نماز پڑھی، اس وقت آپ کا مسواک کرنا ثابت، آپؐ کا وصیت کرنا ثابت، آپ کا امت کو ہدایت دینا ثابت، یہاں تک کہ اللھم الرفیق الاعلیٰ اللھم الرفیق الاعلیٰ' کہتے ہوئے دنیا سے تشریف لے گئے۔

ملحوظ رہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ابوظبی (متحدہ عرب امارات) میں قائم ثقافتی مرکز Cultural Center کے عظیم الشان ہال میں ۲۰ ربیع الآخر ۱۴۰۹ھ ۲۹ نومبر ۱۹۸۸ء سہ شنبہ کی شام کو "اسلامی بیداری کے رہنما اصول" کے موضوع پر ایک تقریر فرمائی، وسیع وعریض ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا، ان میں متحدہ عرب امارات کے بڑے ذمہ داروں، اہم شخصیتوں اور تعلیم وتربیت اور اسلامی مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کی بھی بڑی تعداد موجود تھی۔ تقریر کا موضوع خود فاضل مقرر ہی کا منتخب ومتعین کردہ تھا، جو وقت کے تقاضے اور ضرورت کے مطابق بھی تھا، اس وقت دنیا کے مختلف ملکوں میں اسلامی بیداری کا بڑا چرچا تھا، اور لوگوں نے بیداری کی ان تحریکوں سے بڑی اُمیدیں بھی وابستہ کر رکھی تھیں اور ان پر بڑا بھروسہ کر لیا تھا۔

لیکن ضرورت اس کی پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے کہ تاریخ کے وسیع وعمیق اور بامقصد مطالعہ اور قدیم وجدید دعوتی واصلاحی تحریکوں، بیداریوں اور کوششوں کے تجربات کی روشنی میں اور احوال وظروف زندگی کے تلخ مگر ٹھوس حقائق وحال ومستقبل پر دوررس ونتیجہ خیز اثرات ڈالنے والے طاقتور، معاصر افکار ورجحانات، امت مسلمہ کو گھیرے ہوئے ناقابل انکار واغماض مشکلات ومسائل اور خطرناک سازشوں کو سامنے رکھ کر موجودہ دور میں عالم اسلامی کے اندر پھیلی ہوئی اسلامی بیداری کا دیانتدارانہ جائزہ لیا جائے اور کچھ

مخلصانہ مشورے پیش کیے جائیں۔

فاضل مقرر تقریباً نصف صدی سے دینی ودعوتی واصلاحی تحریکوں کا مطالعہ کرتے رہے ہیں، انہوں نے مختلف ومتعدد تحریکوں کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے، بعض تحریکات کے محترم قائدین کے ساتھ ان کے گہرے مراسم ومخلصانہ تعلقات رہے ہیں، ان کو ان کا اعتماد حاصل رہا ہے، اور مقرر نے ان کی جدوجہد کے نتائج کا اعتراف بھی کیا ہے، ان کی ہمت افزائی بھی کی ہے، اور بعض اوقات کچھ ایسی باتوں کی طرف برادرانہ ومخلصانہ انداز سے توجہ بھی دلائی ہے جن سے ان تحریکوں میں موجودہ کسی نقص کی تکمیل ہوسکتی تھی، یا جن سے ان کی قوت وتاثیر میں اضافہ کا امکان تھا، یا جن امور کی طرف ذمہ داروں اور کارکنوں کو مزید توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ اور اکثر مواقع پر یہ مشورے اعتراف، احترام اور شکریہ کیساتھ قبول بھی کیے گئے۔

اس برجستہ تقریر میں جس میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ٹیپ رکارڈر سے نقل کے بعد معمولی اضافہ اور اصلاحات بھی فرمائیں، گزشتہ مختلف مواقع پر پیش کردہ تاثرات اور مشوروں کا بڑا اچھا خلاصہ آگیا ہے، اور اسلامی بیداری کے مبارک مقصد جو بڑی ذمہ داری اور بڑی نازک اور اہم امانت ہے، کی خاطر جدوجہد میں مصروف افراد اور جماعتوں کے لئے مفید وکارآمد چیز بن گئی ہے، اس سے اسلامی بیداری کو صحیح رُخ دینے، دینی واصلاحی کوششوں کو زیادہ مفید اور نتیجہ خیز بنانے میں مدد مل سکتی ہے، اور امت مسلمہ کو خاص طور سے اسلامی ممالک میں جہاں بیداری کی تحریکیں زیادہ سرگرم ہیں، مثالی اسلامی زندگی کے حقائق، اس کے پیغام اور اس کے مقام ومنصب سے قریب تر کیا جاسکتا ہے۔

حضرت مولانا نے اپنے شارقہ کے ایک سفر کے حوالہ سے یہ بات بھی فرمائی کہ میں نے شارقہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ جتنا خلیج سے واقف ہیں، شاید دنیا کے کم لوگ واقف ہوں گے، آپ خلیج کے رہنے والے ہیں، مگر آپ ایک ہی خلیج کو جانتے ہیں اور یہ وہ خلیج ہے جو ''جزیرۃ العرب'' کو ایران سے الگ کرتی ہے، بیچ میں پانی ہے، میں آپ کو اس سے بھیانک خلیج کی خبر دیتا ہوں وہ خلیج جو اسلام اور مسلمانوں کے درمیان پڑی ہوئی ہے، اسلام

اور مسلمانوں کے درمیان کئی کئی خلیجیں ہیں، عقائد، اور عبادات میں خلیج، کتنے لوگ ہیں جو مسلمان ہیں، کلمہ پڑھتے ہیں، لیکن نماز سے ان کو کوئی غرض نہیں اور بہت سے ہیں جن کے عقائد وعبادات دونوں درست ہیں لیکن اخلاق ومعاملات کو فہرست سے بالکل خارج سمجھتے ہیں، ان کے آس پاس کے لوگ شاکی ہیں، اور شاکی نہیں تو کم از کم شکر گزار نہیں، پھر اس کے بعد کتنے ہیں جن کے نزدیک تعلقات میں، سیاسیات میں، خدا کے دوست اور دشمن میں کوئی فرق نہیں، ان کے نزدیک صالح اور فاسد میں کوئی فرق نہیں، ان کے نزدیک دیندار اور بے دین میں کوئی فرق نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ صاف فرماتا ہے:

"وَلَاتَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ" کہ تمہارا جھکاؤ بلکہ ادنیٰ جھکاؤ بھی نہیں ہونا چاہئے ان کی طرف جنہوں نے ظلم کو اپنا شیوہ بنا رکھا ہے، اگر ایسا ہوا تو پھر تم آگ کی گرفت میں آجاؤ گے۔

جدہ سے ۱۹/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۸/ نومبر ۱۹۸۸ء کو ابوظبی کے لئے روانگی ہوئی جہاں شیخ احمد خلیفہ نے دعوت دے رکھی تھی، جنہیں رئیس متحدہ عرب امارات شیخ زائد بن سلطان آل نہیان کا اعتماد حاصل تھا، اور مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مقیم ابوظبی بھی اس کا برابر تقاضہ کرتے رہے تھے، جو جامعۃ العین ابوظبی میں حدیث کے بڑے استاد تھے، دو روز ابوظبی میں قیام رہا اور ۲۱/ ربیع الثانی/ ۳۰/ نومبر کو شارجہ کا سفر ہوا، جہاں اس کے حاکم شیخ سلطان بن محمد القاسمی سراپا انتظار تھے، ان سے عالم اسلام کے حالات کے تناظر میں ضروری اور مفید گفتگو ہوئی، اور ظہر کی نماز ان کے یہاں ادا کی گئی اور پھر ظہرانہ ہوا جس میں ممتاز اعیان وعمائدین نے شرکت کی، پھر ڈاکٹر سالم بن شیخ عبداللہ علی المحمود کے دولت خانہ گئے اور وہیں قیام رہا اور یہیں سے دبئی اور شارجہ کے پروگرام میں شرکت کے لئے جانا ہوتا رہا، یہاں تک کہ ۲/ دسمبر کو ہندوستان واپسی ہوئی۔

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی سے معلوم ہوا کہ داعی ومحرک سفر شیخ احمد خلیفہ السویدی ابوظبی کے سب سے اہم ثقافتی وعلمی مرکز المجمع الثقافی ابوظبی کے صدر تھے اور وہ عالم اسلام کی اہم شخصیات کو ہر سال اس میں دعوت دیتے تھے، مولانا تقی الدین ندوی کی تحریک پر انہوں

نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دی اور ان کے ساتھ میرا بھی نظام سفر بنا، انہوں نے اس کا بھی اہتمام کیا کہ ابوظبی ایئرپورٹ بذات خود استقبال کے لئے آئیں۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ابوظبی کے المجمع الثقافی کے پروگرام میں جس موضوع کا انتخاب کیا وہ بہت اہمیت کا حامل تھا اور وہ بہت پسند کیا گیا، مولانا تقی الدین کے عنوان پوچھنے پر یہ بتایا گیا کہ اس کا عنوان "الصحوة الإسلامية المعاصرة والحديث عن الحاجة إلى ترشيدها" ہوگا۔ یہ محاضرہ ۲۹ رنومبر ۱۹۸۸ء کو ابوظبی میں ہوا جس میں ممتاز شخصیات اور اہل علم وفضل اور اہل فکر ونظر حضرات نے شرکت کی، بعد میں یہ محاضرہ "ترشيد الصحوة الإسلامية" کے عنوان سے اور دبئ وشارجہ کے دوسرے محاضرات کو شامل کر کے ان کا مجموعہ بھی "ترشيد الصحوة الإسلامية" سے دار عرفات رائے بریلی سے طبع ہوا، اس کی طباعت میں مولوی جعفر مسعود حسنی ندوی نے خاص دلچسپی لی۔ اور حضرت مولانا کی دعائیں حاصل کیں۔

دبئ میں کلیۃ الدراسات الاسلامیہ میں محاضرہ ہوا جس کا عنوان تھا: "إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى" جس میں اہل کہف کی صفات وخصوصیات اور ان کے کردار اور منہج دعوت وفکر وطریقۂ زندگی پر موجودہ حالات کے تناظر میں رہنمائی فرمائی گئی تھی کہ آج کے نوجوانوں کو انہیں آئیڈیل بنا کر اپنا کردار مغربی فکر وتمدن کے خلاف پیش کرنا چاہئے۔

دبئ میں شیخ سعید لوتاہ رئیس ''بنک دبی الاسلامی'' اور مشہور تاجر شیخ سیف احمد غریر نے بڑے تعلق کا اظہار اور تکریم کا معاملہ کیا۔

شارجہ میں قاعۃ المحاضرات میں بھی مغربی فکر وتمدن کو موضوع بنا کر ایسے اسلامی کردار پیش کرنے کی دعوت دی گئی جس سے مغرب کا کھوکھلا پن واضح ہوا اور اسلامی تہذیب وثقافت کی اہمیت سامنے آئی اور اس کو اختیار کرنے کی طرف طبیعتیں راغب ہوئیں، کہ اقوام وملل کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بڑی سے بڑی تمدنی ترقی انہیں تباہی سے بچا نہ سکی تب وہ اخلاق کی پستی کے شکار ہوئے، اخلاق کی بلندی سب سے بڑی چیز ہے اور وہ سیرت پاک اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات کے مطالعہ اور ان کو نمونہ بنا کر

اپنا عملی واخلاقی کردار پیش کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور اسی کی آج جب کہ دنیا سائنسی ترقی کے بام عروج پر ہے، زیادہ ضرورت ہے۔

لکھنؤ میں دینی تعلیمی کونسل کا مشاورتی جلسہ

۲۵ر دسمبر ۱۹۸۸ء کو لکھنؤ میں دینی تعلیمی کونسل کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس کی صدارت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے فرمائی، حضرت مولانا نے اپنے خطاب میں بہت مؤثر انداز سے فرمایا کہ اللہ کی رحمت کا نزول اسی وقت ہوتا ہے جب ملت کے ہر فرد میں ذمہ داریوں کا احساس، حالات کو سمجھنے اور اس کے مطابق جذبہ وشعور کے ساتھ کام کرنے کی صلاحیت اور دل سوزی وفکرمندی کا مظاہرہ ہو، کہ اس ملک میں جس طرح کے مسائل درپیش ہیں ان کے مقابلہ کے لئے جیسے دینی وروحانی فیصلہ کی ضرورت تھی، اس کا مظاہرہ نہیں ہوسکا، اور جو کچھ پیش آرہا ہے اس کا دھارا اس قدر تیز اور مشینری اس قدر چابک دست ہے کہ صاف نظر آرہا ہے کہ اگر اجتماعی طور پر ملت اسلامیہ نے اس پر سنجیدگی اور دردمندی سے غور نہیں کیا تو مستقبل میں اس کا جو خمیازہ بھگتنا ہوگا اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، اصل مسئلہ یہ ہے کہ آنے والے دنوں میں اس ملت کا اور اس کی نوجوان نسل کا تعلق اسلام اور اس کے بنیادی دینی عقائد سے باقی رہے گا یا نہیں؟ دینی تعلیمی کونسل چوتھائی صدی سے اسی پیغام کو عام کرنے کی جدوجہد میں لگی ہوئی ہے۔

حضرت مولانا نے تعلیمات قرآنی اور سیرت نبویؐ کے حوالہ سے فرمایا کہ اس ملت کے لئے یہ بات مخصوص کی گئی ہے کہ جب تک اپنی طرف سے محض اللہ کی رضا کی خاطر کا مظاہرہ نہیں ہوگا، اس وقت تک اللہ کی رحمت نہیں آئے گی، اور یہ کہ اس بات کی فکر پیدا ہوجائے کہ ہماری موجودہ اور آئندہ نسل مسلمان کی حیثیت سے باقی رہے، اور قرآن وحدیث سے اس کا رشتہ قائم رہے، اور دینی ضرورت اپنی تمام ضرورتوں پر مقدم کی جائے، میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اللہ کی رحمت اس طرح آئے گی کہ بڑے سے بڑے سیاسی مبصر اور وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں زمام کار ہے، وہ حیرت زدہ رہ جائیں گے۔

اور فرمایا کہ ملت اسلامیہ کو اس ملک میں اپنے دینی و ملی تشخص کے ساتھ اگر زندہ رہنا ہے تو اس کے لئے از خود فیصلہ کرنا ہوگا، اصل اہمیت اسی فیصلہ کی ہے، معاملات و ماحول کی سختی کے باوجود اجتماعی طور پر یہ فیصلہ کرلیا جائے اور اس کی روشنی میں نئے سرے سے سفر کا آغاز ہو تو یقیناً تاریخ کا رُخ بدل جائے گا، تمام مسائل کے لئے ملت کا یہ جذبہ اور فیصلہ شاہ کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا عبداللہ مغیثی مہتمم جامعہ اسلامیہ گلزار اجراڑہ نے میرٹھ میں عظیم اجلاس کی پیش کش کی جس کا انعقاد مارچ ۱۹۸۹ء میں ہوا، حضرت مولانا نے اس کی صدارت قبول فرمائی۔

حیدرآباد کا جلسۂ پیام انسانیت (۲۹ر دسمبر ۱۹۸۸ء)

حجاز مقدس اور امارات کے سفر سے واپسی کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اہم سفر حیدرآباد (ہندوستان) کا ہوا، جہاں دینی تعلیمی کونسل اور پیام انسانیت کے اہم پروگرام ہوئے، ملک کی نازک صورت حال اور محبان وطن کی ذمہ داری کے عنوان سے حیدرآباد کے عظیم جلسۂ پیام انسانیت میں خطبۂ صدارت پیش کیا جو ۲۹ر دسمبر ۱۹۸۸ء کو ہوا تھا، اگرچہ حیدرآباد کے اس اہم سفر میں راقم الحروف ساتھ نہ تھا، کہ وہ حجاز مقدس اور امارات کے سفر میں ساتھ تھا، اور دارالعلوم کے مشاغل کی وجہ سے دارالعلوم میں رہنا ضروری تھا، محترمی ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی، مولانا الحاج عبدالکریم پاریکھ، مولانا معین اللہ ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء، مولانا واضح رشید ندوی، مولانا نذرالحفیظ ندوی، مولانا محمود الازہار ندوی اساتذۂ دارالعلوم اور عزیزی مولوی سید محمد حمزہ حسنی ندوی ہمراہ تھے۔ حیدرآباد کا قیام ۲۸ر دسمبر ۱۹۸۸ء تا یکم جنوری ۱۹۸۹ء رہا، اس سفر کا اہم مقصد تین اہم اجتماعات میں شرکت تھی، اول حلقۂ پیام انسانیت کے تحت مسلم اور غیر مسلم دانشوروں اور اصحابِ فکر سے خطاب کرنا تھا، جس کا اہتمام کل ہند حلقۂ پیام انسانیت کی آندھرا شاخ نے کیا تھا، دوسرے پیام انسانیت و دینی تعلیمی کونسل پر اجلاس عام سے

خطاب، اور تیسرے دارالعلوم سبیل السلام میں مؤطا امام مالک کے درس کا آغاز، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی کتاب ''قاموس الفقہ'' کی رسم اجرا اور دارالحدیث کی عمارت کا افتتاح تھا، اس کے علاوہ متعدد ضمنی اجتماعات میں شرکت تھی، جس میں آندھرا پردیش کی مجلس علمیہ سے خطاب، ندوہ ایجنسی، ارم کالج اعظم پورہ حیدرآباد اور المرکز الاسلامی حمایت نگر میں آمد بھی شامل تھی، ان اجتماعات وجلسوں کی تفصیل مولانا محمود الازہار ندوی مرحوم کے قلم سے تعمیر حیات ۱۰ر جنوری ۱۹۸۹ء صفحہ ۱۳، ۱۴، ۱۵ میں ملاحظہ ہو۔

ان پروگراموں کو کامیاب بنانے اور منظم طریقہ سے چلانے میں جناب سید جمیل الدین، بہاء الدین صاحب، انجینئر سید غلام محمد صاحب، مولانا محمد رضوان القاسمی، الحاج غلام محمد بھائی پٹنی مالک بمبئی آندھرا ٹرانسپورٹ، عبداللہ بھائی پٹنی، الحاج عبدالقادر صاحب اور جناب مصلح الدین کی محنت وکوشش اور فکرمندی کا بڑا دخل رہا، اور ان کی خدمات لائق تعریف رہیں۔ یکم جنوری کو تبلیغی مرکز میں بھی خطاب کیا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں توسیعی خطبات کا سلسلہ

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں توسیعی خطبات کا سلسلہ پہلے سے رہا ہے، اور اس میں ممتاز اہل علم وفکر، ادیب ومصنف، محقق ومفکر، دانشور حضرات کو جن کی اپنے فن میں شہرت رہی ہے اور کسی حد تک انہیں مرجعیت بھی حاصل ہوئی، دعوت دی جاتی رہی ہے، اور اس کے لئے جمعیۃ الاصلاح کا پلیٹ فارم سب سے اچھا ذریعہ سمجھا گیا، جس میں طلبہ کو خود ابھرنے اور سامنے آنے کا موقع ملتا ہے، اس سال جن اہم شخصیات کو مدعو کیا گیا، ان میں پروفیسر ڈاکٹر خلیق احمد نظامی (علی گڑھ)، مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی (کلکتہ) اور ڈربن یونی ورسٹی جنوبی افریقہ میں پروفیسر ڈاکٹر سید حبیب الحق ندوی کی شخصیتیں تھیں، پہلا خطبہ ڈاکٹر خلیق احمد نظامی سابق وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے نومبر ۱۹۸۸ء کے اوائل میں علوم قرآن کے ہندوستان پر اثرات کے موضوع پر دیا تھا، دوسرے خطبہ کے لئے مشہور اہل قلم عالم مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کو دعوت دی گئی، مولانا معصومی مشہور ندوی فاضل مولانا عبدالرحمٰن کاشغری ندی کے شاگرد اور علم وتحقیق

میں عالمی شہرت کے حامل شخص ہیں۔ انہوں نے اپنا پہلا خطبہ ۲۵؍دسمبر کو بعد مغرب جمالیہ ہال میں دیا، اس نشست کی صدارت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمائی اور موضوع محاضرہ تھا ''ہندوستان کی شروح حدیث کا تقابلی جائزہ''۔ دوسرا خطبہ معصومی صاحب نے مولانا عبداللہ عباس ندوی معتمد تعلیم ندوۃ العلماء کے زیر صدارت مجلس میں دیا۔ اس کا عنوان تھا ''پانچویں صدی کی ایک اہم ادبی شخصیت اوران کے کارنامے یعنی الشیخ ابوالحسن الباخرزی صاحب دمیۃ القصر وعصرۃ أہل العصر''، معصومی صاحب نے اس غیر معروف لیکن اہم شخصیت پر ایسا تحقیقی وجامع مقالہ پیش کیا کہ اس شخصیت کے پورے خدوخال نمایاں ہوگئے۔ پھر ۷؍جنوری ۱۹۸۹ء کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ایک اہم خطاب فرمایا، ۸؍جنوری کو بعد نماز مغرب ڈاکٹر سید حبیب الحق ندوی (ڈربن، جنوبی افریقہ) کا محاضرہ ہوا جس میں انہوں نے مسلمان اور سائنس کی خدمات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، اس کے بعد مجھے ان کے خطبہ پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی، میں نے ان کے علمی محاضرہ کو سراہا جس میں انہوں نے بھرپور اور مدلل انداز میں علم کی اہمیت کو اجاگر کیا تھا اور درخشاں ماضی سے روشن مستقبل کی رہنمائی کی تھی۔

چند ممتاز اہل علم کی وفات

اندرون ملک اور بیرون ملک جن اہم شخصیات اور ممتاز اہل علم کی وفات کے صدمہ سے گزرنا پڑا، ان میں مولانا نسیم احمد فریدی، مولانا ابوالعرفان خان ندوی، مولانا عبیداللہ بلیاوی، مولانا ضیاءالحسن اعظمی، معالی الشیخ محمد صالح القزاز اور اسلامی دینی کتابوں کے انگریزی مترجم ومصنف ڈاکٹر محمد آصف قدوائی لکھنوی کے حادثہ وفات ہیں۔

مولانا نسیم احمد فریدی مرحوم کا تعلق امروہہ کے فریدی فاروقی خاندان سے تھا اور وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے ممتاز شاگرد ومسترشد اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے مجاز وخلیفہ۔ اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس انتظامی کے رکن تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے صاحبزادہ وخلیفہ حضرت خواجہ معصوم سرہندی کے مکتوبات کو اردو قالب میں ڈھالا اور ان کے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ کے تذکرہ کے

علاوہ حضرت شاہ غلام علی دہلوی کا تذکرہ، شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلوی کا تذکرہ جو حضرت سید احمد شہید کے نانا تھے اور حضرت شاہ اسماعیل شہید کا تذکرہ اس کے علاوہ وصایا شیخ شہاب الدین سہروردی صاحب ''عوارف المعارف'' ان کی قلمی یادگار وشاہکار ہیں جو الفرقان بکڈپو لکھنؤ سے شائع ہوئیں، ان کے اس علمی وتاریخی ذوق کے حامل ان کے دو قریبی عزیز پروفیسر خلیق احمد نظامی جو ان کے بھانجہ ہیں اور پروفیسر نثار احمد فاروقی ہیں جو ان کے بھتیجے ہیں۔

دوسرا حادثہ جو ۱۷ر نومبر ۱۹۸۸ء/ ۱۶ر ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ کی صبح کو ۳ بجے لکھنؤ میں پیش آیا، وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے سابق قائم مقام مہتمم اور بزرگ استاد متبحر عالم مولانا ابوالعرفان خاں ندوی جونپوری کا ہے، جنہوں نے ۶۵ر سال کی عمر میں وفات پائی، اور اپنے وطن جون پور کے قدیم شاہی قبرستان میں مدفون ہوئے، دار العلوم ندوۃ العلماء میں ان کی نماز جنازہ مولانا مفتی محمد ظہور ندوی نے اور جون پور میں وہاں کی بزرگ ہستی مولانا شاہ عبدالحلیم جون پوری نے پڑھائی، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کے ساتھ راقم سفر حجاز پر تھا۔

مولانا مرحوم گوناگوں صفات وامتیازات کے حامل عالم ومعلم دین تھے، حافظہ، ذہانت غیر معمولی تھا اور معقولات ومنقولات دونوں پر اور اس کے ساتھ تاریخ پر گہری نظر تھی، وہ میرے بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کے رفیق درس اور تقریباً ہم عمر تھے، دار العلوم سے فراغت کے بعد ان کا دار العلوم ہی میں تدریس میں تقرر ہو گیا تھا اور ان سے کئی نسلوں نے فائدہ اٹھایا، بڑے وسیع المطالعہ اور سریع المطالعہ تھے، افسوس کہ ان کی کوئی تصنیف سامنے نہ آسکی، البتہ مقالات ومضامین ہیں جن کا مجموعہ کتاب کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

تیسرا حادثہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے حدیث شریف کے استاد اول مولانا ضیاء الحسن اعظمی ندوی کا ہے، دار العلوم میں ایک عرصہ سے صحیح بخاری شریف کا درس ان کے ذمے تھا اور وہ اس کا اہتمام کرتے تھے کہ کتاب مکمل اور ٹھیک پڑھائی جائے، اور تواضعاً آخر میں اس کی تکمیل ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے کراتے، بخاری

شریف کے علاوہ سنن ترمذی، سنن ابوداؤد وغیرہ کے بھی درس دیئے، اوران کا درس ممتاز رہا، دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث کرنے کے بعد جہاں ان کو شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی سے شرف تلمذ حاصل تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور تخصص ادب کیا، اس وقت سے راقم سے ان کا ربط و تعلق ہوا، جو آخر تک رہا، ۲/جنوری ۱۹۸۹ء، ۲۱/جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ کو دوشنبہ کا دن گزار کر رات کو لکھنؤ میں وفات پائی اوران کے وطن مئو جنازہ گیا، جہاں تدفین عمل میں آئی، ان کی عمر ۵۴/سال تھی۔

چوتھا حادثہ وفات حضرت مولانا عبیداللہ بلیاوی کا ہے، جن کی حیثیت جماعت تبلیغ کے اہم ستون کی تھی اوران کو بانی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی کا بڑا اعتماد حاصل رہا تھا، ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی نے حجاز مقدس دعوت و تبلیغ کے کام کے تعارف کے لئے بھیجا، اور پھران کے پیہم تقاضے واصرار پر خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا اپنے گھر کی مستورات کے ساتھ حجاز مقدس کا سفر ہوا اور ۶، ۷ ماہ قیام رہا، اس میں برادر معظم مولانا محمد ثانی حسنی مرحوم بھی ساتھ تھے۔

دوسرے سفر میں جو ۵۰-۵۱ء میں ہوا، مجھے بھی رفاقت کا شرف حاصل ہوا، اس میں مولانا عبیداللہ بلیاوی کی بہت سی خصوصیات، تواضع، فنائیت، صبر واستقامت، علمی رسوخ، اور کام کی دھن یہ سب دیکھنے کو ملیں اوران کی قدر بڑھتی گئی، وہ مصر وشام، سوڈان، فلسطین وغیرہ بھی حضرت مولانا کے ساتھ گئے، اور حجاز میں مزید قیام کے ذریعہ کام کو اور وسعت دی، پھر ہندوستان قیام اختیار کر کے یہاں دعوتی کام میں لگنے والوں کی سرپرستی ورہنمائی کی، اوران سے بڑا دینی نفع پہونچا، ان کا انتقال نظام الدین مرکز دہلی میں تھا، جہاں ان کی دینی ودعوتی زندگی کا آغاز ہوا تھا اور جہاں تعلیم وتدریس حدیث کا بھی انہوں نے شغل رکھا تھا، ۸/رجب ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۵/فروری ۱۹۸۹ء تین بجے شب کو ہوا، ستر سال عمر پائی۔

پانچواں حادثہ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی کا ہے، جو غیر معمولی صبر، تسلیم ورضا، قوت عمل، انگریزی زبان پر قدرت اوراس کے ذریعہ دینی خدمت کا محیر العقول نمونہ تھے، مجلس تحقیقات

ونشریات اسلام جب قائم ہوا تو اس کی کتابوں کا آغاز ان کی کتاب ''مقالات سیرت'' سے ہوا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ماذا خسر العالم... کا انگریزی ترجمہ کیا جو بہت مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ ''ارکان اربعہ'' اور ''نقوش اقبال'' کے بھی ترجمے کیے۔

اس طرح ان کا مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے گہرا تعلق تھا، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی اہم کتابوں کے بھی ترجمے کیے جن میں ''معارف الحدیث'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انہوں نے پچیس سال کی عمر سے معذوری کے دن گزارے اور تاعمر یہ معذوری رہی لیکن دینی وعلمی کاموں میں اس معذوری کو مانع نہیں بننے دیا، جو ۱۹۴۶ء سے آخر تک رہی، یہاں تک کہ ۲۰/فروری ۱۹۸۹ء/۱۲/رجب ۱۴۰۹ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا غفر اللہ لہ ورحمہ رحمۃ واسعۃ۔

چھٹا حادثہ سعودی عرب کی عظیم اور حجاز مقدس کی قد آور شخصیت معالی الشیخ محمد صالح قزاز سابق سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ جو یکم رجب المرجب ۱۴۰۹ھ/ ۶/فروری ۱۹۸۹ء کو پیش آیا، ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء میں حجاز مقدس کا سفر جب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ ہوا تھا اور مشائخ وعلماء حرم واعیان سے ملاقاتیں ہوئی تھیں، ان میں ایک اہم شخصیت شیخ محمد صالح قزاز کی بھی تھی، جن کا تعلق حضرت مولانا سے بعد میں بڑھتا ہی گیا، پھر وہ رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ہو گئے، اور حضرت مولانا کا انہوں نے ہمیشہ بڑا خیال رکھا، ان کے طے کردہ رابطہ کے ایک وفد میں جس میں شیخ احمد محمد جمال بھی تھے، شام، لبنان، اردن، عراق کا ہوا تھا اور کویت کے راستہ واپسی ہوئی تھی، میں بھی ساتھ تھا، ادھر کچھ عرصہ سے وہ بیمار تھے، گزشتہ سفر حجاز میں مکہ مکرمہ میں ۱۵ یا ۱۶/نومبر ۱۹۸۸ء کو مولانا عبداللہ عباس ندوی کے مکان سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ مجھے بھی حاضری کا شرف حاصل ہوا، وہ سراپا انتظار تھے، ان کی اہم خدمات اور کارناموں میں حرمین شریفین کی توسیع کی نگرانی کی ذمہ داری کے علاوہ عالم اسلام کے مسائل وقضایا کے حل کی فکر وکوشش اور دنیا کے مختلف خطوں میں رابطہ کے وفود بھیج کر ان کا جائزہ اور تعاون اور پھر مکہ مکرمہ میں تحفیظ القرآن کے وسیع نظام کا قیام اور خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول کرے اور ان کے مرتبے کو بلند فرمائے، آمین۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کا کانپور اجلاس

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا کانپور اجلاس اس لئے بہت اہمیت کا حامل اجلاس تھا کہ یکساں سول کوڈ کا مسئلہ بہت زور شور سے اٹھایا گیا تھا، اور مسلمانوں کے عائلی قانون کو اعتراض کا نشانہ بنایا جا رہا تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے رہنما خطبۂ صدارت میں پوری قوت سے یہ بات کہی کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ان کا عائلی قانون اس خدا کا بنایا ہوا ہے جس نے قرآن حکیم اتارا ہے۔ یہ خطبۂ صدارت اجلاس نہم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ منعقدہ ۴، ۵/مارچ ۱۹۸۹ء میں بمقام کانپور، اتر پردیش پیش کیا گیا، حضرت مولانا نے اپنے خطبۂ صدارت میں یہ گلہ بھی کیا کہ یہ مسئلہ مسلمانوں کا داخلی اور ان کی شریعت کے تحفظ کا تھا، اور اس سلسلہ میں پورے ملک میں غیر معمولی اور کثیر تعداد میں احتجاج، جلسے ہوئے، اور حکومت ہند کو اپنے جذبات سے آگاہ کیا گیا مگر افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ ملک کے پریس اور فرقہ پرست طاقتوں نے اس کو اس طرح پیش کیا کہ جیسے اس ملک پر باہر سے کوئی حملہ ہونے والا ہے یا کوئی ہیبت ناک کوہ آتش فشاں پھٹنے والا ہے، یا کوئی مہلک وبا پھیلنے والی ہے، اور صاف صاف یہ بات کہی کہ:

"ایک جمہوری ملک میں جہاں قانون چلتا ہو، جہاں ہر شہری کو برابر کا حق دیا گیا ہو، وہاں ہر شہری کو اور شہریوں کی ہر تنظیم کو اور آبادی کے ہر عنصر کے نمائندوں کو یہ حق ہے کہ پارلیمنٹ (ایوان قانون ساز) میں اپنے قومی عوامی جلسوں میں، اپنی مجلسوں میں، اور اخباروں کے کالموں میں وہ اس بات کی شکایت کریں کہ ہمارا فلاں حق نہیں مل رہا ہے، ہمارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، کوئی ملک جس کی جمہوریت پر بنیاد ہو، جو جمہوری ہو، اس کے بغیر نہیں چل سکتا"۔(۱)

کانپور میں اس اجلاس کے انعقاد کو برمحل قرار دیتے ہوئے یہاں ندوۃ العلماء کی تحریک کے آغاز وافتتاح کا بھی ذکر کیا کہ: ہمیں خوشی ہے کہ یہ اجلاس ایسے تاریخی شہر میں ہو رہا ہے جس نے ملی مسائل، دینی تعلیم، تحریک خلافت و آزادی میں شایان شان حصہ لیا، جہاں سے سب سے پہلے تحریک ندوۃ العلماء کا آغاز ہوا، اور اس کے ابتدائی جلسے

---

(۱) خطبۂ صدارت کانپور، تعمیر حیات، ۲۵/مئی ۱۹۸۹ء، ص: ۵، ۶، ۷، ۸)

اور مشاورتی مجالس ہوئیں، جن میں اس عہد کے ممتاز وسر برآوردہ علماء شریک ہوئے جن سے ندوۃ العلماء کی بنیاد پڑی، اور ایک تعلیمی تجربہ گاہ دارالعلوم کا منصوبہ تیار ہوا، جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے ایک پڑوسی شہر لکھنؤ کا انتخاب کیا، اور یہیں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے بانی ومفکر حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی کے والد نامدار شیخ وقت حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء کا بڑا وقت گزرا، اور یہیں ندوہ کا تخیل بروقت ان کے ذہن میں آیا، پھر یہ کہ یہیں مچھلی بازار کی مسجد پر انگریزی حکومت کے ایک ناروا اقدام پر سارے ہندوستان میں ناراضگی، حفاظت مساجد، اور حمیت دینی کی لہر دوڑ گئی جس کی مؤثر و پرزور ترجمانی امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنے پرزور قلم سے ''الہلال'' میں کی، اور اس میں مولانا سید سلیمان ندوی کا تلاطم خیز مضمون ''مشہد اکبر'' نکلا، یہ تاریخی یادیں اور یہ قابل فخر خصوصیات اس شہر کے لیے اور اس اہم اجلاس کے انعقاد کے لیے نہ صرف جواز؛ بلکہ استحقاق پیش کرتی ہیں۔ (حوالہ سابق)

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں دوروزہ دینی تعلیمی کنونشن

یکم ودو جون ۱۹۸۹ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہونے والے دینی تعلیمی کنونشن میں ہندوستان بھر سے آئے ہوئے علماء، وکلاء، جدید تعلیم یافتہ، اور مدارس عربیہ کے منتخب مندوبین کے سامنے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صدر دینی تعلیمی کونسل اترپردیش کا چشم کشا خطبۂ استقبالیہ تھا جس میں انہوں نے آزاد دینی مدارس ومکاتب کا کارنامہ، ان کی ضرورت وافادیت اور نئے چیلنج، جائزہ، مشورہ کے ساتھ رہنمائی کی، جس میں آخر میں انہوں نے یہ توجہ دلائی بلکہ آگاہ کیا کہ مدارس ومکاتب کے سرکاری امداد قبول کر لینے سے ان کا عوامی رابطہ کمزور پڑ جاتا ہے، بلکہ ٹوٹ جاتا ہے جو بہت مضر ہے، دینی تعلیم کے بقاء اور ملت کی تشخص کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ ایثار وقربانی سے کام لیا جائے، قناعت اور ایمان واحتساب سے اس چراغ کو روشن رکھا جائے، کہ اس دین کا ماضی، حال اور مستقبل ایمان ویقین، ایثار وتوکل اور عزم وہمت سے وابستہ رہا ہے، اور رہے گا، اور یہی جوہر ہر طرح کے بدلے ہوئے حالات اور تیز

وتند آندھیوں میں بھی اس چراغ کو گل ہونے سے بچاتا رہا ہے اور بچاتا رہے گا"۔ (یہ خطبۂ استقبالیہ تعمیر حیات ۱۰/جون ۱۹۸۹ء، ص ۵، ۶، ۷ میں ملاحظہ ہو)۔

یہ دوروزہ کنونشن کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے بہت مؤثر و کامیاب رہا، جس میں ملک کے چیدہ و برگزیدہ حضرات نے شرکت کی، ان میں علماء بھی تھے، وکلاء اور جدید تعلیم یافتہ بھی، اسمبلی پارلیمنٹ کے ممبران بھی تھے، مدارس و مکاتب، اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ و ذمہ دار حضرات بھی تھے، مختلف جماعتوں اور تحریکوں کے ذمہ دار بھی، اس میں مقررین نے کچھ مطالبات و تقاضے عام مسلمانوں، مسلم تعلیم گاہوں کے ذمہ داروں سامنے رکھے تو کچھ مطالبات حکومت کے سامنے بھی رکھے، اور دینی مدارس کے سلسلہ میں قانون میں ترمیم کو ضروری قرار دیا اور عام مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ اس وقت پورے ملک میں تعلیم کی راہ سے جو تہذیبی انقلاب لانے کی مہم جاری ہے، اس کا ملک گیر سطح پر مطالبہ اور اس کے لئے سنجیدہ اور مثبت لائحۂ عمل کی ضرورت ہے۔

اس کنونشن میں یوپی کے علاوہ بہار، آسام، مہاراشٹر کے تقریباً آٹھ سو مندوبین نے شرکت کی، جن میں آسام کی قد آور شخصیت و رکن اسمبلی مولانا عبدالجلیل چودھری صاحب بھی تھے، جو وہاں امیر شریعت اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے تربیت یافتہ وخلیفہ ہیں، انہوں نے بھی خطاب کیا، ان کے علاوہ جناب سید حامد سابق وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے خطبہ افتتاحیہ پیش کیا، جنرل سکریٹری دینی تعلیمی کونسل ریاض الدین احمد صاحب نے سکریٹری رپورٹ اور مولانا سید منت اللہ رحمانی نے خطبۂ صدارت پیش کیا، مولانا عبدالکریم پاریکھ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وغیرہ کے بھی خطاب ہوئے۔

محدث جلیل مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کی دوسری تشریف آوری

مولانا محمد ضیاء الحسن اعظمی ندوی استاد اول قسم الحدیث کلیۃ الشریعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی وفات کے بعد ضرورت محسوس کی گئی کہ حدیث کے ممتاز فاضل و محقق و مدرس مولانا محمد عبدالرشید نعمانی جن کا حدیث شریف کے موضوع سے بڑا شغف ہے، اور اس

میں ان کا قابل قدر کام ہے اور پھر یہ کہ وہ حدیث شریف میں استفادہ کے خاطر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں وقت گزار چکے ہیں اور اس کے شیخ الحدیث حضرت مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی سے خصوصی طور پر کسب فیض کیا، کو دعوت دی جائے، چنانچہ انہوں نے وہ دعوت قبول فرمائی اور ماہ شوال ۱۴۰۹ھ (مئی ۱۹۸۹ء) کے وسط میں لکھنؤ تشریف لائے، تا کہ حدیث کے طلبہ کو خاص طور پر مستفید فرمائیں، فضیلت دوم میں صحیح بخاری شریف کا درس اور اس کے اختصاص فی الحدیث کے طلبہ کے لیے طحاوی شریف کا درس اور خارج اوقات میں شرح نخبہ (اصول حدیث) کا درس دیگر طلبہ کے لئے دیا، اور تحقیقی ذوق پیدا کرانے کے لئے خارج اوقات میں کتب خانہ جا کر حدیث کے طلبہ کو اور عالمیت کے آخر کے دو سالوں کے ان طلبہ کو جن کو حدیث میں استفادہ کا شوق تھا، حدیث سے استفادہ کے طریقے سکھائے۔ ان کا قیام بہت مبارک رہا اور ان کی تکریم میں پروگرام بھی ہوا، اگرچہ وہ باقاعدہ سند یافتہ ندوی نہیں ہیں مگر ان کے ندوۃ العلماء سے تعلق اور وہاں رہ کر طالب علمانہ ایام گزارنے کی وجہ اور پھر ان کی اپنی علمی خدمات کے اعتراف میں ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے انھیں اعزازی طور پر ندوی قرار دیا۔ کہ اس کی ایک نظیر موجود ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے بحیثیت معتمد تعلیم ندوۃ العلماء کے یہ خصوصیت مولانا عبدالماجد دریابادی کے ساتھ برتی تھی، حضرت مولانا نے ان کے تکریم کے جلسہ میں جون ۱۴ / جون ۱۹۸۹ء کو بعد نماز مغرب سلیمانیہ ہال میں ہوا، ان کی خدمات کے اعتراف میں شہادت بالحق کے طور پر یہ بھی فرمایا کہ:

''شہادت بالحق کے طور پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک دو شخصیتوں کو چھوڑ کر برصغیر میں مولانا عبدالرشید نعمانی فن حدیث اور اسماء الرجال میں منفرد مقام کے حامل ہیں، ہمیں مسرت ہے کہ اپنی مصروفیات و مشاغل کے باوجود مولانا یہاں تشریف لائے، اور ہمارے طلبہ نے ان سے استفادہ کیا، ہماری خواہش ہے کہ مولانا یہاں بار بار تشریف لائیں، دارالعلوم ان کے لئے اجنبی جگہ نہیں ہے، یہاں انہوں نے دو سال قیام کیا ہے، اور دارالعلوم کے اس وقت کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں صاحب سے حدیث میں

استفادہ کیا، یہ ان کا اپنا ادارہ ہے، ادارے پر ان کا حق ہے اور ادارہ کا ان پر حق ہے، مولانا صرف یہاں مہمان نہیں، اس خاندان کے ایک معزز فرد بھی ہیں''۔

آیت اللہ خمینی کا انتقال

ایران کے انقلاب اسلامی کے بانی و رہنما آیت اللہ روح اللہ خمینی نے اپنی طویل زندگی کے آخری دس بارہ سال ایک بڑی طوفانی تحریک کی قیادت کے بعد ۸۸ سال کی عمر میں ۳؍جون ۱۹۸۹ء کو انتقال کیا، روح اللہ ان کا نام تھا، مذہبی شخصیت کی وجہ سے آیت اللہ خطاب تھا، جو ایران میں بڑے شیعہ عالم کے لئے خاص ہے، انقلاب کی کامیابی کے نتیجہ میں انہیں مقتدا کی حیثیت ایران میں حاصل ہوئی اور ان کے نام کے ساتھ ''امام'' کا لاحقہ بھی لگ گیا، ان کی شخصیت کے کئی پہلو تھے ایک علمی، دوسرا مذہبی، اور تیسرا سیاسی، انقلابی تحریک کو کامیاب بنانے میں انہوں نے تینوں پہلوؤں سے مدد لی، خمینی صاحب شاہ ایران کے زمانہ میں ملک بدر رہے، اور ایک مدت عراق میں رہنے کے بعد، فرانس چلے گئے اور وہاں سے انہوں نے بڑی ترقی یافتہ تدابیر سے کام لینا شروع کیا، جن میں ایران میں اپنی تقاریر کی کیسٹ گلی گلی، گاؤں گاؤں پھیلانے کی مؤثر تدبیر تھی، خمینی صاحب نے موجودہ زمانہ کی بے محابا سیاسی تدابیر کو اختیار کرنے میں دریغ نہیں کیا، اور جانوں کے اتلاف کی انہوں نے پرواہ نہ کی، پھر اپنی حفاظت کے لئے بھی انہیں حجاب در حجاب رہنا پڑا اور ایک مقتدا و مذہبی رہنما کے لئے یہ طریقہ بطور نمونہ سامنے آنے میں حجاب بن گیا، اس طرح خمینی صاحب کے بارے میں دو نظریئے قائم ہو گئے، مخالف نظریہ اور موافق نظریہ، اہل تشیع نے ان کے لیے عقیدت و محبت میں غلو کیا، اور اہل سنت میں ایک نظریہ تائید کا اور دوسرا مخالف اور سخت تنقید کا سامنے آیا، جہاں تک خمینی صاحب کے انقلاب کی کامیابی اور اس کے اثرات کا تعلق ہے تو اس کے دو دور سامنے آئے، ایک دور انقلاب لانے کا دور ہے، جس نے ان کو پورے عالم اسلام میں ہیرو بنا دیا تھا، دوسرا دور انقلاب کو قائم رکھنے اور آگے کے اقدامات کا ہے، جن میں انقلاب کو دوسرے اسلامی ملکوں تک پہونچانے اور وہاں کی

حکومت کو ختم کرا کے اپنے اثر میں لینے کی کوشش کا دور ہے، اس دوسرے دور میں عراق کے ان محترم مقامات کو جن کو اہل تشیع حضرات کے یہاں غیر معمولی تقدس کا درجہ حاصل ہے، ایرانی اقتدار کے ماتحت لانے، اور حرمین شریفین میں اقتدار حاصل کرنے کا جذبہ ان کی جدوجہد کا محور بن گیا تھا، یہ چیز بڑے خطرہ کی تھی، اس لئے کہ روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ان کے دو دیرینہ رفیق حضرت صدیق اکبرؓ و حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما آرام فرما رہے، اور اہل تشیع اس کے صرف مخالف ہی نہیں بلکہ اس کی تبدیلی کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس بات کو اپنے مذہب کا جزء سمجھتے ہیں، لہٰذا وہاں شیعی مذہب کے پیشواؤں کا اقتدار مسلمانوں کے لیے نہایت خطرناک اور ناقابل قبول تصور ہے جس کے امکانات کا موقع بھی نہیں دیا جا سکتا۔

خمینی صاحب نے ایک تاریخی انقلاب کرنے سے جو شہرت و مقبولیت حاصل کی تھی، اس کو ایران عراق جنگ اور حرمین شریفین کی حکومت کو بدلنے کی ان کی کوشش اور اس کے لئے مختلف تدابیر اختیار کرنے اور حجاج کے بھیس میں رضا کار بھیجنے اور ایام حج میں وہاں مظاہرے اور نعرہ بازی کرنے اور حجاج کے ساتھ خفیہ طور پر توڑ پھوڑ کا سامان بھیجنے سے جس میں بہت سی جانیں گئیں، شدید نقصان پہونچا، ان کی اس طرح کی کارروائیوں کے پس منظر میں یہ خواہش دیکھی جاتی رہی ہے کہ مقامات مقدسہ کی تولیت بدل کر ان کے ہاتھوں میں آجائے اور وہ وہاں اپنے شیعی مذہب کے مطابق جس کی خواہش ان میں صاف محسوس کی گئی، نظام قائم کر دیں، یہی وہ امور تھے جس کی بنا پر بعض اہل بصیرت و اہل سنت نے خمینی صاحب کے نظام و رجحان پر سخت تنقید کی۔

خمینی صاحب نے شام میں حکمراں اور گمراہ فرقہ دروزی کے ساتھ تعاون کیا جو اپنے ملک کی سنی آبادی کے ساتھ ظلم و تشدد میں ملوث تھے، لبنان کے شیعوں کو منظم کرنے میں بھی ایران کی انقلابی حکومت نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کی بنا پر لبنان میں شیعہ سنی مسئلہ نے قومی تصادم کی شکل اختیار کر لی، ایران عراق جنگ میں جو بے محابہ خون بہا اور بار بار عالم اسلام کے قائدین و زعماء کے سمجھانے کے باوجود صلح کے لئے تیار نہ ہونے پر بہت سے مسلم

ذہنوں کو یہ خیال بدلنے پر مجبور کیا کہ خمینی صاحب خالص اسلام کی سربلندی چاہتے ہیں۔

اگر خمینی صاحب اہل سنت کے معاملہ میں توسع اور رواداری سے کام لیتے اور اپنی سیاست کو اپنی گروہی وابستگی کے تابع نہ رکھتے اور ایک ایسی جنگ کو مسلسل جاری رکھنے پر مصر نہ ہوتے جس میں لاکھوں مسلمانوں کا خون بہتا رہا اور صرف کفار کو فائدہ پہنچتا رہا، تو ان کو بلاتفریق مذہب وملت مسلم قائد کی حیثیت مل جاتی۔ بہت سے ان کے وہ دوست جوان کے ہمنوا ہو گئے تھے اور فرقہ ومسلک کی بات نظر انداز کر کے ان کا ساتھ دے رہے تھے ان سے الگ ہو گئے، اخوان المسلمون نے اور ان سے متعلق بعض جماعتوں نے بھی شروع میں تائید کی لیکن پھر وہ سخت برگشتہ ہو گئے۔

اب یہ بات مخفی نہ رہی کہ خمینی صاحب کی حکومت صرف شیعہ حکومت ہے، جو اپنے مقاصد کو سیاسی وعسکری طریقہ سے پورا کرنا چاہتی ہے۔ یہاں ایک لطیفہ کی بات بھی قابل ذکر ہے کہ:

خمینی صاحب سے ۱۹۶۵ء میں یا اس سے ایک سال آگے یا پیچھے ایک موقع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی بھی ملاقات ہوئی تھی، یہ ان کی انقلابی شخصیت کے ظاہر ہونے سے کافی پہلے کی بات ہے، اس وقت خمینی صاحب صرف آیت اللہ تھے، اور عراق میں بے وطنی کی زندگی گزار رہے تھے، لیکن عراقی حکومت نے ان کے علمی ودینی مقام کو ملحوظ رکھا تھا، وہ حرم شریف حاضری کے موقع پر رابطۂ عالم اسلامی کے دفتر آئے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس وقت وہاں موجود تھے، ملاقات ہوئی، حضرت مولانا نے مشہور عربی رسالہ "ردّۃ ولا أبا بکر لہا" (کہ ارتداد پیش آرہا ہے اور ابوبکر جیسی شخصیت موجود نہیں) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس کا نام "ردّۃ ولا أبا حسن لہا" (یعنی ارتداد ہے مگر علی جیسی شخصیت نہیں) ہونا چاہئے تھا، مولانا نے فرمایا کہ ارتداد کے لحاظ سے ول أبا بکر لہا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ذکر ہی مناسب ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے دوسرا مقولہ ہے "قضیۃ ول أبا حسن لہا" (کہ مسئلہ بہت الجھ گیا ہے، اور اس کے سلجھانے کے لیے علی جیسی شخصیت نہیں ہے)، اس پر وہ خاموش ہو گئے، پھر حرم شریف کے اندر ایک جگہ ایک ہی صف

میں ملاقات ہوگئی، عالم اسلام کی ایک اہم شخصیت مولانا مودودیؒ بھی موجود تھے، خمینی صاحب نے کہا کہ ہم سب لوگ اس وقت مقام مقدس پر ہیں آیئے دعا کریں اور یہ کہہ کر ہاتھ اٹھا دیا اور بار بار ایک ہی آیت: "رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَان." دہراتے رہے (کہ اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما اور ان لوگوں کی بھی مغفرت فرما جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزر گئے) اس سے آگے کا حصہ چوں کہ خمینی صاحب کے موافق نہ تھا، اس لیے اس کو نظر انداز کر رہے تھے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے لقمہ دیتے ہوئے آگے کا حصہ ذرا زور دے کر پڑھا: "وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَؤُوْفٌ رَّحِیْمٌ" (اور ہمارے دلوں میں کینہ کپٹ نہ رکھ ان لوگوں کے سلسلہ میں جو ایمان لائے، بے شک تو بڑا شفیق و رحیم ہے)۔

اس موقع پر مولانا مودودی خوب محظوظ ہوئے اور مولانا سے کہا کہ آپ نے اچھی چپت لگائی (۱)۔

المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی کی ضرورت وافادیت

ارکان مجلس انتظامی ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ اسلامی سال کے آغاز میں ماہ محرم کی کسی تاریخ میں ہوتا رہا ہے، اس بار بعض مصلحتوں سے اسلامی سال کے اختتام پر ۲۵؍ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۹؍جولائی ۱۹۸۹ء کو ہوا، اس میں ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی رپورٹ میں المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی کے شعبہ کی اہمیت وافادیت وضرورت پر خاص زور دیا جس کا قیام ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء میں عمل میں آیا تھا، انہوں نے فرمایا:

"دارالعلوم کے اندر نئے دعوتی و تعلیمی مقاصد کی تکمیل کے لئے کچھ اقدامات کئے گئے ہیں جن میں ایک اہم اقدام "المعہد العالی للدعوۃ والفکر اسلامی" کا قیام ہے، جو ندوۃ العلماء کے روشن ضمیر اور بالغ نظر بانیوں کے خواب کی تعبیر اور وقت کے اہم تقاضہ کی تکمیل کے مرادف ہے، یہاں داخلہ لینے والے طلبہ کو (جو بالعموم دارالعلوم کے فضلاء

(۱) تفصیلی مضمون تعمیر حیات ۲۵؍جولائی ۱۹۸۹ء میں ملاحظہ ہو۔

اورطلبہ ہی ہوتے ہیں) ان مخالف وموافق تحریکات سے واقف کرایا جاتا ہے جو ممالک اسلامیہ میں بالعموم اور ممالک عربیہ میں بالخصوص رائج اور مقبول ہیں، اور جو اسلام کے صحیح فکر اور دین کی صحیح دعوت کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں، اور تعلیم یافتہ حلقہ میں ذہنی انتشار، اسلام پر بے اعتمادی اور غیر محدود تجدد، ترقی پسندی، قوم پرستی یا اشتراکیت کے لئے زمین ہموار کرتی ہیں۔ اس غرض کے لئے طلبہ کو جدید و مؤثر اسلوب میں (خاص طور پر عربی زبان میں) اپنے خیالات اور اسلام کی صحیح دعوت پیش کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے ایک جامع وہمہ گیر اور مؤثر نصاب تجویز کیا گیا ہے جو تدریس اور مطالعہ کے درمیان تقسیم ہے، خدا کے فضل سے اس میں تدریسی خدمت ورہنمائی کا فرض انجام دینے کے لئے خود دارالعلوم کے اساتذہ میں سے ایسے افراد مل گئے ہیں جو اس کام کی پوری اہمیت رکھتے ہیں، اگر توفیق الٰہی شامل حال رہی تو اس معہد سے نکلنے والے فضلاء کسی عرب ملک میں بھی وقت کے تقاضہ کے مطابق دین کی دعوت، صحیح و مستند اسلام کی طرف رجوع اور مخالف اسلام تحریکوں و فلسفوں کی تردید کا فرض انجام دے سکتے ہیں''۔(۱)

ترکی میں عالمی رابطۂ ادب اسلامی کا اجلاس

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اگست ۱۹۸۹ء میں ترکی اور برطانیہ کے دو ہفتے کے سفر پر تشریف لے گئے تھے، راقم بھی ہمراہ تھا، رابطۂ ادب اسلامی کا اجلاس (۱۲-۱۶ راگست) استنبول ترکی میں تھا جس کی صدارت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمائی اور اس کے افتتاحی واختتامی جلسوں سے خطاب بھی کیا اور استنبول کے ایک نواحی محلّہ سلطان چفلی کی وسیع مسجد سلام میں بھی خطاب کیا، پھر آکسفورڈ یونی ورسٹی میں قائم اسلامک سنٹر کے اجتماع (۲۳ راگست) میں شرکت کے لیے لندن تشریف لے گئے اور کئی اجتماعات سے خطاب فرمایا اور ۳۰ راگست کو واپس تشریف لائے۔

رابطۂ ادب اسلامی کی استنبول کانفرنس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

---

(۱) ماخوذ از روئیداد ناظم ندوۃ العلماء، پیش کردہ جلسہ انتظامی ۲۵ رذی الحجہ ۱۴۰۹ھ، ندوۃ العلماء۔

نے اہم اور کلیدی خطاب کیا جس کے آخر میں انہوں نے بطور اظہار تشکر و تحدیث نعمت کے یہ فرمایا کہ:

''یہ دعوت اللہ کی حکمت و مصلحت کے مطابق اور اس کی توفیق سے ہندوستان سے اٹھی، اور اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس کا توقع سے کہیں زیادہ استقبال ہوا، خاص طور سے عرب ادباء وفضلاء کی جانب سے ہمارے عرب اساتذہ، ہمارے دوستوں اور ساتھیوں نے اس دعوت پر لبیک کہا۔ اور اس طرح اس کو قبول کیا جو ان کی شرافت، ان کے کرم اور ان کے مقام و منزلت کے مناسب تھا۔

ہماری یہ مجلس عثمانی سلطان محمد الفاتح کے شہر استنبول (قسطنطنیہ) میں منعقد ہو رہی ہے، اس میں بھی ایک نیک شگون ہے، یہ شہر ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ کوئی چیز خواہ کتنی ہی کم عمر ہو، بلند ترین درجات تک پہنچ سکتی ہے، محمد الثانی جنہیں محمد الفاتح کہا جاتا ہے، نے یہ شہر ۲۴ رسال کی عمر میں فتح کیا تھا، ہمارا اس شہر میں اجتماع ایک فال نیک ہے کہ ''یہ نئی دعوت یہ کم سن تحریک بھی شباب تک پہونچے گی اور پوری دنیا میں پھیلے گی، ان شاء اللہ''۔

جلسہ میں مقررین و مقالہ نگار حضرات نے زور دے کر یہ بات کہی کہ ادب کی راہ سے آنے والے فساد کا مقابلہ ادب ہی کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے، یہ اجلاس تین دن چلا، اس کی تفصیل مولانا عبدالنور (نور عظیم ندوی) آفس سکریٹری رابطۂ ادب اسلامی دفتر ندوۃ العلماء کے قلم سے ملاحظہ ہو جو تعمیر حیات ۲۵ رستمبر ۱۹۸۹ء، ص:۶ سے پیش کی جارہی ہے۔

''حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ۱۲ راگست سے ۱۸ راگست تک ایک ہفتہ کی مدت ترکی کے دارالسلطنت استنبول میں گزارا، اور اس موقع پر استنبول کے ایک نواحی محلہ کی ایک وسیع مسجد و مدرسہ میں ایک ایسے بڑے مجمع سے دینی و دعوتی خطاب فرمایا جس میں ترکی میں دعوتی کام کرنے والے کارکنوں، باہر سے آئی ہوئی تبلیغی جماعتوں کے افراد اور دینی مکاتب و مدارس کے ذمہ دار و منتظمین موجود تھے، اس تقریر میں مجاہد و فاتح اور صدیوں تک پاسبان خلافت رہنے والی اولوالعزم ترکی قوم کی دینی و ملی خدمات اور اس کی مجاہدانہ و فاتحانہ کارناموں اور شاندار ماضی کو یاد دلانے کے بعد موجودہ دور اور ذمہ داریوں، حفاظت و اشاعت

دین کے فریضہ اور مستقبل کے اندیشوں اور خطرات سے آگاہ کیا گیا ہے۔

یورپ اور اس کے ایجنٹوں کی خطرناک سازشوں (منصوبوں) کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، یہ تقریر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے کتابچہ کی شکل میں شائع ہوگئی ہے، اور مجلس سے طلب کی جاسکتی ہے جس کا عنوان تھا:

''ترکی کی مجاہد ملت اسلامی ماضی کے درخشاں کارناموں اور حال و مستقبل کے اندیشوں اور خطرات کے درمیان، تاریخی جائزہ ومطالعہ، مؤرخانہ وغیر جانبدارانہ نتائج اور مخلصانہ مشوروں اور آگاہیوں کے ساتھ''۔ (یہ تقریر ''تعمیر حیات'' لکھنؤ، شمارہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۸۹ء، صفحہ ۵، ۶، ۷، ۸، ۹ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے)۔

آکسفورڈ لندن کے اسلامک سنٹر کی میٹنگ میں شرکت

۲۳ راگست کو آکسفورڈ کے اسلامی سنٹر کے ٹرسٹیوں کا سالانہ جلسہ تھا جس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ترکی میں منعقدہ رابطہ ادب اسلامی کی کانفرنس کے بعد شرکت فرمائی۔

ٹرسٹیوں کے اس جلسہ میں اس کے تقریباً تمام اہم ارکان شریک ہوئے، رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف مکہ مکرمہ، امام محمد بن سعود اسلامی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن ترکی، قطر یونی ورسٹی کے کلیۃ الشریعہ کے ڈین شیخ ڈاکٹر یوسف القرضاوی، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر خلیق احمد نظامی، کویت کے مشہور بزرگ عالم وداعی ومخیّر تاجر شیخ عبداللہ علی المطوع، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

معمول وضابطہ کے مطابق سنٹر کی نشستیں ہوئیں، آئندہ کے کاموں کا پروگرام طے کیا گیا، اس کی مالی پوزیشن اور اس کے استحکام پر غور ہوا، مالی لحاظ سے اس کو خود کفیل بنانے کے لئے اس کا ایک وقف تشکیل دیا گیا، جس کو علم دوست اور اسلام پسند حضرات کی طرف سے مالی تعاون کیے جانے کی اپیل بھی کی گئی، تین اہم نقاط کو زیادہ لائق توجہ قرار دیا گیا، ان میں ایک اعلیٰ

علمی سطح کے سہ ماہی انگریزی مجلّہ کا اجراء، دوسرے انگریزی میں ایک موقر تاریخ اسلامی کی ترتیب، تیسرے اسلام کے تعلق سے انگریزی میں ایک معیاری تاریخی اطلس کی تیاری۔

اسی کے ساتھ مختلف اسلامی موضوعات پر عالم اسلام کی متعدد ممتاز علمی شخصیتوں کے توسیعی خطبات کے پروگرام کو مزید بڑھانے کا فیصلہ بھی کیا گیا، نیز دوسرے دیگر ایسے وسائل اختیار کرنے کی تجویز منظور کی گئی جس سے فکر اسلامی کے مفید پہلوؤں پر تحقیق و مطالعہ کرنے والوں کو اپنی اعلیٰ صلاحیت کے دائرہ میں رہتے ہوئے تعلیمی وظائف مہیا کرنے کی ضرورت کو بھی قابل توجہ قرار دیا گیا۔

سنٹر اپنی کارگزاریوں کے لیے اب تک آکسفورڈ یونی ورسٹی کے ہی ہالوں کو استعمال کرتا رہا، خود اس کی مخصوص عمارت نہ ہونے کے باعث اس کا دفتر بھی اس کے ڈائرکٹر کی رہائش گاہ کے وسیع کمرہ میں تھا، لیکن اب اس معاملہ میں سہولت پیدا ہوگئی ہے، اور سنٹر کو یونی ورسٹی کی ایک سادہ لیکن کشادہ عمارت کرایہ پر مل گئی ہے جس میں دفتر کی ضرورت کے مطابق متعدد کمرے اور سیمینار کے لائق ایک ہال بھی ہے۔ چنانچہ اب سنٹر کے تمام کام اسی عمارت میں انجام دیئے جانے لگے ہیں، اور یونی ورسٹی کی احسان مندی سے سنٹر کو استغناء حاصل ہوگیا ہے۔

آکسفورڈ اسلامی سنٹر کے اس جلسہ میں شرکت کے مقصد کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا ایک دوسرا اہم مقصد اپنا وہ ٹھوس علمی مقالہ آکسفورڈ لندن میں پیش کرنا تھا جو انہوں نے رسالت محمدی کے عظیم ترین کارنامے اور دنیا کے علم و تمدن کے بقاء و ترقی پر اس کے اثر بلکہ احسان پر تیار کیا تھا، یہ مقالہ یورپین مفکرین اور اہل قلم کے ٹھوس حوالوں کے ساتھ مدلل طریقہ سے مرتب کیا گیا، چنانچہ لندن کے دو سنٹروں میں اور آکسفورڈ کے اسلامی سنٹر میں مسلم عیسائی اہل علم کے مخلوط حاضرین میں یہ مقالہ پیش کیا گیا، مقالہ کو بڑی داد و تحسین حاصل ہوئی۔ (تفصیل کے ملاحظہ کریں: تعمیر حیات، ۱۰/اکتوبر ۱۹۸۹ء)۔

یہ مقالہ تعمیر حیات ۲۵/اکتوبر ۱۹۸۹ء ''انسانیت کے محسن اعظم اور شریف و متمدن دنیا کا اخلاقی فریضہ'' کے نام سے شائع ہوا جو ۲۲/اگست ۱۹۸۹ء کو اسلامک اسٹڈیز سنٹر آکسفورڈ یونی ورسٹی انگلینڈ میں پڑھا گیا، اور ۲۶/اگست کو لندن کے بین الاقوامی اسلامک سنٹر پارک روڈ میں

مختلف ملکوں اور زبانوں سے تعلق رکھنے والے ایک عظیم مجمع کے سامنے تشریح وترجمانی کے ساتھ پیش کیا گیا۔

حیدرآباد میں رابطۂ ادب اسلامی کا سیمینار

حیدرآباد میں مورخہ ۷، ۸، ۹ /اکتوبر ۱۹۸۹ء کو رابطۂ ادب اسلامی نے ''تحریک آزادی واصلاح عوام میں ادب اسلامی کا حصہ'' کے موضوع پر سیمینار منعقد کیا، جس کے افتتاحی واختتامی اجلاس حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے زیرصدارت ہوئے، اور آخر میں حسب معمول تجاویز وقرارداد پاس ہوئیں، مقالات جو پیش کیے گئے ان کی تعداد چالیس تھی جن میں برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد اور عوامی اصلاح کا کام کرنے والے علماء، ادباء، شعراء کے کاموں، ان کی زبان وقلم کی مؤثر شرکت کو موضوع بحث بنایا گیا، ان کے اثرات، ان کے انداز اور ان کے خصوصی وزن کو واضح کیا گیا۔ ان مقالات میں شخصیتوں کے تنوع اور ان کے کاموں کے مختلف پہلو سامنے آئے، اور یہ عام طریقہ سے محسوس کیا گیا کہ برطانوی سامراج میں مسلمان اہل علم وادب کا غیر معمولی اور اولین حصہ رہا ہے، جو متعدد اسباب اور رکاوٹوں کے باعث نظرانداز کیا جاتا رہا ہے، اس کو سامنے لانا ضروری ہے، تاکہ اہل وطن کو یہ معلوم ہو کہ ملک کو آزاد کرانے میں اور سماجی وانفرادی خوبیوں کی طرف توجہ دلانے میں مسلمانوں کا کیا نمایاں حصہ رہا ہے، جس کو سمجھنے اور اس سے مسلمانوں کا مقام جاننے میں مدد ملتی ہے، اس موقع پر حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز دہلوی، ان کے خلیفہ امیرالمومنین حضرت سید احمد شہید اور ان کی جماعت مجاہدین، اور مشہور مجاہد آزادی سلطان ٹیپو شہید کی خدمات کو بھی یاد کیا گیا اور اس کے بعد ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء تک آزادی کی کوششوں کے تسلسل کا بھی تذکرہ اچھے انداز میں سامنے آیا۔

برصغیر کی صورت حال پر ایک تبصرہ ومشورہ

پڑوسی ملک پاکستان میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم اور ان کے رفقاء کے ایک ہوائی حادثہ میں شہید ہوجانے کے بعد ایک کمزور نئی حکومت کی تشکیل سے بڑا انتشار اور حالات کی

ابتری پیدا ہوگئی تھی، متعدد بڑے شہروں میں، شہریوں کا جان و مال کا اطمینان باقی نہیں رہا، اور اسی کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ملک کی مسلمان حیثیت میں کیا تبدیلی پیدا کردی جائے گی جس سے پاکستانی ملت اسلامیہ کی امنگوں اور آرزوؤں کا خون ہوگا۔ جہاں تک ہمارے ملک ہندوستان کا تعلق ہے تو یہاں کانگریس اور حزب مخالف کے درمیان رسہ کشی کے باوجود حالات نسبتاً جمہوری راستہ میں چلتے رہے ہیں، لیکن اخلاقی اور سماجی بگاڑ کو دور کرنے کی طرف سے مسلسل بے توجہی نے ملک کے سماج کو ایک نہایت سنگین خطرہ کے دہانے پر پہونچا دیا، اور نسلی لسانی اور مذہبی تصادموں کا خطرہ جواب خطرہ سے آگے بڑھ کر ملک کی سماجی زندگی میں زلزلہ پیدا کرنے والے حالات میں تبدیل ہوگیا ہے، یہ حالات بدامنی سے بڑھ کر فساد اور مسلح ٹکراؤ کے دائرہ میں داخل ہوگئے ہیں، ''موجودہ بدامنی اور فرقہ وارانہ صورت حال'' کے عنوان سے یہ تبصرہ وشورہ تعمیر حیات ۲۵/ اکتوبر ۱۹۸۹ء/ ۲۴/ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ کے اداریہ کے طور پر شائع ہوا۔ اس میں ایک مشورہ یہ بھی تھا جو ہندوستانی مسلمانوں کو تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو ایسی تدبیروں کی تلاش کرنے کی سخت ضرورت ہے جن سے ملک کی اکثریت کے دل میں ان کی اور ان کے مذہب کی وقعت پیدا ہو، اور ان کی تہذیب وتمدن کی خوبیوں کو وہ محسوس کرسکیں، اس سے مسلمانوں کی عزت میں اضافہ ہوگا، اور متوازن ذہن کے لوگ ان کے فکر وتمدن کی خوبیوں کو سمجھ سکیں گے، اور اس کے نتیجہ میں ملک کے حالات مسلمانوں کے لئے کئی نوعیتوں سے تبدیل ہوسکتے ہیں۔ اس کے لئے دعوتی مزاج اور پیام انسانیت کے طرز کے کام کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

مسلمان امت دعوت ہیں، اور خیر امت کی حیثیت رکھتے ہیں، ضرورت ہے کہ وہ صورتیں زیادہ سے زیادہ پیدا کی جائیں جن سے غیروں کو ان کی دعوت اور ان کے خیر امت ہونے کے پہلو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملے، اور وہ اس سے صحیح فائدہ اٹھا سکیں۔

دو خاندانی حادثے (دسمبر ۱۹۸۹ء)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ سیدہ طیب النساء (طیبہ بی) بنت سید احمد سعید بن حضرت شاہ ضیاء النبی حسنی جو راقم الحروف کی ممانی

تھیں اوران کی بڑی پھوپھی راقم کی دادی (اہلیہ مولانا سید خلیل الدین حسنی) اورچھوٹی پھوپھی سیدہ خیر النساء بہتر (اہلیہ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی) راقم کی نانی تھیں، ۷۴ سال کی عمر میں اپنے وطن تکیہ کلاں رائے بریلی میں ۱۵/دسمبر ۱۹۸۹ء/۱۵/جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ کو وفات پا گئیں، مرحومہ کے دادا عارف باللہ حضرت شاہ سید ضیاء النبی حسنی رحمۃ اللہ علیہ ایک مصلح داعی، عالم و بزرگ تھے، جن کا فیض یوپی کے مشرقی اضلاع اوراس کے آگے بھی پہونچا، مرحومہ کو بھی اپنے دادیہال کی خصوصیات ملی تھیں اور نماز کے معاملہ میں غیر معمولی حال تھا، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کی فکر وانتظار اوراذان کے بارے میں بار بار استفسار پھر دنیا سے بے رغبتی، قیمتی سے قیمتی چیز دوسرے کو بہت آسانی سے دے دینا، اوراس کا شوق پورا کردینا ان کا بڑا وصف تھا، راقم کی والدہ سے انہیں بڑا انس وتعلق تھا، اوران کے قریب رہنا پسند کرتی تھیں، عشاء بعد جلد ہی سونے کا معمول تھا اور عشاء بعد گفتگو بہت ناپسند کرتیں، مرحومہ کو برسہا برس سے جسمانی کمزوری اور ضعف کی بعض دیگر بیماریاں تھیں، ان کو اس کے دورے بھی پڑتے تھے جس سے قلبی تکلیف ہوجاتی تھی، آخر میں پیر کی ہڈی ٹوٹنے سے معذوری اور بڑھ گئی تھی اوروہی وفات کا سبب بنی، اورانتقال کے وقت ایسا ظاہر ہوا کہ جیسے انہوں نے جنت میں اپنا ٹھکانہ دیکھ لیا ہے، اورنفس مطمئنہ کے ساتھ وہ رخصت ہوئیں، جنازہ میں غیر معمولی مجمع ہوا، اوراپنے عظیم المرتبت دادا حضرت شاہ ضیاء النبی حسنی کے قریب مدفون ہوئیں، مرحومہ کے نانا سید عبدالرزاق کلامی صاحب صمصام الاسلام (منظوم ترجمہ فتوح الشام واقدی) تھے جو حضرت سید احمد شہید کے بھانجہ سید حمید الدین کے پوتے تھے۔

دوسرا حادثہ وفات خاندان کا مگر بیرون ملک کا ہے جو ہمارے رشتہ کے ماموں وچچا سید احمد الحسنی مرحوم کا ہے جنہوں نے ۱۶/دسمبر ۱۹۸۹ء/۱۶/جمادی الاولی ۱۴۱۰ھ کو لاہور میں وفات پائی، وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بے تکلف ساتھیوں میں تھے، اورعربی زبان وادب کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی تعلیم حاصل کی، حضرت سید احمد شہید کا خاندان جب ان کی شہادت کے بعد سندھ سے

ٹونک آیا توان کے اجداد بھی وہیں مقیم ہوئے، وہ حضرت سید احمد شہید کے نواسہ سید محمد اسحاق جوان کے بڑے بھائی مولانا سید محمد اسحاق کے پوتے تھے، کے بیٹے سید محمد اسماعیل کے بیٹے تھے، سید محمد اسماعیل مرحوم کو راقم کے نانا مولانا سید عبدالحی حسنی سے بڑا تعلق اور خاندانی قرب تھا۔

مولانا سید احمد الحسنیؒ پاکستان منتقل ہوگئے تھے اوران کی صلاحیتوں سے حکومت پاکستان نے بھی فائدہ اٹھایا، وزارت خارجہ سے منسلک ہونے کی وجہ سے انہیں ماہر ترجمانی کا موقع بھی ملا اور جب شاہ فیصل پاکستان آئے تھے توان کے اور صدر ایوب خان کے درمیان ترجمانی کی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے انہیں بڑا تعلق تھا اور ہم لوگوں کو بھی ان کی شفقت حاصل تھی، ۱۹۱۷ء ان کا سن پیدائش ہے۔

گزشتہ ماہ نومبر برادر عزیز مولوی سید محمد الحسنی بن مولانا ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی حسنی کی تقریب نکاح کی مناسبت سے شرکت کی دعوت بھی ان کو دی گئی کہ شاید یہ ویزہ کے حصول کا سبب بن جائے مگر یہ مقدر نہ تھا، رحمہما اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

چند دیگر وفیات

ان دو خاندانی حادثہ وفات کے بعد جن چند ملی حادثوں وصدمات سے گزرنا پڑا، ان میں ایک حادثہ وفات مولانا افضل حسین قیم جماعت اسلامی کا ہے جنہوں نے ۲؍جنوری ۱۹۹۰ء کو وفات پائی، وہ ۱۹۷۲ء سے جماعت اسلامی ہند کے قیم تھے، اوران کی اہم تصنیفات بھی ہیں جوان کے لئے صدقۂ جاریہ ہیں۔

دوسرا حادثہ مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی کا ہے جو دوشنبہ ۸؍رجب ۱۴۱۰ھ / ۵؍فروری ۱۹۹۰ء کو لکھنؤ میں پیش آیا، مفتی صاحب کا اہم کارنامہ فتاویٰ فرنگی محل کی ترتیب ہے، ان کا تعارف ایک ممتاز صحافی، بلند پایہ عالم، اور مجاہد آزادی کی حیثیت سے تھا، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ دینیات سے وابستہ رہے، پھر اردو اکاڈمی اترپردیش کے صدر بھی ہوئے اور وہ علمائے فرنگی محل کی یادگار رہے۔

تیسرا حادثہ ہمارے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک خوردسال مگر باکمال عالم دین مصنف ومحقق مولوی محمد منصور نعمان ندوی رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ کا ہے جنھوں نے جمعہ کی نماز میں سجدہ کی حالت میں ماہ فروری ۱۹۹۰ء کے تیسرے ہفتہ میں بھوپال میں وفات پائی جوان کے علمی خاندان کے افراد کے لیے خاص طور پر ان کے والد مولانا محمد نعمان خاں ندوی (برادر مولانا محمد عمران خاں ندوی) کے لیے اہم سانحہ تھا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں شعبہ تجوید وقراءت کا افتتاح

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنی دیگر تمام علمی سرگرمیوں کے ساتھ اس سال بنام خدا قراءت سبعہ وعشرہ کا بھی نظم کیا، اس کا ایک مظاہرہ ۲۶رفروری ۱۹۹۰ء کو بعد نماز مغرب معہد القرآن الکریم کے ہال میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کی صدارت میں ہوا، اوران کی مفصل تقریر بھی ہوئی، حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی ناظم جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ ورکن انتظامی ندوۃ العلماء، عالم جلیل مولانا محمد یونس جون پوری شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارن پور بھی تشریف فرماتھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی صد سالہ پیدائش کی تقریبات

تقسیم ہند کے بعد حکومت ہند میں مولانا ابوالکلام آزاد کی مضبوط نمائندگی تھی اوروہ ملک کے وزیر تعلیم بنے، ان کے یوم ولادت اور یوم وفات دونوں کو حکومتی سطح پر اہمیت دی جاتی ہے، مولانا آزاد میموریل اکاڈمی لکھنؤ کے زیر اہتمام ایک اہم پروگرام صد سالہ جشن کے طور پر ۴رمارچ ۱۹۹۰ء کو گنا سنستھان آڈیٹوریم میں ہوا جس میں حکومتی سطح پر بھی اچھی نمائندگی تھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے خطاب میں انھیں ایک ہشت پہل ہیرا سے تعبیر کیا کہ جن کے ایک ایک پہلو پر کتاب نہیں، کتابوں کا سلسلہ بلکہ کتب خانہ تیار ہوسکتا ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خطاب میں یہ بھی واضح کیا کہ: ''میں ان سے

بار بار ملا ہوں اور ان سے استفادہ کا موقع بھی ملا ہے، ان کا حضرت سید احمد شہید کے خاندان سے عقیدت کا، اور ندوۃ العلماء سے مسلک کا، اور ذہن وفکر کا بڑا تعلق تھا، انہوں نے اپنی جوانی کی ایک مدت دار العلوم ندوۃ العلماء کے ماحول میں گزاری ہے، علامہ شبلی نعمانی سے ان کا رشتہ ایک مستفید کا اور مولانا کا رشتہ ان سے ایک قدر دان کا تھا، ادارہ دار المصنفین، اس کے رفقاء اور خاص طور پر مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی (اعظمی) اور مولانا مسعود علی ندوی سے ان کے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات تھے"۔

دہلی میں پیامِ انسانیت کا ایک اہم جلسہ

۱۷ر مارچ ۱۹۹۰ء کو دہلی میں پیامِ انسانیت کا ایک جلسہ منعقد ہوا، مجمع کوئی بہت زیادہ نہیں تھا مگر جو تھا وہ ملک کا عطر و دماغ تھا، صدارت سابق گورنر اڑیسہ شمبھوناتھ پانڈے کی تھی اور ہائی کورٹ کے چار جج صاحبان شریک جلسہ تھے، جلسہ کی کارروائی کمیونسٹ لیڈر چندر پال ترپاٹھی نے چلائی، مہاتما گاندھی (گاندھی جی) کے پوتے رام چندر گاندھی بھی شریک تھے، کئی صوبوں کے سابق وزرائے اعلیٰ بھی شریک ہوئے، کلیدی اور رہنما خطاب داعی اجلاس حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا تھا جنھیں ہر مقرر خراج عقیدت پیش کر رہا تھا اور ان کی ہی تقریر کو بنیاد بنا کر سب مقرر اپنی بات کہہ رہے تھے، اس کا بنیادی موضوع تھا کہ انسانیت مردہ ہو چکی ہے، اس کو بیدار کیا جائے، خال خال افراد جو ہر قوم میں رہتے ہیں اور اس قوم میں بھی ہیں، ان کا فرض ہے کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں اور نفرت کی آگ بجھائیں اور مظلوم انسانوں کی جان و مال کی حفاظت کا تہیہ کریں۔

مسلمان قائدین و سیاسی رہنماؤں میں جناب عبدالرحمٰن انتولے سابق وزیر اعلیٰ مہاراشٹر، سی۔ کے جعفر شریف بنگلور، وزیر داخلہ حکومت ہند مفتی محمد سعید بھی شریک تھے اور ان کے بھی خطاب ہوئے۔

جلسہ بہت کامیاب اور اپنی نوعیت کا منفرد تھا مگر اخبارات نے اس کو ایک دوسرے رُخ سے پیش کیا کہ جیسے جلسہ حکومت نے بلایا ہو، جس سے آزاد صحافت کا تجربہ

خراب سامنے آیا۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا یہ خطاب کانسٹیٹیوشن ہال وٹھل بھائی پٹیل بھون نئی دہلی میں ۱۷/مارچ ۱۹۹۰ء کو ہوا جس کا عنوان تھا: ہندوستان تاریخ کے ایک نازک موڑ اور فیصلہ کن دوراہے پر کھڑا ہے اور آج ملک کے ضمیر کو جھنجھوڑنے، اس کی روح کو چیخ کر پکارنے اور انسانی شرم وحیا، انسانیت دوستی اور خوف خدا کے آخری رمق سے کام لینے کی ضرورت ہے، جلسہ میں ممتاز قانون داں، دانشور، سیاسی، سماجی، مذہبی جماعتوں کے ممتاز رہنما حضرات بھی تھے، جن میں لیفٹیننٹ جنرل جے. ایس. اروڑا بابا اور سا سنگھ جی مہاراج خالصہ، گورنر بہار جناب یونس سلیم قابل ذکر ہیں۔

اردو اکاڈمی اتر پردیش کے زیر اہتمام مولانا عبدالماجد دریابادی پر سیمینار

۱۹/مارچ ۱۹۹۰ء لکھنؤ میں ایک اہم سیمینار مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت وخدمات پر اردو اکاڈمی اتر پردیش نے لکھنؤ میں منعقد کیا جس کے چیئرمین ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی تھے۔ جلسہ کی اہمیت اس سے بھی بڑھی کی صوبہ کے گورنر شریک تھے اور وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ، وزیر محنت اعظم خاں وغیرہ کے علاوہ ملک کے تمام اہل قلم، مصنف، محقق، صحافی، دانشور، اور اساتذہ نے بھی اپنے قیمتی وقیع مقالات کے ساتھ شرکت کی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنے دہلی کے پروگرام کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے، ان کا خطبہ صدارت مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے پڑھ کر سنایا، مولانا دریابادی کا صحافت کے علاوہ اہم اور بڑا کام تفسیر کا ہے اور وہ بھی انگریزی تفسیر کا جس کا اعتراف ملک وبیرون ملک میں ہے، یہ خبر بھی آئی ہے کہ مراکش کی لجنة التنسيق العربی جو عرب لیگ کی شاخ ہے، اس نے اس عصر کی تمام انگریزی تفسیروں کا جائزہ لینے کے بعد تفسیر ماجدی کو دعوتی مقصد کے لیے پچاس ہزار چھاپ کر مفت تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے، افسوس کہ اس سیمینار میں مولانا دریابادی کے برادرزادہ وجانشین حکیم عبدالقوی دریابادی بھی اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے، یہ سیمینار دو روز ۱۹، ۲۰/مارچ ۱۹۹۰ء چلا۔

پروفیسر مشیر الحق ندوی کی شہادت

مشیر الحق ندوی بحری آبادی وائس چانسلر کشمیر یونی ورسٹی کو دشمنوں نے کشمیر میں پہلے اغوا کیا پھران کو ہزار کوشش کے بعد بھی نہیں چھوڑا اور شہید کر دیا، یہ واقعہ ۱۳ر رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ/ ۱۰راپریل ۱۹۹۰ء کا ہے۔

مشیر صاحب کا تعلق ندوہ سے بہت قدیم اور استفادہ کا تھا، پھر وہ جامعہ ملیہ نئی دہلی چلے گئے، اور تعلیم کے آگے کے مراحل طے کرنے کناڈا میں میک گل میں جا کر تقابل ادیان میں ریسرچ کیا، پھر اور ترقی کی یہاں تک کہ پٹیالہ یونی ورسٹی پنجاب میں استاد اور پھر جامعہ ملیہ نئی دہلی میں پروفیسر اور کشمیر یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے، ان کا سانحۂ وفات علمی حلقوں میں اور دانش گاہوں میں بہت محسوس کیا گیا۔

پیام انسانیت کا بنگلور میں ایک جلسہ

ملک کی جو صورت حال ہے اور ظلم وسفا کی کا بازار گرم ہے، جو حکومت کے کنٹرول سے باہر نظر آرہا ہے، ملک کے دانشوروں، سیاسی، سماجی، مذہبی لوگوں کو جھنجھوڑنے کی ضرورت کے پیش نظر پیام انسانیت ملک کے مختلف حصوں میں جلسوں، ڈائیلاگ اور پروگراموں کی ضرورت کا احساس دلانے کے لئے پروگرام منعقد کئے جارہے ہیں، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مارچ میں دہلی میں اس کا ایک اہم پروگرام کیا اور اب بنگلور میں اس کا اہم پروگرام منعقد کر لیا جو ۱۲ر جون ۱۹۹۰ء کی شام پریسیڈنسی ہال میں ہوا، حضرت مولانا کے اس میں اہم معاون مولانا عبد الکریم پاریکھ اور بنگلور میں اہم اور سرکردہ شخصیت وصحافی میر مقصود علی خان مدیر اعلیٰ روزنامہ سالار بنگلور نے حصہ لیا اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اردو تقریر کا انگریزی ترجمہ میر مقصود علی خاں نے کیا۔ اس میں حضرت مولانا نے توجہ دلائی تھی کہ آگ کو جب کوئی غذا نہیں ملتی تو خود کو کھانے لگتی ہے، اور مزید آگاہ کیا کہ تشدد کا رجحان جو اس ملک میں فرقہ وارانہ ومذہبی بنیاد پر پیدا ہو گیا ہے، یہ کسی حد پر جا کر رکنے والا نہیں، یہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا، اور طبقوں، برادریوں، ذاتوں، اور پڑوسیوں

کو اپنا شکار بنائے گا اور یہ ملک کے لئے تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ہے، جلسہ میں برادران وطن بڑی تعداد میں اور دوسرے دانشور شریک تھے۔

پیام انسانیت کا لکھنؤ میں جلسہ

۲؍جولائی ۱۹۹۰ء کو ریاست اتر پردیش کی راجدھانی شہر لکھنؤ میں ''فوکس'' کے زیر اہتمام ایک نمائندہ فرقہ واریت مخالف کنونشن ہوا، جس میں ملک کے سیکولر مزاج دانشوروں، اور علماء کے علاوہ متعدد علمی وسیاسی، سماجی، اور مذہبی شخصیتوں نے شرکت کی، اس موقع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے کلیدی ورہنما خطاب میں آگاہ کیا کہ غلطی کو غلطی نہ تسلیم کرنا خطرناک بات ہے، انہوں نے فرمایا غلطی کسی سے نہیں ہوتی، لیکن جو چیز خطرناک ہے، وہ یہ کہ غلطی کو غلطی مانا نہ جائے۔

انہوں نے کہا کہ میں پیام انسانیت کا کریڈٹ خود اپنے سر نہیں لیتا، اس کا سہرا میرے سر بندھا ہوا نہیں ہے، میری صلاحیتیں، میرا تجربہ، میرے مشاغل، میرا ذوق اور میری صحت کوئی چیز بھی اس کی متحمل نہیں تھی لیکن دل میں ایک چٹک تھی جس نے مجھے اس پر آمادہ کیا، اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری یہ نحیف آواز اتنے بڑے لوگوں کو اور ایسے پڑھے لکھے اشخاص کو جمع کرے گی، یہ اس ملک کی صلاحیت اور زندہ دلی کی دلیل ہے۔

چند اہل تعلق کا سانحۂ وفات

۲۹؍جون ۱۹۹۰ء کو حکیم شرافت حسین رحیم آباد اور ۲؍جولائی ۱۹۹۰ء کو ان کے بلند اقبال صاحبزادے ڈاکٹر ارشد حسین نے وفات پائی۔ دونوں حادثۂ وفات قریبی تعلق وربط کی وجہ سے ہم اہل ندوۃ العلماء کے لئے بہت محسوس کئے جانے والے تھے کہ ان کا قیام بھی ندوۃ العلماء سے متصل محلہ مکارم نگر میں تھا، اور حکیم صاحب جمعہ کی نماز کے لئے مسجد دارالعلوم تشریف لاتے تھے، بچوں کے لئے دینی نصاب کی تیاری میں ان کا اہم کردار رہا ہے، جس میں ان کے یہ صاحبزادے بھی معاون تھے جو میرے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں رفیق درس

تھے، اوران کے لکھنؤ کے قیام میں ان کے ساتھ اور مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی (صاحبزادہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ) کے ساتھ عصر بعد بیٹھک ہوا کرتی تھی جس میں مختلف موضوعات زیر تذکرہ آتے جو دینی، ادبی، صحافتی، ملی، سیاسی بھی ہوا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان دونوں کی مغفرت فرمائے، اور رفع درجات فرمائے، ایک حادثہ وفات ایک نوجوان ندوی فاضل مولوی ذکی الدین ندوی افریقی کا بھی پیش آیا جو ہماری مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ کے مخلص کارکن اور اس کے انگریزی شعبہ سے وابستہ تھے، طالب علمی کا پورا زمانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں گزارا اور نماز باجماعت کے بڑے پابند رہے، تکبیر اولیٰ کا بہت اہتمام تھا، افسوس کہ میڈیکل کالج لکھنؤ میں چندروز رہ کر ۹ر جولائی ۱۹۹۰ء کو بروز دوشنبہ وفات پائی، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ان کا تعلق ۱۹۵۷ء سے تھا، جب ان کا تعلیمی آغاز ہوا تھا۔

دینی تعلیمی کونسل کی عاملہ کی لکھنؤ میں میٹنگ اور کچھ اہم فیصلے

دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کی مجلس عاملہ اور عام اراکین کونسل کی ایک مشترکہ میٹنگ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں ہوئی، جس میں سید حامد سابق وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، میر مقصود علی خاں کنوینر دینی تعلیمی کونسل کرناٹک، سید جمیل الدین صاحب کنوینر دینی تعلیمی کونسل آندھرا پردیش وغیرہ نے بھی شرکت کی، ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی سکریٹری دینی تعلیمی کونسل نے رپورٹ پیش کی۔ صدر دینی تعلیمی کونسل حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مختصر طور پر اپنا یہ پیغام دیا کہ مسائل کے باوجود مسلمانوں کو دینی تعلیمی کونسل کی تحریک کو گاؤں گاؤں پھیلانے کا فریضہ انجام دینا چاہئے۔ مولانا نے حکومت کی بے توجہی کو افسوس کے ساتھ محسوس کرتے ہوئے کہا کہ حکومتیں عوام کی اجتماعیت اور اپنے مسائل پر فکری ہم آہنگی اور ایک مضبوط نقطۂ نظر اور اس کے بے خوف اظہار کی زبان سمجھتی ہیں، جس کا اظہار اس سے پہلے مسلم پرسنل لاء کے سلسلہ میں ہو چکا ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ خود اتحاد واتفاق سے دینی تعلیمی تحریک کو مضبوط بنیادوں پر قائم کریں اور یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ ہر رکاوٹ کے باوجود اپنی تہذیب، اپنی شریعت اور اپنے دین کو باقی رکھیں گے۔

عالم عربی کا تازہ المیہ

عالم عربی میں البعث العربی نامی جماعت عیسائی اور قومیت نواز عربوں کی ایک جماعت ہے جس کی تشکیل ایک شامی عیسائی پروفیسر مسٹر میشیل عفلق نے چار دہائی قبل شام میں کی تھی، اس جماعت کو ان عربوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی جو سیاست میں اسلامی تصورات کو اثر انداز ہوتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے، نوجوان عربوں پر عربی نسل و زبان کے تعلق سے عربی قومیت کے اس نعرہ نے بڑا اثر ڈالا، اور اس جماعت کو حامیوں کی ایک تعداد مل گئی، ان میں جو پڑھے لکھے تھے انہوں نے تو اس کو اسلام کی طاقت کو کمزور کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اختیار کیا، وہ یا تو عیسائی عرب تھے، یا ملحد کمیونسٹ مسلمان، اور عرب عوام کو عربی زبان و نسل کا نعرہ پسند آیا، اور وہ حقیقت سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے اس کے حامی ہوئی، اس تحریک نے فوج اور تعلیم کے حلقوں پر زیادہ توجہ دی، چنانچہ جلدی وہ وقت آگیا کہ فوجی طاقت کے بل پر شام میں بعثی حکومت قائم ہوئی، جس کے سربراہ دروزی مذہب کے معتقدین اور ان کے تحت فوج میں بھی اسی مذہب کے ماننے والوں کی اکثریت ہوگئی، جو بعث عربی جماعت سے منسلک ہیں، اس بعثی حکومت نے اہل دین کے ساتھ بہت ظلم کیا، اور اس کے نتیجہ میں بے شمار اہل دین و علم شام چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں پناہ گزیں ہوئے، پھر مزید یہ ہوا کہ بعث عربی کے سربراہ پروفیسر میشیل عفلق عراق پہونچ گئے، اور وہاں کی فوجی حکومت کے فکری نظریاتی سرپرست بن گئے۔

عراقی صدر صدام حسین نے ان کو عزت کے مقام پر بٹھایا اور اپنا نظام حکومت ان کے نظریہ کے تابع کر دیا، اس کے نتیجہ میں عراق کے علماء اور اہل علم پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹنے لگے، معتبر معلومات کی رو سے وہ ایک سخت گیر عربی فوجی مزاج کے فوجی قائد تھے، انہوں نے اپنے سے اختلاف کرنے والوں کو کبھی برداشت نہیں کیا، عراق کے شمالی حصہ میں کرد مسلمانوں کے مطالبہ کو انہوں نے اس طرح فوجی طاقت سے دبا دیا کہ اس سے دشمن کو بھی کم دبایا جاتا ہے، ان میں سے بے شمار کیمیائی گیس کے بموں کا شکار ہوئے، ایران

سے جنگ صدر صدام حسین نے مذہب یا سنی عقیدہ کی بنیاد پر نہیں لڑی، بلکہ فوجی نظریہ کی بنیاد پر لڑی اور جب کسی نے مذہبی نظریہ کی بات کی تو اس کو خاموش کر دیا، انہوں نے شط العرب کی ملکیت کو ایران سے اپنے اختلاف اور لڑائی کی وجہ قرار دیا، اور ایرانی حکمرانوں پر عرب دشمن مجوسی صفت ہونے کا الزام لگایا، پھر عراق ایران جنگ کے طویل ہو جانے پر اور ایران کے اسلامی نعرہ کے اثر انداز ہونے کے معاملہ میں انہوں نے بحیثیت عرب ہونے کے اپنے کو محافظ اسلام قرار دیا، اور سالانہ اسلامی کانفرنس کرنا شروع کی، جس میں مختلف ملکوں کے علماء کو بلانے اور اپنے حامی اسلام ہونے کا اظہار کرتے، اپنی وزارت اوقاف کو بھی چست بنایا، اس درمیان میں بعثی قائد میشیل عفلق کا انتقال ہو گیا، اس کے بارے میں یہ اعلان ہوا کہ وہ انتقال سے قبل مسلمان ہو گیا تھا۔

ایران عراق جنگ کے آخری سالوں میں لوگوں کے ذہنوں میں صدام حسین کا خراب تصور بدلنے لگا تھا کہ اچانک انہوں نے کویت کو دھمکی دینا شروع کر دی، اور پھر عرب اور مسلمان ملکوں کے منع کرنے کے باوجود ۲؍ اگست ۱۹۹۰ء کو کویت پر حملہ کر دیا اور فوجی طاقت سے اس پر قبضہ کر لیا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس جنگ میں جس میں دو لاکھ عراقیوں کی بھی جان گئی، اور نہ معلوم کتنا جانی و مالی نقصان ہوا، کویت پر قبضہ کر لینے کے بعد محض ایران دشمنی کم کرنے کے لئے وہ سارا اختلافی علاقہ ایران کو دے دیا، اور ایران سے دوستی کی خواہش ظاہر کی، اور مصلحت کا تقاضا اب اس میں سمجھا کہ ایران کو اب دوست اور پڑوسی قرار دیں، زمین کا وہ حصہ جس کی حفاظت کے لئے ان کے کہنے سے دو لاکھ عراقیوں نے جان دی، اور لاکھوں عراقی معذور و بیمار ہو گئے، انہوں نے ان حکمرانوں کو جن کو وہ عرب دشمن اور مجوسی صفت کہتے تھے، بہ آسانی دے دیا، اور ایک عرب ملک کو جو مستقل اور آزاد تھا، طاقت کے زور سے لے لیا، اور اس کی وجہ سے عربوں کے مابین جو صورت پیدا ہوئی اور پورا عرب منطقہ اور مرکز اسلام جن غیر معمولی خطرات میں گھر گیا، اس کی وہ پرواہ نہیں کر رہے، اور کویت کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، سمجھ میں آنے والی بات نہیں، سوائے اس کے کہ ایران سے اختلاف والا علاقہ بہت چھوٹا اور کم فائدہ کا تھا، اور یہ علاقہ بڑا مالا مال، اور نسبتاً وسیع ہے، یہ کون سا انصاف ہے۔

یہ اقدام عالم عربی کے لیے بڑے خطرہ کے طور پر سامنے آیا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اوران کے رفقاء نے ضروری سمجھا کہ پورے عالم اسلام خصوصاً عالم عربی کواس خطرہ سے آگاہ کریں اوراس کے حقائق ومضمرات سامنے لائیں، اور جواس کے نتائج سامنے آسکتے ہیں، ان سے باخبر کریں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں ''کاروان زندگی، جلد چہارم)

رائے بریلی میں حمد ومناجات کے موضوع پر عالمی سیمینار

۱۶، ۱۷، ۱۸ر ربیع الاول ۱۴۱۱ھ مطابق ۷، ۸، ۹ر اکتوبر ۱۹۹۰ء کو رابطۂ ادب اسلامی (عالمی) کے شعبہ برصغیر وممالک مرقیہ نے حمد ومناجات کے موضوع پر رائے بریلی میں مذاکرۂ علمی (سیمینار) طے کیا، اور بلاد عربیہ کی اہم شخصیات کو بھی اس میں مدعو کیا اوران میں بعض ممتاز شخصیات نے شرکت کا وعدہ بھی کرلیا، اوران کی شرکت سے یہ سیمینار عالمی سیمینار کی طرح ہوگیا، ان شخصیات میں خاص طور پر شیخ احمد محمد جمال مکہ مکرمہ، شیخ ضیاء الدین صابونی شاعر طیبہ (مدینہ منورہ) کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلہ میں جودعوت نامہ ارسال کیا گیا وہ حسب ذیل تھا جو بحیثیت سکریٹری رابطۂ ادب اسلامی کاتب تحریر کی طرف سے تھا۔

''جب شکستہ دلی اور بے قراری دل کو مضطرب کررہی ہو، اورانسان اپنی اس بے قراری کو دوسروں کے سامنے رکھنا چاہتا ہو، یا اپنے قلبی اضطراب کو سکون پہونچانے کے لئے اظہار کرنا چاہتا ہو، تو عموماً الفاظ ساتھ نہیں دیتے، اس مجبوری میں عموماً آدمی کو آنسوؤں کا سہارا لینا پڑتا ہے، لیکن اس بے اختیارانہ کیفیت میں جو الفاظ بھی ساتھ دے رہے ہوں وہ جذبات وکیفیات کا آئینہ بنتے ہیں، اور یہ وہ انداز کلام ہوتا ہے جو عام عبارت میں ادب کی طاقت بھر دیتا ہے، اور شاعری میں ہو تو شاعری کو چمکا دیتا ہے۔

انسان کی تاریخ میں اس طاقت وکیفیت کی عبارتیں روز اول سے پائی گئی ہیں، خاص طور پر تاریخ کے اولین موقعوں پر انسان اپنے خدا کے حضور اپنی پریشانیوں اور بے چینیوں کے ساتھ دعا ومناجات کرتا رہا ہے، اس نے یہ مناجاتیں معابد میں جاکر یا اپنی جگہوں پر ہی اپنی خلوتوں میں اور بعض بعض وقت اپنی جلوتوں میں بھی پیش کی ہیں، ہم کو

انبیاء علیہم السلام اور سابقہ امتوں کے صالح افراد کی بے قراری، آہ وزاری کے واقعات کے متعدد نمونے قرآن مجید میں ملتے ہیں، پھر حضور پُر نور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں جوان کیفیتوں سے پُر تھیں، ملتے ہیں، شاعرانہ صلاحیت رکھنے والے حضرات اس طرح کی کیفیتوں کے حامل مضامین کو شعری طریقہ سے ادا کرتے رہے ہیں، جو ادبی و شعری طاقت کے حامل شہ پاروں میں شمار کرنے کے قابل ہیں، اور حمد ومناجات کے ناموں سے موسوم کئے جاتے ہیں، اگر ایسے شہ پاروں کا جائزہ لیا جائے تو ان کے بڑے اچھے اور بے تاب دلوں کے عکاس نمونے ملیں گے۔

مولانا سید محمد ثانی حسنی میموریل سوسائٹی رائے بریلی کی دعوت وتعاون سے رابطۂ ادب اسلامی نے آئندہ مذاکرۂ علمی کے لئے اسی موضوع کو اختیار کیا ہے۔ مولانا محمد ثانی حسنی جن کے نام سے یہ سوسائٹی موسوم ہے خود بھی مناجات ودعا کی شاعری سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے، اور اس صنف میں ان کے مؤثر نمونے بھی ہیں، اور رائے بریلی جو مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا وطن اور دینی وعلمی شخصیتوں کی جگہ ہے، مناجات کی شاعری کی کئی شخصیتوں کا مقام رہا ہے، اس لئے بھی اس موضوع کے لئے وہاں مذاکرہ کے انعقاد کی دعوت کو قبول کرنا مناسب سمجھا گیا، امید ہے کہ وہاں اس موقع پر اس صنف سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اپنی تحقیقات وتخلیقات پیش کرسکیں گے۔ جلسہ کی صدارت رابطۂ ادب اسلامی کے صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کریں گے۔

ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ اس موقع کے لئے تحقیقی مقالہ کے ساتھ شرکت فرما کر مشکور فرمائیں گے۔

مذاکرۂ علمی بتاریخ ۱۶، ۱۷، ۱۸ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ مطابق ۷، ۸، ۹ اکتوبر ۱۹۹۰ء بمقام رائے بریلی منعقد ہوگا، قیام وطعام کا انتظام داعیوں کی طرف سے ہوگا۔ موضوع کے بنیادی عنوانات کے کسی ذیلی عنوان کو اختیار کیا جاسکتا ہے:

۱۔ حمد ومناجات کا تاریخی جائزہ۔

۲۔ حمد ومناجات کا ادبی جائزہ اور اس کے عناصر خاصہ۔

۳۔حمد و مناجات کے اہم شعراء۔
۴۔حمد و مناجات کے اہم نمونے۔
۵۔اردو حمد گوئی کا تقابل غیر اردو حمد گوئی کے ساتھ۔

سیمینار اپنے وقت پر کامیابی اور مؤثر انداز سے انجام پایا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جو سیمینار کی صدارت فرما رہے تھے، نے درد وکسک میں ڈوبی ہوئی آواز ولہجہ میں خطبہ پیش کیا اور حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سفر طائف وعرفات کی دعا کے الفاظ سنائے تو مجمع پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے مقام ومحل کی مناسبت سے حضرت سید احمد شہید، انکی تحریک اصلاح ودعوت اور ان کے خاندان کے افراد کے نمونے۔ایک تاریخی وادبی جائزہ مؤثر انداز میں پیش کیا، جو خاصے کی چیز تھی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا خطبۂ صدارت تعمیر حیات شمارہ ۲۵/اکتوبر ۱۹۹۰ء، ص ۵، ۶، بقیہ ۱۴ پر حمد و مناجات اور ان کی دینی وادبی قدر وقیمت کے عنوان سے ملاحظہ ہو۔

سکریٹری رپورٹ

سکریٹری رپورٹ میں جو کاتب تحریر کی طرف سے تھی، بعد حمد وصلوٰۃ کے عرض کیا گیا کہ:

"حمد و مناجات ودعا ایسے موضوعات ہیں جو دینی جذبات کے عکاس اور پروردگار عالم کے دربار میں پیش کرنے کے لئے اس کے بندوں کے اظہار عبدیت کا ذریعہ ہیں۔ان کی تاریخ اتنی پرانی ہے جتنی کہ انسان کی، یہ جذبات مدح واعتراف عظمت کی صورت میں ہو تو حمد بن جاتے ہیں، اور ان میں محبت ووارفتگی کا ظہور ہو تو مناجات کی شکل میں نمایاں ہوتے ہیں، ان میں طلب وسوال کی بے چینی ہو تو دعا بن جاتے ہیں، ان سب پہلوؤں میں جو بات قدر مشترک ہے، وہ ہے بندہ کا اپنے مالک وپروردگار سے ربط وتعلق، اس کے بندوں میں نبیوں، ولیوں کے یہاں، شاعروں اور ادب کے ماہروں کے یہاں، جاہلوں اور عامیوں کے

یہاں، سب جگہ یہ صنف کلام ملتی ہے اور وجدان وانفعال کے ادبی رنگ کی حامل ہوتی ہے، لیکن چوں کہ اس کا موضوع مذہبی چھاپ رکھتا ہے، اس لئے عموماً اہل ادب اپنے سرمایۂ فکر وفن میں اس کو شامل نہیں کرتے، اہل ادب کا یہ رویہ عموماً ہر اس کلام کے ساتھ ہوتا ہے جس کو ادب کی نیت وارادہ سے ادا نہ کیا گیا ہو، اس طرح ادب کے بہت سے لعل وگہر جو ادب کا لیبل نہیں رکھتے ہیں، ادبی دائرہ میں نمایاں کئے جانے سے رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ ادب وہ بھی ہے جو ادب کی نیت وارادہ سے کیا جائے، اور وہ بھی ہے جو ادب کی نیت وارادہ سے نہ کیا جائے۔ لیکن وہ زبان وبیان کے آداب پورے کرتا ہو، اور اگر اس میں وجدان وانفعال بھی کارفرما ہو تو اس کو ادب کے شہ پاروں میں شمار نہ کرنا زیادتی ہے۔

حمد ومناجات ودعا میں ادب کے رنگ کے خاصے نمونے ملتے ہیں، یہ ایک روح پرور کلام ہے، اور کم انسان ایسے ہوں گے جن کو ان میں سے کسی ایک سے واسطہ نہ پڑا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے اپنے محبوب بندوں اور نبیوں کو حمد ومناجات ودعا کی توفیق دی، انہوں نے خوب حمد ومناجاتیں کیں، قرآن مجید میں حمد ومناجاتوں اور دعاؤں کے مضمون کو بلیغ انداز اور مؤثر ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہے، ان سے جذبات وکیفیات کی تصویر الفاظ کے پیرایوں میں ابھرتی ملتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس طرح گویا اپنے بندوں کو تلقین بھی کی کہ اس سے کس طرح مخاطب ہوں، اس کی ایک مثال سورۃ البقرہ کی آیت الکرسی میں اور سورۂ حشر کے آخر کی آیات میں جامع اور مؤثر انداز کی حمد ہے، اور سورہ فاتحہ میں تو اس سلسلہ میں جامعیت وجمال وکمال کی بڑی مثال ہے، اور عبدیت والتجا کے ساتھ مناجات ودعا بھی ہے، قرآن مجید کے علاوہ حدیث شریف میں حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے بلیغ اور مؤثر کیفیت کے عکاس الفاظ میں حمد ودعا ومناجات کے نمونے جگہ جگہ ملتے ہیں۔ اور یہ سب نثر کا سرمایہ ہیں، شعراء نے ان سے بھی کسب فیض کیا، انہوں نے اپنے دلوں کی التجاء واحساس کو شعری قالبوں میں ڈھالا، اور متنوع اسلوب اختیار کئے، اس طرح حمد ومناجات کے نمونے سامنے آئے، اور ادب کی ایک ایسی صنف بن گئے، جس میں دلنوازی بھی ہے، اور احساس وشعور کے لئے اثر پذیری بھی ہے، وہ ایک طرف دل

کوکھولتے ہیں، اوردوسری طرف احساس وشعور میں تڑپ پیدا کرتے ہیں۔

ادب کے مؤرخین اورناقدین نے اس کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا، حالانکہ ادب کا یہ ایک شگفتہ اور وجدان وانفعال سے وابستہ کلام ہے، جو قابل قدر بھی ہے، اورقابل استفادہ بھی۔

ہماری انجمن رابطۂ ادب اسلامی نے جوادب اوراسلام کے ربط کوخصوصی طور پر واضح کرنے کی خدمت انجام دیتی ہے، ادب کی اس کیفیت واحساس کے حامل پہلوکواپنے اس مذاکرۂ علمی کا موضوع بنایاہے، اورآپ سب حضرات کواس کے لئے زحمت دی ہے۔

رابطۂ ادب اسلامی کی طرف سے یہ چھٹا سالانہ مذاکرۂ علمی ہے جورائے بریلی میں منعقد ہورہاہے، گزشتہ سال حیدرآباد میں انہی تاریخوں میں ''تحریک آزادی میں ادب اسلامی کا حصہ'' کے عنوان پر مذاکرۂ علمی منعقد کیا گیا تھا، اوراس سے قبل اورنگ آباد میں نعتیہ شاعری پراوراس سے پہلے لکھنؤ میں اورجے پور میں مذاکرۂ علمی منعقد ہوئے، یہ رابطہ ایک عالمی انجمن ہے، ممالک غیر میں بھی اس کے ذمہ دارحضرات مذاکرۂ علمی اورخدمت ادب اسلامی کے دیگر کاموں کی فکر کرتے ہیں، چنانچہ مصر، اردن، ترکی، سعودی عرب، بنگلہ دیش، اورجنوبی افریقہ میں بھی الحمدللہ ادب اسلامی پر مذاکرۂ علمی منعقد ہوئے۔

رابطۂ ادب اسلامی کے مرکزی دفتر لکھنؤ سے ادب اسلامی پر ماہانہ ایک عربی بلیٹین بھی نکلتاہے، متعدد کتابیں ادب اسلامی کے تعلق سے شائع کی گئیں۔

یہ مذاکرۂ علمی جوحمد ومناجات کے ادبی مطالعہ پر منعقد کیا جارہاہے، اس کے لئے ہم مولانا محمد ثانی حسنی ایجوکیشنل میموریل سوسائٹی کے شکرگزار ہیں کہ اس نے اس کی ضیافت قبول کی کہ رائے بریلی کواوراس کی اس سوسائٹی کواس موضوع سے خاص ربط ہے، اسی رائے بریلی میں حضرت سید احمد شہید کی تحریک دعوت وجہاد اٹھی اوراس سے ادب اسلامی کو بڑی مدد ملی، یہاں حمد ومناجات کے شعراء بھی ہوئے، جن میں صدر رابطہ ادب اسلامی کی والدہ صاحبہ (مخدومہ سیدہ خیرالنساء بہتر رحمہا اللہ) نیز ان کے بعض اہل خاندان (ہمشیرہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم مرحومہ وبھانجہ مولانا محمد ثانی حسنی اور بہنوئی مولانا سید ابوالخیر برق)

خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس لیے اس شہر میں اور اس سوسائٹی کی ضیافت میں اس موضوع پر مذاکرۂ علمی کا منعقد ہونا ایک اچھی مثال ہے، ہم سوسائٹی کے اور رائے بریلی والوں کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس مذاکرۂ علمی سے خصوصی دلچسپی لی، اور ہم آپ سب کے بھی شکر گزار ہیں کہ آپ نے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے اس مذاکرۂ علمی میں شرکت کی۔ (تعمیر حیات، ص ۸، ۲۵ / اکتوبر ۱۹۹۰ء)

اہم مقالہ نگار حضرات میں شیخ عبدالقدوس ابوصالح (دعا و مناجات ادب عربی میں) استاد احمد محمد جمال، شیخ ضیاء الدین صابونی، ڈاکٹر عبدالحلیم عویس، ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی (بلاد عربیہ)، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقی ندوی، پروفیسر محمد راشد ندوی، پروفیسر احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر اجتباء ندوی، پروفیسر عبدالباری شبنم سبحانی، حسن عسکری طارق، چودھری مبارک عثمانی، پروفیسر عبدالوہاب، ڈاکٹر طفیل احمد مدنی، جناب انیس احمد چشتی، مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی، مولانا عبیداللہ کوکنی، مولانا آفتاب عالم ندوی، ڈاکٹر محمد اکرم ندوی وغیرہ (ہندوستان) اور پروفیسر وقار احمد رضوی (کراچی پاکستان) کے نام ہیں۔

بابری مسجد کا مسئلہ نئے موڑ پر

بابری مسجد کا جس وقت تالا کھولا گیا تھا اس وقت دونوں فریقوں کے درمیان باہمی برہمی نے جارحانہ شکل اختیار نہ کی تھی، اس وقت کسی بڑی تاخیر کے بغیر ٹھنڈے طریقوں سے آپسی تفہیم وافہام کا طریقہ اختیار کیا جاتا، تو شاید کسی درمیانی فارمولے پر دونوں فریق راضی ہو جاتے، اور اگر اس سے حل کی شکل نہ نکلتی تو عدالت کی وساطت کو بسر و چشم قبول کر لینے پر دونوں فریقوں کو مجبور کیا جاتا، مسلمانوں نے تو مان لیا تھا لیکن افسوس کہ جنم بھومی لیڈروں نے نہیں مانا۔

ہمارے خیال میں بابری مسجد کے سلسلہ میں افہام و تفہیم کا طریقہ زیادہ بہتر تھا، اور اس کا نتیجہ نہ نکلنے کی صورت میں عدالتی چارہ جوئی اور حکومت کو بار بار توجہ دہانی کا طریقہ تھا، اور اس کی کوشش ہمارے قائدین نے کی، اس کے ساتھ ملک کے مخلص اور سمجھدار

ہندو قائدین کو بھی یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ہندوستان نے اپنے لئے سیکولرزم کا جو اصول طے کیا، اوراس کے مطابق ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنی عبادت گاہوں کی حفاظت اور اپنے مذہبی معمولات کو ادا کرنے کی جو سہولت واجازت دے رکھی ہے اور ملک کا دستور اس کی تائید کرتا ہے، اس سب کو قائم رکھنے میں ان کو عوام کا ذہن بھی بنانا چاہئے، اور اس کے خلاف بولنے، کرنے والوں کو اس سے باز رکھنا چاہئے، اگر ایسا نہ کیا گیا تو نقصان کسی اور کا نہیں، ملک کا ہے، اور ملک کے باشندوں میں صرف کمزور نہیں طاقتور بھی نقصان اٹھائیں گے، اور دنیا میں ملک کی شہرت خراب اور نام کو نقصان پہونچے گا"۔(۱)

چند اہل علم واہل تعلق کی وفات

ادھر چند ماہ میں جن خاص اہل تعلق وممتاز اہل علم وبعض قائد شخصیات نے وفات پائی، ان میں سرفہرست نام مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند کا ہے، ان کے علاوہ مولانا محمد یوسف کوکنی، مولانا محمد عرفان خان ندوی بھوپالی کے اہم وقابل ذکر نام بھی ہیں۔

مولانا محمد یوسف کوکنی نے ماہ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ میں وفات پائی، وہ مدراس یونی ورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبۂ عربی رہے، اور امام ابن تیمیہ کو ریسرچ کا موضوع بنایا، اور ان کے اس مقالہ کی جو بعد میں کتابی شکل میں سامنے آیا، اچھی شہرت ہوئی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ سے بھی ان کی وابستگی رہی تھی اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔

مولانا محمد عرفان خاں ندوی بھوپالی، بھوپال کے اس ندوی خاندان کے اہم فرد تھے، جس کا ندوہ کی خدمت اور ترقی میں بڑا حصہ رہا ہے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا محمد عمران خاں ندوی دارالعلوم ندوہ کے مہتمم اور پھر دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کے بانی وامیر رہے۔ اور یہ ان کے خاص معاونوں میں تھے، ان کا انتقال بھی ماہ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ میں بھوپال میں ہوا جہاں ان کا قیام تھا۔

تیسرا اہم اور بڑا ملی حادثہ مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کی وفات کا ہے جو خال

---

(۱) اداریہ تعمیر حیات، ۱۵/نومبر ۱۹۹۰ء از راقم)۔

معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے زمانۂ طالب علمی میں ان کے معاصر رہے تھے اوران کی نسبت سے ہم پر شفقت فرماتے تھے، جماعت اسلامی کے قائدین میں تھے، اورطویل عرصہ امیر جماعت اسلامی رہے اوراپنی علمی خصوصیات، گونا گوں صفات وکمالات کے حامل بزرگ تھے۔ ۵/دسمبر ۱۹۹۰ء کوان کی وفات کا علم ہوا۔

ان کے علاوہ جن خاص اہل تعلق کی وفات کا صدمہ پہونچا ان میں ندوۃ العلماء کے کارکنوں میں ایک مردصالح ڈرائیور سید نصیر احمد صاحب کی وفات ہے جو۲/دسمبر ۱۹۹۰ء کو پیش آئی، ان کا تعلق بارہ بنکی کے ایک قصبہ سے تھا، وہ صف اول کا بڑا اہتمام رکھتے تھے۔ دوسرے خواجہ بہاء الدین اکرمی ندوی بھٹکلی مرحوم مصنف ”عرب ودیار ہند“ کا ہے جو ۱۹۲۸ء، ۱۹۳۰ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بغرض تعلیم رہے تھے اوران خوش نصیبوں میں تھے جنھوں نے میرے بڑے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ناظم ندوۃ العلماء سے ازخود حدیث کا درس لیا تھا اور مسلم شریف پڑھی تھی، اوران کے افادات کو بھی قلمبند کیا تھا، افسوس کہ وہ علمی اثاثہ محفوظ نہ رہ سکا، الحاج مولانا محی الدین منیری مرحوم ان کے خویش (داماد) ہیں، خواجہ اکرمی کا سانحۂ وفات ۷/دسمبر ۱۹۹۰ء کو بھٹکل میں پیش آیا۔

رائٹرس کانفرنس کے زیراہتمام پیام انسانیت کا اہم جلسہ

۲/دسمبر ۱۹۹۰ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں ہندو مسلم ادیبوں، شاعروں اوردانشوروں کے نمائندہ جلسے میں جورائٹرس کانفرنس کے زیراہتمام ہوا تھا، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کا خطبۂ صدارت پیش کیا گیا جس میں انہوں نے باورکرایا کہ کسی بھی سماج کے لئے سب سے بڑا خطرہ خواہ وہ دنیا کا قدیم سماج ہو یا جدید سماج ہو، یہ ہے کہ اس کے اندر ظلم کا مزاج پیدا ہوجائے، پھراس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اس ظلم کو ناپسند کرنے والے اس معاشرہ میں انگلیوں پر بھی گنے نہ جاسکتے ہوں، دوربین تو دوربین خردبین سے بھی ان کو دیکھا نہ جاسکے۔ مزید انہوں نے کہا کہ میں مذاہب انسانی، تاریخ وفلسفہ

اوراخلاق کا ایک طالب علم ہونے کے ناتے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس ملک کے لئے سب سے بڑا خطرہ اور آپ کی پہلی توجہ کا مستحق ظلم وتشدد کا رجحان، انسانی جان ومال اورعزت وآبرو کی بے قیمتی ہے۔ جس کا ظہور فرقہ وارانہ فسادات، طبقاتی اونچ نیچ کی بنا پر پورے پورے خاندانوں اور محلوں کی صفائی، تھوڑے سے مالی فائدے کے لئے انسان کی جان لے لینا، سفاکانہ جرائم، اور مظالم کی کثرت اور سب کے آخر میں مطلوب ومتوقع جہیز نہ لانے پر نئی بیاہی دلہنوں کو جلا دینا یا زہر دے کر مار دینا اوران سے پیچھا چھڑانا ہے۔

اور پھر آگاہ کیا کہ خدا کے وجود کے بعد جس حقیقت پر تمام مذاہب، فرقوں اور مکاتب خیال کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ ظلم خواہ کسی سے سرزد ہو، بڑا گناہ (مہاپاپ) اور ملکوں اورقوموں کے حق میں سم قاتل ہے، اوراس کا نتیجہ دیر یا سویر نکل کر رہتا ہے، اوراس کی موجودگی میں کوئی ملک یا قوم (خواہ اس کے پاس کیسے ہی قدرتی وسائل، جنگی طاقت، عددی کثرت، شاندار تاریخ، اورعلم وادب اور فلسفے کے خزانے ہوں) پھل پھول نہیں سکتی۔

اور فرمایا: فرقہ پرستی، جارحیت اور تشدد کا کھلا رجحان ملک کو زمین دوز اور دھماکہ خیز سرنگوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتا ہے جو بالآخر ملک کو لے ڈوبے گا، گاندھی جی اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے کہ فرقہ وارانہ منافرت، تشدد، جارحیت پہلے ملک کی آبادی کے دو اہم عنصروں ہندو مسلم فرقوں کے درمیان اپنا کام کرے گی، پھر یہی ذیلی مذہبی اختلافات طبقات اور برادریوں کی صف آرائی اورنسلی، لسانی، صوبائی وعلاقائی تعصبات کی شکل میں ظاہر ہوگی، اور جب یہ کام بھی ختم ہوجائے گا تو وہ آگ کی طرح (جب اس کو جلانے کے لئے ایندھن نہ ملے تو اپنے کو کھانے لگتی ہے) ملک کو اور امن پسند شہریوں کو اپنا لقمہ بنالے گی اور یہ ملک تباہ ہوکر رہ جائے گا"۔ (تعمیر حیات، ص۵، ۶، شمارہ ۲۵ر دسمبر ۱۹۹۰ء)

خطبۂ استقبالیہ ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی کا تھا، اہم شرکاء میں جناب شری پورنانند، جناب علی سردار جعفری، ڈاکٹر کلب صادق، پروفیسر ہری کشن اوتھی، سردار کرم جیت سنگھ، مشہور اردو ادیب وناقد شمس الرحمٰن فاروقی صاحب، جناب ودیا ساگر وغیرہ تھے۔

علماءِ ترکستان کی ندوۃ العلماء آمد

دہلی مرکز دعوت وتبلیغ نظام الدین سے اطلاع آئی تھی کہ ترکستان کے علماء کا ایک وفد آیا ہے، وہ لکھنؤ بھی آئے تا کہ ندوۃ العلماء دیکھے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ملاقات کرے، وفد جب آیا تو حضرت مولانا اپنے وطن دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں تشریف فرما تھے، ان کو اطلاع دی گئی تو وہ ندوۃ العلماء تشریف لائے اور ان مہمانوں کی تکریم میں ایک جلسہ عباسیہ ہال میں ہوا، اور ان کو مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی مطبوعات کا ایک انتخاب بھی پیش کیا گیا، معلوم ہوا اور جیسا کہ ان میں بعض نے بتایا بھی کہ انہوں نے اپنے ایمان وعقیدہ کو بچانے میں غیر معمولی مجاہدوں اور قربانیوں سے کام لیا، اور غاروں میں چھپ کر اپنے بچوں کو تعلیم دی، خاص طور سے ان حضرات نے حضرت مولانا کی کتاب قصص النبیین کا بھی تذکرہ کیا کہ اس سے توحید ورسالت وآخرت کو سمجھانا اور عربی سے واقف کرانا آسان ہوا، یہ حضرات ترکستان کے علاقوں ازبکستان، مرغینان، کرغستان، تاجکستان، نوکد، سراوان کے تھے، اور ان میں امام وخطیب بھی تھے، اور عربی زبان سے اچھے واقف علماء بھی، جن میں شیخ عبدالوالی بن محمد ولی أندجانی قابل ذکر ہیں، جواز بکستان کی جامع مسجد کے امام وخطیب تھے، انہوں نے قصص النبیین کا خاص طور پر ذکر کیا اور روائع اقبال سے بھی تاثر ظاہر کیا۔ یہ ۱۴، ۱۵/ دسمبر ۱۹۹۰ء کی بات ہے۔

افسوس اور فکر کی بات

ہندوستان دوبارہ تقریباً انہی حالات میں چلا گیا ہے جو تقسیم ہند کے فوراً بعد پیش آئے تھے، اور جن میں جذبات کی حکمرانی تھی اور عقل ودوراندیشی کو نظر انداز کر دیا گیا تھا، اور جن میں یہ احساس کارفرما تھا کہ مسلمانوں نے مسلمانوں کے نام پر جب برصغیر میں اپنا ایک علاحدہ ملک لے لیا ہے تو پھر ان کو دوسری جگہ عزت وسلامتی سے رہنے کا حق کیوں ہو؟ لیکن پھر بھی چند اہل عقل ایسے تھے جن کی دوراندیشی سے جذبات کی غلط روی کے روک تھام میں مدد ملی، اور بہ تدریج حالات کی گرمی اور خون آشامی کم ہوتی گئی، اور سلامتی کی فضاء واپس ہوئی، اور ملک صنعتی واقتصادی ترقی کرنے لگا، افسوس کہ چند سال سے اکثریتی طبقہ

کے ایک گروپ نے وہی پرانی سیاست دہرانی شروع کردی، اور ایسے مسائل چھیڑنا شروع کئے کہ جن سے مذہبی منافرت کا جنون بڑھنے لگا اور آگ بھڑکنے لگی جس سے ملک کے پارہ پارہ ہونے کا خطرہ ہے۔ (اداریہ تعمیر حیات، ۲۵ر دسمبر ۱۹۹۰ء از راقم الحروف)

مسلمان بچوں کے لیے ایک نادر تحفہ

حال میں یو.کے. اسلامک اکاڈمی برطانیہ نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی قصص النبیین کا انگریزی ایڈیشن اعلیٰ طباعت کے ساتھ شائع کیا، جو بچوں کی نفسیات اور ان کی ذہنی صلاحیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے آسان زبان اور دلچسپ انداز میں عربی میں مرتب کیا گیا تھا، یہ نبیوں کے قصے ایک طرف تو تاریخی حقائق ہیں، دوسری طرف نصیحت وعبرت اور موعظت کا بیش بہا خزانہ ہیں، ان سے صحیح عقائد کی طرف رہنمائی ملتی ہے، اخلاق اور سیرت وکردار کی تربیت ان کے ذریعہ کی جاسکتی ہے، نیز یہ قصے ذہنی وفکری صلاحیتوں کے نشو ونما کے لئے بھی مفید ہیں۔

کتاب کا اچھا استقبال سامنے آیا ہے اور برطانیہ کی کچھ تعلیم گاہوں میں داخل نصاب بھی کرلی گئی ہے۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ بھی مشہور محقق ومصنف ڈاکٹر حمید اللہ (پیرس) کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوچکا ہے۔

ہندوستان میں انگریزی ایڈیشن مجلس تحقیقات ونشریات اسلام نے ہی طبع کیا ہے، یہ انگلش میڈیم اسکولوں کے لئے جو بکثرت قائم ہورہے ہیں، بہت مفید ہے۔ (۱)

چند اہم وفیات

ادھر چند ماہ میں جن اہم دینی وعلمی اور ملی شخصیات کے سانحۂ وفات سے گزرنا ہوا ان میں سب سے اہم امیر شریعت بہار واڑیسہ وبانی جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا سانحۂ وفات ہے کہ ناظم امارت شرعیہ بہار مولانا سید نظام الدین نے بذریعہ فون اطلاع دی، بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری کے فرزند اصغر اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا سید منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ کا

---

(۱) ماخوذ از مضمون تعمیر حیات، ۲۵ر جنوری ۱۹۹۱ء، ص ۴، از راقم)

۱۹/مارچ ۱۹۹۱ء، ۳/رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ کو انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا سید منت اللہ رحمانی کی زندگی بڑی جہد مسلسل کی زندگی تھی جس سے انہوں نے دین وملت کو تقویت پہونچانے کا کام لیا، اور ایسے نقوش چھوڑے جو زندہ وتابندہ رہیں گے۔

دوسرا اہم سانحہ وفات مولانا محمد تقی امینی کا ہے جو ممتاز محقق وعالم دین تھے، ندوۃ العلماء نے جب ادارۂ تحقیقات شرعیہ قائم کیا تو اس کی ذمہ داری ان کے سپرد کی، اور اسکو انہوں نے اچھی طرح بنایا پھر وہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات سے وابستہ ہوگئے اور اس کے ناظم اور پھر صدر شعبۂ دینیات ہوئے اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی ہوئے، افسوس ۲۱/جنوری ۱۹۹۱ء کو انہوں نے وفات پائی۔ وہ مولانا افضل علی پھلواروی کے شاگرد تھے اور وہ مولانا حکیم سید عبدالحیٔ حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء کے شاگرد تھے۔

تیسرا سانحہ مولانا قاضی سجاد حسین دہلوی کا ہے جنہوں نے فارسی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جن میں دیوان حافظ شیرازی خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس کے علاوہ فتاویٰ تاتارخانیہ کی تحقیق وطباعت بھی ان کا کارنامہ ہے، وہ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن بھی تھے، ان کا انتقال ۲۴/دسمبر ۱۹۹۰ء میں ہوا۔

خلیج کی جنگ اور اس کے مضمرات ونتائج پر سیمینار

۳/مارچ ۱۹۹۱ء کو آل انڈیا مسلم انٹلکچول فورم کی دعوت پر ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی، اس کی صدارت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے فرمائی، مذاکرہ کا موضوع تھا ''خلیج کی جنگ: کیا کھویا کیا پایا؟'' مذاکرہ میں سرکاری یونی ورسٹیوں، اور عربی مدارس کے اساتذہ، علمی وتحقیقی اداروں کے ارکان اور دیگر علماء ومفکرین نے شرکت کی، مذاکرہ میں مقالات، تقریروں، اور مشوروں کے بعد اعلامیہ بھی منظور ہوا، اور پھر بعد میں چند اہم تاثرات ومضامین کے اضافہ کے ساتھ اس کا مجموعہ بھی منظر عام پر آیا، جو قرارداد منظور ہوئی، ان میں آخری قرارداد یہ تھی کہ:

''یہ کانفرنس اپنے صدر عالی قدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تازہ

کتاب ”کیف یستعید العرب مکانتهم اللائقة بهم“ میں دیئے ہوئے ایک مشورہ کو اپنی قرارداد کا حصہ بناتی ہے، وہ یہ کہ:

”مسلمان نازونعمت اور آرام وآسائش کی زندگی کے بجائے جفاکشی، محنت، اور لباس ورہن سہن میں سادگی اختیار کریں، اور سیاحانہ زندگی اپنائیں کہ یہی حکم خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے گورنروں کو دیا تھا، زنہار کہ تمہارے جسم پروردۂ آرام وآرائش ہو، زنہار کہ تم عجمی لباس اختیار کرو بلکہ سورج کی تپش کو جھیلنے کی سکت پیدا کرو، یہی عربوں کا شیوہ ہے، اور معد بن عدنان کی طرح رہن سہن میں خشونت اختیار کرو، اور چوب خشک کی مانند بے لچک بنو، معمولی لباس اپناؤ، قافلہ کو ضروری اسلحہ سے لیس رکھو، آبادی میں اضافہ کرو، تیر نشانہ پر چلاؤ“۔

اور ایک اہم قرارداد یہ بھی تھی کہ اللہ کا شکر ہے کہ کویت آزاد ہو گیا، عراقی فوجیں واپس چلی گئیں، اب مغربی فوجوں کی ضرورت باقی نہیں رہی، ہم پُرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ مغربی فوجیں جلد از جلد واپس جائیں، اور اگر کچھ فوجوں کی موجودگی ضروری ہو تو وہاں اسلامی ممالک کی فوجیں متعین کی جائیں۔

اور یہ کہ سعودی عرب کا دوسرے ملکوں سے دفاعی تعاون لینا حسب مصلحت غلط نہ تھا لیکن مستقبل میں اس پر انحصار نہیں، اپنی بہترین فوج کی تیاری کی طرف توجہ کی جائے اور یہ کہ اسلام کی شیرازہ بندی کی عملی کوشش کے ساتھ اس کے اجتماعی، تعلیمی، سیاسی اور اقتصادی نظام واحکام کو نافذ کیا جائے اور غیر اسلامی افکار وتحریکات کے تئیں سخت رویہ اختیار کیا جائے۔

سابق وزیر اعظم ہند راجیو گاندھی کا دردناک قتل

ہندوستان کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کا فخر رہا ہے لیکن پندرہ سال سے سیاسی موقع پرستی کے ساتھ تشدد وفرقہ پروری کا جو دور دورہ رہا ہے، وہ جمہوریت کے دعویٰ کو پوری طرح داغ دار بنا رہا ہے، اور سیاسی قتل کے یہ واقعات اس بگاڑ کو اور بھی ہیبت ناک بنانے میں لگے ہیں۔ ہندوستان کے دانشوروں، سیاستدانوں اور مسند حکومت

پر بیٹھنے والوں کو غور کرنا چاہئے کہ ایسے بگاڑ کی بنیاد کیا ہے، اور ایسے واقعات کن اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان واقعات سے ان کو سڑک حادثات کی طرح سمجھ کر گزر جانا مسئلہ کا حل نہیں بن سکتا، ان واقعات کے پیچھے جو بگاڑ، موقع پرستی اور جذبات ہوتے ہیں، ان کا مطالعہ کر کے ان کے ازالہ کی فکر کرنے کی ضرورت ہے، ملک کے صحیح تقاضوں کو پورا کرنے کی طرف سے غفلت اور عوام کے مختلف طبقات کو مطمئن نہ کرسکنا بھی ایسے واقعات وحالات کا بڑا سبب ہوا کرتا ہے۔

یہ واقعہ تمل ناڈو میں ۲۱ رمئی ۱۹۹۱ء کو ایک پروگرام میں پیش آیا جس میں انہیں خطاب کرنا تھا، شاہ بانو مطلقہ نان نفقہ کیس کے تعلق سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی ان سے متعدد خوشگوار ملاقاتیں رہیں، اور خود بھی وہ ان کی دہلی کی قیام گاہ میں ملنے آئے اور توجہ سے بات سنی اور پارلیمنٹ میں مسلم پرسنل لا کی حمایت میں ویب جاری کر کے شریعت بل پاس کرایا، لیکن اس کے بدلہ دوسری قوموں کو خوش کرنے کے لئے بعض ایسے اقدامات کئے، جس سے ملک وملت کو نقصان بھی پہونچا، ملک کی ترقی کے لئے بھی مفید اقدامات کئے جس کے لئے انہیں یاد رکھا جائے گا۔

دو اہم حادثۂ وفات

پہلا حادثہ ڈاکٹر سید ابراہیم ندوی حیدرآبادی کا ہے، جنہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی اور ان کے رفقاء میں مولانا ناصر علی ندوی، مولانا لقمان خاں بھوپالی، مولانا لقمان ندوی اعظمی، مولوی ابوالبقاء ندوی، مولوی محمد عباس ندوی گیاوی کئی ایسے رفقاء ہیں جن کا راقم سے اچھا ربط وتعلق رہا، مولوی سید ابراہیم ندوی کا اصلاً تعلق بہار کے سادات خاندان سے تھا اور انھیں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے قرابت کا تعلق تھا، افسوس کہ ۲۱ رجون ۱۹۹۱ء کو ان کا حادثۂ وفات پیش آیا۔

دوسرا حادثہ دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین مولانا معراج الحق قاسمی کی وفات کا ہے جنہوں نے ۱۸ راگست ۱۹۹۱ء وفات پائی، ان کا دارالعلوم میں خال معظم مولانا سید

ابوالحسن علی ندوی کا دورۂ حدیث میں ساتھ رہا تھا جب خال معظم نے چند ماہ دیو بند میں قیام فرمایا تھا، ۱۹۴۶ء میں جب میرا دارالعلوم میں داخلہ ہوا اور شرائط دورہ کی کتابیں پڑھیں تو مولانا کی خاص شفقت حاصل ہوئی کہ ان کو میری سرپرستی کے لئے خال معظم نے فرمایا تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان سے متعلق تعزیتی جلسہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے تقریر فرمائی اور ان کے حادثۂ وفات کو علمی و دینی حلقوں کے لئے بڑا حادثہ قرار دیا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ ان سے شرف تلمذ بھی کاتب تحریر کو حاصل ہوا۔

ندوۃ العلماء میں شعبۂ تربیت افتاء وقضاء کا قیام

ندوۃ العلماء کے ذمہ داران وہمدردان اس فکر کو شدت سے محسوس کرتے تھے کہ دارالعلوم میں باقاعدہ شعبۂ تربیت افتاء کا قیام عمل میں آئے، کلیۃ الشریعہ میں اختصاص فی الفقہ کے طلبہ میں سے زیادہ باصلاحیت طلبہ کو اس میں موقع دیا جائے تو فقہ کی اعلیٰ تربیت حاصل کریں اور افتاء وقضاء میں مہارت پیدا کریں، اور ایک سالہ تربیتی کورس رہے، اس کا باقاعدہ آغاز ۱۴۱۱ھ سے کردیا گیا، فالحمد للہ علی ذلک.

۲۷ رمحرم الحرام ۱۴۱۱ھ/ ۱۹ راگست ۱۹۹۱ء کو ارکان مجلس انتظامی کی میٹنگ تھی اور اسی موقع پر دارالقضاء والافتاء کی عمارت کے سنگ بنیاد کی پُر وقار تقریب ہوئی۔ اس سے قبل دو اہم کلیات: کلیۃ الشریعۃ اور کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابہا کے ساتھ ایک سالہ کورس فکری تربیت کے لیے المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی دس سال قبل ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء سے قائم ہے جو بہت کامیاب ہے۔

دارالعلوم کے شعبوں، اس کے فضلاء کی کارکردگی اور بانیانِ ندوۃ العلماء کے مقاصد کی تکمیل کے کاموں کی تفصیل جاننے کے لئے رواں سال ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۰ء کی مجلس انتظامی کی روداد ناظم ندوۃ العلماء ملاحظہ ہو جو تعمیر حیات کے شمارہ ۲۵ راگست ۱۹۹۰ء کے صفحات ۵، ۶، ۷ میں شائع ہوئی ہے اور تفصیل اور حقائق پر مبنی رپورٹ ہے۔

سیکولرزم اور ہندوستان کے موضوع پر سیمینار

ہندوستان کی فرقہ وارانہ اور روز بروز بگڑتی ہوئی صورت حال کو دیکھتے ہوئے ضرورت محسوس کی گئی کہ سیکولرزم اور ہندوستان کے موضوع پر ایک سیمینار بلایا جائے، ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی نے اس خدمت کو انجام دیا، اور اہم سیاسی شخصیات کو مدعو کیا جن میں مرکزی وزیر مادھوراؤ سندھیا، اور جناب غلام نبی آزاد اور جناب سلمان خورشید خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ان کے خطبۂ استقبالیہ کے بعد افتتاحی وکلیدی خطاب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ہوا، جس میں انہوں نے ایک مثال سے واضح کیا کہ:

فرقہ وارانہ تعصب بھی ایک آدم خور شیر ہے، یہ بہت سے بے گناہوں کو اپنی خوراک بنا چکا ہے، اور ابھی مزید خون خرابے کا خطرہ ہے، وہ اپنے پالنے والے اور جگانے والے کو بھی کھا جاتا ہے۔

اس اہم جلسہ میں جسے مسلم انٹلکچول فورم نے بلایا تھا مختلف لوگوں نے خطاب کیا، اور یہ پیغام سامنے آیا کہ ہندوستان کی سالمیت سیکولرزم ہی پر قائم رہ سکتی ہے۔ یہ جلسہ ۸/اکتوبر ۱۹۹۱ء کو لکھنؤ میں ہوا۔

یادگار سلف حضرت مولانا محمد احمد پرتاپگڑھی کا حادثۂ وفات

یادگار سلف حضرت مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی نے الٰہ آباد میں ۳/ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۱ء دس بجے رات کو اپنے میزبان ڈاکٹر ابرار احمد کے مکان میں جان جان آفریں کے سپرد کی، ان کا حادثۂ وفات بہت محسوس کیا جانے والا اور نا قابل تلافی نقصان حادثہ ہے۔ کاتب تحریر کو بھی ان کی شفقت اور دعائیں حاصل تھیں اور ان کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل ہوتی تھی، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

بھوپال میں رابطۂ ادب اسلامی کا ساتواں سالانہ علمی مذاکرہ

بھوپال میں مورخہ ۴، ۵، ۶/ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۳، ۱۴، ۱۵/اکتوبر ۱۹۹۱ء

میں تین روزہ سیمینار منعقد ہوا جو رابطۂ ادب اسلامی نے بلایا تھا، جس میں بلاد عربیہ سے فاضل جلیل شیخ محمد بن ناصر العمودی مساعد امین عام رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے بھی شرکت کی، افتتاحی واختتامی اجلاس کی صدارت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمائی اور مختلف مجلسوں کی صدارت محدث جلیل مولانا محمد عبدالرشید نعمانی (کراچی)، مولانا عبداللہ عباس ندوی (مکہ مکرمہ)، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، پروفیسر محمد راشد ندوی نے کی۔

نظامت کے فرائض کاتب تحریر نے اور اس کے علاوہ ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقی علی گڑھ، مولانا عبدالنور ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء، ڈاکٹر سید ضیاء الحسن ندوی (دہلی) اور مولوی سید شرافت علی بھوپالی (دارالعلوم تاج المساجد بھوپال) نے کی، سوال وجواب کا بھی ہر نشست کے اختتام پر موقع دیا گیا، اور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، مولانا عبداللہ عباس ندوی نے ادب کے جمالیاتی اور نظریاتی پہلو پر تشفی بخش جوابات دیئے، اور رابطۂ ادب اسلامی کے قیام کے اسباب وضرورت کو واضح کیا گیا کہ اس سیمینار میں ادیبوں، شاعروں، دانشوروں کی اچھی تعداد تھی۔

پیام انسانیت کے جلسہ کا بھی انعقاد ہوا، اور مولانا حبیب ریحان خاں ندوی کے قائم کردہ ادارہ دارالتصنیف والترجمہ کا افتتاح عمل میں آیا، سیمینار کا موضوع دعوتی واصلاحی ادب تھا۔

افغانستان میں اسلامی حکومت کا قیام

۱۹۷۹ء سے افغانستان میں روسی مداخلت کے خلاف جو جنگ آزادی شروع ہوئی، اس نے اسلامی جہاد کا انداز اختیار کرلیا تھا اور اس میں دین پسند عنصر نے اپنی جان ومال سے بڑی قربانی دی جو رنگ لائی۔ مولانا عبداللہ عباس ندوی نے اس موقع پر جو تعمیر حیات میں اداریہ لکھا، وہ ہم سب کی آواز تھی، وہ تحریر ملاحظہ ہو:

۲۸/اپریل ۱۹۹۲ء کا دن صرف افغانستان کی تاریخ کا روز سعید نہیں بلکہ ہم تمام مسلمانوں کے لئے روز عید سے بڑھ کر عید کا دن تھا، کامرانی وسربلندی کا یہ لمحہ دس بیس سال میں نہیں بلکہ کئی صدیوں کے انتظار کے بعد نصیب ہوا ہے، ناکامیوں کا ایک تسلسل تھا جو کئی

سو برس سے چلا آ رہا تھا۔ آج شہدائے اسلام عالم برزخ سے اپنے خون سے سینچے ہوئے پودے کو لہلہاتا ہوا دیکھ رہے ہوں گے، افغانی مجاہدین کی سرخی نے آج امت اسلامیہ کو سرخرو کر دیا، مصنوعی اور غیر فطری سرخی کو سویرا دیکھنا نصیب نہیں ہوا، وہ تاریکی میں نمودار ہوئی اور تاریکی ہی میں سمٹ کر ایک سیاہ داغ بن کر انسانیت کی پیشانی پر ابھری اور مٹ گئی، تاریخ کے دھندلکے میں ہمیشہ کے لئے دفن ہوگئی، اور اس ایک سرخی پر کیا موقوف ہر رنگ زوال پذیر ہے، مٹنے ہی کے لئے ابھرتا ہے، خواہ وہ لیبیا کا سبز رنگ ہو یا ہندوستان کی ایک سیاسی تنظیم کا زعفرانی رنگ، یہ سب مٹنے ہی کیلئے ابھرے ہیں، باقی رہنے والا رنگ، سدا بہار رنگ، ہمہ گیر اور پختہ گیر رنگ صرف خدائے وحدہ لاشریک کا رنگ ہے۔

صبغة الله و من أحسن من الله صبغة خدا کا رنگ، اور خدا سے بہتر رنگ کس کا ہے۔

یہ محض قافیہ سنجی یا رعایت لفظی نہیں ہے، رحمت حق کا ظہور معنوی ہے کہ مولانا شیخ صبغت اللہ مجددی، جدید مسلم افغانستان کے پہلے صدر قرار پائے، یہ فال نیک ہے کہ اب ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ ہی کا رنگ ہر رنگ پر غالب رہے گا۔

ٹیلی ویژن پر جب ایک جھلک دکھائی گئی کہ ایک صاحب جبہ و دستار، نورانی شکل وشباہت کا مرد مجاہد اپنی متواضع چال سے سادہ، پروقار انداز میں کرسی صدارت کی طرف بڑھ رہا ہے تو بے اختیار بُحتری کے وہ اشعار یاد آ گئے جو اس نے متوکل باللہ کیلئے عید کی مبارک باد کے طور پر لکھے تھے:

ومشيت مشية خاضع متواضع — لله لا يزهى ولا يتكبر

فلو أن مشتاقا تكلف فوق ما — فى وسعه لسعى اليك المنبر

(آپ تواضع وانکساری کی چال سے چلے، اور یہ تواضع وخاکساری اللہ تعالیٰ کے لئے تھی جس کے حضور نہ کوئی اپنی خوبیوں کی نمائش کر سکتا ہے، نہ تکبر کر سکتا ہے، اگر کوئی صاحب اشتیاق اپنی طاقت سے بڑھ کر اظہار عقیدت کی طاقت رکھتا تو یہ منبر جس پر آپ بیٹھنے جا رہے ہیں خود بڑھ کر آپ کی طرف آ جاتا)۔

شیخ صبغت اللہ مجددی ۲۰ رسالہ جلاوطنی کے بعد ۶۹ رسال کی عمر میں اپنے وطن واپس

آئے ہیں، داؤد خاں کی وزارت کے زمانہ میں گرفتار بھی ہوئے تھے، جرم تو کوئی فرضی لگایا گیا تھا، مگر اصل جرم دعوت دینی کے لئے سرگرم ہونا تھا، اس زمانہ کے ایک روزنامہ نے ان کے اوران کے رفقائے کار کے بارے میں لکھا تھا کہ یہ لوگ رجعت پسندی کے داعی ہیں، قوم کو کئی صدی پیچھے لے جانا چاہتے ہیں، عورتوں کو پردہ میں رکھ کر پسماندہ بنانا چاہتے ہیں، یہ لوگ اس راہ کی دعوت دیتے ہیں کہ اگر ان کا بس چل گیا تو جنگل کا قانون چلے گا، چور کے ہاتھ کاٹے جائیں گے، زانی سنگسار کئے جائیں گے اور قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔

آئے دن کی بلا سبب اور بلا جرم گرفتاریوں سے نجات پانے کے لئے یہ لوگ ملک چھوڑ کر باہر جانے کے لئے مجبور ہو گئے تھے، ان کے جانے سے ان لوگوں کو سکون ہوا جو حکومت کو ان کے حق میں مشورہ دے رہے تھے کہ:

أخرجوهم من قريتكم انهم أناس يتطهرون . (ان کو اپنی بستیوں سے باہر نکال دو، یہ وہ لوگ ہیں جو بڑے پاکباز بنتے ہیں)۔

شیخ مجددی اپنی خود عائد کردہ جلاوطنی کے دوران چند دن حجاز میں بھی رہے اور رابطہ عالم اسلامی کے عملہ سے تعاون کرتے رہے، اس کے بعد بلجیم جا کر مرکز اسلامی کی قیادت کی۔

پھر جب مجاہدین نے باقاعدہ آزادیٔ وطن کی جدوجہد شروع کی تو اپنے طلباء اور مریدوں کی بڑی تعداد کے ساتھ اس مہم میں شریک ہو گئے، شیخ صبغۃ اللہ المجددی اور ڈاکٹر عبدالرسول سیاف (جن کے نام میں عربوں نے یہ تبدیلی کردی کہ بجائے عبدالرسول کے عبدرب الرسول کردیا) دونوں کابل یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے پروفیسر تھے۔ شیخ مجددی کا اختصاص حدیث نبویؐ ہے۔ موجودہ حکومت کی تشکیل پر ان دونوں فاضل اساتذہ کا بہت دانشمندانہ طرز رہا اور انہی کے مساعی سے باہمی اختلافات کی خلیج پاٹی جا سکی ہے۔

بہرحال نیا افغانستان اس طرح مسلم دانشمندوں کے ہاتھوں آیا ہے گویا جیسے کسی فرد کو حیات نو ملے، تمام مسلمانانِ عالم کی دعائیں اور تمنائیں ان کے ساتھ ہیں، "وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ".

(اوران سے کہہ دو کہ عمل کئے جاؤ خدا اوراس کا رسول اورمومن (سب) تمہارے عملوں کودیکھ لیں گے) (۱)۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مسجد اقصیٰ کے امام شیخ محمد محمود الصیام کی آمد

مسجد اقصیٰ کے جلاوطن امام شیخ محمد محمود الصیام کی دارالعلوم ندوۃ العلماء تشریف آوری حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت پر ہوئی، معتمد تعلیم ندوۃ العلماء مولانا عبداللہ عباس ندوی نے انکا تعارف کرایا، بعد عصر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ کے لان میں رابطہ ادب اسلامی کی طرف سے انہیں استقبالیہ دیا گیا، جہاں کاتب تحریر کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ وہ خیر مقدم کرے، اوران کو کتابوں کا تحفہ پیش کرے، مغرب کی نماز کی امامت کرا کران کی تکریم کی گئی۔ ڈاکٹر محمد الصیام اسرائیلی مقبوضہ غزہ پٹی میں قائم فلسطینی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں، اورانتفاضہ تحریک کے رہبروں میں ہیں۔

ڈاکٹر محمد الصیام نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے اپنی دینی، فکری وابستگی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت تن تنہا مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ہی ایک ذات گرامی ہے جن سے عالم اسلام کی دینی، علمی، فکری سربراہی وابستہ ہے، جب کوئی خاص واقعہ پیش آتا ہے تو عالم اسلام روشنی کے لئے ان کی طرف دیکھتا ہے، انہوں نے مسئلہ فلسطین کواس کے تنگ اور محدود دائرے سے نکال کر سارے عالم اسلام کا مسئلہ بنا کر پیش کیا اور فلسطین کے مسئلہ کو سارے مسلمانوں کا مسئلہ بنادیا۔

بعد مغرب دارالعلوم کی وسیع مسجد میں شہریوں کے ایک جم غفیر کے سامنے امام صاحب کا خطاب ہوا۔

امام صاحب کے استقبال کی مناسبت سے مسجد اقصیٰ اور فلسطین کا ذکر لازمی تھا۔ وہاں اسرائیلی مملکت کے قیام اور صہیونی خطرات اور سازشوں کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا کہ اخلاقی قدروں، انسانی اخوت وغیرہ کو سب سے

---

(۱) تعمیر حیات، ۱۰رمئی ۱۹۹۲ء، ۶رذی قعدہ ۱۴۱۲ھ

زیادہ خطرہ رہا ہے تو وہ یہودیوں سے جنہوں نے انسانیت کے خلاف ہر دور میں سازشیں کی ہیں، اس ضمن میں کارل مارکس کا بھی ذکر کیا جو کمیونزم لایا، وہ بھی یہودی تھا، مزید فرمایا کہ روس وامریکا وغیرہ ہر جگہ جہاں غیر فطری نظام ملتے ہیں، وہاں یہودیوں کا ہی دماغ نظر آتا ہے، لیکن تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ انسانی تہذیب اور اسلام کو نقصان پہونچانے کے لئے پہلی بار یہودیت اور عیسائیت ایک ہوئی ہے، حالانکہ دونوں مذہبی اعتبار سے ایک دوسرے سے عداوت رکھتے ہیں، یہ اتحاد پورے عالم انسانی اور انسانیت کی بقاء کے لئے خطرہ ہے۔

اور اس کے ساتھ حضرت مولانا نے اسرائیل سے تعلقات اور اسرائیل کو تسلیم کرنے والے ممالک خواہ وہ ہندوستان ہو، خطرہ کی بات بتایا۔ عصر بعد کی نشست میں حضرت مولانا کی وہ یادگار تقریر بھی امام صاحب کو سنائی گئی جس میں عظیم فاتح وفاتح قدس سلطان صلاح الدین ایوبی کے کارنامے کا ذکر کر کے معرکہ حطین کی یاد دلائی گئی تھی جب قدس عیسائیوں کے قبضہ میں تھا اور ان سے لیا گیا کہ آج پھر ویسی ہی حمیت وغیرت، معرکہ اور فاتح کی ضرورت ہے، یہ تقریر یاسر عرفات کی موجودگی میں جو فلسطین کی تنظیم آزادی (P.L.O.) کے قائد تھے، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے اجلاس میں کی گئی تھی۔(۱)

ندوۃ العلماء میں ''المعہد العالی للقضاء والافتاء'' کی عمارت کا افتتاح

المعہد العالی للقضاء والافتاء جسے بانیان ندوۃ العلماء نے اپنے مقاصد میں رکھا تھا، کا قیام بھی عمل میں آیا، قضا وافتاء کے شعبوں پر مشتمل اس معہد (فیکلٹی) کے لیے ایک وسیع اور اس کی شایان شان عمارت کی تعمیر مکمل ہوئی، اس کے شعبے، افتاء، قضاء، اور تحقیقات شرعیہ ہوں گے، اور ہر شعبہ کا ایک ذمہ دار ہوگا اور اس کے معاونین ہوں گے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے افتتاحی تقریب میں اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے ایک مضمون میں یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمان جہاں بھی اقلیت میں رہے ہیں، وہاں ان کا اپنا نظام قضاء رہا ہے، ان کے ذمہ داروں کو ''دانش مند'' کہا جاتا تھا۔

---

(۱) تعمیر حیات، ۱۰ر مارچ ۱۹۹۲ء، ص: ۱۰

دارالقضاء کی اہمیت وضرورت کو بتاتے ہوئے فرمایا کہ مسلمانوں کو چاہئے اپنے تنازعات اور جھگڑوں کو دارالقضاء میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے فیصلے کے مطابق حل کریں اور اس ضرورت کی طرف بھی توجہ دلائی کہ مسلمانوں کو اس میں خودکفیل ہونے کے ساتھ مالیات میں بھی خودکفیل ہونا چاہئے، اور دارالقضاء کے قیام کے ساتھ غیرسودی بینکوں کا قیام بھی اہم ملی وانسانی ضرورت ہے۔

اس موقع پر معتمد تعلیم ندوۃ العلماء مولانا عبداللہ عباس ندوی نے المعہد العالی کے چاروں شعبوں دارالافتاء، دارالقضاء، مجلس تحقیقات شرعیہ اور مجلس مذاکرۂ علمی کا ذکر اور ان کے ذمہ داروں کے ناموں کا اعلان کیا(۱)۔

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور بلاد عربیہ کی دو اہم شخصیتوں کی وفات

۱۱ر رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ/ ۱۷ر مارچ ۱۹۹۲ء کو مئو میں محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے وفات پائی، وہ قدیم طرز کے علماء کی یادگار اور محدثین کے لئے نادرۂ روزگار ہستی تھے، علم حدیث، تاریخ ورجال اور فقہ سے ان کی گہری دلچسپی اور اس پر بڑی نظر تھی، اس کے علاوہ بھی دوسری خصوصیات وکمالات تھے جن کا ذکر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے بیان میں کیا ہے کہ ''علمی تفرد وامتیاز کے علاوہ مولانا کے اخلاق، فہم وفراست، ملت کے مسائل ومفادات سے واقفیت وفکر مزید برآں ہے، اس لئے نہ صرف علمی حلقہ میں خلا پیدا ہوا ہے بلکہ ملت کی صف قیادت میں بھی بڑی جگہ خالی ہوگئی ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے ندوہ میں بھی پڑھایا، وہ اسی زمانہ میں اترپردیش اسمبلی کے ممبر بھی تھے اور ان کا لکھنؤ میں قیام تھا، اور ان کا عارضی مکان لکھنؤ میں ہمارے محلّہ میں تھا، اس لئے قریب سے دیکھنے اور استفادہ کا موقع ملا، پھر بعد میں ندوۃ العلماء ان کی تشریف آوری متعدد موقعوں پر ہوئی۔

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے علاوہ جن اہم شخصیتوں نے اس عرصہ میں وفات

---

(۱) تعمیر حیات، ۱۰ر مارچ ۱۹۹۲ء، ص:۱۰

پائی، ان میں ایک شخصیت مولانا محمد سعود شمیم ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کا حادثۂ وفات ہے، جواعلیٰ علمی وادبی ذوق رکھتے تھے اور مدرسہ صولتیہ کے ناظم ہونے کی وجہ سے ضیوف حرم کے میزبان بھی ہوتے جوان کی ضیافت میں آتے تھے، اتوار ۲۷ رشعبان ۱۴۱۲ھ، یکم مارچ ۱۹۹۲ء کی صبح انہوں نے مکہ مکرمہ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

اسی طرح اسلامی مفکروشاعرعمر بہاء الدین الامیری کا حادثۂ وفات پیش آیا جواسّی سال کی عمر میں ریاض (سعودی عرب) میں انتقال کر گئے، رابطۂ ادب اسلامی عالمی کے بنیادی ارکان میں تھے، ان کا تعلق شام کے مشہور شہر حلب سے تھا، وہ صاحب دیوان شاعروادیب تھے، جن کی تعداد بیس سے زائد ہے، ان کے ایک دیوان پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مقدمہ بھی ہے، اس کے ساتھ وہ اخوان المسلمون کے شام میں رہنماؤں میں تھے، اور شام (سوریا) کے پاکستان میں سفیر بھی رہ چکے تھے، رابطہ ادب اسلامی کے لکھنؤ اجلاس جنوری ۱۹۸۶ء میں انہوں نے شرکت فرمائی تھی، یہ حادثہ ہمارے رابطہ ادب اسلامی کے لیے خاص طور پر بڑا سانحہ ہے۔

ندوۃ العلماء کے قیام کے سو سال

ندوۃ العلماء جس کا قیام ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں عمل میں آیا تھا، اس کی صد سالہ مدت پوری ہونے کے بعد ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اپنی رپورٹ میں اس کی وسعت وترقی، نصاب جدید کی تدوین اور اس کی مقبولیت، نئے تربیتی مراکز کے قیام اور نئے تعارفی ودعوتی لٹریچر کی تیاری، عالم عربی میں روح وفکر اسلامی کی اشاعت وحفاظت اور نئے فتنوں کے مقابلہ کی کامیاب جدوجہد کے میدان میں، محسنین ومعاونین اور مخلص رفقائے کار کا تعارف وتذکرہ کیا، اس کے ساتھ حضرت مولانا نے نظامت رپورٹ میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی مطبوعات اور اس کے اثرات اور اس میں ندوہ کے کردار پھر معہد الدعوۃ والفکر الاسلامی کے ذریعہ دارالعلوم کے فضلاء میں وسیع تر مطالعہ، فکرونظر کی گہرائی وگیرائی، عصر حاضر کے فتنوں سے واقفیت اور جواب دینے کی صلاحیت پیدا کرنے کے کام کا بھی تذکرہ کیا اور نئے شعبہ معہد القضاء والافتاء کی ضرورت بھی واضح کی کہ اس سلسلہ میں

زیادہ وضاحت وتشریح کی ضرورت نہیں ہے کہ اب ایسے محاکم شرعیہ اور دارالقضاء کی ضرورت ہے اوراس کے لئے فضلاء مدارس کی مشق وتربیت ایک عملی ضرورت اور بدیہی حقیقت بن گئی ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جس کے مولانا صدر تھے، کے کاموں کا بھی تذکرہ کیا اور فرمایا کہ اس کے قیام، اس کی تحریک، اوراس کے عظیم الشان اجلاسوں اور شاہ بانو کیس میں اس کی بے نظیر کامیابی میں ندوہ کا بھی اس طرح حصہ ہے کہ اس کے متعدد شرکاء وذمہ داران مجلس انتظامی ندوۃ العلماء اور بورڈ کی مجلس عاملہ کے مشترک رکن ہیں۔

اتحاد ملت کانفرنس ممبئی اور آل انڈیا ملی کونسل کا قیام

۲۳-۲۴ رمئی ۱۹۹۲ء کوملت کی اجتماعیت کے لئے اس کے علماء وقائدین نے بلاتفریق مسلک ومشرب اتحاد ملت کانفرنس بلائی اوراس کا اجلاس ممبئی میں رکھا، چوں کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا موضوع ودائرہ پرسنل لا اور عائلی مسائل وقانون تک محدود تھا، دوسرے ملی مسائل وقضایا اور ضرورتوں کے لئے اسی میں ایک اور متحدہ پلیٹ فارم کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی جو مسلم مجلس مشاورت کے کمزور پڑنے کے بعد اور بڑھ گئی تھی، خاص طور پر مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی اور ڈاکٹر محمد منظور عالم نے اس کے لئے پہل کی، اور خطبۂ افتتاحیہ کے لئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کو دعوت دی۔

حضرت مولانا کا یہ خطبۂ افتتاحیہ تعمیر حیات ۲۵ رجون ۱۹۹۲ء کے اداریہ کے طور پر شائع ہوا جو چار صفحات پر مشتمل ہے: ’’ملک وملت دونوں خطرہ میں‘‘ اس عنوان سے شائع ہوا، جس کا آغاز یہ تھا کہ:

’’اس وقت ہمارا ملک اور ہماری ملت دونوں ایسے خطرات ومصائب اور ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہیں جوملکوں اور ملتوں کی زندگی اور تاریخ میں بعض اوقات صدہا برس کے بعد اور بعض اوقات اس سے بھی زائد عرصہ کے بعد پیش آتی ہے اگر اس کی جلد خبر نہ لی گئی تو پہلے ہی ملت اپنے تشخص، اپنی مذہبی آزادی، اپنی ثقافت وتہذیب اور اپنے عزیز سرمایہ (معابد ومدارس، علمی ذخیرہ اور زبان وادب) سے محروم ہوگی، پھر یہ وسیع

اور شاندار ملک مکمل طریقہ پر تباہ ہو کر رہ جائے گا، بغض وعناد، بدگمانی اور بے اعتمادی کی فضا انسانی جان اور عزت وآبرو کی بے وقعتی، مردم آزاری وآدم بیزاری، عقل پر جذبات کی حکمرانی، دوراندیشی پر کوتاہ اندیشی کا غلبہ، ملکی مفاد پر ذاتی اغراض کی ترجیح، جذبات کے پیچھے بہہ جانے اور کھوکھلے نعروں کا، دیوانہ بن جانے کی عادت، ایک ایسا زہر ہے جو بڑی سے بڑی قوم اور ملک کی ہستی کا خاتمہ کر دیتا ہے، اور اس کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے، فرقہ وارانہ فسادات، تنگ نظری، مفاد پرستی، حد سے بڑھا ہوا احساس برتری، جذبات سے مغلوب ہو جانے، روئی کی طرح جلد آگ پکڑ لینے اور بارود کی طرح بھک سے اُڑ جانے کی صلاحیت کسی ایک میدان میں محدود اور کسی ایک فرقہ کے ساتھ مخصوص نہیں رہ سکتی، نفرت واقتدار کی بڑھی ہوئی ہوس کی آگ کو اگر جلانے کے لئے ایندھن نہ ملے تو وہ خود کو کھانے لگتی ہے، دور جاہلیت کے ایک حقیقت پسند عرب شاعر نے عرصہ ہوا، کہا تھا۔

والنار تأكل نفسها　　　ان لم تجد ما تأكله

(آگ اپنے کو کھانے لگتی ہے اگر اس کو کچھ اور کھانے کو نہ ملے)۔

رابطہ ادب اسلامی کی تعارفی مہم اور اس کے وفد کا مختلف شہروں کا دورہ

عالمی رابطۂ ادب اسلامی کا ایک وفد ادب اسلامی کے تعارف کی غرض سے کانپور، الہ آباد، بنارس، اور اعظم گڑھ گیا جس میں رابطہ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے کاتب تحریر بھی شامل تھا، اور دار العلوم کے اساتذہ مولانا محمد واضح رشید ندوی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی اور رابطہ کے مرکزی دفتر کے ذمہ دار کی حیثیت سے مولوی عبد النور (نور عظیم) ندوی ہمراہ تھے، ان کے علاوہ آل انڈیا مسلم انٹلکچول فورم کے صدر ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی اور اندور بھوپال کے بورڈ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر قاضی عبد الحمید ندوی وفد میں شامل تھے۔ کانپور میں ۲۶؍ جولائی ۱۹۹۲ء کو دار التعلیم والصنعت میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا، جس میں مقامی کالجوں، اسکولوں اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات شریک ہوئے جن کے سامنے راقم نے رابطہ کے قیام کے مقصد اور پیغام کو واضح کیا۔ مولوی

مظفر الحق ندوی اور حاجی محمد اسحاق نے جلسہ کا نظم کیا تھا۔ دوسرے دن الٰہ آباد میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے سربراہ ڈاکٹر سید محمد اجتباء حسینی ندوی نے نشست کا نظم کیا، جو رابطہ کے رکن تاسیسی بھی ہیں، اس نشست میں شہر کے ممتاز ادباء، ماہرین قانون، ماہرین تعلیم، اور علم دوست حضرات شریک ہوئے، ان اہم حضرات میں دینی تعلیمی کونسل کے جنرل سکریٹری ریاض الدین احمد اور مشہور شاعر و ادیب ڈاکٹر طفیل احمد مدنی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ راقم السطور نے سالانہ سیمیناروں کے موضوعات کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور ادب اسلامی کی تعریف اور اسلامی لٹریچر کی تدوین کے سلسلہ میں رابطۂ ادب اسلامی کے منصوبہ اور کوششوں کا تعارف کرایا، اور متعدد شرکاء نے اظہار خیال کیا۔

تیسرے دن ۲۸ رجولائی ۱۹۹۲ء کو جامعہ سلفیہ بنارس میں وفد کا استقبال ہوا اور دار الحدیث ہال میں شیخ الحدیث مولانا عبد الحمید رحمانی کی صدارت میں نشست ہوئی۔ وکیل الجامعۃ السلفیہ اور رکن رابطۂ ادب اسلامی ڈاکٹر مقتدا حسن ازہری نے وفد کے ارکان کا تعارف کرایا اور کہا کہ:

اس تحریک کی آواز ایسی جماعت بلند کر رہی ہے جسے پوری امت مسلمہ کا اعتماد حاصل ہے، اس موقع پر انہوں نے ندوہ کی اہمیت اور اس کے عظیم مقاصد پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ ندوہ نے اپنے مقاصد کی تکمیل میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ انہوں نے جامعہ سلفیہ کی طرف سے بھرپور تعاون کا بھی یقین دلایا، اس نسبت سے بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے لکچرار ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی (ندوی مظاہری) نے بھی شرکت کی اور اظہار خیال کیا۔

آخر میں صدر مجلس مولانا عبد الحمید رحمانی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ آج ہمارے چہار طرف فحش لٹریچر پھیلے ہوئے ہیں جس کے اثرات کو ختم کرنے کے لئے رابطہ جیسی تنظیم کی ضرورت ہے۔ الحمد للہ یہ تنظیم اپنا پورا کام نبھا رہی ہے، اس لئے ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم رابطہ ادب اسلامی کا بھرپور تعاون کریں۔ اس کے دعوتی و اصلاحی پروگرام اصلاح امت کے سلسلہ میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، راقم السطور نے بھی اظہار کیا، اور دین و ادب کی ہم آہنگی پر زور دیا۔

۲۹؍جولائی ۱۹۹۲ء کوشبلی اکاڈمی (دار المصنفین) اعظم گڑھ میں نشست ہوئی، جلسہ کی نظامت مولانا ضیاء الدین اصلاحی ناظم دار المصنفین نے کی، راقم الحروف نے رابطہ کے قیام کے محرکات پر روشنی ڈالی اور مغربی افکار ونظریات اور کمیونسٹ نظریات کے اثرات کا ذکر کیا کہ اس سے ہمارے نوجوانوں کے سامنے جوادب آیا، وہ ان کے موروثی ومذہبی قدروں سے متصادم تھا، اس لئے ضرورت محسوس کی گئی کہ اس کا مقابلہ ادب اسلامی کے ذریعہ کیاجائے، پھر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے ادب اسلامی کی اہمیت وضرورت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، سوالات وجوابات کی بھی نشست ہوئی جس میں جوابات مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور راقم الحروف نے دیئے، اور ادب کو انسانیت اور صالح انسانی احساسات وتاثرات کی ترجمانی کے ساتھ وابستہ رکھنے کی طرف توجہ دلائی اور اس کے خلاف جو رزم آرائی ہے اس کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ سوال وجواب کی اس نشست پر رابطہ ادب اسلامی کی اس تعارفی مہم کا اختتام ہوا، جس کا آغاز کانپور سے ہوا تھا۔ واپسی میں رائے بریلی ہوتے ہوئے لکھنؤ واپسی ہوئی۔ (۱)

آکسفورڈ اسلامی سنٹر کے اہم فیصلہ اور پروجیکٹ

لکھنؤ سے لندن حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کے ہمراہ کاتب تحریر ۸؍ستمبر ۱۹۹۲ء کو اسلامی سنٹر آکسفورڈ کے ٹرسٹیز کے جلسہ میں شرکت کے لئے گیا اور ۲۰؍ستمبر ۱۹۹۲ء کو واپسی ہوئی، انجینئر محمد عثمان حیدرآبادی بھی ساتھ تھے، جوجدہ سے دہلی آکر لندن اور پھر لکھنؤ واپسی تک ساتھ رہے، اس سلسلہ میں ایک تفصیلی رپورٹ قومی آواز میں صحافی حسین امین صاحب نے شائع کی، جس کا اختصار پیش کیا جاتا ہے۔

آکسفورڈ اسلامی سنٹر اس وقت منجملہ اور کاموں کے دواہم پروجیکٹوں پر کام کررہا ہے۔ ایک تو اسلامی تاریخی انڈیکس کی تیاری اور دوسرے ایک جامع اور وسیع اسلامی تاریخ مرتب کرنے کا منصوبہ، بورڈ آف ٹرسٹیز کے جلسہ میں ان دونوں منصوبوں اور دیگر کاموں کے لیے اپنے ٹرسٹیوں میں سے کچھ ٹرسٹیوں کی ایک کمیٹی کی تشکیل بھی کی، تاکہ وہ کاموں کی رہنمائی اور نگرانی کرسکے۔ یہ کمیٹی جن شخصیتوں پر مشتمل ہے ان میں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے سکریٹری جنرل اور ملک

(۱) تفصیلی رپورٹ تعمیر حیات ۲۵؍اگست ۱۹۹۲ء، ص: ۱۲، ۱۳ میں ملاحظہ ہو۔

عبدالعزیز یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف، برونائی مسلم اسٹیٹ کے وزیر تعلیم مسٹر عبدالعزیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر خلیق احمد نظامی اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے سینٹ کراس کالج کے ایک استاد شامل ہیں۔

اسلامی سنٹر کے قیام کی منظوری کے سلسلہ میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ جس وقت برطانیہ کی وزیر اعظم مسز مارگریٹ تھیچر تھیں جو آکسفورڈ یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ ہیں، آکسفورڈ یونیورسٹی کی اکاڈمک کونسل کا ایک جلسہ ہوا تھا جس کے ایجنڈہ میں صرف دو باتیں تھیں، ایک تو یہ کہ مسز تھیچر کو اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی جائے کہ نہیں، دوسرے یہ کہ آکسفورڈ اسلامی سنٹر کے لئے جگہ دی جائے کہ نہیں۔ اور دونوں میں صرف ایک پر فیصلہ ہونا تھا، چنانچہ کونسل نے سنٹر کے قیام کے جگہ کی فراہمی کو منظوری دی۔

ٹرسٹی بورڈ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (صدر) ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف سعودی عرب (نائب صدر)، شیخ خالد علی رضا، سعودی عرب (ڈائرکٹر تیل کمپنی جدہ)، پروفیسر خلیق احمد نظامی انڈیا، ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن ترکی، ڈاکٹر یوسف قرضاوی قطر، شیخ عبدالعزیز علی مطوع کویت، ڈاکٹر احسان شفیق عراق، ڈاکٹر سی. ایس. جی. فلپ آکسفورڈ یونیورسٹی، ڈاکٹر رچرڈ ریپ (آکسفورڈ یونیورسٹی)، پروفیسر گریفین (آکسفورڈ یونیورسٹی) اور کاتب تحریر کا نام شامل ہے۔

باوجود یہ کہ سنٹر کو آکسفورڈ یونیورسٹی کا تعاون حاصل ہے، لیکن وہ ایک آزاد ادارہ ہے، اور اپنی مالیات اور پالیسیوں کے معاملہ میں خودمختار ہے۔ سعودی عرب، برونائی، اور ازبکستان نے تحقیقاتی کاموں کے لئے اسکالرشپ بھی دی ہے، سال رواں دو اسکالرشپ حکومت ازبکستان نے اپنے ذمہ لی ہیں۔ ان میں ایک امام بخاری پر کام کرنے اور ایک امام ترمذی پر کام کرنے کے لئے۔ اور ایک اسکالرشپ کی ذمہ داری حکومت پاکستان نے لی ہے۔

مجوزہ پروجیکٹ میں ایک اسلام کے متعلق غلط فہمیاں دور کرنے کا کام ہے کہ ایک اسلامی تاریخی انڈیکس تیار کیا جائے جس کے توسط سے عالم اسلام کے فکری، ثقافتی،

اور دیگر حالات وتغیرات کی تاریخ پیش ہو۔

دوسرا پروجیکٹ ایک جامع وسیع اسلامی تاریخ سے متعلق ہے جو آغاز اسلام سے لے کر عہد جدید تک محیط ہو، اور اس کی علمی، فکری، ثقافتی، ادبی، سیاسی، اقتصادی، اخلاقی دینی جائزہ کی تفصیل پر مشتمل ہو۔

۱۰ر ستمبر ۱۹۹۲ء کو جو اہم میٹنگ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں ہوئی، اس میں امام بخاری کی یادگار کے قیام سمیت دوسرے مختلف پروجیکٹوں پر غور ہوا، اور ان پر عمل درآمد کی پیش رفت پر اطمینان کا اظہار کیا گیا، امام بخاری کی یادگار کے قیام کا منصوبہ امام بخاری کی آخری آرام گاہ سے متصل ان کی مسجد اور مدرسہ کے احیاء اور تعمیر پر مشتمل ہے، امام بخاری کا مدرسہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے جو اب از سر نو قائم کئے جانے کا مستحق ہے، اس یادگار کی تعمیر کے لئے عالم اسلام کے بعض معیاری اور ممتاز نقشہ سازوں سے نقشہ تیار کرایا جارہا ہے۔(۱)

چند اہل تعلق واہم شخصیات کی وفات

جن اہل تعلق اور بعض شخصیات نے داغ مفارقت دیا ان میں ایک اہم نام مولانا جمیل احمد ندوی مددگار ناظم ندوۃ العلماء کا حادثۂ وفات ہے، جن کا انتقال مختصر علالت کے بعد ۸ر جون ۱۹۹۲ء کو لکھنؤ میں ہوا، انہیں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء کی سرپرستی اور رفاقت میں دفتری معاملات میں معاونت کا شرف حاصل تھا۔

دورا حادثۂ وفات مولانا سراج احمد قمر فتحپوری کا ہے جو ملی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے، تحفظ شریعت کے جلسوں اور بابری مسجد کے معاملہ میں ان کی اچھی کوشش سامنے آئی تھی جو ان سال اور بہت کارگزار عالم دین تھے، بارہ بنکی کے قصبہ فتح پور کے رہنے والے تھے، افسوس یہ حادثہ ۱۵ر ستمبر ۱۹۹۲ء کو جیپ حادثہ کی صورت میں پیش آیا۔

تیسرا حادثہ مسلمانوں کے سیاسی امور میں اہمیت رکھنے والے اہم رکن پارلیمنٹ اور کئی مدتوں تک وزارت پر فائز رہنے والے شخص جناب ضیاء الرحمٰن انصاری کی وفات ہے

---

(۱) رپورٹ حسین امین، تعمیر حیات، ۲۵ر ستمبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۔

جن کا تعلق مانگر مئو ضلع اناؤ سے تھا، ان کی وقتاً فوقتاً حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ملاقات کے لئے لکھنؤ اور رائے بریلی تشریف آوری ہوتی رہتی تھی، اس کے ساتھ ان کا پارلیمنٹ میں شاہ بانو کیس میں اسلامی نقطۂ نظر سے مسئلہ کو واضح کرنے میں اہم حصہ بھی رہا تھا، حادثہ ۸/اکتوبر ۱۹۹۲ء کو پیش آیا۔

چوتھا حادثۂ وفات مولانا حکیم عبدالقوی دریابادیؒ (برادرزادہ وخویش مولانا عبد الماجد دریابادی) ومدیر ''صدق جدید'' کا ہے، جو مجلس انتظامی ندوۃ العلماء کے رکن بھی تھے، اور ہم لوگوں کو ان کے ہم محلہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، افسوس جمعہ کے دن ۱۶/اکتوبر ۱۹۹۲ء کو لکھنؤ میں دو بجے دن کے قریب جان جان آفریں کے سپرد کی۔

پانچواں اور بڑا اہم حادثۂ وفات حضرت مولانا مسیح اللہ خاں شیروانی خلیفۂ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ہے، جن کی یادگار مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد مظفر نگر ہے، ۱۷/جمادی الاول ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۳/نومبر ۱۹۹۲ء کو انہوں نے وفات پائی اور نماز جمعہ کے بعد بہت بڑے مجمع نے نماز جنازہ ادا کی، اور اسی مدرسہ کے احاطہ میں تدفین عمل میں آئی۔

لیسٹر (برطانیہ) میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا اہم خطاب

اسلامی فاؤنڈیشن برطانیہ کے شہر لیسٹر میں ایک عرصہ سے قائم ہے، جس نے مغربی ممالک میں اسلام کے تعارف اور اس کے بارے میں غیر مسلموں کے تصورات کی درستگی کے کام کو پیش نظر رکھا ہے، پاکستان کے مشہور صاحب علم پروفیسر خورشید احمد جو پاکستانی سینٹ کے رکن بھی ہیں، اس ادارے کے قائم کرنے میں پیش پیش رہے ہیں، اور یہ ادارہ بہ تدریج ترقی کرتے ہوئے اب ذرائع علمی سے آراستہ ایک نمایاں ادارہ بن گیا ہے، شہر سے باہر اس کو ایک قطعۂ زمین مع عمارتوں کے حاصل ہو گیا ہے، اسی سال ادارہ اس میں منتقل ہوا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنے سال گذشتہ کے سفر برطانیہ کے دوران اس ادارہ کی دعوت پر اس میں بھی گئے تھے، اور ایک مؤثر ومفید تقریر کی تھی، سال رواں بھی ادارہ نے مولانا کو دعوت دی، جلسہ کا اہتمام کیا، اور جلسہ منعقد کیا، اس جلسہ میں

مولانا نے عربی وار دو دونوں زبانوں میں تقریر فرمائی، اردو تقریر کو ''امت مسلمہ کا فرض منصبی اور اس کے انقلابی اثرات'' کے عنوان سے تعمیر حیات ۲۵/اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۵-۶ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

اس کے آخر میں اس بات کی طرف خاص توجہ دلائی گئی تھی کہ: ''اگر آپ نے اس ملک میں رہتے ہوئے زندگی کا ایک نیا ماڈل (Model)، ایک نیا سانچہ اور ایک نیا نمونہ پیش کیا، جس میں یہاں کی زندگی، طرز معاشرت، نفس پرستی، اور دولت پرستی اور ہر قسم کی آزادی سے امتیاز ظاہر ہوا، تو لوگوں کے اندر اسلام کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوگا، وہ آپ کے یہاں آئیں گے، اور کہیں گے کہ ہمیں کوئی کتاب دیجئے جس سے ہم سمجھیں کہ اس انقلاب کا سرچشمہ کہاں ہے، کہاں سے یہ تبدیلی آئی، اور کیسے آپ میں یہ امتیاز پیدا ہوا؟

اور اپنے دعائیہ کلمات میں یہ پیغام بھی دیا کہ اللہ وہ دن ہمیں دکھائے کہ اس ملک سے دنیا پرستی، نفس پرستی اور مادیت کی ہوا چلی، الحاد اور لادینیت کا رجحان پیدا ہوا تھا ویسے ہی یہاں سے اب ایمان کی، اخلاق کی، انسانیت اور شرافت وہدایت کی ہوا چلے۔

افغانستان سے بوسنیا تک کے حالات کا ایک تجزیہ

ادھر افغانستان میں جہاں کمیونزم اور روسی مداخلت کے خلاف جہاد وقربانی کا سلسلہ ۱۹۷۹ء سے شروع ہوا تھا، اور ۱۵/لاکھ افراد کی قربانی سے حاصل ہونے والی آزادی کی ملکیت پر نبرد آزمائی چل رہی ہے، قربانی اور جہاد کا مرحلہ تو افغان قوم نے بحسن وخوبی انجام دے دیا، لیکن صلح وامن کا زمانہ آپسی موافقت آپسی رواداری سے گذارنے کے عمل میں کوتاہی ہورہی ہے، قائدین اچھے لوگ ہیں، جہاد کا زمانہ اتفاق ومحبت سے گذارا، اب امن قائم ہونے پر نظری اور قبائلی اختلاف پر پورا قابو نہیں پارہے ہیں، حالانکہ ملک روسی استعمار اور اس کے حامیوں کے ظلم وسفاکی کے نتیجہ میں تباہیوں کے ملبہ سے اور اس کی زمین بارود کے زہر سے ابھی صاف نہیں ہوسکی ہے، اور اس کو غیروں اور مخالف اسلام طاقتوں کی مدد واحسان مندی کی محتاجی برابر قائم ہے، اور اس کے دور کرنے کا موقع نہیں حاصل ہو پارہا

ہے، ادھر الجزائر کو ۱۵ر لاکھ باشندوں کی قربانی کے بعد بھی مغربی ثقافت وفکر کی غلامی کے جوتے کے نیچے عرصہ سے کچلا جا رہا ہے، اور وہاں عوام اور حکومت کے درمیان سخت ٹکراؤ ہے اور بوسنیا ایک زخم ہے جو ایک اسلام دشمن طاقت نے اسلام کے مظلوم وقہر زدہ وابستگان کے جسم میں لگایا ہے، جس سے برابر لہو ٹپک رہا ہے، یوگوسلاویہ کی سابق کمیونسٹ حکومت میں بوسنیا ہرزے گووینا ملک کی مسلم اقلیت کی بڑی آبادی کا علاقہ ہے، صوبوں کو آزادی ملنے پر ملک کی عیسائی اکثریتی علاقہ نے اس علاقہ پر اپنا کنٹرول کرنے کے لئے ہر قسم کا ظلم اختیار کیا، جس کے شکار مسلمان ہیں اور ایک عیسائی اقلیتی فرقہ بھی ہے، لیکن مسلمان زیادہ ہونے کے باعث ظلم کا اصل شکار ہیں، لاکھوں انسان کا قتل اور دیس نکالا ایسا ظلم ہے کہ متحدہ اقوام نے بھی اس پر احتجاج کیا، یہ مسلمان غیر معمولی صبر اور پامردی کا ثبوت دے رہے ہیں، اور سخت سے سخت حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

اور ایک طرف حال یہ ہے کہ مسلم ممالک میں جگہ جگہ حکومتوں، حکومتوں کے درمیان اور حکومت وعوام کے مابین لڑائی ہے، حکومتیں عام طور پر مغرب کی وفادار، اور عوام اسلام کی بالادستی کے خواہاں ہیں، جنہیں دبایا کچلا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ سامنے آرہا ہے کہ ہماری کیفیت وحقیقت پانی کے جھاگ سے زیادہ نہیں ہے، جب کہ مسلمان ممالک کی تعداد ساٹھ تک پہونچ چکی ہے، اور دنیا میں مسلم آبادی کا تناسب چوتھائی ہے، اور پھر ان کے متعدد علاقے معدنیات سے لبریز اور دولت سے بھرپور ہیں، یہ ایسی صورت حال ہے کہ جس سے حکمت وتدبر دانشمندی اور ملت کے اتحاد وعزت کی فکر اور اپنے قول وعمل کے احتساب سے نہیں نپٹا گیا تو حالات سنگین سے سنگین تر ہوتے جائیں گے۔(۱)

عالمی دعوت وفکر اسلامی کانفرنس کا رائے بریلی میں انعقاد

۱۴-۱۵-۱۶ر نومبر ۱۹۹۲ء کی تاریخوں میں رائے بریلی (اترپردیش) میں مولانا محمد ثانی حسنی سوسائٹی کے زیر اہتمام عالمی دعوت وفکر اسلامی کانفرنس کا انعقاد ہوا، جس کے

(۱) تعمیر حیات، ۱۰ر اکتوبر ۱۹۹۲ء، اداریہ از راقم۔

مرکزی عناوین حسب ذیل ہیں:

۱۔ برصغیر ہندو پاک و بنگلہ دیش میں دعوت اسلامی اور اس کا اسلوب۔

۲۔ عالم عربی میں دعوت اسلامی اور اس کا اسلوب۔

۳۔ افریقہ میں دعوت اسلامی اور اس کا اسلوب۔

۴۔ یورپ میں دعوت اسلامی اور اس کا اسلوب۔

۵۔ جنوب مشرقی ایشیا میں دعوت اسلامی اور اس کا اسلوب۔

یہ کانفرنس حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے زیر صدارت بلائی گئی تھی، اور داعی مولانا محمد ثانی حسنی سوسائٹی تھی جس کے صدر ڈاکٹر سید احمد الحسنی ندوی اور جنرل سکریٹری مولوی امتیاز احمد ندوی اور مولوی حمزہ حسنی ندوی کی کوششیں رہیں۔

اس کانفرنس میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے سعودی سفارت خانہ کے قائم مقام سفیر اور بنگلہ دیش سے مولانا سلطان ذوق ندوی، امارات، اردن وغیرہ کے بھی نمائندے شریک ہوئے، کویت سے مولانا بدرالحسن قاسمی نے شرکت کی، اہم مہمانوں میں ڈاکٹر عبدالحلیم عویس (مصر)، شیخ محمد محروس المدرس (عراق)، ڈاکٹر امین القضاۃ (اردن)، جناب عبدالفتاح سعید مدیر مجلّہ منارالاسلام ابوظبی، احمد فہمی زمزم ندوی (ملیشیا) اور ہندوستان سے مولانا عبدالکریم پاریکھ، مولانا عبداللہ مغیثی، میر واعظ (کشمیر) عمر فاروق کے نام ہیں، سمینار کی ایک نشست مدرسہ فلاح المسلمین امین نگر تیندوارائے بریلی میں ہوئی اور وہاں مندوبین کو استقبالیہ دیا گیا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا خطبۂ صدارت لکھا ہوا تھا جو مولوی جعفر مسعود حسنی ندوی نے پڑھ کر سنایا، البتہ ایک نشست میں دعائیہ کلمات میں حضرت مولانا نے مسلمانان ہند پر زور دیا کہ وہ اس ملک کو بچانے کی ذمہ داری قبول کریں، کیوں کہ اس ملک کا، یہاں کی زمین کا، انسانوں اور بسنے والوں کا اور ہم سایوں کا ہم پر حق ہے اسلام کی تعلیمات پر عمل کیا جائے، اور اس ملک کو پوری ہمدردی کے ساتھ اور سمجھ داری کے ساتھ بچانے کی کوشش کی جائے، تب ملک میں رہنے کا صحیح مطلب اور فائدہ ہوگا، اور یہ بات بھی بڑے دردوسوز سے فرمائی کہ مسلمانوں کے ہوتے ہوئے یہ ملک اگر تباہ ہوا تو میدان حشر

میں رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ ہوگا اور آپ کا گریبان ہوگا۔

جلسہ کو کامیاب بنانے میں سوسائٹی کے ذمہ داروں، ارکان اور معاونین کے علاوہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ اور مدرسہ فلاح المسلمین، مدرسہ ضیاء العلوم کے اساتذہ کا بڑا حصہ رہا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کا آٹھواں سمینار

یہ سیمینار بعنوان ''خطوط وتاثراتی خاکے ادبی نقطہ نظر سے'' ۱۷-۱۸/نومبر ۱۹۹۲ء مطابق ۱۴۱۳ھ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ علامہ شبلی نعمانیؒ کے وسیع ہال میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے زیر صدارت منعقد ہوا، سمینار اگرچہ علمی وادبی تھا لیکن پورے سمینار پر ایک روحانی چادر تنی ہوئی تھی، اس میں عرب ممالک کی شخصیتوں میں جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض کے استاد سوشیالوجی ڈاکٹر عبدالحلیم عویس، جمعیۃ امام ابوحنیفہ بغداد کے صدر شیخ محمد محروس المدرس، مدیر المرکز الثقافی اردن ڈاکٹر امین القضاۃ، ابوظہبی کے ممتاز صحافی اور مجلہ منار الاسلام کے ایڈیٹر شیخ عبدالفتاح سعید، ملیشیا کے ندوی فاضل احمد فہمی زمزم اور دوسری جامعات، علمی اداروں، مدارس کے نمائندے اور میر واعظ کشمیر عمر فاروق شریک ہوئے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے افتتاحی نشست میں اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ:

''رابطۂ ادب اسلامی کا کام صرف تاریخوں کا جائزہ لینا ہی نہیں ہے، بلکہ ان تمام علمی گوشوں کو تلاش کرنا ہے، جہاں ادب اسلامی ملتا ہے، خطوط کی دینی حیثیت ہوتی ہے، جو آج کل ٹیلی فون پر بات کرنے کی ہوتی ہے، پہلے بے ساختہ جذبات کی ترسیل خطوط کے ذریعہ ہوا کرتی تھی، کیوں کہ خط لکھتے وقت لکھنے والا تنہا ہوتا ہے، اور اپنے مخاطب سے کھل کر بات کرتا ہے، اور اپنے جذبات کو بے تکلفی سے بیان کرتا ہے، جس طرح آج کے دور میں ٹیلی فون پر یہ سمجھ کر بات کی جاتی ہے کہ رسیور کا ایک سرا مخاطب کے پاس ہے، دوسرا خطاب کرنے والے کے پاس، اور درمیان میں کوئی نہیں۔

حضرت مولانا نے خطوط میں مرزا غالب، مولانا آزاد، اور سب سے بڑھ کر امام ابن تیمیہ کا نمونہ پیش کیا، اور انہوں نے خطوط میں عربی کے ذخیرہ کا خاص طور پر ذکر کیا اور بعض کتابوں کا حوالہ دیا جو خطوط پر مشتمل ہیں، یہ بتایا کہ جو بات خطوط میں ہے وہ اور ناچوں میں نہیں ملی۔

ڈاکٹر عبدالحلیم عویس (جامعۃ الامام ریاض) شیخ مانع حماد (سکریٹری جنرل ندوۃ الشباب العالمیہ ریاض) نے بھی اظہار خیال کیا، ڈاکٹر عویس نے بتایا کہ قاہرہ میں ادب اسلامی کی تحریک بہت فروغ پا رہی ہے اور نوجوان بڑے متوجہ ہیں، جو عیسائی ادبی انجمنوں میں جانے لگے تھے وہ ادب اسلامی کی انجمنوں و سمیناروں میں شریک ہونے لگے، ڈاکٹر حماد جہنی نے کہا کہ کمیونزم و سرمایہ داری نظام دونوں فیل ہو گئے، ادب ایمان اور اسلام کے صالح جذبات پیدا کرنے میں مؤثر ثابت ہوا ہے، ہندوستانی جامعات کی نمائندگی کرتے ہوئے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے کہا کہ اس تحریک کے نتیجہ میں نوجوان لکھنے والوں کا شعور بیدار ہوا ہے، منفی نظریہ والوں نے جو تباہی مچائی، ضروری ہے کہ ہم اپنی تحریروں ونگارشات کے ذریعہ ذہنوں کو صاف کریں۔

دوسرے دن محدث جلیل شیخ عبدالفتاح ابوغدہ بھی پہونچ گئے تھے، سمینار میں شعری نشست بھی ہوئی جس میں مختلف زبانوں عربی، اردو، ملیشین، بنگالی میں اشعار پیش کئے گئے، سکریٹری رپورٹ کاتب تحریر نے پیش کی۔ (تعمیر حیات ۲۵ رنومبر ۱۹۹۲ء ص ۱۰)

بابری مسجد کا انہدام، ظلم و بربریت کا دور دورہ اور پیام انسانیت کے جلسے

۶ ردسمبر ۱۹۹۲ء کو وہ حادثہ پیش آیا جس نے ہر صاحب ضمیر انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، فرقہ پرست لوگوں نے بابری مسجد کے مسئلہ کو لے کر ذہنوں کو مسموم کرنے کا کام ایک پوری پلاننگ کے ساتھ کیا تھا، اس کا نتیجہ وہی پیش آیا جس کا خطرہ تھا، مرکز میں کانگریس کی حکومت اور ریاست میں بی جے پی کی حکومت تھی، بی جے پی، وشو ہندو پریشد، آر۔ ایس۔ ایس، بجرنگ دل، شیو سینا ان جماعتوں کا موقف کھلا ہوا تھا کہ وہ اس ملک میں رام راشٹریہ کی بات کرتے رہے ہیں، لیکن کانگریس پارٹی نے ہمیشہ مسلمانوں کے مفاد کو بھی ساتھ رکھ

کرا پنی تحریک چلائی، مسلمانوں کو تکلیف اس بات کی زیادہ ہوئی کہ اس واقعہ سے کانگریس اپنے کو بری نہیں کر سکتی، اور اس کے وزیر اعظم نرسمہا راؤ پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، مسلم قائدین وعلماء نے ان سے ملاقات کا ایک پروگرام بنایا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی قیادت میں ایک نمائندہ وفد نے ملاقات کی، میں بھی اس وفد میں تھا، وزیر اعظم سے مل کر ملک کے حالات کے سلسلہ میں ان کا غیر ذمہ دارانہ انداز دیکھ کر مایوسی ہوئی، حضرت مولانا نے ان سے کھل کر بات کی، وہ خاموش سنتے رہے۔

فسادات ردعمل تھا، بابری مسجد کے حادثۂ شہادت کا لیکن ایسی صورت حال سے اقلیت کو زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے، ممبئی کا فساد خاص طور پر بہت فکر مندی کا باعث بنا، اور مسلم قائدین نے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے لائحہ عمل سونچا، دوسری طرف پیام انسانیت کے ایسے اجتماعات جگہ جگہ منعقد کئے گئے جن میں سیاسی پارٹیوں کی بھی نمائندگی ہو، اور شہری انتظامیہ کی بھی نمائندگی ہو اس کے ساتھ ہندو سماج کے مؤثر حضرات کو بھی مدعو کیا گیا اور بعض کو داعی بنایا گیا۔

بابری مسجد کے حادثہ پر ''تعمیر حیات'' کا اداریہ

بابری مسجد کے حادثہ پر راقم الحروف نے اپنا تأثر تحریر کیا جو ''تعمیر حیات'' میں اداریہ کے طور پر شائع ہو، اس کا اہم حصہ نذر قارئین کیا جارہا ہے:

''بالآخر ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو وہ سنگین واقعہ پیش آگیا جس کا خطرہ کئی سال سے تھا، ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء سے ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء تک مسلمانوں کو اس مسجد کے لئے کیا کیا جدوجہد کرنی پڑی، عدالتی، سیاسی، عوامی جدوجہد کی، دستور میں دی گئی ضمانتوں کا حوالہ دیا، مساویانہ حیثیت کی طرف توجہ دلائی، کیا کیا اندازے اور توقعات قائم کیں، وعدوں اور یقین دہانیوں پر اعتماد کیا، جذبات ابھرے تو ان کو سنبھالا، لیکن اکثریت کے فرقہ پرستوں کو جو ضد تھی انہوں نے پوری کی، انتظامیہ نے طاقت کا استعمال زائد از ضرورت سمجھا، اور دیکھتے دیکھتے مسجد کی عمارت فرش کے برابر کر دی گئی، مسلمانوں کے جذبات بھڑکے، انتظامیہ نے دبا دیا۔

مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ بہت صبر واستقامت کا تھا کہ بابری مسجد صرف ایک مسجد

کا مسئلہ نہیں، تمام مسجدیں اس سے جڑی ہوئی ہیں کہ وہ اس ملک میں اسلام کی اور امت اسلامیہ کی آبرو بن چکی ہے، بلکہ مسجد کو اسلام میں جو حیثیت حاصل ہے اس کی بنا پر دنیا بھر کے مسلمانوں کے دلوں میں بھی اس مسجد کی بنیادیں گڑ چکی ہیں، اس کی حفاظت کی ۴۳ سالہ جدوجہد نے اس کو صرف ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں نہیں بلکہ دنیا کے ایک ارب مسلمانوں کی دھڑکن بنا دیا ہے، فرقہ پرستوں نے اس کو گرا کر اپنا ایک منصوبہ تو پورا کرلیا، لیکن وہ دوسرا مقصد پورا نہیں کر سکتے کہ وہ آباد رہے یا نہ رہے، مسجد ہی رہے گی، اور مسلمان اس وقت تک بے چین رہیں گے جب تک اس کی بازیابی نہیں ہو جاتی، مسلمانوں کے دلوں میں یہ ایک شگاف ہے، اس کو دور کرنے کی ذمہ داری پوری کرنے میں انتظامیہ نے کوتاہی کی تو ملک کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا، اور امت اسلامیہ کی تاریخ میں اس کی بہت مثالیں ہیں کہ دیر سویر اللہ کی مدد آئی، اور یہاں بھی اسی کی امید ہے کہ مسجد ان شاء اللہ واپس ملے گی۔

رہا یہ مسئلہ کہ اب مسلمان کیا کریں تو قرآن مجید میں، فرعون، بنی اسرائیل، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں اسے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے ان واقعات سے جو قرآن مجید میں ذکر کئے گئے ہیں بڑی رہنمائی اور روشنی ملتی ہے، اہل حق کو بالآخر غلبہ حاصل ہوا اور وہ منصور و موید من اللہ ہوئے، مسلمانوں کو حوصلہ بلند رکھنا چاہئے، اور دانائی وہمت سے کام لینا چاہئے، رضائے الٰہی کے طریقوں کو اور امت دعوت کے وطیرہ کو اختیار کرتے ہوئے، ممکنہ وسائل سے جدوجہد کرنا چاہئے، اور قرآن مجید کے اس فرمان پر یقین رکھنا چاہئے کہ وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين کہ تم ہی بلند رہو گے اگر تم صاحب ایمان رہو گے۔ (از اداریہ تعمیر حیات، ۲۵/دسمبر ۱۹۹۲ء)۔

ملک میں فسادات کی لہر

بابری مسجد کے انہدام کے بعد ملک میں فسادات کا ایک سلسلہ شروع ہوا، اس سے متاثر ہو کر راقم الحروف نے ''تعمیر حیات'' کے لئے اداریہ لکھا جس کی اہم سطریں پیش کی جا رہی ہیں۔

بابری مسجد کے انہدام کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں جو ہولناک فسادات

بلکہ جان و مال کی سفا کانہ تباہی جس طرح ہوئی، اس نے اقلیت کے دلوں میں بدامنی و بے اعتباری کے غیر معمولی احساسات پیدا کردیئے، مسلمانوں کو بابری مسجد کے انہدام پر بہت صدمہ پہونچا تھا، وہ اس بات کے متوقع تھے کہ ان کے زخم دل پر کچھ مرہم رکھا جاتا، لیکن فسادات نے اوران فسادات میں یک طرفہ مسلمانوں پر مصیبت ٹوٹ پڑنے نے اور پھر اس کے بلاکسی خاص روک ٹوک کے کئی کئی روز تک وحشیانہ طریقہ سے جاری رہنے نے ملک کی انتظامیہ کے متعلق ان کو بہت مایوس کیا، اور دنیا کی نظر میں بھی انتظامیہ کا کردار بہت مجروح ہوا، انتظامیہ اگرچہ زبان سے زیادہ سے زیادہ ہمدردی ظاہر کرتا رہا لیکن اس کا طریقۂ کار مایوس کن رہا۔

خاص طور پر ممبئ کا فساد بہت ہولناک تھا، ممبئ کی تباہی کسی ایک یا دو فرقوں کی تباہی نہیں، ممبئ شہر ہندوستان کا اقتصادی دار الصنعت کی حیثیت رکھتا ہے، آدمیوں، عمارتوں، فرموں، کارخانوں، اور دکانوں کی تباہی، ملک کے اقتصادی ڈھانچہ کی بھی تباہی ہے، جس کا نقصان ملک کو کئی دہائیوں تک جھیلنا پڑے گا، اجودھیا کا واقعہ، پھر ممبئ و احمد آباد کی تباہی کا واقعہ انتظامیہ کی بے تدبیری اور لا پرواہی کی ایسی مثال ہے جو اس کے ذمہ داروں کے تعلق سے عرصہ تک یادرکھی جائے گی، اور ان کی شہرت برابر داغ دار رہے گی۔

مسلمانوں کی تعداد اس ملک میں اتنی کم نہیں ہے کہ وہ ایسی کوششوں سے فنا کردئے جائیں، فسادات سے صرف یہ ہوگا کہ جانی و مالی تباہی کا سلسلہ چلے گا پھر تھک کر یا ظلم و زیادتی کی کثرت سے شرما کر لوگ بتدریج تھم جائیں گے لیکن کئی دہائیوں تک وہ کئی طرح کی تباہی کے نتائج بھگتیں گے، کوئی ایک فریق دوسرے فریق کو ختم کرنے کی تمنا پوری نہ کر سکے گا۔

عدم تشدد، رحم دلی، انسانی ہمدردی کی دعوت یا ارادے کے لئے جو عملی فکرمندی بلکہ ایثار و قربانی کی ضرورت ہے، اس کے بغیر ہندوستان کے جمہوریت اور عدم تشدد کے دعوے صدا بصحراء سے زیادہ ثابت نہ ہوسکیں گے، اور ہندوستان اپنے قائدین آزادی کی جن تمناؤں کے ساتھ آزاد ہوا، وہ تمنائیں کامیاب نہ ہوسکیں گی۔

دوسرے اس سنگین حادثہ کی وجہ سے اور اس سے پیدا ہونے والی ہلاکت خیزی

کے حال میں اقلیت کے لئے صبر و برداشت کا امتحان ہے، لیکن مسلمان ہونے کی وجہ سے اپنے تأثر و ناراضی کے اظہار میں اور واقعہ کے ردعمل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دکھائے ہوئے راستہ سے ہٹنا نہیں ہے، اسی میں مسلمان کے لئے کامیابی کی ضمانت ہے، مسلمان کا کام اللہ کی نصرت سے بنتا ہے، اور یہ نصرت اللہ کو راضی کرنے پر آتی ہے۔

(تعمیر حیات، ۲۵ر جنوری ۱۹۹۳ء)

بارہ دری لکھنؤ میں پیام انسانیت کا بروقت اور اہم جلسہ

۶ر جنوری ۱۹۹۳ء کو لکھنؤ کی مشہور تاریخی عمارت قیصر باغ بارہ دری میں پیام انسانیت کا ایک عظیم اجلاس ہوا، جس کی صدارت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمائی، جس میں بلاتفریق مذہب و ملت بہت سے نامور دانشور اور بعض سیاسی لیڈران اور عوام و خواص کا ایک اچھا مجمع موجود تھا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا خطاب ''ملک و معاشرہ کا سب سے خطرناک مرض ظلم و سفاکی'' کے نام سے رسالہ کی صورت میں بھی شائع ہوا، جس میں توجہ دلائی گئی تھی کہ اس اعصابی جذباتی دورہ کے دور کرنے کا سب سے مفید و مؤثر طریقہ مذہبی پیشواؤں، ملک کے دانشوروں اور سیاسی قائدین کی جدوجہد اور مہم جوئی کی ضرورت ہے۔

وزیر اعظم نرسمہا راؤ سے علماء و قائدین کے ایک وفد کی ملاقات

۹ر جنوری ۱۹۹۳ء کو آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے ایک وفد نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سربراہی میں وزیر اعظم ہند پی وی نرسمہا راؤ سے ملاقات کی، اس ملاقات میں بابری مسجد کا موضوع اور مہاراشٹر اور گجرات کے فسادات کا موضوع بھی آیا، وفد میں مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم وقف دارالعلوم دیوبند، مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ، جناب صلاح الدین اویسی، جناب ظفریاب جیلانی، مولانا عبدالکریم پاریکھ اور دوسرے حضرات تھے، راقم الحروف بھی اس سفر و ملاقات میں ساتھ تھا، حضرت مولانا نے وزیر اعظم سے مذکورہ موضوعات پر کھل کر بات کی، یہ بات بھی سامنے لائی گئی کہ حکومت کو جو کرنا چاہئے

تھا اس نے اس میں کوتاہی کی، اور بابری مسجد کی شہادت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جگہ مسجد کی نہیں رہی، اور یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ مسجد دوبارہ وہیں بنے، یہ ملاقات ایک گھنٹہ چلی، سلامتی ایجنسیوں اور ریاستی حکومتوں نے اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں جو کوتاہی کی، اس کی طرف بھی توجہ دلائی گئی، وزیر اعظم سب خاموش سنتے رہے۔

رائے بریلی میں پیام انسانیت کا جلسہ

۸ر فروری ۱۹۹۳ء کو شہر رائے بریلی میں گورنمنٹ کالج کے وسیع میدان میں ملک کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لینے اور ان خطرات کو محسوس کرنے اور ان کا سد باب کرنے کے لئے جو ملک کو درپیش ہیں، فرقہ وارانہ اتحاد، ملک میں امن وامان، تحفظ کا احساس اور باہمی اعتماد واحترام کی فضا پیدا کرنے کے لئے شہر اور ضلع رائے بریلی کے متعدد ہندو، مسلم، سکھ خیر پسندوں اور انسانیت دوستوں سے حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے زیر صدارت ایک بڑے جلسہ کے انعقاد کا انتظام کیا، جس میں سامعین وشرکاء کی تعداد کا اندازہ جو مختلف فرقوں، مسلکوں، پیشوں اور ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے، ۱۰-اور ۱۵ ہزار کے درمیان کیا جاتا ہے، متعدد ہندو مسلم سکھ مقررین نے اظہار خیال کیا، اور ملک کی موجودہ صورت حال پر اظہار افسوس وفکر وتردد کیا، سامعین اول سے آخر تک ہمہ تن گوش رہے، حاضرین کا احساس تھا کہ انہوں نے شہر میں اس سے بڑا جلسہ نہیں دیکھا، حضرت مولانا کی یہ تقریر رسالہ کی صورت میں ''ملک میں آزادی کا صحیح مطلب اور فائدہ۔ ہندوستان کی موجودہ صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ'' کے عنوان سے اردو اور ہندی میں طبع ہوا۔

لکھنؤ کے جلسہ پیام انسانیت کی طرح یہ جلسہ بھی اہمیت کا حامل تھا اور اس جلسہ کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کے داعی سابق ایم پی وایم ایل رائے بریلی کے ایک ہندو لیڈر اکھلیش سنگھ تھے۔

چند اہم اہل علم ودعوت کی وفات

ادھر چند ماہ میں جن اہم اور اہل علم وادب نے وفات پائی ان میں دار العلوم ندوۃ

العلماء کے لائق فرزند، اور استاد اور رابطہ ادب اسلامی کے مرکزی دفتر لکھنؤ کے انچارج مولوی عبدالنور نور عظیم ندوی کا سانحۂ وفات ہے جنھوں نے طویل علالت کے بعد اتوار ۲۷/ شعبان ۱۴۱۳ھ مطابق ۳۱/ جنوری ۱۹۹۳ء کو لکھنؤ میں وفات پائی، اور ڈالی گنج قبرستان میں تدفین عمل میں آئی جس میں ہزاروں کا مجمع شریک تھا، مرحوم کا وطن ضلع سدھارتھ نگر (بستی) تھا، انہوں نے مقامی تعلیم کے بعد دارالعلوم سلفیہ بنارس، مدرسہ رحمانی جھنڈانگر (نیپال) اور پھر ندوۃ العلماء میں بھی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد دارالعلوم احمدیہ دربھنگہ میں کچھ مدّت پڑھایا اور ندوہ میں استاد ہوئے، ازہر جاکر عربی ادب میں ایم اے کیا، اور پھر کچھ وقت جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض میں عربی وانشاء کی تدریس کی اور پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء واپس آکر پڑھانے لگے اور تاحیات یہ خدمت دی، اور رابطہ ادب اسلامی کے تحریک میں سرگرم وفعال رہے۔

دوسرا حادثہ مولانا غلام محمد نورگت ترکیسری کا ہے، جنھوں نے ۲۱/ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ کو قلبی دورے کے نتیجہ میں وفات پائی، مولانا ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن تھے، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بڑا تعلق رکھتے تھے، ان کی دعوت پر مولانا کا گجرات کا سفر ہوا اور انہوں نے دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر کی تقریب سنگ بنیاد میں جو کئی دہائیوں کی بات ہے، بلایا تھا۔

اور ایک حادثہ وفات ہمارے خاندانی تعلق کا ہے کہ برادر عزیز مولوی سید محمد الحسنی بن مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کی اہلیہ اور میرے پھوپھی زاد بھائی ڈاکٹر سید حسن مثنیٰ حسنی کی بڑی صاحبزادی سیدہ زکیہ (والدہ مولوی عبد اللہ حسنی ندوی، مولوی عمار عبدالعلی حسنی ندوی، مولوی بلال عبدالحی حسنی ندوی) ہے، ۲۴/ شوال ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۷/ اپریل ۱۹۹۳ء کو مختصر علالت کے بعد وفات پائی، اور تدفین آبائی قبرستان تکیہ کلاں رائے بریلی میں ہوئی۔ یہ حادثہ پورے خاندان کے لئے خاص طور پر مرحومہ کے والدین ماجدین کے لئے سخت حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔ مرحومہ کی تعلیم وتربیت میں ان کے نانا مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنیؒ کا بڑا حصہ تھا اور مرحومہ کی دادی صاحبہ بھی بڑی سوجھ

بوجھ رکھنے والی خاتون تھیں، جو کاتب تحریر کی حقیقی پھوپھی تھیں۔

۱۱رمئی ۱۹۹۳ء کو جنوبی ہند کی اہم شخصیت مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری نے وفات پائی، وہ صاحب علم ودعوت اور صاحب مسند ارشاد بزرگ تھے، اور دار العلوم دیوبند میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھیوں میں تھے اور لاہور میں حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے یہاں زمانہ تعلیم میں ساتھ رہے تھے، اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن بھی تھے، اور اس کے جلسوں میں تشریف لاتے تھے، مجھے بھی ان کی شفقت حاصل تھی۔

پانچواں حادثہ عالم اسلام کی ممتاز شخصیت ادیب وصحافی، مفکر وداعی شیخ احمد محمد جمال کا ہے، جن کا روز عرفہ (۹رذی الحجہ ۱۴۱۳ھ) کو قاہرہ میں انتقال ہوا، اور خادم الحرمین الشریفین کے خصوصی طیارہ سے مکہ مکرمہ ان کا جنازہ لایا گیا، اور جنۃ المعلاۃ میں تدفین ہوئی۔

رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے ایک وفد میں جو ۱۹۷۳ء میں شام، لبنان، اردون، عراق، کویت گیا تھا۔ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے ساتھ میں بھی تھا جہاں انہیں بہت قریب سے دیکھنے اور ان کی صفات وکمالات سے واقفیت کا موقع ملا، وہ گذشتہ سال رابطہ ادب اسلامی کے حمد ومناجات کے سمینار میں رائے بریلی بھی آئے تھے، اور مجلہ التضامن الاسلامی مکہ مکرمہ میں جس کے اس وقت وہ ایڈیٹر تھے، اپنے اچھے تأثرات بھی لکھے تھے۔

اور ایک حادثہ حکیم صیانت اللہ صدیقی امروہوی کا ہے جن کا ۲۴رمئی ۱۹۹۳ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے انتقال ہوا، وہ بھی ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن تھے اور بڑے حاذق طبیب اور صاحب علم وتحقیق تھے۔ اس کے ساتھ انہیں خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے بیعت کی اجازت حاصل تھی جن سے وہ بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے۔

''صحافت عصر حاضر میں'' - ایک محاضرہ

دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کی انجمن الاصلاح نے راقم السطور کو محاضرہ کی دعوت دی جس کا موضوع ''صحافت عصر حاضر میں'' تھا، یہ پروگرام ۲۳رمئی ۱۹۹۳ء کو ہوا، جس میں عالمی صحافت پر یہودی اقتدار کا خاص طور پر ذکر کیا گیا کہ وہ عالمی صحافت اور ذرائع ابلاغ پر پوری

طرح قابض ہیں، اور دنیا کے تمام ملکوں خصوصاً عالم اسلام میں وہ بارودی سرنگوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں، حقائق کو مسخ کر کے اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں یہودی صحافت کو خاص ملکہ حاصل ہے، وہ جس واقعہ کو جس رنگ میں پیش کرنا چاہتے ہیں، پیش کرتے ہیں، پوری دنیا میں مسلمانوں کا قتل عام ہورہا ہے، مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی اور اگر اتفاق سے کسی یہودی کے تلووں میں کانٹا بھی چبھ جائے تو اسے صفحہ اول میں جلی سرخیوں میں شائع کرتے ہیں، کوئی بھی مسلم حکمراں یا امیر جب کوئی ایسا اقدام کرتا ہے جس سے اسلام اور مسلمانوں کو تقویت پہونچتی ہو، تو اس کے خلاف آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں، اور بنیاد پرستی، تاریک خیالی، ظلم و بربریت کا الزام لگاتے ہیں، اور دنیا کے سامنے اسے اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ گویا یہی پوری انسانیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے، البتہ ان سیاست دانوں اور حکمرانوں کی مدح سرائی میں ضرور زمین آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں، اور ان کے ناپاک عزائم کی تکمیل اور صہیونی منصوبوں کی تنفیذ کے لئے آلہ کار بنے رہتے ہیں، اور عصر حاضر میں ہر اسلام پسند کو رجعیت پسند، اصول پرست (بنیاد پرست) دقیانوس، تشدد پسند، دہشتگرد، انسانی حقوق کو پامال کرنے والا جیسے القابات سے بدنام کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

مقالہ میں یہ بھی بتایا گیا کہ ذرائع ابلاغ کے کلیدی منصوبوں پر یہودی طویل پلاننگ اور سخت فکر و تدبر سے پہونچے ہیں، اور پہونچ جانے کے بعد ذہنوں کی کنجی ان کے ہاتھوں میں ہے اور یہ بھی بتایا گیا کہ صحافت کے مختلف میدان ہیں، سیاسی میدان، ثقافتی میدان، اصلاحی میدان و اخلاقی و دینی میدان، اقتصادی میدان۔

اور حال یہ ہوتا ہے کہ مخصوص ذہنی مقصد کو لے کر چلا جاتا ہے، اور اسی کے تحت رنگ لہر پیش کیا جاتا ہے جس سے خبر سننے والا یا پڑھنے والا رفتہ رفتہ غیر محسوس طریقہ سے اس کے افکار و تصورات کا ہم نوا بن جاتا ہے۔

استنبول میں رابطۂ ادب اسلامی کی کانفرنس

۱۷/ اگست ۱۹۹۳ء کو حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی استنبول میں رابطہ ادب

اسلامی کے سہ سالہ اجلاس، لندن کے پروگرام اور امریکہ میں تمام مذاہب کی ایک عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے دہلی سے روانہ ہوئے اور دبئ ہوتے ہوئے استنبول پہنچے، راقم الحروف بھی ان کے ہمراہ تھا، اور بھائی عثمان حیدر آبادی بھی ساتھ تھے۔

۲۰ راگست کو عالمی رابطہ ادب اسلامی نے اپنا سہ سالانہ اجتماع ترکی کی تاریخی راجدھانی استنبول میں زیر صدارت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی منعقد کیا جو ۲۷ راگست تک جاری رہا، اس اجتماع کے افتتاحی اجلاس میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کے صدر مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے صدارتی خطبہ دیا اور افتتاحی نشست میں مولانا ہی نے دعا کی۔

اس اجلاس میں ادب اسلامی کو ممتاز کرنے کے سلسلے میں متعدد اہم فیصلے کیے گئے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ ادب اسلامی کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا مقابلہ کرایا جائے، یہ مقابلہ جس کے بارے میں باقاعدہ اعلان جلد کیا جائے گا، فی الحال عربی سے اردو اور اردو سے عربی تک محدود رہے گا۔

رابطہ ادب اسلامی نے ایک اہم فیصلہ یہ بھی کیا کہ اسلامی ادیبوں کے تعارف کے لیے ایک ڈائرکٹری تیار کی جائے گی نیز اسلامی ادب کے دائرے میں آنے والے پی ایچ ڈی کے مقالات کی بھی ایک ڈائرکٹری تیار کی جائے گی، اس کام کو رابطہ کا صدر دفتر انجام دے گا، اس کے نتیجے میں اسلامی ادب پر کام کرنے والوں کی رہنمائی بھی ہوگی اور ان کا آپس میں ایک دوسرے سے تعارف ہو سکے گا۔

رابطہ نے مصر کے مشہور اسلامی ادیب استاذ کیلانی کے اعزاز میں اور ان کی قدردانی کے طور پر آئندہ موسم سرما میں قاہرہ میں ایک جلسہ بلانے کا فیصلہ کیا، اس موقع پر اسلامی ادب کے موضوع پر ایک سیمینار کا بھی اہتمام کیا جائے گا، اس کے ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ دیگر اسلامی ادیبوں کے اعزاز میں بھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے اجتماعات کیے جائیں گے۔

رابطہ نے طے کیا کہ وہ دو سہ ماہی رسالے شائع کرے گا، عربی کا عربی دفتر سے اور اردو کا برصغیر کے دفتر سے۔

اردو سے عربی، عربی سے اردو زبان میں اسلامی ادب کے ترجمے کے مقابلے

کے سلسلے میں ذمہ داری کو متعلقہ دفتر کے سپرد کیا گیا۔

کام کی آسانی کے لیے رابطہ ادب اسلامی کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا، ایک برصغیر ہندوپاک اور اطراف کے ملکوں کے لیے، دوسرا عرب ممالک اور اس کے قریبی ملکوں کے لیے، دونوں کے صدر دفتر ایک ایک نائب صدر کے تحت رکھے گئے اور دونوں کے مشترکہ صدر مولانا علی میاں ندوی تھے، استنبول میں دونوں حصوں کا یہ تیسرا سہ سالہ اجلاس ہوا۔

اجلاس میں دونوں دفاتر کے ذمہ داروں نے اپنی جو رپورٹ پیش کی اس میں اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا گیا کہ رابطہ ادب اسلامی نے عالمی پیمانے پر آج سے سات برس قبل جو کام شروع کیا تھا، وہ اس وقت دنیا کے مختلف ملکوں مصر، اردن، مراکش، سعودی عرب، پاکستان، ہندوستان، بنگلا دیش اور جنوبی افریقہ میں بڑی مقبولیت حاصل کر رہا ہے اور باقاعدہ کام ہو رہا ہے۔

اجلاس کے دوران جس کے افتتاحی جلسے میں مصر کے ممتاز اہل قلم و ادیب محمد قطب مصری نے خطبہ دیا اور ترکی کے نمائندے اور ترکی زبان کے شاعر و ادیب پروفیسر علی نار نے مہمانوں کا استقبال کیا، دونوں سکشنوں کے ذمہ داروں نے اپنی اپنی رپورٹ پیش کی جس میں ادب اسلامی کے تعارف و ترویج کے سلسلے میں جو کام ہو رہا ہے، اس کو جو وسعت ملی ہے، اس کا جائزہ لیا گیا۔

رابطہ کے عربی دفتر کے ذمہ دار ڈاکٹر عبد القدوس ابوصالح نے عربی دفتر کی رپورٹ پیش کی جس میں اسلامی افسانہ نگاری کے مقابلے کے نتائج کی تفصیل بتائی گئی۔ اس مقابلے کا اعلان ایک سال قبل ہوا تھا، اور مقابلے میں داخل ہونے والی تصنیفات کی جانچ کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی تھی۔

انھوں نے بتایا کہ اردن کے ادیب جہاد رجبی کو دو ہزار ڈالر کا پہلا انعام افسانے پر دیا گیا۔ مختصر افسانے پر ۵سو ڈالر کا انعام مصر کے ادیب احمد محمود مبارک کو ملا۔ افسانے کا دوسرا انعام مراکش کے سلام احمد ادریس کو ملا جو ڈیڑھ ہزار ڈالر کا ہے۔ تیسرا انعام افسانے پر شام کے عبد السلام راغب کو ملا جو ایک ہزار ڈالر کا ہے، مختصر افسانے پر دوسرا انعام اردن کے خالد حروب کو

ملا جو ۳ سوڈالر کا ہے، اور تیسرا انعام مصر کے فاروق حسام سید کو ملا جو ۲ سوڈالر کا ہے۔

اس کے علاوہ بعض اچھے افسانوں پر فلسطین، مصر، سعودی عرب اور اردن کے افسانہ نگاروں کو فی کس سوڈالر کا انعام دینا منظور کیا گیا، افسانہ نگاری کے مقابلے میں ہندوستان اور ملیشیا سے بھی افسانے موصول ہوئے تھے لیکن وہ انعام کے معینہ معیار پر پورے نہیں اترے۔

رپورٹ میں بتایا گیا کہ انعامات کی تقسیم آئندہ موسم سرما میں قاہرہ یا عمان میں ایک تقریب منعقد کر کے کی جائے گی۔

رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ عربی دفتر سے ادب کی پانچ کتابوں کی تیاری اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے۔

برصغیر کی طرف سے پیش کردہ رپورٹ میں سالانہ سمیناروں اور متعدد کتابوں کی اشاعت اور ادب اسلامی کی ترویج کے سلسلے میں مختلف ریاستوں کے دوروں کا تذکرہ کیا گیا تھا، رپورٹ برصغیر کے دفتر کے ذمہ دار کے طور پر کاتب تحریر نے پیش کی۔

اس عالمی اجتماع کے بعد ادب اسلامی پر ایک علمی مذاکرہ (سمینار) کا بھی انعقاد کیا گیا جو ''اسلامی نظریہ ادب کے سلسلے میں مختلف تصورات اور ان کے مابین نقطۂ اتحاد'' کے موضوع پر تھا، اس موضوع پر مختلف ملکوں کے آٹھ پروفیسروں نے تحقیقی مقالے پیش کیے جو گہرے مطالعہ اور علمی جائزوں پر مشتمل تھے، ہندوستان سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبہ عربی سید ضیاء الحسن ندوی نے اپنا مقالہ پیش کیا جس کو حاضرین نے مضمون اور زبان دونوں لحاظ سے پسند کیا۔ ظہران یونیورسٹی کے پروفیسر جابر قمیحہ اور امام محمد ابن سعود یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح کے مقالے بھی خاصے فکر انگیز اور موضوع پر سیر حاصل بحث کرنے والے تھے۔

ایک گراں قدر مکتوب

استاذ الاساتذہ مولانا محمد ناظم ندوی مدظلہ رابطہ ادب اسلامی کی کانفرنس میں شرکت

کے لیے پاکستان سے استنبول تشریف لے گئے تھے، جہاں چند روز حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ان کی رفاقت رہی، ترکی سے واپسی کے بعد موصوف نے مکتوب اپنے رفیق درس و رفیق عمر حضرت مولانا کے نام بھیجا ہے وہ اس لائق ہے کہ اس سے ہمارے قارئین کرام بھی محفوظ ہوں، اس مکتوب میں استنبول کے یادگار مقامات کا ذکر بھی کیا گیا ہے، اور اس میں حب و وفا کی تصویر سامنے آتی ہے جواب نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

صدیقی و حبیبی الکریم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید ہے کہ آپ لندن کے بعد امریکہ سے بعافیت لکھنؤ واپس آگئے ہوں گے۔

۲۰؍اگست یوم شنبہ کو آپ لندن کے لیے روانہ ہوئے تھے، میں دوسرے روز اتوار کی شام کو استنبول سے روانہ ہو کر ۳۰؍اگست کی صبح کو کراچی پہونچا۔ علی سلمہ پاس لے کر طیران گاہ کے اندر موجود تھے، پہونچتے ہی میں نے علی سے کہا کہ ہمارے قلبی صدیق جنھوں نے اپنے تعلق خاطر کی بناء پر تاکید سے کہا ہے کہ کراچی پہونچتے ہی اپنی بعافیت واپسی سے مطلع کرنا، لندن کا پتہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے ان کو دے دیا، وہ گلشن اقبال میں رہتے ہیں اور میں اپنے قدیم مکان ملیسر میں رہتا ہوں، دو دن کے بعد انھوں نے کہا کہ ہڑتال اور ہنگامہ کی وجہ سے گھر سے باہر نہیں نکل سکا، میں نے کہا کہ آپ کو تار بھیجنا بے کار ہے کہ آپ لندن سے امریکہ کے لیے روانہ ہو چکے ہوں گے، مجھے ان کی اس کوتاہی یا مجبوری پر بہت قلق ہوا۔

استنبول کا یہ سفر آپ کی دعوت کی بنا پر ہوا، آپ کی محبت مجھ کو کشاں کشاں استنبول لے گئی، ۶-۷؍سال کے بعد آپ سے ملاقات کر کے جو مجھ کو خوشی ہوئی، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، آپ کا بھی یہی حال تھا، ملتے ہی آپ نے اپنے تعلق اور محبت کا جس انداز میں ذکر کیا وہ میرے لیے باعث صد سعادت و شرف ہے، میرا خیال تھا کہ مجھے آپ سے زیادہ تعلق ہے، اس سے پہلے بھی زمانۂ طالب علمی کو مستثنیٰ کر کے اتنی طویل رات، دن ہر وقت ملاقات کا موقع نہیں ملا تھا، ہر نماز، ہر ناشتہ، ہر کھانا، دن رات کا ساتھ ساتھ بلکہ پہلو بہ پہلو،

ہر لمحہ، مسرت وسعادت تھا، سوا آرام کرنے کے اوقات کے ہر آن ایک جگہ رہے، ماضی کی یاد تازہ کرتے رہے۔

میں کیا بتاؤں کہ مجھ پر کیسا ذھول خود فراموشی کی کیفیت رہی، آپ سے مل کر آپ کی تقریر سن کر آپ کا آبدیدہ ہوکر اپنے قلبی جذبات کا اظہار، یہ وہ منظر اور یادگار لمحات ہیں جن کو الفاظ میں ادا نہیں کیا جاسکتا، آپ کی وجہ سے استنبول دیکھا، حضرت ابوایوبؓ انصاری صحابی رسول ﷺ کے مزار پر حاضری دی، مسجد فاتح میں جمعہ کی نماز ادا کی، میں جب زینہ کو طے کرتا ہوا بعض ترکی نوجوان کے سہارے سے اوپر پہونچا تو میرے جذبات کا سمندر امنڈ آیا، اپنے اوپر قابو نہیں پاسکا، کمزور دل کو تھام نہ سکا، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور دل کو ہلکا کیا کہ یہ محمد فاتح کی یادگار مسجد ہے جس نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تھا، اس کے قلعہ کو مسمار کرنے کے لیے خاص قسم کی توپ بنائی تھی، عہد بیزنطینی کی دیوار اب بھی موجود ہے جو اس قلعہ کی پختگی کی علامت ہے، آپ ہی کی وجہ سے باسفورس کے جمیل ترین ساحل پر واقع محل کے سامنے سبزہ زار پر نماز مغرب ادا کی پھر اس کے سبزہ زار پر بیٹھ کر سمندر کا حسین منظر دیکھا، پھر دوسری بلند منزل پر واقع دوسرے سبزہ زار پر رات کا کھانا کھایا، ہر کھانا اور ناشتہ میں ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب رہے، سبحان اللہ! کیا ساعت تھی جو معلوم نہیں دوبارہ کب آئے گی۔

دوسرے جمعہ کی نماز بھی ترکی کی دوسری تاریخی مسجد سلیمان قانونی میں ادا کی، دوسری مسجد پہلی مسجد سے زیادہ وسیع، حسین اور بلند تھی، مسلسل تقریباً دس دن تمام نمازیں ایک جگہ ادا کیں، ناشتہ کھانا ساتھ کھایا، تمتع من عرار نجد، مشہور شعر آپ نے بار بار پڑھا اور دوسرے فارسی شعر بھی اسی مضمون کے پڑھے، کیا ایسے دن پھر آئیں گے؟

آپ کی وہ تاریخی تقریر جس کے متعلق آپ نے مجھ سے کہا کہ راستہ میں اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا، حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا جو ذکر قرآن کریم میں ہے کہ حضرت خضر نے دو یتیم بچوں کے صالح باپ کی خاطر اس دیوار کو قائم کیا جس کے نیچے صالح باپ نے اپنے بچوں کے لیے خزانہ دفن کیا تھا، آپ نے کیا خوب استدلال کیا کہ صالح باپ کی وجہ سے اگر یتیم بچوں کو خزانہ دیا جاسکتا ہے تو آپ کے صالح آباء

واجداد، غازی وفاتح سلف کی خاطر آپ لوگوں کو دوبارہ عظمت کیوں نہیں دی جاسکتی؟ اس عربی تقریر کے ترکی ترجمہ کے بعد ترک نوجوان نے جذبات سے مغلوب ہوکر اپنی کرسیوں سے اٹھ کر نعرۂ تکبیر بلند کیا، کیا خوب منظر تھا، آپ کے اس استدلال کی داد نہیں دی جاسکتی، یہ الہامی تقریر تھی جو آپ کی زبان سے ادا کی گئی۔

آپ سے ملاقات کے بعد مجھے اپنا یا جلسہ کا کوئی پروگرام باعث کشش نہیں رہا۔ ذہول اور خود فراموشی کا یہ حال ہوا کہ جو ادب عربی پر عربی مقالہ لکھ لے گیا تھا، اس کو ڈاکٹر عبد القدوس ابوصالح نائب الرئیس، رابطہ الادب الاسلامی کے حوالہ کرنا بھی بھول گیا، عزیزی محمد رابع صاحب کے لیے ایک اردو میں مقالہ لکھا تھا جو تقویم ناسوتی اور تقویم ملکوتی کے درمیان فرق پر تھا جس میں میں نے کمیونزم کی جو مدت حکومت ماسکو میں رہی تھی، اس کو تقویم ملکوتی کے حساب سے ایک گھنٹہ ۴۸ منٹ ثابت کیا تھا اور چونکہ انسان عجلت پسند ہے لہٰذا تقویم ناسوتی کے ۷۴-۷۵ سال جو کمیونزم کی مدت حیات ہے، اسے طویل سمجھ کر گھبرا گیا تھا میں نے اس میں لکھا تھا کہ اے عجلت پسند انسان! امریکہ عالمی طاقت کی مدت بھی چند منٹ سے زیادہ نہیں ہے۔

آپ نے یہودیوں اور فلسطینیوں کے درمیان معاہدہ امن کی خبر اخبار میں پڑھی ہوگی، عیسائیوں کی فتوحات کا سلسلہ جو جنگ بلقان ۱۹۱۲ء سے شروع ہوکر دولت عثمانیہ کی شکست ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد قائم رہا، اب اس کی تکمیل ہورہی ہے، عربوں کی بے بسی، یہودیوں کی بالادستی، امریکہ کا عالمی نظام جدید کا آغاز اور اس کی کامیابی، عربوں کی عربیہ اور عروبہ کی جزیرۃ العرب میں ناکامی، چھوٹی چھوٹی کمزور حکومتوں کا قیام جو سب امریکہ کے طفیلی ہیں اور امریکہ کی بری، بحری فوج کی جزیرۃ العرب کے چاروں طرف پھیلی ہوئی طاقت ہے، یہودیوں کا تیز خنجر اسرائیلی حکومت کی شکل میں عرب ممالک کے قلب میں پیوست ہے، یہ معاہدہ امن عربوں کی شکست کی المناک یادگار ہے۔

یہودی وزیر اعظم نے جو ڈانٹ کر فلسطینیوں کو بات کہی ہے، معلوم نہیں اس کی تلخی عربوں نے محسوس کی کہ نہیں؟ مصریوں نے ۱۴ سال قبل یہودیوں کا اعتراف کیا تھا، یہ

دوسرا معاہدہ امن دیکھئے کیا رنگ لاتا ہے، اس معاہدہ امن میں بیت المقدس کو یہودیوں کے قبضہ میں رکھنے کا ذکر ہے اور تین سال تک اس موضوع پر بات کرنے کی فلسطینیوں کو اجازت نہیں ہے، بلد یاتی آزادی کا سودا کر کے یاسر عرفات خوش ہیں اور عیسائی بیوی سہا کو اپنے ساتھ واشنگٹن لے جا کر مسرور وشاداں ہیں۔

میرے ذہول اور خود فراموشی کا یہ حال رہا کہ وہ مضمون بھی آپ کو نہ دے سکا جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا جو زمان ومکان وقرآن کریم کے عنوان پر لکھا تھا، آپ نے اس میٹنگ کے اختتامی مشاعرہ میں اپنے شعر سنانے کو کہا تھا، ابھی میں اٹھنے والا تھا کہ وہ مجلس برخواست کر دی گئی اور عالم ذہول میں کھویا رہا، لیکن مجھے اپنے ذہول پر اور خود فراموشی پر زیادہ افسوس نہیں ہے کہ اس سفر کی میری غرض اور تمنا پوری ہوگئی یعنی آپ سے طویل ملاقات، بر آں ملاقات آپ کے ساتھ نماز باجماعت کی سعادت، ساتھ ناشتہ کھانا، گفتگو، آپ کی تقریروں کی سماعت کی مسرت، آپ کی محبت وتعلق وتعلق خاطر کا بار بار ذکر۔ عزیزی رابع صاحب اور عزیزی واضح صاحب نے جو میری خاطر مدارات کی اور جو آرام پہونچایا، ان سب کا شکر گزار ہوں، برادرم سعید الرحمٰن صاحب ندوی اور دوسرے ندوی عزیزوں کو سلام مسنون۔

آپ کا قدیم رفیق محمد ناظم ندوی

استنبول میں ہم نے محسوس کیا کہ آپ کی اشتہا بہت کم ہوگئی ہے، برائے نام آپ "لقیمات یقمن صلبی" پر عمل کرتے تھے، یہ کیفیت ہم سب کے لیے باعث تشویش تھی، امید ہے امریکہ سے واپسی کے بعد یہ کیفیت یعنی عدم اشتہا کی کیفیت جاتی رہی ہوگی، لندن وامریکہ کے سفر میں آپ کی تقریروں کے ریکارڈ سننے کی تمنا ہے، لندن وامریکہ کے سفر کے بعد آپ کا سفر حجاز کتنے دنوں تک رہا اور کب واپسی ہوئی؟

۱۲/ روز کے بعد جب میں کراچی آیا تو ایسا محسوس ہوا کہ ۱۲/ دنوں تک فاقہ کے بعد کھانا کھا رہا ہوں، اپنے وطن کے کھانے کی کیا بات ہے؟ کھاتے ہی طاقت ونشاط محسوس کی۔

استنبول میں طیران گاہ تک محترم علی نار رخصت کرنے آئے اور دوسرے شامی نوجوان خالد حسن ابوتائب بھی اندرون طیران گاہ تک آئے، یہ پشاور میں کسی ادارہ سے

مسلک ہیں، مع اہل وعیال مقیم ہیں، عربی زبان کے اچھے قادر الکلام شاعر ہیں، جہاد افغانستان پر جس قدر عربی، فارسی پشتو وغیرہ میں قصیدے کہے گئے ہیں، ان کے منظوم ترجمے کررہے ہیں، زبان پر خوب قدرت ہے، میرا دیوان انھوں نے بالاستیعاب پڑھا۔

آپ کے سفرنامے کا انتظار رہے گا، پرسوں مدثر میاں کے فون سے معلوم ہوا کہ ان کے والد جناب توسل حسین صاحب کا دہلی آتے ہوئے راستہ میں انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، صالح دیندار شخصیت تھی۔

آپ کا مخلص قدیم رفیق معترف، محمد ناظم ندوی۔

لندن میں

استنبول سے ۲۸ راگست کو لندن روانگی ہوئی، جہاں ایرپورٹ پر پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب، ڈاکٹر فرحان احمد نظامی صاحب، عزیزی مسرور احمد لکھنوی اور عزیزی محمد اکرم ندوی استقبال کے لیے موجود تھے، ایرپورٹ سے سیدھے آکسفورڈ گئے اور جناب ڈاکٹر فرحان احمد نظامی صاحب کے مکان پر قیام رہا، یکم ودو ستمبر کو سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز کے اجتماعات ہوئے جن میں مقامی ارکان اور یونیورسٹی کے نمائندوں کے علاوہ ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف، شیخ یوسف قرضاوی، سلطنت برونائی کے نمائندہ اور سنٹر کے رکن کی حیثیت سے وہاں کے وزیر تعلیم شیخ عبدالعزیز شریک ہوئے، پہلی نشست میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے عربی میں خطاب کیا جس میں حاضرین کا خیر مقدم کیا گیا، پھر ۲ رستمبر کو اجلاس بخیر وخوبی ختم ہوا، ان دودنوں میں میں نے سنٹر کے کاموں کو دیکھا اور اس سے بڑی خوشی ہوئی۔

۲ رستمبر کی شام کو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ آکسفورڈ سے لندن مسرور صاحب کے مکان پر منتقل ہوگئے، اگلے دن جمعہ کو ان کی نوتعمیر شاندار مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی گئی اور نماز سے پہلے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا خطاب ہوا، نماز پڑھ کر اپنے مستقر پر آگئے اور کچھ ٹھہر کر ایرپورٹ ہوگئے، جہاں عصر کی نماز پڑھی گئی اور غروب آفتاب سے پہلے نیویارک کے لیے روانہ ہوگئے، نیویارک میں ماسٹر سمیع صدیقی مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی، فصیح احمد صدیقی، ڈاکٹر رضی احمد صدیقی اور جناب ہدایت حسین (سابق معتمد مال ندوۃ

العلماء) کے صاحبزادہ ساجد حسین صاحب، مرحوم امین سلونوی صاحب کے صاحب زادہ ڈاکٹر عرفان امین اور بعض دیگر احباب سے ملاقاتیں ہوئیں، پھر ۴؍ستمبر کو شکاگو (امریکہ) میں تمام مذاہب کی ایک عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے کے لیے روانہ ہو گئے۔

شکاگو میں عالمی مذاہب کانفرنس

شکاگو کے اس پروگرام میں شرکت کے لئے جناب ڈاکٹر احمد عبدالحی پٹنہ کا بہت اصرار تھا، ان کے بھائی شکاگو میں ڈاکٹر حامد عبدالحی ان سے تقاضہ کر رہے تھے، اور اس کی اہمیت بتا رہے تھے کہ وہاں کے بسنے والوں نے عالمی بھائی چارہ، مفاہمت وغیرہ کے مقاصد کے تحت عالمی کل مذاہب کانفرنس کا اہتمام کیا تھا، اور اب اس کے سو سال پورے ہونے پر اس کا دوسرا اجلاس بلایا گیا ہے، جو ۲۸؍اگست ۱۹۹۳ء سے ۵؍ستمبر ۱۹۹۳ء تک چلے گا اور اس میں دنیا کے مختلف بڑے مذاہب بشمول اسلام، عیسائی، یہودی، ہندو، بودھ، جین، اور بہائی کے ممتاز رہنماؤں اور عالموں کو مدعو کیا گیا ہے، یہ کانفرنس کونسل فار اے پارلیمنٹ آف دی ورلڈس ریلیجنس (کونسل برائے اجتماع عالمی مذاہب) کے نام سے ہوتی ہے، اور یہ کہ اس کانفرنس کے دوران مختلف مذاہب کے زیر اہتمام نمائش بھی ہوگی، جس میں مذہب سے متعلق فن پارے (تصاویر، نقاشی، کتبے) سنگ تراشی کے نمونے، مخطوطات وغیرہ شامل ہوں گے، کانفرنس کے مقاصد میں عالمی مذاہب کے درمیان یکجہتی، عالمی دوستی، اور بھائی چارہ وغیرہ شامل ہے، کانفرنس میں مدعو کئے جانے والوں میں ہندوستان سے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے علاوہ ہندو، بدھ، جینی وغیرہ مذاہب کے نمائندے بھی شامل ہیں، اور رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کو بھی مدعو کیا گیا تھا، اسلامی دنیا کے مہمانوں کے لئے میزبان گروپ کے چیرمین ڈاکٹر حامد عبدالحی پٹنہ تھے، جن کے اصرار و تقاضہ پر کہ ان سب کے درمیان حق بات کہنے کا ایک اچھا موقع ہے، سفر اختیار کر لیا گیا، مگر وہاں پہونچ کر جو صورت حال دیکھی تو حضرت مولانا کو اور ہم سب کو شدید انقباض ہوا اور پروگرام سے جلدی واپسی کی گئی۔

مجدد الف ثانی کا حکیمانہ طرز دعوت زیادہ کامیاب ہوسکتا ہے

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ کے سفر امریکہ کے موقع پر جناب سہیل احمد مقیم حال امریکہ نے ۲۵ر ربیع الاول ۱۴۱۴ھ مقام شکاگو، امریکہ کی ایک مجلس میں حضرت مولانا مدظلہ سے کچھ سوالات کئے تھے جن کا جواب بہت چشم کشا ہے، لہٰذا مجلس کی یہ گفتگو ہدیہ ناظرین ہے:

''شام کی چائے کے بعد مولانا علی میاں کی محفل میں حاضری رہی، دیگر حاضرین مجلس میں ڈاکٹر محمد اسماعیل میمن خلیفۂ مجاز شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، ڈاکٹر سلمان ندوی بن علامہ سید سلیمان ندویؒ ساؤتھ افریقہ سے، اور ڈاکٹر مزمل صدیقی ندوی کیلیفورنیا سے موجود تھے، مسلمانوں کی اجتماعی صورتحال پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ آج یہود ونصاریٰ اپنی تمام تر مذہبی دوری واختلافات کے باوجود مسلمانوں کے خلاف ایک جگہ جمع ہیں اور عیسائیوں کے وسائل اور یہود کا دماغ اسی کام پر مامور ہے کہ کس طرح مسلمانوں کی انفرادی واجتماعی زندگی سے اسلامی اقدار کو نکالا جائے، چنانچہ ہر مسلمان کو اس خطرے سے آگاہ رہتے ہوئے اپنے احتساب کی ضرورت ہے کہ کہیں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یہود و نصاریٰ کی اس سازش کا شکار تو نہیں ہو رہا''۔

اس سوال کے جواب میں کہ دنیائے اسلام میں اسلامی نظام کیسے قائم و نافذ ہوسکتا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ دو طریقے ہوسکتے ہیں، ایک تو یہ کہ دین وایمان والوں کو کرسی تک پہنچایا جائے، یا پھر دین وایمان کو کرسی تک پہنچایا جائے، پہلے طریقۂ کار میں خدشہ اس بات کا ہے کہ کرسی والے کرسی چھوڑنے پر کرسی توڑنے کو ترجیح دیں، اور معاملات احسن کے بجائے اور ابتر ہوجائیں، دوسرا طریقہ مدت طلب ضرور ہے لیکن پائیدار ہے اور شاید اس کے بغیر چارۂ کار بھی نہ ہو، حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک تجدید سے بھی اسی طریقۂ کار کا عندیہ ملتا ہے کہ کرسی، کرسی والوں کو ہی مبارک ہو، دین دار تو اس کی اصلاح چاہتے ہیں نہ کہ کرسی، مولانا نے فرمایا کہ ہر دور کا ایک بڑا چیلنج رہا ہے اور بزرگان دین نے ایسے چیلنجوں کا مقابلہ

ہمت وحکمت سے کیا ہے، آج کے دور کے دنیائے اسلام میں سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ امت مسلمہ کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقے ونسل کا دین اسلام پر بحیثیت ایک زندہ وکامل دین کے اعتماد وبحال کیا جائے، یہ اسی اعتماد کا متزلزل ہونا ہی ہے کہ آج دنیائے اسلام میں ہی اسلام کی عملی حیثیت سے متعلق نظریاتی تصادم موجود ہے، یہ اسی اعتماد کے متزلزل ہونے کا نتیجہ ہی ہے کہ جدید تعلیمی نظام سے فارغ شدہ طبقہ دین اسلام کو چودہ سو سال پرانا ایک مذہب تصور کرتے ہوئے اسے انفرادی یا اجتماعی زندگی میں کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں اور کہیں تو یہ طبقہ کاروبار زندگی کے نظام کو چلانے والے کی حیثیت سے بہ نفس نفیس اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کام میں مصروف ہے، چنانچہ کرنے کا بہت اہم کام یہ ہے کہ اس طبقہ تک رسائی حاصل کی جائے اور اس کے علمی معیار کے مطابق اس کا اعتماد اسلام پر بحیثیت ایک زندہ ومکمل ضابطۂ حیات کے بحال کیا جائے، مولانا نے فرمایا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے مسلمان بچوں کے تعلیمی نصاب ونظام کی تطہیر کی جائے اور اس میں اسلامی تعلیمات واقدار دینی تربیت اس طرح شامل کی جائے کہ آج کا مسلمان نوجوان علوم جدیدہ کے حصول کے ساتھ ساتھ اسلام کا ایک مخلص ودیانتدار سفیر وسپاہی بھی بن جائے، اس اہم کام کی طرف سے اسلامی تحریکوں اور مخلص کارکنوں نے اب تک صرف نظر کیا ہے، اس کام کے نتیجے میں ایسی تعلیم یافتہ مسلمان نسل وجود میں آئے گی جو دینی تعلیم وتربیت وحمیت سے آراستہ ہو اور پھر یہ نسل اسلام کو اپنی انفرادی واجتماعی زندگیوں میں مکمل طور پر نافذ کرنے کی کوشاں ہو۔

اسی شام کو بعد از نماز مغرب ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نے یورپ وامریکہ میں مقیم مسلمان نوجوانوں کے لیے بالخصوص اپنے پیغام میں فرمایا کہ آج مغرب اپنی بے پناہ مادی ترقی لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے، لیکن اس مغربی تہذیب نے انسانیت کی جو اخلاقی وروحانی ومعاشرتی پامالی اقدار کی ہے وہ اس کی مکمل ناکامی کا ثبوت ہے، آج کے مسلمان نوجوانوں کی بالخصوص یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی مکمل زندگی کو اسلامی سانچہ میں ڈھالیں، اپنی روحانی واخلاقی تربیت اسی نہج پر کریں کہ ان سے ملنے والے، ان کی طرز زندگی کو اللہ والی زندگی بنانے کے مکلّف ہیں بلکہ اسی زندگی سے وہ دوسروں تک

دین پہونچانے کا فریضہ بھی ادا کرسکتے ہیں، بزرگان دین اسلام کی زندگیاں ودعوت دین اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔(۱)

مکتوب امریکہ

آپ نے حضرت مولانا کی ایک مجلس کا ذکر اور مفید مضمون پڑھا، اب آپ اس مجلس کے مرتب ڈاکٹر سہیل احمد خاں کے انداز فکر کا بھی اس خط سے اندازہ لگا لیجئے جو انہوں نے اس مجلس کے ساتھ لکھا تھا، خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ میں رہ کر ایک اسلامی الفکر جدید تعلیم یافتہ ملی غیرت وحمیت رکھنے والے بندۂ مومن کے فکروسوچ کا کیا انداز ہے اور دین وملت کی کیسی فکروتڑپ ہوتی ہے۔

قبلہ محترم جناب مولانا علی میاں! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خط کے ذریعہ آپ کی خدمت میں حاضری کی جسارت کررہا ہوں، اس اتوار وپیر کو شکاگو میں آپ کی خدمت میں حاضری کا موقعہ پاکر اللہ پاک کا بے حد شکر ادا کیا، اللہ رب العزت نے آپ سے قلبی انسیت ومحبت عطا فرمائی، محض اس کا احسان ہے، ورنہ یہ گناہ گار اس قابل نہیں، اللہ پاک سے دعا ہے کہ اس قلبی محبت کو اپنی محبت واطاعت میں اضافہ کا باعث فرمائیں، آمین۔ آپ سے دعاؤں کی خصوصی درخواست ہے کہ احقر سے اللہ پاک اپنے دین کا کام صحیح بنیادوں پر خلوص نیت کے ساتھ لے لیں، اس زندگی کی سانسیں بھی اس کی یادومحبت میں گزریں اور خاتمہ بھی اسی حالت میں ہو، آمین ثم آمین۔

بحیثیت ایک مسلمان، قلب اس حالت پر بے حد بے چین رہتا ہے کہ کس طرح اللہ کا دین عام ہوجائے اور بالخصوص، ہم مسلمان صحیح معنوں میں اللہ کے اطاعت گزار بن جائیں، فی الحال تو قیام امریکہ میں ہے لیکن شدید خواہش واپس پاکستان لوٹنے کی ہے کہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی زندگی مسلمانوں کے درمیان اور دینی ماحول میں گزرجائے، اللہ پاک سے دعاء ہے کہ وہ اپنے خاص بندوں سے اس دیار کفر میں اپنے دین کے پھیلنے اور عمل پیرا ہونے کا کام لے لے، احقر تو ''پتھر اپنی جگہ میں کچھ وزن رکھتا ہے'' کے مصداق اپنی کوشش کا دائرہ کار تو اسی

(۱) تعمیر حیات، ۱۰/نومبر ۱۹۹۳ء ص ۶ اور ۱۰)

جگہ کو سمجھتا ہے، جہاں پیدا ہوا، پلا بڑھا اور جس جگہ کو شاید اس کی کڑھن کی شدید ضرورت بھی ہو، اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ قبولیت وخیر وبرکت وعافیت کا معاملہ فرمائیں، آمین۔

اتوار کی شام کو آپ کی محفل میں بیٹھ کر ایسا لگا کہ شاید عرصے سے تعلق اور مکمل ذہنی ہم آہنگی ہو، آپ نے فرمایا کہ ''آج کے دور کا اہم چیلنج مسلمان جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا اسلام پر اعتماد بحال کرنا ہے''، واللہ، دل ودماغ اس نقطے پر پچھلے بہت دنوں سے بے چین تھا کہ کرنے کا یہ بے حد اہم کام ہے، اپنی اسی الجھن میں اظہار کے لیے آپ کو کچھ عرصہ پہلے خط تحریر کرنے کا ارادہ باندھ رہا تھا کہ اللہ پاک نے آپ کی خدمت میں حاضری کا موقعہ عطا فرمادیا اور گویا اپنی اس الجھن کے اظہار سے پہلے ہی آپ کے خیالات معلوم ہوکر بے حد اطمینان ہوا اور دل میں اللہ پاک کا بے حد شکر گزار بھی ہوا، اس ملک یعنی امریکہ ویورپ میں تو پھر بھی کسی نہ کسی درجہ یہ لوگ اپنے بچوں کو اسلامی تعلیم دینے کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں، لیکن بدقسمتی سے اپنے ملک میں تو لوگ عمومی طور پر اس سے بے خبر ہیں، اپنے بچوں کو انہی اسکولوں میں تعلیم دلواتے ہیں جہاں اساتذہ تو مسلمان ہیں، لیکن نصاب میں اسلام کی کوئی تعلیم وتربیت واخلاقی اقدار نہیں ہیں، اور پھر یہی بچے آگے بڑھ کر ملک کے صحافی واستاد، وڈاکٹر وانجینئر وحکمراں وغیرہ بنتے ہیں، ان اسکولوں کی تعلیم کے مقابلے میں قدیم درسی یعنی درس نظامی پر مبنی مدرسے ہیں، جہاں سے الحمدللہ وہ بچے فارغ ہوتے ہیں جو دینی تعلیمات سے تو بہرہ ور ہوتے ہیں لیکن پھر ملک وقوم کے روزمرہ معاملات زندگی میں ان کا دخل عمل قدرے محدود ہوتا ہے، چنانچہ صورتحال یوں ہے کہ جو ملک وقوم کی مختلف درجوں میں باگ ڈور سنبھال رہے ہیں، وہ دین کی تعلیمات سے شاید صحیح معنوں میں کبھی بہرہ ور ہی نہ ہوئے اور دوسری جانب جو اس سے مکمل طور پر بہرہ ور ہوں ان کا نظام زندگی میں عمل ودخل بہت محدود ہے، اس فاصلے کو دور کرنے کی شاید ضرورت ہے کہ وہ بچے جو جدید تعلیم حاصل کررہے ہیں، ان کے تعلیمی نصاب میں اسلامی تعلیمات واخلاقی اقدار کی تعلیم وتربیت کو شامل کیا جائے، گویا ان کی سوچ اسلامی بنائی جائے کہ کل جب وہ صحافی یا استاد یا ڈاکٹر یا انجینئر یا حکمراں بنیں تو اپنی سوچ میں اسلامی ہوں اور اسلام کو بحیثیت ایک

زندہ دین ومکمل مذہب کے دیکھتے ہوں، احقر اس کوشش کو کرنے کی اپنے اندر بے حد تڑپ پاتا ہے، شاید اس وجہ سے بھی زیادہ کہ خود بھی اس جدید تعلیمی نظام کی پیداوار ہے اور اپنے اردگرد بے شمار ایسے لوگوں کو دیکھتا ہے جو کبھی تو اپنی سوچ وعمل میں اسلام ومسلمانوں سے انتہائی بے زار نظر آتے ہیں، وجہ اس کی شاید یہی سمجھ میں آتی ہے کہ گھر میں مضبوط اسلامی اقدار کی غیر موجودگی میں، اسکولوں کے جدید تعلیمی نصاب ونظام نے انہیں اسلام سے قریب کرنے کے بجائے دور ہی کر دیا، اس سلسلے میں آپ سے خصوصی درخواست ہے کہ دعاؤں میں بھی یاد رکھئے اور ہر ہر مرحلے پر ذہنی وفکری وعملی رہنمائی فرمایئے، آپ سے مل کر اپنی زندگی میں اس کوشش سے متعلق روشنی کی کرن پیدا ہوئی ہے کہ ان شاء اللہ صحیح رہنمائی کے ساتھ اور ہر قسم کی ذہنی وفکری مدد کے ساتھ یہ کام ممکن ہو سکے، آمین، فرمایئے گا کہ یہ کوشش کن خطوط پر استوار ہو، اس کے واضح مقاصد کیا کیا ہوں اور ان کو پانے کے لیے کس حکمت عملی پر عمل کیا جائے، کاش اس کوشش کے سلسلے میں مضبوط بنیادوں پر ایک مکمل و متوازن تعلیمی نصاب عمل میں آسکے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اس تعلیمی نصاب کو آنے والی نسل تک پوری استطاعت کے ساتھ پہنچانے والے بھی ممکن ہوسکیں، آمین ثم آمین، احقر کو اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اگر اس قسم کا تعلیمی نصاب وتعلیم وتربیت کرنے والے اساتذہ مہیا ہو جائیں تو بے شمار دردمند کارکنان اسلام اس کو اپنے اپنے علاقوں میں رائج کرنے والے ہو جائیں گے۔

پچھلے اتوار کو آپ کی محفل میں بیٹھ کر جو کچھ سیکھا اس کو احقر نے الفاظ میں محفوظ کرنے کی جسارت کی ہے، آپ سے التماس ہے کہ اس پر نظر ثانی کر کے اصلاح فرمائیں، اللہ پاک دین کا صحیح فہم وصحیح عمل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین، آپ کے نصیحت کردہ ذکر کی تسبیحات تو الحمدللہ احقر پڑھتا ہے، لیکن اپنی کمزوری ومعمولات کی بنا پر نماز عصر کے بعد ممکن ہو پاتا ہے، جب کہ آپ نے بعد از فجر بعد از مغرب نصیحت فرمائی تھی، اللہ پاک قبول فرمائیں، آمین۔

آپ سے اب اجازت چاہوں گا اس التماس کے ساتھ کہ اپنی دعاؤں وتوجہ میں احقر کو خصوصی یاد رکھیں، اس کی روحانی وعملی، فکری واخلاقی تربیت فرمائیں، اللہ پاک آپ کو

تندرستی وصحت وایمان کی سربلندی عطا فرمائیں اورآپ کا پرشفقت سایہ امت پر قائم رکھیں، اللہ پاک آپ سب اور ہم سب کے حافظ وناصر ہوں، مولانا رابع صاحب کی خدمت میں سلام، احقر کی تحریر میں کوئی غلطی یا گستاخی ہوگئی ہواس کی احقر دل سے معافی چاہتا ہے، امید ہے اس کو احقر کی کم علمی جانتے ہوئے صرف نظر فرمائیں گے، جزاکم اللہ خیراً، فقط والسلام، احقر سہیل احمد خاں، شکاگو، مؤرخہ ۲۴؍ربیع الاول ۱۴۱۴ھ مطابق ۹؍ستمبر ۱۹۹۳ء) (تعمیر حیات ص ۱۸-۱۹، ۱۰؍نومبر ۱۹۹۳ء)

تین ملکوں کے سفر سے واپسی پر ندوہ میں ایک محاضرہ اور تاثرات

ہمارا بیرونی سفر تین اجتماعات میں شرکت کے لیے تین ملکوں کا ہوا، ان میں تیسرا سفر امریکہ کا تھا، امریکہ کے شہر شکاگو میں عالمی مذاہب کانفرنس منعقد ہورہی تھی، اس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدعو تھے اور شرکت کا وعدہ کرچکے تھے، اس لیے شرکت کے لیے تشریف لے گئے، شکاگو امریکہ کے دو تین بہت متمدن اور بڑے شہروں میں سے ایک ہے، وہ ثقافتی اہمیت زیادہ رکھتا ہے، دوسرا شہر نیویارک ہے، وہ امریکہ کا سب سے بڑا کاروباری اور تجارتی اہمیت کا حامل شہر ہے، شکاگو میں کالے لوگوں کی بھی خاصی تعداد ہے، ان کے ادارے ہیں، یہ کالے لوگ خاص عقیدہ کے لوگ رہے ہیں، ان کا عقیدہ شروع میں اپنے سفید آقاؤں کے ظلم کے نتیجہ میں مخالفانہ جذبہ پر مبنی رہا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ میاں کا رنگ کالا ہے، شیطان کا رنگ گورا ہے، اس لیے وہ سفید فام لوگوں کو شیطان کی طرح سمجھتے تھے، اور چونکہ امریکہ کی گوری نسل کے لوگ ان کو افریقہ سے پکڑ کا غلام بنا کر امریکہ لائے تھے، اس لیے ان کو گوروں سے نسبت رکھنے والی باتوں سے نفرت ہے، لہٰذا ان میں سے ایک تعداد عیسائیت سے بیزار ہوکر مختلف مذاہب میں داخل ہوئی اوران میں سے بہت سے لوگ اسلام لے آئے، امریکہ میں مسلمانوں کی ایک تعداد ان پر مشتمل ہے، دوسری نسلوں کے لوگ بھی مسلمان ہوئے ہیں، پورے امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد ۵۰ لاکھ یا کچھ زیادہ ہوگی، تنہا شکاگو میں ڈھائی لاکھ مسلمان ہیں۔

آج سے سو سال پہلے شکاگو میں ایک جشن کے موقع پر ایک فاضل وکیل نے مذہبی جذبہ کے تحت الحاد کا مقابلہ کرنے کے لیے دنیا کے مختلف مذاہب کی ایک کانفرنس بلائی تھی، اس کے سو سال پورے ہونے پر وہاں کے چند مذہب پسند دانشوروں نے اس کو اعلیٰ پیمانہ پر دوبارہ کرنے کا نظام بنایا تاکہ الحاد کے خلاف ایک سنجیدہ محاذ بن سکے اور مذہبی رجحان کا فروغ ہو۔

یہ مذاہب کانفرنس کیا تھی، ایک بین الاقوامی مذہبی سمینار اور بین الاقوامی مذہبی مشاعرہ تھا، مختلف مذاہب کے نمائندے اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرنے کے لیے اسٹیج پر آئے، اس کے علاوہ مذہبی افکار سے تعلق رکھنے والے متعدد موضوعات پر مقالے پڑھے گئے، اس کانفرنس کا اصل مقصد کیا تھا، یہ مذاہب کا ایک علمی سیمینار تھا یا کسی سیاسی مقصد کا حامل اجتماع تھا، بہر حال کوئی مقصد اس کے پیچھے کام کر رہا ہوگا، وہ مقصد مخلصانہ اور قیمتی بھی ہوسکتا ہے، اور سیاسی غرض کا حامل مقصد بھی ہوسکتا ہے، دنیا میں یہ سب ہوتا ہے، بعض کاموں کا اصل مقصد بہت دیر میں ظاہر ہوا کرتا ہے، بہر حال یہ کانفرنس امریکہ کے سفر کا بہانہ بنی۔

امریکہ کے پہلے سفر کے بعد جو ۱۹۷۷ء میں ہوا تھا، اور جس میں امریکہ کا دعوتی دورہ بھی کیا تھا، حضرت مولانا کا ارادہ تھا کہ اب امریکہ جانا نہ ہوسکے گا کیونکہ فاصلہ بہت اور صحت کمزور اور خود مشرقی ملکوں میں کام بہت ہے، لہٰذا دعوت ملنے پر حضرت مولانا نے اس کانفرنس میں شرکت کرنے سے معذرت کی لیکن ڈاکٹر احمد عبد الحی صاحب جو پٹنہ بہار کے مشہور سرجن اور مسلمانوں کے ہمدرد اور مسلم انجمنوں کے بڑے معاون اور ندوہ کی مجلس انتظامیہ کے رکن ہیں، ان کے بھائی ڈاکٹر حامد عبد الحی جو شکاگو میں رہتے ہیں اور وہاں مسلمانوں کے نمائندے ہیں، بہت مصر ہوئے اور وہاں دعوت واصلاح کے دیگر پروگراموں کا بھی وعدہ کیا تو حضرت مولانا نے سفر کا ارادہ فرمالیا اور وعدہ کرلیا، مولانا کو یورپ جانا تھا، اس سے اس سفر کو جوڑ لیا۔

مذاہب کانفرنس ۲۸ راگست سے ۴ رستمبر تک تھی، اپنے متعینہ وقت پر منعقد ہوئی، حضرت مولانا نے اپنا مقالہ بھجوادیا تھا اور خود تاخیر سے پہونچنے کی اطلاع دی تھی، چنانچہ

مولانا کانفرنس کے آخر روز پہونچ سکے، مولانا کا ارادہ آخری روز کے پروگرام میں جانے کا تھا، لیکن وہاں بین المذاہبی مظاہرہ کا طرز دیکھ کر مولانا نے اس سے بہت عدم انشراح محسوس کیا، جلسہ گاہ تک گئے لیکن بغیر باقاعدہ شرکت کے واپس آ گئے، وہاں مختلف مذاہب کے منتر پڑھے جارہے تھے اور مرد و زن کا بے محابا اجتماع بھی تھا، یہ ناپسندیدہ منظر دیکھتے ہی مولانا بلا شرکت آ گئے۔

مگر حضرت مولانا کو بڑی فکر تھی کہ ان کی وجہ سے داعیوں کو جنھوں نے حضرت مولانا کو بلایا تھا، شرمندگی اٹھانی پڑے گی، لیکن داعی حضرات نے حضرت مولانا کے احساس کو قبول کیا اور اجازت دے دی، پھر داعی حضرات نے دوسرے روز مسلمانوں کے درمیان خطاب کا پروگرام رکھا، اس میں دنیا کے مختلف ملکوں کے رہبر اور داعی شریک ہوئے اور اہم اور مفید تقریریں ہوئیں۔

شکاگو کانفرنس سے قبل برطانیہ میں آکسفورڈ اسلامی سنٹر ٹرسٹی بورڈ کا سالانہ جلسہ تھا، حضرت مولانا آکسفورڈ میں اس سنٹر کے چیئرمین بھی ہیں، وہاں کا سفر اس جلسہ میں شرکت کے لیے ہوا تھا، آکسفورڈ اور کیمبرج برطانیہ کی بڑی یونیورسٹیاں ہیں، وہ برطانیہ میں علمی وفکری صلاحیت پیدا کرنے کی معیاری دانش گاہیں مانی وسمجھی جاتی ہیں، آکسفورڈ یونیورسٹی نے اس اسلامک سنٹر کو اپنے کسی دیگر شعبہ کے معیار و حیثیت کا ادارہ تسلیم کرلیا ہے، اور یہ اس نے سرسری طور پر تسلیم نہیں کیا، بلکہ ایک سال تک کارکردگی دیکھنے کے بعد اس کے کام کی سطح سے مطمئن ہو کر کیا۔

انتظامی امور سے یہ سنٹر ایک وقف کے نام سے شروع ہوا ہے، وقف کی ایک کمیٹی ہے، اس کے ۱۴ ممبر ہیں، ۷ ممبران کا کورم ہے، اس کے ۱۴ ارکان میں مسلمان ارکان کا ۱۱ کی تعداد میں ہونا ضروری ہے۔

اس سنٹر نے اب تک چند بڑے اہم کاموں کی ذمہ داری اپنے ذمہ لی ہے:

۱۔ انگریزی میں ایک معیاری جامع اسلامی تاریخ پیش کرنا جو ۱۴ جلدوں میں ہوگی۔

۲۔ مفصل جامع علمی اٹلس۔

۳۔ امام بخاری کی جہاں مسجد تھی، وہاں شاندار مسجد اور ایک جامعہ قائم کرنا، اس کے اس منصوبہ کو ازبکستان کی حکومت نے منظوری دے دی ہے اور تعاون کا وعدہ کیا ہے، یہ کام سنٹر کے ذریعہ انجام پائے گا، اس میں حکومت برونائی مالی تعاون کرے گی۔

ان دونوں سفروں سے پہلے ترکی میں رابطہ ادب اسلامی کی کانفرنس ہوئی تھی، رابطہ کے جلسوں کی شرکت کے علاوہ حضرت مولانا کا ایک اہم خطاب ہوا جس میں ترک نوجوان اور اہل علم شریک ہوئے اور یہ کامیاب اور مؤثر جلسہ تھا اور گویا ترکی کے سفر کا حاصل تھا۔

اس بین الممالکی سفر میں پہلے استنبول ۲۰ راگست سے ۲۷ راگست تک پھر آکسفورڈ ۲۷ راگست سے ۲ ستمبر تک، پھر شکاگو کا پروگرام ۲ ستمبر سے ۷ ستمبر تک پھر حرمین شریفین حاضری دینے کے بعد ہندوستان واپسی ہوگی۔

اس سفر میں علمی ودعوتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ یورپ وامریکہ کے موجودہ حالات اور اثر ورسوخ کا بھی تھوڑا بہت جائزہ لینے کا دوبارہ موقع ملا۔

کئی دہائیوں قبل یورپ کی طاقتیں مشرقی ممالک میں باقاعدہ حاکم تھیں اور ان کے رعب واثر کا سکہ چلتا تھا، اب ان کا رعب وداب ختم ہو چکا ہے لیکن ماضی کے کچھ اثرات باقی ہیں اور ان کی سیاسی حکمت علمی کا زور قائم ہے، وہ اس کے اثر سے مشرقی ممالک پر حاوی ہیں اور ان کی اصل سربراہی امریکہ میں ہے۔

جب ہندوستان میں انگریز حکومت کر رہے تھے، اس وقت ہندوستان اور مشرقی ممالک میں رہنے والے یورپ کے بارے میں بڑا اعلیٰ تصور رکھتے تھے، ان کو اس کے بارے میں جنت جیسا تصور تھا، یہ بات ان بعض سفرناموں سے ظاہر ہوتی ہے جو اس وقت لکھے گئے، برطانیہ کی حکومت کی وسعت کا حال یہ تھا کہ کہا جاتا تھا کہ برطانیہ کی مملکت میں سورج غروب نہیں ہوتا، یہ جملہ ایک ایسی وسعت کا تصور پیدا کرتا تھا جس سے خیال ہو کہ گویا برطانیہ تمام دنیا پر حکومت کرتا ہے، بات صرف یہ تھی کہ کرۂ ارضی کے مختلف حصوں پر

اس کا قبضہ تھا، تو سورج کسی نہ کسی جگہ نکلا ہی ہوتا تھا۔

مگر یہی برطانیہ اور یورپ کے دیگر ممالک آج زوال پذیر ہیں اور ان کی عالمی قیادت ختم ہونے کے راستہ پر ہے مگر کسی ایسی قوم کا ہونا ضروری ہے جو یورپ کے زوال سے خالی ہونے والی جائے قیادت کو پر کر سکے، لیکن نظر ڈالنے پر معلوم ہوتا ہے کہ آج کوئی قوم اس خلا کو پر کرنے کے لائق نظر نہیں آتی، یہ ضرور ہے کہ مشرقی قوموں نے ترقی کی ہے، لیکن وہ ابھی قیادت کے میدان سے بہت نیچے ہیں، جب ہندوستان آزاد ہوا تھا تو اس سے یہ امید تھی کہ وہ یورپ کی ترقی یافتہ قوموں سے مقابلہ کی منزل تک پہونچے گا، لیکن یہ توقع اب پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتی، ہندوستان ابھی اپنے ملک کی اندرونی کمزوریوں سے باہر نہیں نکل سکا ہے بلکہ وہ ان کمزوریوں میں ڈوبتا جا رہا ہے، یورپ کے زوال کے بعد کون اس کی جگہ لے گا، یہ سوال برابر تشنہ ہے۔

امریکہ کے تازہ سفر میں میں نے گذشتہ ۱۶ رسال قبل کی بہ نسبت فرق محسوس کیا، پہلے جب گیا تھا تو امریکہ کو تمدن و خوش حالی میں بہت بلند مقام حاصل تھا مگر اب کمی ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ اقتصادی اعتبار سے امریکہ بہت ہی بہتر حالت میں ہے، لیکن یہ بات واقعاتی طور پر پوری طرح صحیح نہیں ہے، اقتصادی طور پر امریکہ میں بھی بدحالی کی ابتداء ہوگئی ہے، اگر امریکہ بدحالی کے بڑھنے پر کمزور ہوا، اور ٹوٹا تو اس کی جگہ کون پر کریگا، یہ ایک اہم سوال ہے۔

یہودیوں کا اثر امریکہ پر بہت ہے، حالانکہ یہودی کل آبادی میں بہت کم تناسب رکھتے ہیں، شاید ایک کروڑ بلکہ ۸۰-۹۰ لاکھ ہوں گے، جب کہ پوری آبادی امریکہ کی ۲۳ کروڑ ہے یعنی یہودی ۳ فیصد ہیں، اس کے باوجود وہ امریکہ کی پالیسی پر قابض ہیں، امریکہ ان کا رہین منت ہے، اور ایک لحاظ سے وہ ان کا غلام ہے اور وہ اپنے دماغ اور اپنی محنت و تدبیروں سے امریکہ کے کلیدی اور اہم عہدوں پر حاوی ہو گئے ہیں، یہودیوں نے سب سے پہلے اقتصادیات، ذرائع ابلاغ اور تعلیم ان تینوں کو اپنا نشانہ بنایا تھا اور انہوں نے ان پر قبضہ حاصل کرلیا۔

گذشتہ قریبی مدت میں دنیا میں ایسے حالات پیش آئے کہ اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ باا ثر ملک امریکہ بن گیا ہے، وہ اپنے سیاسی اثر ورسوخ کا استعمال کرتا رہتا ہے اور قرض وامداد کے حربے کو کام میں لاتا ہے یعنی ضرورت مند ممالک کو امدادیں دیتا یا دلواتا ہے، قرضوں کا محصول سودی ہوتا ہے اور بڑے ملک یہ قرض مشروط ڈھنگ سے دیتے ہیں، ان دونوں وجوہ سے قرض لینے والے ملک بندھ جاتے ہیں، اور قرض دینے والے کو اس طرح تجارتی مفاد بھی حاصل ہوتا ہے اور سیاسی اثر ورسوخ بھی، آج کل کا اقتصادی نظام ایسا ہے کہ قرض دینے والا بھی فائدے میں رہتا ہے، اس کی اصل رقم محفوظ رہتی ہے اور اس کا سود ہر سال ملتا ہے، لہٰذا آمدنی کا ذریعہ بھی ہے اور اثر ورسوخ کا بھی، بیشتر مشرقی ممالک مغربی ممالک کے مقروض ہیں اور مقروض ہوتے جارہے ہیں، مشرقی ممالک کی دوقسمیں ہیں، ایک تمدن میں پس ماندہ اور غریب ممالک دوسرے تمدن میں پس ماندہ لیکن دولت مند ممالک، غریب مشرقی ممالک اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرتے ہیں اور قرض لیتے رہتے ہیں، قرض لیتے لیتے عموماً قرض اتنا بڑھ جاتا ہے کہ ادا کرنا ممکن نہیں رہ جاتا صرف سود ادا کرتے ہیں، اور کبھی اس کو ادا کرنے کے لئے بھی سود لینا پڑتا ہے، پھر مجبوری اور محتاجی میں قرض دینے والے کے اشاروں پر چلنے پر مجبور ہوتے ہیں، خود ہمارے ملک ہندوستان کے بجٹ کی آمدنی کا ٪۲۰ فیصد سود کی ادائیگی کے لیے مخصوص کیا گیا تھا اور اس سال آمدنی کا ٪۲۵ فیصد قرض کی ادائیگی کے لیے مخصوص کیا گیا، ظاہر ہے مجبوری اور بے کسی ایسے ممالک کو مدد کرنے والی بڑی طاقت سے دبنے اور بات ماننے پر مجبور کرتی ہے۔

دوسرے مشرقی ممالک وہ ہیں جو دولت مند ہیں مثلاً تیل کی دولت والے ممالک، ان ممالک کی فاضل رقم یورپی ممالک کے بنکوں میں جمع ہوتی ہے اور ضرورت پڑنے پر ان سے لینا ہوتی ہے، یورپی ممالک حسب ضرورت بنک سے وہ رقم قرض لے کر خرچ کر ڈالتے ہیں یا اپنے فائدے کے لیے دوسرے کمزور ممالک کو قرض دے دیتے ہیں، پھر جب مشرقی ممالک کو ضرورت ہوتی ہے تو بنک میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے ان سے کہا جاتا ہے ابھی ہمارے پاس نہیں ہے، تم ہماری ضمانت پر کسی دوسرے بنک سے قرض

لے لو جو سود دینا پڑے گا، وہ تمہاری جمع شدہ رقم کے سود سے ادا ہو جائے گا۔

اس وقت صورت حال یہ بن گئی ہے کہ ساری دنیا کے ملک بشمول روس اس امداد اور قرضوں کے ایرپھیر کیے سب زیادہ تر امریکہ کے غلام ہو گئے ہیں، امریکہ اپنی اس بالادستی سے جو دباؤ ڈالتا رہتا ہے، وہ ہی کیا کم ہے، اس کے ساتھ ساتھ اپنی پالیسی ومصالح کی خاطر دنیا کے مختلف ممالک اور خطوں میں سازشیں بھی چلاتا رہتا ہے اور کسی طاقت کو ابھرنے اور مضبوط ہونے نہیں دینا چاہتا، سب کو دباؤ میں رکھنا چاہتا ہے، چنانچہ جو بھی طاقت بن کر ابھرنے لگے، سیاسی یا اقتصادی تدبیروں سے اس کو گرادیا جاتا ہے یا اس کی ہمسر طاقت سے اس کو لڑادیا جاتا ہے اور اس کی ابھرتی ہوئی طاقت کو تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔

اس طرح کی سازشوں کے لیے انہی ممالک کے اہل سیاست میں سے کسی کو ذریعہ بنایا جاتا ہے، ایسے مشرقی ممالک میں بآسانی مل جاتے ہیں، یہ لوگ بھی جاہ یا مال کے ذاتی فائدوں کے لئے ہر برا کام کر سکتے ہیں، قوم کو تباہی کے کنارے پہونچا سکتے ہیں، چنانچہ مشرقی ممالک میں ایسے لوگ کئی جگہ ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ قرض لینے والے اس کے نتائج پر دھیان نہیں دیتے، قرض فوری طور پر تو بہت فائدہ اور لطف کی چیز ہے، لیکن نتیجہ کے اعتبار سے پریشانی کا باعث ہوتا ہے لیکن جب کوئی اپنے مصارف بڑھائے اور اپنی اصلی آمدنی پر اکتفاء نہ کر سکے یا اس کے حالات اتنی آمدنی پر اکتفاء کرنے کے نہ ہوں تو پھر وہ قرض کا سہارا لیتا ہے اور اگر وہ بار بار قرض لیتا ہو تو انجام معلوم ہے۔

میں حضرت مولانا کے ساتھ استنبول گیا جس کا صدیوں تک دبدبہ رہا ہے جیسا کہ آج لندن وامریکہ کا دبدبہ ہے، اس کو محمد بن الفاتح نے فتح کیا تھا، اس کی فتح نہایت مشکل بلکہ ناقابل عمل قسم کا کارنامہ تھی، متحدہ یورپ کو ایک مسلمان مشرقی طاقت سے رسوا کن شکست برداشت کرنا پڑی تھی، اس سے ترکی کی خلافت کی اس قدر دھاک بیٹھ گئی تھی کہ اس کی عظمت کے سامنے بڑی بڑی طاقتیں سرنگوں تھیں، یہ واقعہ یورپ کے ممالک کے دلوں میں کانٹے کی طرح چبھتا رہا، دوسری طرف ترکی کی اس پر عظمت حکومت کی بنا پر مسلمانوں کا ایک وقار تھا، ان کی ہیبت تھی، یورپ اس کو میدان جنگ میں شکست نہ دے سکا تو اس نے

میدان سیاست میں اقتصادی طور پر شکست دینے کی تدابیر اختیار کیں، متعدد اسباب اور بعض کمزوریوں کی بناء پر ترکی کی آمدنی مصارف سے کم ہوئی، تو یورپ نے اس کو خوب قرض دیا اور قرض سے زیر بار کردیا، اس سے خلافت عثمانی کمزور پڑتی چلی گئی، ترقیات رکتی گئیں اور بار بڑھتا چلا گیا، پھر سیاسی تدابیر اختیار کیں، بالآخر مسلمانوں کی یہ طاقت بکھر گئی، شام خلافت عثمانیہ کا ایک چھوٹا سا صوبہ تھا، اس کے چار ملک بنا دیئے گئے: (۱) سوریا (۲) فلسطین (۳) لبنان (۴) اردن۔

اس کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں بسایا گیا، عربوں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا قریب تھا کہ فلسطین فتح ہوجائے، مگر ان مغربی ممالک نے مداخلت کر کے جنگ رکوادی اور کہا کہ میز پر فیصلہ ہوگا، میز پر فیصلہ کی بات کو منوانے کی برابر کوششیں کیں حتیٰ کہ اب ۴۵ سال بعد میز پر ذلت کا فیصلہ قبول کیا جارہا ہے، حالات کو موڑنے اور اپنی مصلحتوں کے مطابق کرلینے کے اس وقت دو بڑے ذریعے ہیں، ایک اقتصادی دباؤ کا ذریعہ دوسرے پروپیگنڈے اور ذرائع ابلاغ استعمال کرنے کا ذریعہ، جہاں تک اقتصادی ذریعہ کا تعلق ہے تو گذشتہ سالوں میں اس کا ایک جائزہ آپ کے سامنے آیا اور جہاں تک ذرائع ابلاغ کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے کہ بین الاقوامی اور درجۂ اول کے ذرائع ابلاغ پر اس وقت ٪۹۰ فیصد قبضہ یہودیوں کا ہے، اس سے انھوں نے بہت فائدہ اٹھایا اور اٹھا رہے ہیں، ذہنوں کو بالکل بدل دیتے ہیں، جو بات باور کرانا چاہتے ہیں، کرا لیتے ہیں اور جو بات ناقابل قبول بنانا چاہتے ہیں ناقابل قبول بنا دیتے ہیں، بات یہ ہے کہ اگر ایک چیز کا بار بار تذکرہ نفسیاتی کشش کے ساتھ ہوتا ہے، تو چاہے وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو، ذہنوں میں رچ بس جاتی ہے، مسلمان اپنے مذہب سے بہت تعلق وعقیدت رکھتا ہے لیکن ذرائع ابلاغ کی مؤثر تدبیروں سے وہ اپنے مذہب سے ناواقف ہوجاتا ہے یا اس کو برا سمجھنے لگتا ہے، یہ سب اعلام اور میڈیا کا نتیجہ ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی ایک صحیح مذہب ہے، دوسرے مذاہب صرف چند رسومات کا نام ہیں، اسلام ہی وہ جامع وہمہ گیر دین ہے جو اس کو پیدائش کے دن سے آخری سانس تک کے مناسب طور وطریق اپنانے کا

ڈھنگ سکھاتا ہے۔

ہم یہ جو بات کہہ رہے ہیں کہ اسلام ہی کامل دین کہلانے کا مستحق ہے اور دوسرے مذاہب کو کامل دین قرار نہیں دیا جاسکتا، یہ ہم محض اسلام کی حمایت میں یا تعصب کی بنیاد پر نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ حقیقت پسندانہ جائزہ لینے سے ثابت ہوتا ہے، اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں صرف بنیادی عقیدہ اور عبادات کی چند شکلوں کے اور کچھ نہیں ہوتا لیکن اسلام میں زندگی کے ہر شعبہ کی رہنمائی ہے، اور اس نے زندگی کے ہر مسئلہ کا حل پیش کیا ہے خواہ عائلی زندگی کے معاملات ہوں یا اقتصادی تقاضے اور ان کے مسائل ہوں یا سیاسی اصول اور طرز عمل ہوں۔

قوموں پر اثر ڈالنے کا تیسرا ذریعہ تعلیم کا ذریعہ ہے، تعلیم سے قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں، تعلیم قوموں کی ترقی کا ذریعہ ہے، زندگی کو بنانے سنوارنے اور ترقی دینے کے لیے جن علوم و معلومات کے ہم آپ ضرورتمند ہوتے ہیں، وہ ہم کو علم و تعلیم سے ہی حاصل ہوتے ہیں، اسلام نے تعلیم کی بڑی اہمیت بتائی ہے اور زندگی کے عام معاملات کے علاوہ مذہبی امور کو بھی علم و تعلیم سے وابستہ کیا ہے، اور جہاں تک دنیاوی عام زندگی کا تعلق ہے تو اس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی بڑی ہمت افزائی کی ہے، مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں علم و تعلیم کے دائرے میں بڑی ترقی کی اور سرمایہ علمی میں بہت اضافہ کیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ میں علم و تعلیم سے بالکل دلچسپی نہ تھی بلکہ علم سے دلچسپی رکھنے والوں کے معاملہ میں ناپسندیدگی کا رویہ تھا جو کبھی سخت سزاؤں تک پہونچ جاتا تھا، اب ایک عرصہ سے یورپ تعلیم پر زور دے رہا ہے اور علم و تعلیم سے اپنی اس دلچسپی کو صرف اپنا کارنامہ ظاہر کر رہا ہے حالانکہ اس کا آغاز اندلس کے مسلمانوں سے سیکھ کر کیا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ علم و تعلیم سے دلچسپی میں وہ اب آگے ہوگیا ہے، اس نے اس کو بہت اہمیت دی ہے، اس اہمیت وکوشش کا نتیجہ ہے کہ اس کے یہاں تقریباً ۱۰۰ فیصد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔

اس کے بالمقابل مشرقی ممالک کا حال بہت برا ہے، علم و تعلیم سے ان ممالک کی دلچسپی گھٹ کر بہت نیچے آگئی تھی، اب بھی باوجود کچھ دلچسپی بڑھ جانے کے زیادہ سے زیادہ

۲۰ فیصد لوگ تعلیم یافتہ ہیں، تو ایک طرف تعلیم یافتہ لوگوں کی کثرت ہے تو دوسری طرف غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی کثرت ہے، اس وجہ سے مشرقی قومیں زندگی کے ہر میدان میں یورپ کی قوموں سے پیچھے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان سے مرعوب بھی ہیں، جب ہمارے عوام وخواص اپنی زندگی اور اپنے اردگرد کی زندگی سے واقفیت نہ رکھیں گے تو کس طرح اپنے لیے ضرورت کی راہ نکال سکیں گے اور اپنے مقابل کا مقابلہ کر سکیں گے؟

مگر اب یورپ اپنی ظالمانہ اور من مانی اور خود غرضانہ زندگی کی ڈھیلی اور بڑی چادر میں الجھ کر گرنے والا ہے، امریکہ اپنی سیاسی و اقتصادی ہوس سے دوسری قوموں کے مسائل میں زیادہ الجھتا جا رہا ہے، اس کی وجہ سے خود اس ملک کی ترقیات میں غفلت ہو رہی ہے اور اس کی وجہ سے اور اس کے اقتصادی معاملات سے اس کی اقتصادی صورت حال متأثر و کمزور ہونے لگی ہے، مختلف ملکوں کو سیاسی مقصد سے قرض دیئے چلا جانا، اس کے لیے دشواری کا سبب بن رہا ہے، عالمی منڈی میں اس کی تجارت کو بھی زوال ہو رہا ہے، لہٰذا امریکہ اقتصادی میدان میں پیچھے ہو جانے سے ڈر رہا ہے اور اپنے اقتصادی مسائل میں الجھنے لگا ہے۔

دوسری طرف جرمنی اور جاپان اقتصادیات میں کافی آگے بڑھ گئے ہیں اور امریکہ کو آنکھیں دکھانے لگے ہیں، دنیا جاپان کے مال کو زیادہ اہمیت دیتی ہے، جاپان کا مال سستا ہوتا ہے، چنانچہ پوری دنیا میں جاپان کا مال زیادہ چل رہا ہے۔

امریکہ اپنی سابقہ کوششوں سے دنیا کا واحد سب سے بڑا ملک بن گیا ہے اور اپنی سازشوں اور استحصالی ترکیبوں سے دنیا کا ناپسندیدہ ملک بن گیا ہے، پوری دنیا پر اس کا سیاسی و اقتصادی دباؤ ہے، مشرق وسطیٰ پورا اس کی مٹھی میں ہے، وہاں صرف ایران اور سوڈان امریکہ کی تابعداری سے گریز کرنے کی جرأت کر رہے ہیں اور امریکہ کے دباؤ سے بچنے کی جدوجہد میں لگے ہیں، کہا نہیں جا سکتا ہے کہ وہ کہاں تک مقابلہ کر سکیں گے۔

کویت سے عراق کو امریکہ نے لڑایا، اس سے قبل ایران سے لڑایا تھا، عراق کے سربراہ صدام حسین نے امریکہ کی سازش کا آلۂ کار بن جانے میں جو بھی فائدہ دیکھا ہو وہ فائدہ ان کو ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، خلیج کا منطقہ امریکہ کے بہت زیادہ اثر میں آ گیا اور امریکہ کو یہ

دکھانے کا موقع بھی مل گیا کہ ہم نے بطور ہمدردی اور مظلوم کی مدد کے لیے ایسا کیا ہے اور اب صدام حسین سے سیاسی بیت بازی ہوتی رہتی ہے، صدام حسین بھی اقتدار میں رہے اور کویت کی حکومت بھی بحال ہوگئی اور امریکہ کے پاس صدام حسین کا نام اور صدام حسین کی وقتاً فوقتاً دھمکی ان ممالک کو اپنا محتاج بنائے رکھنے کا بہترین ذریعہ بھی باقی ہے کہ اگر ہم سے تم مستغنی ہوگئے تو صدام موجود ہیں تم کو ختم کردیں گے۔

اس وقت امریکہ کے پاس اقتدار کی سب سے بڑی طاقت ہے لیکن اب ایک بڑی تبدیلی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ اس لیے کہ پوری دنیا امریکہ کی شرارتوں کو سمجھنے لگی ہے۔

ہمارے فائدہ کی بات یہ ہے کہ ہم اپنی طاقت اور کمزوریوں کو سمجھیں اور اس کے مطابق اپنے کو تیار کریں اور دوسرے یہ کہ اپنے دشمن کی طاقت وکمزوری کا صحیح اندازہ لگائیں، دشمن کو کمزور سمجھنا اور نعروں اور جوشیلے بیانات پر خوش ہو جانا صحیح بات نہیں ہے، اس سلسلہ میں مسلمان ملک بہت پیچھے ہیں، ایک طبقہ وہ ہے جو آنکھ بند کرکے یورپ کی برتری کا قائل ہے، اور یورپ کے علم وتمدن سے بھی بیحد مرعوب ہے اور ایک طبقہ ایسا ہے جو خود سے کچھ کرنے کی ہمت ہی نہیں رکھتا، یہ جانتا ہی نہیں کہ کون طاقت ور ہے اور کون کمزور۔

آج ضرورت ہے اقتصادیات، ذرائع ابلاغ اور تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے، اقتصادیات تو ترقیات کی کنجی ہے اور تعلیم وذرائع ابلاغ غیر معمولی اثرات پیدا کرتے ہیں، اس لیے کہ جو چیز دل ودماغ میں ڈالی جاتی ہے، وہ ہی دل ودماغ میں بھر جاتی ہے اور پھر وہی نکلتی ہے اور اس سے آدمی کا کردار بنتا ہے اور حکمت عملی پیدا ہوتی ہے۔

صدام حسین نے کویت پر حملہ کیا اس لیے کہ عراق کی دیرینہ خواہش تھی کہ کسی طرح کویت اس کا صوبہ بن جائے اور اس کو امریکہ کے ہاں ونہیں کے اشارے سے دھوکہ ہوا کہ امریکہ کویت کے لیے طاقت نہ استعمال کرے گا اور کویت مقابلہ نہیں کرسکتا، عراقی سربراہ نے امریکی سفیرہ سے ملاقات میں کہا کہ کویت ہمارا ملک ہے، ہم کچھ کریں گے، امریکی سفیرہ نے اشارہ دیا کہ یہ تمہارا داخلی معاملہ ہے، لیکن جب عراق نے بھرپور کارروائی کی تو امریکہ نے طاقت کے استعمال کا فیصلہ کرلیا اس لیے کہ اس میں امریکہ کا فائدہ تھا اور

صدام کے کویت پر حملہ کے بہانے امریکہ کو خلیج کے ممالک میں فوجی طور پر دخیل ہو جانے کا بڑا اچھا موقع ہاتھ آ گیا اور وہ صدام کو کویت سے ہٹانے کے نام سے آ دھمکا اور اپنے پاؤں جما لیے، صدام کو باقی رہنے دیا کہ یہ آدمی پھر کام آ سکتا ہے چنانچہ جب کوئی سر اٹھاتا ہے تو امریکہ کہتا ہے کہ صدام موجود ہے۔

خلیجی جنگ نے مشرق وسطیٰ کو جتنا نقصان پہونچایا اس کی تلافی دسیوں سال تک نہ ہو سکے گی، عراق کمزور ہوا، خلیج کے دوسرے ممالک امریکہ کے لیے زر خرید غلام ہوئے اور خلیجی ممالک کی دولت مصارف جنگ میں بے تحاشا طور پر دی گئی، عراق کمزور ہوا، لیکن صدام حسین کی آن بان قائم ہے۔

یہ سب اسی وقت معلوم ہوگا جب ذرائع ابلاغ کی صحیح رپورٹنگ کرنے اور غیر جانبدار رپورٹوں سے رابطہ ہو سکے اور صحیح رپورٹ مل سکے، اعلیٰ معیاری ذرائع ابلاغ ذہن وفضا بناتے ہیں اور رائے ہموار کرتے ہیں۔

برطانیہ میں تین علاقے ہیں (۱) انگلینڈ (۲) اسکاٹ لینڈ (۳) شمالی آئرلینڈ۔

انگلستان کے لوگ ڈپلومیسی اور سیاسی سوجھ بوجھ میں بہت بڑھے ہوئے ہیں، اسی ڈپلومیسی اور سیاسی چالاکی سے انھوں نے دنیا کے بہت سے مشرقی ممالک پر قبضہ کر لیا تھا، برطانیہ کے مقابلہ میں امریکہ زیادہ ماہر نہیں ہے، چنانچہ امریکہ برطانیہ سے مشورے لیتا ہے لیکن برطانیہ کہیں اس کو پھنسا بھی دیتا ہے۔

یورپ میں فرانس و جرمنی دو مضبوط ملک ہیں، اہل یورپ ان دونوں ملکوں کو اپنا بڑا سمجھتے ہیں، برطانیہ کو یورپ کے ممالک عموماً پسند نہیں کرتے لیکن برطانیہ کو سہارا دراصل امریکہ سے ملتا ہے، امریکہ کی وجہ سے وہ برادری میں مضبوط پوزیشن میں ہے، انگریزی زبان انگلینڈ کی ہے لیکن اس کا چلن اور دنیا میں رواج صرف اسی وجہ سے نہیں ہے بلکہ امریکہ کی بھی قومی زبان ہونے کی وجہ سے باقی ہے، امریکہ نے اپنی سیاست بیرونی سیاست اور اس کے خاطر اپنی دولت کو پھنسایا ہے کہ اس کے عوام بار بار مطالبہ کرتے ہیں کہ دیگر ممالک کی فکر چھوڑو اور اپنے گرتے ہوئے حالات سنبھالو، امریکہ کے باہر کا مال

سستا ہونے سے امریکہ کے بہت سے کارخانہ بند ہوتے جارہے ہیں، چنانچہ قومی اخراجات میں کمی لانے کی کوشش کی جارہی ہے، وہاں پر یہ سب باتیں اخبار میں آجاتی ہیں، پریس کے ذریعہ کاروبار پر اور حکومت پر اثر ڈالا جاتا ہے، وہاں کے اخبارات میں ہر قسم کی خبر اور معلومات فراہم کردی جاتی ہیں اور اتوار کا اخبار تو ۱۵ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے، آپ کو مارکیٹ جانے کی ضرورت نہیں، گھر بیٹھے آپ اخبارات سے دنیا کی حالت اور اپنے ملک کی اقتصادی اور اجتماعی کیفیت معلوم کرسکتے ہیں۔

وہاں کاروبار و معاملات میں دیانت داری ہے لیکن یہ انسانیت اور نیکی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے کاروبار کو چلانے کے لیے ہے اس لیے اگر ذرا بھی مال میں خرابی آجائے تو اس کا حرجہ ہوجاتا ہے اور اس کے اثر سے مال کی بکری متاثر ہوجاتی ہے اور نقصان کا باعث بنتی ہے، اس لیے وہاں دیانت داری کے بغیر کاروبار کو ترقی نہیں ہوسکتی، اور اب تو ٹیلی ویژن نے اخبارات وریڈیو دونوں کو فیل کردیا ہے، یہ نفسیاتی بات ہے کہ انسان آنکھوں سے دیکھ کر جتنا متاثر ہوتا ہے اتنا پڑھ کر یا سن کر متاثر نہیں ہوتا۔

جن کے ہاتھ میں یہ سب ذرائع ابلاغ ہیں وہ اکثر وبیشتر یہودی ہیں، یہودیوں نے اعلیٰ مناصب پر فائز ہونے کے لیے امریکہ پر جو اپنا اثر ورسوخ قائم کرلیا ہے، وہ محض مکاری نہیں بلکہ انھوں نے بہت پہلے سے منصوبہ بندی کی پھر اس کے لیے ٹھوس محنت کی ہے، یہودی تعلیم پر اتنی محنت کرتے ہیں کہ ہر دیگر مشغولیت سے کٹ کر تعلیم کے ہوجاتے ہیں۔

زمانۂ طالب علمی میں اپنے اساتذہ کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے امریکہ میں یہودی نسل کے لوگ دیگر لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ لیاقت کا ثبوت دیتے ہیں اور اس طرح اہم سے اہم منصب تک پہونچ جاتے ہیں، پھر ان کو اپنی قوم کی بڑی فکر رہتی ہے، قوم ان کی ترقی کے لیے مدد کرتی ہے اور وہ کامیاب ہونے پر قوم کی فلاح وترقی کی فکر کرتے رہتے ہیں، فلسطین میں اسرائیلی حکومت کو جمانے اور اس کو خطرات سے بچانے کے لیے تمام یہودی ہر وقت کوشاں رہتے ہیں اور

دامے، درمے، سخنے کوئی کمی نہیں کرتے، اس کے برعکس مسلمانوں نے اور عربوں نے فلسطینیوں کے لیے اور بیت المقدس کو بچانے کے لئے کبھی سنجیدہ فکر نہیں کی۔

ہمیں ماضی کے واقعات سے سبق لینا چاہئے، ۲۰۰، ۳۰۰ سال سے مسلمانوں کی زوال کی حالت کیوں چل رہی ہے، اس کی تاریخ کا جامع مطالعہ کرنا چاہئے، مختلف ممالک میں کیا کیا کوتاہیاں کی گئیں اور مغربی قوموں نے کس کس طرح اپنے جال میں پھنسایا اور کن تدبیروں سے پھنسایا، تاریخ، سیاسیات، اقتصادیات، نفسیات اور جغرافیائی معلومات میں سب موادمل جائے گا اور ان کا مطالعہ یقیناً باعث عبرت وبصیرت بن سکتا ہے لیکن ہم کو صرف تفریحی مطالعہ میں مزا آتا ہے، یا پھر جی ہی نہیں لگتا۔

سمرقند وبخاریٰ کی بازیافت

آکسفورڈ کے اسلامی سنٹر نے اپنے منصوبوں میں ایک منصوبہ یہ طے کیا کہ امام بخاری کی آخری آرام گاہ واقع سمرقند میں ایک بڑی درسگاہ اور مسجد کی تعمیر کی جائے، اس میں شرکت کی دعوت ملنے پر وہاں کا سفر ہوا، اس پروگرام میں ایک کانفرنس بھی تھی اور تعمیری منصوبہ کا نقشہ اسلامی سنٹر آکسفورڈ نے جس کا میں بھی رکن ہوں، حکومت ازبکستان کے تفصیلی اتفاق وتعاون سے تشکیل دیا تھا، ہم لوگوں کا ترکستان کے اس اہم اور مرکزی واسلامی تاریخ کے یادگار علاقے میں کئی روز رہنا ہوا، لوگوں سے ملے جلے، آثار دیکھے اور حالات جاننے کا اچھا موقع ملا، کانفرنس جو امام بخاری کی زندگی اور کارناموں پر تھی ۲۳ر اکتوبر ۱۹۹۳ء کو سمرقند کی ایک کانفرنس بلڈنگ میں ہوئی، افتتاحی اجلاس میں اسلامک کانفرنس آرگنائزیشن کے جنرل سکریٹری حامد الغامد، سعودی عرب کی مجلس شوریٰ کے نائب صدر ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف، ازبکستان کے نائب وزیراعظم، برونائی کے وزیر تعلیم عبدالعزیز، اسلامی سنٹر آکسفورڈ کے صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ڈائرکٹر ڈاکٹر فرحان احمد نظامی نے جلسہ کو خطاب کیا، ان کے علاوہ اہم شرکاء میں قطر کے ادارہ احیاء السنہ کے صدر ڈاکٹر یوسف القرضاوی، رابطہ عالم اسلامی کے نائب سکریٹری جنرل امین

عقیل عطاس، شام کے مشہور عالم علامہ عبد الفتاح ابوغدہ بھی اسٹیج پر تھے، ازبکستان کے صدر اسلام کریموف کو بھی شرکت کرنا تھی لیکن انہوں نے اپنا پیغام بھیجا جو افتتاحی اجلاس میں پڑھا گیا، اور تمام مقررین نے امام بخاری کے اس منصوبہ کو سراہا جس کو آکسفورڈ کے اسلامی سنٹر نے تجویز کیا تھا، سمینار میں دنیا کے مختلف اطراف سے آئے ہوئے مندوبین نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے، مقالات کی چار نشستیں ہوئیں، اور یہ پروگرام دوروز ۲۳-۲۴/اکتوبر چلا۔

سمینار کے اہم شرکاء میں دیگر جن اہم شخصیات اور علماء نے شرکت کی، ان میں پروفیسر خلیق احمد نظامی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند، مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا محمد اکرم ندوی، مولانا محمد اسلام قاسمی، مولانا محمد سفیان قاسمی، انجینئر محمد عثمان حیدرآباد، مولانا سعید احمد پالن پوری استاد حدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا ناصر علی ندوی استاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء، پاکستان سے مولانا سلیم اللہ خاں بانی و مہتمم جامعہ فاروقیہ کراچی، مولانا عبد الرزاق اسکندر مہتمم جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی، مولانا محمد عادل جامعہ فاروقیہ، استاذ عجاج خطیب متحدہ عرب امارات، ڈاکٹر مصطفیٰ طحان (کویت) مولوی احمد فہمی زمزم ندوی (ملیشیا) مولوی علی آدم ندوی (جنوبی افریقہ) اور دیگر چند اہم اصحاب علم اور محققین نے حصہ لیا، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے مولوی سید سلمان حسینی ندوی اور کاتب تحریر بھی شریک تھا، شرکاء کی مجموعی تعداد نوے ہوگئی تھی، اور ۲۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی دعا پر کانفرنس اختتام کو پہنچی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے صحیح بخاری کی پہلی حدیث کی روشنی میں جو نیت اور مقصدیت اور اس کے ثمرات واثرات پر ہے، اس بات کی طرف اپنی تقریر میں توجہ دلائی کہ ہمارا منصوبہ بھی امام بخاری کے کام اور مقام کے مطابق ہونا چاہئے، اور اسی طرح امام بخاری نے اپنی کتاب الجامع الصحیح کو جس حدیث پر ختم کیا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ سے بندگی کا تعلق اور اس کے ذکر وثنا کی اہمیت بتائی گئی ہے، ہمارے منصوبہ کی روح بھی اسی کے

مطابق ہونی چاہئے دنیا میں یادگار کے طور پر تعمیرات قائم کرتے ہیں، اور جو مقاصد اور نیت ہوتی ہے اور جو دکھاوا اور تفاخر ہوتا ہے، اس سے ہمارے اس منصوبہ کو پاک رہنا چاہئے۔

حضرت مولانا کی اس تقریر کا لوگوں پر اچھا اثر ہوا اور بہت توجہ سے سنی گئی، چونکہ وہ اسلامی سنٹر آکسفورڈ کے صدر بھی ہیں، اس لئے ان کی تقریر اہمیت اور مقصد کا تعین کرنے والی تقریر قرار پائی۔

کانفرنس کے اختتام پر مدعوین کے لیے منصوبہ کے جائے وقوع کے معاینہ کا نظم کیا گیا، یہ جگہ جلسہ گاہ اور شہر سے تقریباً ۳۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ایک قصبہ ''خرتنگ'' ہے یہاں امام بخاری کے زندگی کے آخری ایام گذرے اور یہیں وفات پائی جو بخارا شہر سے تقریباً پونے تین سو کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے جو امام بخاری کا وطن تھا اور جس کے نام کی نسبت ہے، ایک دن بخارا جانے کا بھی نظم بنا اور وہاں سلسلہ نقشبندیہ کے بانی اور عظیم المرتبت مصلح ومربی اور جلیل القدر شیخ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند کی قبر پر حاضری دی گئی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ اس قافلہ میں جو سمرقند سے بخارا گیا، علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ بھی تھے اور دوسرے مندوبین بھی، پرائیوٹ گاڑی کا انتظام بھائی انجینئر محمد عثمان حیدرآبادی نے اپنے خرچ پر کر دیا تھا۔

امام بخاری کی آرام گاہ (مرقد) جو سمرقند کے قصبہ ''خرتنگ'' میں ہے، اس سے متصل ایک چھوٹی مسجد اور ایک مکتب بھی ہے، اہل قصبہ مسجد میں جمع ہو گئے تھے جن سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، فضیلۃ الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ، شیخ عجاج خطیب اور ازبکستان کے امور دینیہ اور ادارے کے صدر شیخ عمر مختار نے خطاب کیا، عربی زبان کے خطابات کے ازبک میں ترجمے ہوئے۔

راقم الحروف نے اس کی تاریخی، علمی اور جغرافیائی اہمیت وحیثیت کو سامنے رکھتے ہوئے ایک سفرنامہ ''سمرقند وبخارا اور اس کی بازیافت'' کے نام سے لکھا جو تعمیر حیات ندوۃ العلماء میں قسط وار شائع ہوا، اور ہمارے مشفق مولانا سید محمد مرتضیٰ حسینی سابق ناظر کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے مکتبۂ حراء لکھنؤ سے شائع کرایا جو اب مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے شائع ہوا ہے اور اس کا عربی ایڈیشن بھی آچکا ہے۔

وقت کا سب سے بڑا اجہاد اور اس کا سب سے بڑا چیلنج

مورخہ یکم و ۲ر نومبر ۱۹۹۳ء کو دار العلوم ندوۃ العلماء کی شبلی لائبریری میں کل ہند دینی تعلیمی کونشن ہوا جس کی صدارت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمائی، جس کا ایک اہم اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے، فرمایا:

''اس زمانہ کا چیلنج یہ ہے کہ اسلام کو اس کی جداگانہ تہذیب، اس کی مخصوص معاشرت، اس کے عائلی قانون، اس کے وسائل معرفت، اس ملک میں اس کے ماننے والوں کی نسلی زبان وادب اور رسم الخط، اور اس کے پورے دینی وتہذیبی ورثہ سے الگ کر دیا جائے، اور اسلام چند عبادات، اور چند رسوم وتقریبات کا جو بعض مذاہب کا کل سرمایہ اور بعض قوموں کا واحد مذہبی نشان ہے، اسلام انھیں مذہبی ومعاشرتی رسوم کا مجموعہ بن کر رہ جائے، مسلمانوں سے کبھی اشارہ وکنایہ سے اور کبھی صاف صاف کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی رضا ورغبت سے، اپنی جداگانہ تہذیب، اور ہر اس چیز سے بے تعلقی اختیار کرلیں، جو ان میں الگ ملت اور ایک مستقل تہذیب کا وارث ہونے کا احساس پیدا کرتی ہے، وہ خود ہی اعلان کر دیں کہ ہم کسی جداگانہ تہذیب کے حامل نہیں، وہ خود اپنے عائلی قانون (پرسنل لا) میں اصلاح وترمیم کا مطالبہ کریں، یا پیش کیا جائے تو اس کو قبول کریں، وہ اپنے تمام تعلیمی مرکزوں کو جو انہوں نے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق قائم کئے تھے، حکومت کی تحویل وانتظام میں دے دیں، اور ان کے نظم ونسق سے خود دست بردار ہو جائیں، تاکہ ان سے ایک ہی طرح کے نمونے (Models) تیار کئے جائیں، اصل خطرہ نسل کشی کا نہیں، معنوی ارتداد، اور ذہنی وتہذیبی نسل کشی کا ہے، اس خطرہ کو دیکھنے اور اس کو محسوس کرنے کے لئے کسی بڑی فراست اور دور بینی کی ضرورت نہیں، یہ تو دیوار کا نوشتہ ہے جس کو ہر ایک پڑھ سکتا ہے، اور اب تو بعض برسر اقتدار پارٹیوں اور علاقائی حکومت نے نصاب تعلیم کی تبدیلی، ہندی زبان کو لازمی قرار دینے اور اس کی جبریہ تعلیم اور ایک نئی تاریخ ترتیب دینے کے اعلان کے

ذریعہ اس کا ایک فیصلہ اور پالیسی کے طور پر اعلان بھی کر دیا۔

اور آخر میں بحیثیت امت کو اپنے ملک، ماحول اور سماج کے لئے، امت رحمت اور اس کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لئے ماہر ملاح (کشتی بان) کا کردار (Part) ادا کرنا ہے، جس کی موجودگی میں اس ملک کو تباہ ہونا اور اس کشتی کو ڈوبنا نہیں چاہئے، اس لئے یہ کام مسلم طبقہ کے مفاد میں نہیں، اس ملک کے مفاد میں ہے اور اس کو انجام پانا چاہئے۔

جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڈھ کا دو روزہ اجتماع

ادھر جن چند اہم دینی و تعلیمی اجتماعات میں شریک ہونے کا موقع ملا، ان میں ایک اہم تعلیمی و دینی اجتماع جامعہ اسلامیہ مظفر پور ضلع اعظم گڈھ کا تھا جو محبّ مکرم مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی اعظمی مقیم ابوظہبی (امارات) نے بلایا تھا جو اس ادارہ کے بانی و سرپرست ہیں، اور اس کام اہتمام کیا کہ اس مشرقی علاقہ کے بڑے علماء و مشائخ کو بھی مدعو کریں، چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حضرت مولانا عبدالحلیم جون پوری، حضرت مولانا سید صدیق احمد باندوی اور علاقہ و مضافات کے اہم علماء، مدارس کے ذمہ داروں واساتذہ وعمائدین، اور ندوۃ العلماء کے علماء واساتذہ کو بھی مدعو کیا اور ایک بڑا عوامی جلسہ بھی کیا، جس میں خطبہ استقبالیہ پیش کیا اور جون پور و اعظم گڈھ کے علماء کی دینی و علمی خدمات پر خاص طور پر روشنی ڈالی، اور ندوہ کے منہج تعلیم کے مطابق ادارہ کے قیام و ضرورت کو بھی واضح کیا اور اس مناسبت سے راقم الحروف سے اپنے مشوروں اور تعلق کا بھی تذکرہ کیا۔

یہ دو روزہ اجتماع ۱۶-۱۷/ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو ہوا، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور حضرت مولانا عبدالحلیم اور حضرت مولانا صدیق احمد کے بیانات سے حاضرین مسعود ہوئے۔

انسٹی ٹیوٹ آف انٹگرل ٹیکنالوجی کی تقریبِ سنگ بنیاد

۳/ نومبر ۱۹۹۳ء کو لکھنؤ میں ہمارے چند اہل تعلق نے جن کا ندوۃ العلماء سے بھی

اچھا تعلق ہے، جن میں سید وسیم اختر صاحب کا نام پیش پیش ہے اور ان کا ہمارے بعض بہت عزیزانہ و برادرانہ تعلق رکھنے والوں سے قریبی قرابت کا تعلق ہے، وہ خود بھی معہد دار العلوم ندوہ میں کچھ عرصہ تدریس کا گذار چکے تھے اور ان کے دو ماموں مولانا سید محمود الحسن ندوی اور ڈاکٹر ضیاء الحسن ندوی بھی دار العلوم کے استاد رہے، عصری ضرورت اور مسلمانوں کی نئی نسل کی ذہنی تربیت اور اعلیٰ تعلیم کے خیال سے ایک ایسے ادارہ کے قیام کی بات سوچی جس سے وہ اپنی عصری ضروریات پوری کر سکیں، اور تعلیم میں وہ دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہیں، اس جذبہ کی حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کو بڑی قدر تھی، اور جب ان کے سامنے ایسے ادارے کے قیام کی بات آئی تو اس کو منظور کیا، اور سنگ بنیاد کی تقریب میں شرکت کی رضامندی دی، انہوں نے اس موقع پر عمائدین، معززین شہر اور علماء اور دانشور طبقہ کے سامنے بڑی اہم تقریر فرمائی جو تعمیر حیات شمارہ ۱۰ ر دسمبر ۱۹۹۳ء ص ۷ تا ۹ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے، جس کا عنوان ہے "صنعتی اور سائنسی علوم کی تعلیم کی افادیت و اہمیت اسلامی تعلیمات اور دور ماضی سے اس کا ثبوت" اس تقریر کا آغاز قرآن مجید کی آیات "وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِيۡدَ فِيۡهِ بَاۡسٌ شَدِيۡدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعۡلَمَ اللّٰهُ مَنۡ يَّنۡصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالۡغَيۡبِ، اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيۡزٌ"

(اور لوہا پیدا کیا، اس میں اسلحہ جنگ کے لحاظ سے خطرہ بھی شدید ہے) اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں، اور اس لئے کہ جو لوگ بن دیکھے اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں اللہ ان کو معلوم کرے، بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔

اور آگے اسی مناسبت سے حضرت داؤد علیہ السلام کا تذکرہ کیا کہ ان کے بارے میں اللہ نے ایک دوسری جگہ فرمایا "وعلمناہ صنعة لبوس لکم"، ہم نے ان کو زرہ بنانے کا علم دیا، جس سے وہ اجسام انسانی کی حفاظت کا کام لے سکیں، ہم نے ان کے لئے لوہے کو نرم کر دیا اور ان کو وہ حکمت عطا فرمائی جس سے کہ وہ لوہے سے شیشہ کا کام لے سکیں، اس موقع و مناسبت سے تقریر ایک الہامی تقریر اور حضرت مولانا کے اعلیٰ قرآنی فہم ذوق کی شاہکار تقریر تمام حاضرین، دانشور طبقہ اور علماء نے بھی محسوس کی، اس طرح انسٹی ٹیوٹ کی

یہ تقریب بہت مبارک اور اچھے طریقے سے انجام پائی اور اس انسٹی ٹیوٹ نے جلد اتنی ترقی کی کہ یونیورسٹی کی حیثیت اس کو حاصل ہوگئی، چوں کہ اس کا سنگ بنیاد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے رکھا تھا بعد وزیر اعلیٰ اتر پردیش ملائم سنکھ یادو نے ان کی تکریم میں اسے یونیورسٹی کی حیثیت تسلیم کیا اور اس کو تسلیم کرنے میں اس کی سبب کا بھی اظہار کیا، اس کے ممبروں میں ندوہ کے بعض اساتذہ کو بھی رکھا گیا، اور بعد میں مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دارالعلوم کو چانسلر کی حیثیت بھی ملی، اور اس کے بانی وسیم اختر صاحب اس کے پہلے وائس چانسلر ہوئے۔ جواب اس کے چانسلر ہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے متعلق اہم سانحہ وفات

مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا محبّ اللہ لاری ندوی کی وفات کا حادثہ ۱۵ر جمادی الثانیۃ ۱۴۱۴ھ/ ۲۹ر نومبر ۱۹۹۳ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پیش آیا جہاں انہوں نے تعلیم حاصل کی، اور پھر اس سے فکری وابستگی رکھی اور اس کی دعوت پر ۱۹۶۹ء/ ۱۳۸۹ھ سے تاوفات اہتمام کا منصب سنبھالا، اور اس کے فرائض کی ادائیگی میں بڑے ورع واحتیاط سے کام لیا، اور ایک صالح، نرم خو اور منتظم شخصیت کے طور پر ان کی شخصیت سامنے آئی جس کا سب نے اعتراف کیا، وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے رفیق درس بھی تھے، راقم الحروف نے ضروری سمجھا کہ ان کے متعلق تأثرات قلمبند کرے کہ دارالعلوم سے راقم کی تدریسی وابستگی اور انتظامی امور میں بہت سے مواقع پر مشوروں اور تبادلۂ خیال ہوتا رہا اور ان کی شفقت حاصل رہی تھی، یہ مضمون ۲۵ر دسمبر ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا جس کا آخری اقتباس پیش کیا جارہا ہے جو ان کے دور اہتمام سے متعلق ہے۔

’’مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے زمانۂ اہتمام میں ندوہ کے اندر متعدد اچھے اور عالمی سطح کے پروگرام ہوئے، ان میں پہلا ندوۃ العلماء کا جشن تعلیمی تھا جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا اسلامی عالمی اجتماع تھا، جس میں باہر کے درجنوں اداروں کے نمائندے شریک

ہوئے، باہر سے آنے والے ان مندوبین کی تعداد ۲۷ تھی، پھر چند سالوں کے بعد ادب اسلامی کا عالمی اجتماع ہوا، جس کے بعد ادب اسلامی کی ایک عالمی انجمن کی تشکیل ہوئی، یہ بھی اپنی نوعیت کا پہلا اجتماع تھا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج ملی اور اسلامی پروگراموں کے کاموں میں اپنی فکر وتوجہ، پرسکون طریقے سے صرف کرنے کا تھا، نام ونمود کے مظاہرے سے وہ بچتے تھے، ان کی عادت تقریر کرنے کی نہ تھی، وہ اپنے خیالات صرف گفتگو سے پیش کرتے، ان کی آراء ذمہ دارانہ اور بالمقصد ہوتی تھیں، وہ بہت سے معاملات میں اپنے رفقاء سے مشورہ کرتے، اور جو مشورے ان کو وقیع محسوس ہوتے، فوراً قبول کرتے، اس طرح انہوں نے ایک برابری کی فضا بنائی، اور اپنی نرمی، خوش اخلاقی اور فکرمندی سے مقبول ہوئے، اور سب کو فائدہ پہونچایا، اور اپنے انتقال سے سب کو خسارہ کا احساس دلایا۔"

مولانا محب اللہ لاری ندوی رحمۃ اللہ علیہ آخر تک مہتمم رہے، ان کی معاونت کیلئے کلیات کے عمید (صدر) اور نائب مہتمم اور مشرف اداری کے طور پر ذمہ داری انجام دینے والوں کی ایک جماعت تھی، اور ناظم صاحب ونائب ناظم صاحب اور معتمد تعلیم صاحب کے صلاح ومشورے اور فیصلے ان کے لیے تقویت کا باعث ہوتے تھے جن کی وہ تنفیذ کرتے، اور سب کے خیر وصلاح کا خیال رکھتے تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور کثیر مجمع نے ان کو ڈالی گنج قبرستان میں سپرد خاک کیا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ وأکرم مثواہ ورفع منزلتہ۔

افسوس کہ ایک ماہ بھی گذرنے نہیں پایا تھا کہ دار العلوم کے ایک قدیم استاد اور مخلص کارکن مولانا شیر حسین لکھنوی نے ۸؍رجب ۱۴۱۴ھ/ ۲۴؍دسمبر ۱۹۹۳ء کو بروز جمعہ لکھنؤ میں وفات پائی، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ، اور اسی ماہ رجب کے آخری عشرہ میں بزرگ ہستی عالم ومصلح ومرشد حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم جے پوری بانی جامعۃ الہدایہ جے پور نے بھی وفات پائی، ان کا تعلق بھی ہم اہل ندوہ سے بہت شفقت کا تھا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ وأکرم مثواہ، اور آپ نے دو صاحبزادے مولانا فضل الرحیم ومولانا ضیاء الرحیم کو

ندوہ میں پڑھایا۔ اور جب جامعہ الہدایہ قائم کیا تو اس کے مشورہ میں ندوہ کو اہمیت وترجیح دی اوراس کے نصاب ونظام تعلیم کا خیال رکھا اور پھر رابطہ ادب اسلامی کا ابتدائی اہم سمینار بھی جامعہ کے زیر انتظام منعقد کیا، ندوۃ العلماء بھی ان کی تشریف آوری ہوئی تھی، چند ماہ قبل آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا گیارہواں اجلاس جے پور کی بھی میزبانی فرمائی تھی، جو ۹-۱۰/اکتوبر ۱۹۹۳ء کو ہوا تھا۔

دارالعلوم بستی کا پروگرام

۱۶/دسمبر ۱۹۹۳ء کو دارالعلوم بستی میں ایک دینی وتعلیمی پروگرام منعقد ہوا جس کے داعی وہاں کی اہم شخصیت اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل مولانا باقر حسین تھے، بستی سے تعلق اوراس کے متوطن ہونے کی وجہ سے مولانا سید محمد مرتضی بستوی ناظر کتب خانہ ندوۃ العلماء کا شرکت کے لیے تقاضہ اور اہتمام رہا، اس موقع پر دینی تعلیمی کونسل کا اہم اجلاس بھی منعقد ہوا، جس میں مشرقی یوپی کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے نمائندوں کی تعداد خاصی تھی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سربراہی میں اس وفد میں مولانا سید ابوبکر حسنی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی، مولانا سید محمد مرتضی مظاہری بستوی، مولوی سید سلمان حسینی ندوی، مولوی سید عبداللہ حسنی ندوی اور راقم الحروف تھا۔

اس موقع پر مولانا سید مرتضی نے اپنے قصبہ مجھوا میر وجمدا شاہی لے جانے کا بھی نظم بنایا، جو ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک کے روح رواں مجدد ومجاہد حضرت سید احمد شہید کے خلفاء کی تجدیدی واصلاحی سرگرمیوں کی جولان گاہ رہ چکا ہے، جن میں مولانا سید جعفر علی نقوی بستوی کا نام سرفہرست ہے کہ جو سید صاحب کی بالاکوٹ میں شہادت کے بعد ان کی دعوت وتحریک کے مشن میں تاحیات سرگرم رہے، اور نیپال کی ترائی تک مدارس کا جال بچھایا اور آوازہ توحید سے ہمالیہ کے دامن کو منور کیا، انہی کے اخلاف اور موجودہ افراد خاندان میں

مولانا مرتضی نے اس تعلق کی تجدید کی، جمدا شاہی میں مولانا عبدالقیوم شاکر اسعدی اپنا مدرسہ اصلاح المسلمین چلارہے ہیں، اور حضرت مولانا اسعداللہ سابق ناظم مظاہر علوم کے مجاز وخلیفہ ہیں اور بہت تعلق رکھتے ہیں۔

مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی کا سالانہ جلسہ

ایک اہم پروگرام ہمارے وطن دائرۂ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی سے متصل گاؤں میدان پور میں واقع مدرسہ ضیاء العلوم کا تھا جو اس کا سالانہ جلسہ تھا اور جلسہ ادھر کئی سالوں سے نہیں ہوا تھا، اسی موقع پر نئی درسگاہ کے سنگ بنیاد کی تقریب بھی عمل میں آئی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جلسہ کی صدارت فرمائی، خطاب اور سنگ بنیاد بھی رکھا، اس جلسہ میں مولانا قمر الزماں صاحب الہ آبادی، مولانا اشتیاق احمد پرتا بگڈھی (خلف اکبر حضرت مولانا محمد احمد پرتا بگڈھی) نے بھی شرکت کی تھی۔